کچھ اطلاع نہ ملی، مکرمی و محبی قاضی محمد خلیل صاحب کی بیاض سے کلام نقل ہوا۔

تبخانوں میں دے پھر اذانیں	قطعہ	ناقوس بھی کعبہ میں بجایا
لیکن نہ کسی نے یوں بھی پوچھا		بے وقت یہ راگ کس نے گایا
تم جیسے چاہو چڑھالو سر پر		ورنہ یوں دوش پہ کاکل ٹھیرے
کوئلیں بولیں پپیہے کوکے		روز و شب شیشہ سے قلقل ٹھیرے
بد دماغی ہے فقط میرے ساتھ		کان کی بات مری غل ٹھیرے
ہم جو چپ ہوں تو سڑی کہلائیں		شیخ چپ ہوں تو توکل ٹھیرے
محفل میں اسکی دور کھڑے ہیں دبے ہم		ہیں اسکے منتظر کہ اشارہ کرے کوئی
کرتا ہوں دیر اسلیئے دینے میں جان کے		مجکو پسند ہے کہ تقاضا کرے کوئی
کہتے ہیں جسنے چھوڑی خودی وہ خدا ہوا		درگذرے ہم خدائی سے بندہ کرے کوئی

رسوا

رُسوا۔ جناب مرزا ہادی حسن صاحب رُسوا، حاجی مرزا ولی جان بیگ کے بیٹے بریلی کے باشندے اور حضرت اسیر کے شاگرد ہیں، آپنے جو تقریظ خمخانۂ جاوید پر لکھی ہے وہ جلد دوم کے آخر میں درج ہے۔ کلام کا نمونہ حاضر ہے

نظر آتی ہے جورِ چرخ سے ویرانی عالم	کھلی آنکھیں نظارہ کرتے ہیں خوابِ پریشاں کا
روتے ہیں اپنے حالِ شکستہ پہ صبح تک	منہ ڈھانکتے ہیں اُن چاکِ سحر سے ہم
آنکھوں سے دل میں کھینچتے ہیں عکسِ روئے یار	فوٹو کا کام لیتے ہیں تارِ نظر سے ہم
رخ میری سمت اور نظرِ لطف غیر پر	اپنی نظر میں گر گئے انکی نظر سے ہم
رہا رازِ محبت سوزِ پنہاں میں نہاں برسوں	کیئے اسرارِ دل زنگِ پریدہ نے عیاں برسوں
کسیکی پردہ پوشی دل سے منظورِ نظر رکھی	رہا طفلِ سرشک آغوشِ مژگاں میں نہاں برسوں
سوالِ وصل پردہ بن گئے تصویرِ خاموشی	رہا زنگِ حیا چشمِ مروت میں نہاں برسوں
بنا یہ جسمِ خاکی مرکبِ جاں مدتوں رسوا	چلی ریگِ رواں میں کشتیٔ عمرِ رواں برسوں

وہ بات بات پہ تیغ ستم دکھاتے ہیں
قضا کا سامنا ہے پر قضا نہیں آتی

ہٹا دے بیچ سے مشتاق کی دیوار آئینہ
تماشائے فروغ حسن سیرت دیکھنے والے

صدمۂ ہجر سے جو لگی ہوئی ہے حالت
کس طرح چیر کے پہلو کو دکھائے کوئی

کہا جو میں نے کہ مانگو تو دل میں نذر کروں
تو ہنس کے بولے ہمیں التجا نہیں آتی

رسوا پنڈت گنگا پرشاد صاحب تذکرۂ ہنود سے کلام لیا گیا۔ ملاحظہ ہو۔ رسوا

ای پری کوچے سے تیرے کیوں قدم اٹھتا نہیں
پڑ گیا مجھ پر بھی کیا سایہ تری دیوار کا

تھے مجھے ہنگامۂ محشر پہ کیا کیا اعتراض
جب تلک دیکھا نہ تھا عالم تری رفتار کا

رسوا منشی سید اولاد حسین بریلوی از سادات نو محلہ، آپ ریاست جیپور کی کونسل عالیہ میں وکالت کرتے تھے، پھر ناظم بھی ہو گئے تھے سنہ ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا، بڑے نکتہ فہم نکتہ رس سخن سنج تھے، لیاقت علمی بہت اچھی تھی، شعر کا شوق بہت کم تھا مگر جب کہتے تھے تو خوب کہتے تھے، فی البدیہہ شعر کہنے کی اچھی مہارت تھی، قاضی محمد خلیل صاحب کی زبانی چند اشعار سننے وہ درج کیے گئے۔ رسوا

بہار چھا گئی آنکھوں میں جب سرور آیا
شراب پینے سے کافر کے منہ پہ نور آیا

شراب چھوڑ کے نیت ہوئی ہے ڈانواڈول
یہ کیسی توبہ کہ ایمان میں فتور آیا

ہماری آنکھ کی اللہ رے مستیاں بے مے
کسی حسیں پہ نگہ جب پڑی سرور آیا

لوگ کہتے ہیں کہ عالم میں بہار آئی ہے
دیکھتے ہم جو گذرتے سوئے زنداں ہو کر

اک جہاں کشتۂ انداز خود آرائی ہے
آپ جو چاہیں کریں آپکی بن آئی ہے

ہم اتنی زیست میں تنگ آگئے ہیں حضرت خضر
کہاں سے لاتے جگر عمر جاوداں کیلئے

ہمیں یہ شرم رسوا مانع ترک محبت ہے
کہینگے خود غرض تھے چار دن کی آشنائی تھی

وہی فغاں ہے، وہی آہ ہے، وہی نالہ
خدا کے فضل سے اپنا جو حال تھا سو ہے

رسوا۔ مولانا فیض احمد صاحب بدایونی، بار بار حالات کے لیے لکھا گیا، مگر باوجود اقراروں کے رسوا

کرتے ہیں زندۂ جاوید مجھے کاٹ کے سر
آب شمشیر نہیں آب بقا دیتے ہیں

عبث کھٹکا ہے چشم باغباں میں
کہ اب کیا تھا ہمارے آشیاں میں

قتل کا مانع ہیں اے قاتل نہیں
پر ابھی یہ ہاتھ اس قابل نہیں

دیکھتا ہوں گو تصور میں تجھے
چاہیئے جو لطف وہ حاصل نہیں

کام کیا مجھ دل شکستہ کا وہاں
شمع کشتہ لائق محفل نہیں

باغ عالم میں جو سونگھا پھول پائی تیری بو
ہر ورق گل کا مزین تھا تری تصویر سے

برہمی زلف سے سب راز سربستہ کھلا
مدعا پایا تیری الجھی ہوئی تقریر سے

ابھی تلاش رہ میکدہ میں بھٹکے واعظ
تم اس گھڑی ہمیں گویا کہ خضر راہ ملے

ہنسی میں بھی ہی سر کدورت لیا ہی تو سنہ جو بے اجازت
مٹی ہی تقدیر کی یہ صورت ہنسا ہنسا کر رلا رہا ہے

فقط لہو کا تھا ایک قطرہ بہا وہ آنکھوں کی راہ سارا
وبال ہے ہو جو دل ہمارا تو تم نہیں پہچان کیا رہا ہے

چھپایا راز محبت اپنا کہ پی گیا آنسوؤں کا دریا
یہ رنگ رخ کو کہو کروں کیا یہ درد دل کا بتا رہا ہے

کچھ عبث آفت میں جان عاشق دلگیر ہے
ضعف دامنگیر ہے وحشت گریباں گیر ہے

یہ سمجھکر مجھ سے منہ پھیرے ہوئے بیٹھے ہیں وہ
زخم دل کے واسطے سوزن نگہ کا تیر ہے

ہے گمان تسکین کا ہی ظلم کی بس انتہا
اس پہ پچھتاتا ہے قاتل دلمیں میرے تیر ہے

بیخودی شوق جواب خط میں دیکھے تو کوئی
ایک ہی مطلب ہے لیکن سو جگہ تحریر ہے

یاں دم آنکھوں میں ہے اور واں یہ گذرتی ہے خبر
آنکھ بیمار نے اب کھولی ہے حال اچھا ہے

یہ کہہ کے آج وہ ہمت بڑھا گیا میری
تری وفا سے پشیماں ہوئی جفا میری

رسوا منشی سید باقر حسین صاحب لکھنوی ملازم میونسپل کمیٹی لکھنو۔ داغ دہلوی کی شاگردی کا دم بھرتے ہیں اور مسن آدمی ہیں، یہ انکا کلام ہے۔ رسوا

پری ہو، حور ہو، یا آدمی ہو
تلاش خوبرو ہے اور میں ہوں

کیوں نہ پروانہ ہو دل شمع حجاب یار کا
ہے فروغ عشق عاشق کے لیے پیغام عشق

کیا صلہ ہمکو ملیگا یہ زباں سے کہدو
ہم نشانِ دلِ گم گشتہ بتا دیتے ہیں

اپنا دل دیجئے گنہگار بنے کیا کہنا ؟
عاشقوں کو وہ سزا روزِ جزا دیتے ہیں

کھو دیا جسنے ہمیں دونوں جہاں سے رُسوا
ہم تو اُس کوسنے والے کو دعا دیتے ہیں

کسی کے روئے انور کا تصور ہو تو ایسا ہو
ہٹائے سے نہ ہٹتا ہو مٹائے سے نہ مٹتا ہو

مزا اس آمد و شد کا قیامت تک رہے باقی
مٹے حسرت اگر کوئی تو پھر ارمان پیدا ہو

دل یہ خالی نہیں رہتا کبھی ارمانوں سے
روز گھر اپنا بھرا رہتا ہے مہمانوں سے

یہ نیا حکم ہے قائل ہوں تری شوخی کا
نہ تو اپنوں سے ملوں اور نہ بیگانوں سے

پھر اُمنگوں کا ظہور اس دلِ ناشاد میں ہے
کچھ ترا رحم بھی شامل تیری بیداد میں ہے

نارسائی ہمیں سُنواتی ہے باتیں کیا کیا
یہی دھبہ تو بڑا دامنِ فریاد میں ہے

مُجھ سے ناخوش ہو جو تم میں بھی خفا ہوں جتنے
ایک سے ایک بھلا عالمِ ایجاد میں ہے

دربدر ڈھونڈھنے سے فائدہ، حاصلِ مطلب
یار کا گھر تو ہمارے دلِ ناشاد میں ہے

وہ اگر ظلم بھی کرتے ہیں تو ہے مہر و وفا
یاں گذارش بھی تو داخل مری فریاد میں ہے

آپ ہمشکل ہیں یکتا ہیں مگر یہ کہیئے ٭
کوئی رُسوا سا بھی اِس عالمِ ایجاد میں ہے

رُسوا

رُسوا ۔ سید محمد اصغر رُسوا خلف میر وزیر علی افگر مرحوم لکھنوی، حضرت رشید لکھنوی کے با عقیدت تلامذہ میں ہیں، خوش فکر شیریں کلام شاعر ہیں، بندش اور مضمون دونوں کا لحاظ رکھتے ہیں، یہ کلام کا نمونہ ہے ٭

ہمنشینوں سے چُھپا کر اُنھیں چاہیں کیونکر
چُھپ سکینگی یہ محبت کی نگاہیں کیونکر

سر سے ٹلتی ہیں حسینوں کے بلائیں کیونکر
یا خدا ہوتی ہیں مقبول دعائیں کیونکر

مُجھ سے کیا پوچھتے ہو ناز و کرشمہ کیا ہے
قتل کی اپنے بتا دوں تمھیں راہیں کیونکر

وصل کی رات ہی پہلے یہ بتا دو مجکو
تم کسی بات پہ رُوٹھو تو منائیں کیونکر

نہ سہی عشق ۔ مروّت بھی ہے آخر کوئی شے
رسم بڑھ جائے کسی سے تو گھٹائیں کیونکر

مولوی سید گلزار علی اور مولوی محمد بشیر سے تحصیل عربی فارسی کی کی فن سخن میں شروع میں مرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبرآبادی سے تلمذ اختیار کیا اور اُنھیں کے ارشاد کی تعمیل میں سُہیل تخلص کیا، لیکن چونکہ طبائع و مذاقِ سخن میں اختلاف تھا کچھ دنوں بعد نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے تلمذ سے بہرہ یاب ہوئے، شوخی فکر اور طبیعت کا چلبلاپن کلام سے ظاہر ہے ۱۸۹۰ء میں گوالیار جا کر ملازم سرکار سیندھیہ ہوئے اب عدالتِ دیوانی ضلع سکرواری میں اہلمد ہیں سن شریف قریب چالیس بیالیس سال کے ہے، طبیعت کا چوچلا مفصلۂ ذیل اشعار سے ظاہر ہے *

یہ کلیجہ ہے میرا دل ہے میرا دم ہے میرا	آ بچے تیر کو پہلو سے نکلنے نہ دیا
غم و یار رنج دیا، داغ دیا، درد دیا،	اُسنے سب کچھ دیا ارمان نکلنے نہ دیا
تیری خاطر سے رقیبوں کا بھی اپنے شکوہ	دل میں آیا تو سہی منہ سے نکلنے نہ دیا
ملے جو قسمت سے ایسا موقعہ تو لطف آئیگا زندگی کا	مزا تو جب ہے کہ وصل میں ہو زبان کیسی دہن کسیکا
ملے تھے قسمت سے وصل کی شب مذاق کیسا یہ مجکو سوجھا	بگڑ گئے وہ شکایتوں سے نتیجہ نکلا یہ دل لگی کا
سوال ہوگا تو اور ہی کچھ جواب دینگے وہ اور ہی کچھ	مزا تو آئیگا حشر کے دن ہماری اُنکی جلی کٹی کا
یہ نا ملال ہوگا ذرا اُنھیں انفعال ہوگا	وہ چھپ کے نکلے عدو کے گھر سے یہی تو ہے وقت بندگی کا
گلے سے اپنے لگاؤ اُنکو شکایتوں سے حصول سوا	لگا ہی قسمت سے ہاتھ یہ دن نہیں ہی موقعہ جلی کٹی کا
کون کرتا ہے الٰہی یہ شرارت مجھ سے	خط پہ خط مجھکو جو گمنام چلے آتے ہیں
یہ جلانیکا نیا ڈھنگ کیا ہے ایجاد	غیر کے خط بھی مرے نام چلے آتے ہیں
کون سنتا ہی ہماری کہ کریں داد طلب	ہائے محشر سے بھی ناکام چلے آتے ہیں
ہم تجھے قتل کرینگے سرِ محشر آ کر	ابتو نوٹس یہ مرے نام چلے آتے ہیں
آنکھوں آنکھوں میں اشارہ ہے کہ دلوائیے دل	پردے پردے میں وہ مطلب کی سُنا دیتے ہیں
حضرت درد کو آہا ہے تکلف کیسا	آپ جب اُٹھتے ہیں تو مجکو بٹھا دیتے ہیں

اُن نرگسی آنکھوں کے تصور میں ہوں بیمار	نیند آنکھوں میں آتی نہیں اک دم شب فرقت
درپیش عدم کا ہے سفر ساتھ چھٹا آج	لے تجھ سے بھی رخصت ہوئے ایام شب فرقت
سب چھوٹ گئے اپنے بچھوڑا مجھے رستم	تا عمر رہی ہو مری ہمدم شب فرقت

رُسوا

رُسوا ۔ لالہ آفتاب رائے رُسوا جوہری ساکن شاہجہان آباد عہد اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶-۳۷) دائم الخمر اور بازاروں میں غزلیں پڑھتے پھرا کرتے تھے ۔ مرتے وقت وصیت کی کہ شراب میں غسل دینا ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یہانتک کہ کپڑوں پر بھی شراب چھڑکی گئی مگر روایت ہے کہ جنازہ اُٹھاتے وقت کسی کو بھی شراب کی بُو نہ آئی ۔ یہ کلام بہم رسیدہ کا خلاصہ ہے ؎

رُسوا ہوا، خراب ہوا اور بدر ہوا	اِس عاشقی کے پنتھ میں جس کا گذر ہوا
مست ہو کر گر پڑے ہیں ہر طرف دیوار و در	ابر رحمت ہے برستا یا برستی ہے شراب
قفس سے چھٹ گئے ہم اور چمن میں جائے نہیں	اُڑیں تو پر نہیں رکھتے چلیں تو پائے نہیں
رُسوا بھی اِس زمانے میں مجنوں سے کم نہیں	کوئی جا نہیں زمیں پہ کہ اشکوں سے نم نہیں
وصل میں بیخود رہے اور ہجر میں بیتاب ہو	اِس دیوانے دلکو رسوا کس طرح سمجھائیے

رُسوا

رُسوا ۔ شیخ محمد عبد الحمید رُسوا ابن شیخ امداد علی متوطن غازیپور مقیم آگرہ چند فارسی غزلیں مرزا نوشہ غالب کو دکھائیں تھیں ۔ اُردو میں مرزا قہر سے اصلاح لی تھی ۔ ۱۲۸۱ھ بسنہ ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے تھے اِسکے سوا اور کچھ حال دستیاب نہو سکا ۔ کلام حاضر ہے ۔

اگر دل مومنوں کے زاہد وا عرش خدا ٹھیرے	بتوں نے جب اُنھیں چھینا تو پھر بتلاؤ کیا ٹھیرے
کہا میں نے ذرا ٹھیرو تو دل لے دلربا ٹھیرے	کہا اُس گیسوؤں والے نے اب کسکی بلا ٹھیرے
دل مضطر ہمارا سینۂ سوزاں میں کیا ٹھیرے	کہاں سیماب و آتش دونو باہم اکجا ٹھیرے
لب جاں بخش کی تیری ہوئی کشتی جو اے قاتل	عجب کیا ہے جو اُنکی خاک بھی خاک شفا ٹھیرے

رُسوا

رُسوا ۔ صاحب طبع رسا منشی کفایت علی رُسوا اکبر آبادی ، قاضی سیّد محمد ہاشم علی مغفور کے خلف اصغر ہیں ، بمقام آگرہ پیدا ہوئے ، انکا خاندانی سلسلہ سیّد علی ہمدانی سے ملتا ہے

قائمقام سارے زمانے کے جمع ہیں		آتے ہیں سب رئیسِ عقیدت شعارِ ہند
وہ روشنی ہے شہر میں راتوں کو آجکل		جسکی ضیا سے ایک ہیں لیل و نہارِ ہند
شاہنشہا درود سے تیرے کچھ اور ہے	......	تزئینِ ہند و رونقِ ہند و بہارِ ہند
پہلے سے شانِ ہند کی کچھ کم نہیں مگر		آنے سے تیرے اور بڑھا افتخارِ ہند
جس شان سے سواریٔ اقدس رواں ہوئی		تاریخ میں رہیگی یہ اک یادگارِ ہند
شاہا جلو میں تیرے رسالوں کے وہ پرے		ایک ایک جن میں رستم و اسفندیارِ ہند
جاندار بن کے چلتی ہے روزِ وغا شہا		قبضے میں تیرے تیغ جواہر نگارِ ہند
تھی خانہ جنگیوں سے نہ فرصت اسے کبھی	قطعہ	کب تھا کسی زمانے میں یہ اقتدارِ ہند
کیا چین سے گذرتی ہے تیرے زمانے میں		اے شہریارِ لندن و اے تاجدارِ ہند
بے انتظامیوں کا نہیں دخل اب کہیں		سنجیدگی سے چلتے ہیں سب کاروبارِ ہند
اب ایک ہی ہے مشرق و مغرب کا بادشاہ		کیونکر نہ دولتوں میں بڑھے اعتبارِ ہند
زندہ کیا حضور نے اکبر کے نام کو		کیوں خلق آپ کو نہ کہے افتخارِ ہند
وہ جو رسا ہے بندۂ دیرینۂ نظام		دیتا ہے یوں دعا تجھے اے تاجدارِ ہند
فرخندہ و مبارک و مسعود و سازوار		دربار ہو یہ اے شہِ عالی تبارِ ہند
پھولے پھلے زمانہ میں گلزارِ خسروی		گل پھول تا کھلائے چمن میں بہارِ ہند
آباد و شاد امپرر و امپرس رہیں		ہو جاں نثارِ شاہ ہر اک جان نثارِ ہند
جتنے رئیس ہند ہیں سب پر ترا یہ لطف		سب مانتے ہیں تجھکو کہ ہے تاجدارِ ہند
آصف سے اتحاد کا محکم ہو رابطہ		ہے وہ رفیقِ دولتِ عظمت مدارِ ہند

رستم

رستم منشی رستم علیخان رستم، الہ آباد کے باشندے اور ۱۹۰۴ء میں مرزا پور میں مقیم تھے رسالۂ پیامِ عاشق سے کلام نقل ہوا۔

کٹ گئی عمر مگر تو نہ کٹی کاٹے سے		طول کس درجہ ترا اے شبِ ہجراں دیکھا

غنچے دیتے ہیں یوں چٹک کے صدا	وحدہٗ لا شریک ہے وہ خدا
پھول بوٹوں میں رنگ قدرت کا	پتا پتا گواہ صنعت کا
کوئی سمجھا نہ آجتک یہ راز	سرو قمری میں کیوں ہو راز و نیاز
کرتی ہے نالہ و بکا بلبل	گل تر پر ہے کیوں فدا بلبل
کیسے کیسے حسیں کئے پیدا	نازنیں مہ جبیں کئے پیدا
باغ عالم کو زیب و زینت دی	لوٹ ہو جائیں دل وہ صورت دی
دیکھکر جلوہ اُس کی قدرت کا	ہے فرشتوں میں شورِ صلِ علیٰ
حمد کرتے ہیں اسکی جن و بشر	اُسکے اوصاف ہیں زبانوں پر
ایسی آنکھیں کہاں سے لائیں ہم	اسکی قدرت کو دیکھ پائیں ہم
ذاتِ باری کو کوئی کیا جانے	آپ اپنے کو وہ خدا جانے

رسا
رسا۔ منشی سید شاہ عبد العزیز بہاری شاگرد مولانا عبد الاحد شمشاد لکھنوی ۱۸۹۳ء سے مشقِ سخن کرتے ہیں اور اپنے اُستاد کے تلامذہ میں ممتاز ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہشت میں بھی نہ چھوٹے گی سکینی مجھ سے	وہاں بھی ہاتھ میں بوتل شراب کی ہوگی
کلیم کو جو جھلک طور پر دکھائی دی	نقاب چہرے سے اُس شوخ کے ہٹی ہوگی
تمہارے حسن میں بے شک زوال آئیگا	ہمارے عشق میں ہرگز نہ کچھ کمی ہوگی

رسا
رسا۔ مرزا غلام مصطفےٰ صاحب مددگار ناظم امور مذہبی ریاست حیدرآباد دکن، پہلے شاید رسوا تخلص تھا اور مہاراجہ پیشکار مدار المہام کی سرکار میں ملازم تھے، حضرت داغ کے دکھنی تلامذہ میں صاف اور اچھا کہنے والوں میں ہیں، حالات کے لئے متواتر خط بھیجے مگر جواب نہ ملا۔ مجبوراً اندراج کلام پر اکتفا کیا گیا ؛

قسمت پہ اپنی ناز کرے سبزہ زار ہند	آتا ہے پایہ تخت میں پھر تاجدار ہند
دلّی میں شل رحمتِ باری ہے جلوس	لندن سے آرہا ہے شہ کامگار ہند

ہیں حیات تھے اِس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوا۔ چند اشعار درج ہیں۔

تڑپتا ہے سسکتا ہے تمہاری آشنائی میں
نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے دلِ مضطر جدائی میں

مَیں روتا ہوں جو نام اُس بت کا لیکر تو وہ کہتا ہے
رسا رسوا کر گئے تم ہمیں ساری خدائی میں

شوقِ دیدار میں بس موت کا چلتا ہی نہیں
دم مری آنکھوں میں اٹکا ہے نکلتا ہی نہیں

کس طرح ضبط کروں دل نہو جب قابو میں
یہ تو کمبخت سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں

دعوتِ ناوکِ دلدار کروں خاک رسا
دل سے اک خون کا قطرہ تو نکلتا ہی نہیں۔

رسا

رسا۔ سید محمد سمعیل باشندہ گیا، اِنکا بیان ہے کہ اُنکے بزرگ ہمدان سے آئے تھے، نئی طرز میں اکثر طبع آزمائی کرتے ہیں رسالوں میں اُنکا کلام بھی اکثر چھپتا رہتا ہے، زبان اور مضمون دونوں کا خیال رکھتے ہیں طبیعت کا رنگ ملاحظہ ہو۔

وہ فصد کر رہے ہیں اگر لالہ زار کا
آئیں کھِلا ہے باغ دلِ داغدار کا

زلفیں ہیں یہ گھٹا نہیں چھائی ہی باغ پر
مُوباف کھُل گیا ہے عروسِ بہار کا

ناصح خیالِ توبہ ہی لیکن مَیں کیا کروں
مجبور ہوں کہ ہے ابھی موسم بہار کا

ہل چل یہ میکدے میں نہیں آج بے سبب
تقوی ہے ٹوٹتا کسی پرہیزگار کا

اپنے حنائی ہاتھوں کی مٹھی کو کھولدے
کچھ کچھ پتا چلا ہے دلِ بے قرار کا

تختے کھِلے ہوئے نہیں پھولوں کے باغ میں
جوبن نکھر رہا ہے عروسِ بہار کا

کس چشمِ سرگیں کا میں کشتہ ہوں اے رسا
آہو طواف کرتے ہیں میرے مزار کا

کیا دھُواں دھار گھٹا اُٹھی ہی میخانے سے
ساقیا نور کا منہ برسے گا پیمانے سے

حلق پر تیغ دودم رکھ کے بھی پھیری نہ گئی
کیا ملا تجکو ستمگر مرے تڑپانے سے

ہے ہر حال میں تقدیر پہ شاکر انسان
سب بنے کام بگڑ جاتے ہیں گھبرانے سے

قتل کے بعد ہے یہ حسرت و افسوس عبث
جی نہ اُٹھونگا مَیں ظالم ترے پچتانے سے

حمد

حمدِ خالق میں عندلیبِ قلم
گلفشاں ہے زہے نصیبِ قلم

کر دے رہا کہ سیرِ چمن کو ترس گئے	صیاد تیرے صدقے اسیرِ قفس گئے
اٹھتے کہاں ہیں نقشِ قدم کی طرح سے ہم	اب تیرے ہو رہے ترے کوچہ میں بس گئے
مدت ہوئی ہے خانہ خرابی ہے اور ہم	سمجھا وطن اسی کو جہاں رات بس گئے
نقشِ قدم نے آپ کے مجبور کر دیا	ہم کوچۂ رقیب میں کیا اپنے بس گئے
دیکھوں نہ آنکھ اٹھا کے بھی حورِ بہشت کو	ایسے کسی کے جلوے اِن آنکھوں میں بس گئے
کنجِ قفس میں رہنے کی عادت سی پڑ گئی	آزاد ہو کے بھی نہ اسیرِ قفس گئے
رسا کو دِل میں رکھتے ہیں رسا کے جاننے والے	وفا کی قدر کرتے ہیں وفا کے جاننے والے
یہ وہ کافر ہیں بُت ایمان انپر لے ہی آتے ہیں	خدا کو ماننے والے خدا کو جاننے والے
وفا کی آزمایش کا سلیقہ تو ذرا سیکھو	بنو تو آشنا، نا آشنا کے جاننے والے
ترا کوچہ ہے ظالم اور مریضانِ محبت ہیں	کہاں جاتے ہیں اِس دار الشفا کے جاننے والے
کیا ذکرِ وفا میں نے تو یوں منہ پھیر کر بولے	زمانے سے مٹے رسمِ وفا کے جاننے والے
بتوں کے جاننے والے خدا کو جان جاتے ہیں	بتوں کو جانتے ہیں کیا خدا کے جاننے والے
خدا کا جاننا بس تھا تو کیوں دنیا میں آئے تھے	خدا کے پاس ہی رہتے خدا کے جاننے والے
رسا کو سب نے سمجھایا مگر سمجھا نہ کچھ ظالم	ہوئے مجبور اس مردِ خدا کے جاننے والے
ہوا ہے زرد مریجان پھول سا چہرہ	عدو سے ملکے یہ کیا اپنا حال کر بیٹھے

رسا **رسا**۔ سید احمد حسین رسا لکھنوی، جگت پور ضلع رائے بریلی میں سنہ ۱۹۰۱ء میں قیام تھا، حالات باوجود تلاش بہم نہ پہنچے، اشعار ملاحظہ ہوں۔

تمھاری چال کا مارا تمھارے ناز کا کشتہ	مسیحا کے جِلانے سے بھی اچھا ہو نہیں سکتا
ستا لو جتنا جی چاہے زباں سے اُف نہ نکلیگی	مرے منہ سے کبھی شکوہ تمھارا ہو نہیں سکتا
دمِ رحلت وہ آئیں یا نہ آئیں سب برابر ہے	کسی صورت سے اب بیمار اچھا ہو نہیں سکتا

رسا **رسا**۔ جناب سید ابو الحسن صاحب خلف راجہ میر محمد حسین صاحب فنا گرد جناب سنہ ۱۸۸۶ء

مجھ سے لاغر کی شبِ غم کیا کہوں کیونکر کٹی
جو شکن بستر پہ تھی تلوار ہو کر رہ گئی
غیر کا مذکور بھی کوئی پیامِ وصل تھا
کس لیے نیچی نگاہِ یار ہو کر رہ گئی
اے رسا کیسی رہی سب دادخواہی حشر میں
جب وہاں نیچی نگاہِ یار ہو کر رہ گئی

پی کے کر لیتا ہوں توبہ جب سے یہ دستور ہے
دل بھی روشن ہے مرا منہ پر بھی میرے نور ہے
غیر سے ملنے کے شکوہ پر قیامت ڈھا گیا
اُنکا یہ کہنا کہ دل سے آدمی مجبور ہے
مَیں سوالِ وصل کر کے اِس ادا پر مٹ گیا
ہنسکے فرمایا کہ یہ درخواست نامنظور ہے
حشر میں اللہ سے فریاد اُن کے ظلم کی
اے رسا یہ بات تو شرطِ وفا سے دُور ہے

دل میں کسیکو رکھو دل میں رہو کسی کے
سیکھو ابھی طریقے کچھ روز دلبری کے
فرقت میں اشکِ حسرت ہم کیا بہا رہے ہیں
تقدیر رو رہی ہے پردے میں بیکسی کے
آئے اگر قیامت تو دھجیاں اُڑا دیں
پھرتے ہیں جستجو میں فتنے تری گلی کے
دیکر مجھے تسلّی بے چین کر رہے ہو
ہنستے ہو وعدہ کر کے قربان اس ہنسی کے
یہ حضرت رسا بھی دیوانے ہو گئے ہیں
چکّر لگا رہے ہیں اک شوخ کی گلی کے
عدو سے اُنسے اگر کچھ ملال ہو جائے
رسا کی پھر تو نہ پوچھو نہال ہو جائے
بڑی ہی دھوم سے دعوت ہو پھر تو زاہد کی
یہ مے جو چار گھڑی کو حلال ہو جائے

ہجومِ حشر میں کیا ہے جو حالت ہو بیاں دل کی
بھری محفل میں کیونکر کوئی کہدے داستاں دل کی
وُہ مجھ سے اُنسے اَن بن ہی سہی شکوہ نہیں اسکا
مگر شامت ہی پھری اور اُنکے درمیاں دل کی
سُنایا حالِ دل اُنکو تو یوں منہ پھیر کر بولے
کسی نے مُنہ لگایا چھیڑ بیٹھے داستاں دل کی

فرصت ملے تو آنکھ ملے مُجھ غریب سے
آئینہ دُور ہو کہیں اُنکے قریب سے
بیٹھیں وہ اُسکے سوگ میں اور میرے سامنے
اللہ موت دے مجھے پہلے رقیب سے
محشر میں اُسنے شرم سے نیچی نگاہ کی
تُر کی تمام کی مری فریاد و آہ کی
ہم بُوند بھر شراب کو ساقی ترس گئے
یہ دن بہار کے یونہی ابکے برس گئے

آنے کو نظر ہیں مری سو فتنہ گر آئے
تجھسا نظر آیا ہے نہ تجھسا نظر آئے

کرتا ہوں دعائیں تو یہ آتی ہیں ندائیں
تو ہو کسی قابل تو دعا میں اثر آئے

کرتا ہے وہی دل میں رسا کے جو ٹھنی ہے
سمجھانیکو سمجھاتے ہیں سب اپنے پرائے

ترے بیمار میں کہنے کو جانِ زار باقی ہے
نہ ہونے کے برابر نبض میں رفتار باقی ہے

رکھیں گے غیر دردِ محبت کو دل میں کیا
یہ نور رسا کے دل میں رسا کے جگر میں ہے

بدلی اُدھر نظر تو اِدھر بھی بدل گئی +
اُنکی ہماری آنکھوں ہی آنکھوں میں چل گئی

مجرم سے اور پرسشِ اعمال حشر میں
کیونکر کہوں کہ شانِ کریمی بدل گئی

دونوں کو سوزِ عشق نے آخر کیا تمام
پروانہ پہلے جل گیا پھر شمع جل گئی

پہلے تو اُسنے دل کو مرے چاک کر دیا
پھر کہہ دیا کہ جا تری حسرت نکل گئی

دو گھڑی کے لئے انسان کو خواب آتا ہے
بند ہو جاتی ہیں آنکھیں جو شباب آتا ہے

محبت یہ ہے آدابِ محبت نام اِس کا ہے
کہ لب تک لا نہیں سکتا ہوں جو دل میں تمنا ہے

نہ پھرنا اپنے وعدوں سے سمجھ کر حشر کو اپنا
وہاں انکا اور عالم ہے وہاں انکی اور دنیا ہے

ترے اقرار سے دلکی جلن میں پڑ گئی ٹھنڈک
ترا حرفِ تسلی مرہم داغ تمنا ہے

نوشتہ میری قسمت کا کہاں سے اُسکے ہاتھ آیا
کہ جو کچھ خط میں لکھا ہے مری قسمت کا لکھا ہے

تمھیں جو مانگنا ہو اے رسا اللہ سے مانگو
بڑی سرکار ہے اُسکی بڑا وہ دینے والا ہے

گیا ہے بن سنور کر غیر کے گھر میہماں کوئی
اب ایسے میں نہیں آتی بلائے ناگہاں کوئی

وہ دم بھر کو سہی لیکن تسلی ہو تو جائے گی
وہ جھوٹی ہی سہی لیکن کرے تو مجھسے ہاں کوئی

کریں اقرار وہ پورا ہمیں باور نہیں آتا
ہم ایسے ہیں ہمارے حال پر ہو مہرباں کوئی

حالِ دل کہنے میں کیسے وہ خفا ہونے لگے
عرض مطلب پر نہیں معلوم کیا ہونے لگے

عشق کا چرچا کہیں ہی حسن کا چرچا کہیں
تذکرے میرے تمہارے جا بجا ہونے لگے

خط لکھا تھا میں نے میرے نامہ بر کی کیا خطا
اُسپہ کیوں بگڑے وہ اسپر کیوں خفا ہونے لگے

آپ سے حورِ جناں بھی مات ہے
آپکی کیا بات ہے کیا بات ہے

روز و شب فرقت کے دونوں ہیں بلا
رات دن ہے دن ہے بدتر رات ہے

انداز دلفریب ہیں شوخی بلا کی ہے
ہر بات لاجواب مرے دلربا کی ہے

جسپر مٹا اُسی نے مٹایا غریب کو
تقدیر ہی خراب دلِ مبتلا کی ہے

یہ حال اب تو ہے ترے بیمارِ ہجر کا
کہتے ہیں چارہ گر بھی کہ مرضی خدا کی ہے

یارب جو تو بھی اُن کا طرفدار ہو گیا
ہم اور کسکو داورِ محشر بنائیں گے

ہے دم میں دم تو راہ پہ لاوینگے ہم تجھے
زندہ رہے تو دل میں ترے گھر بنائیں گے

زاہد جو تجھ سے اُلجھے کسی روز مے پرست
ظرفِ وضو کو توڑ کے ساغر بنائیں گے

ہاتھ مَلتا ہوں کہ کیوں حشر میں کی تھی فریاد
اُنکی نیچی ہے نظر مجکو پشیمانی ہے

آگیا ہجر میں کوئی تو ذرا دل ٹھیرا
پھر وہی میں ہوں وہی میری پریشانی ہے

جب نتھے سامنے میرے تو پریشانی تھی
اب جو وہ سامنے آئے ہیں تو حیرانی ہے

عاشق کو تیرے لاکھ کوئی رہنما ملے
تیرا پتہ ملا ہے نہ تیرا پتہ ملے

تم مجھ سے آملے کبھی دشمن سے جاملے
جب یہ مزاج ہے تو کوئی بنتے کیا ملے

جب دَیر میں یہ دیکھا کہ اپنا گذر نہیں
کعبے کے جانیوالوں میں مجبور جاملے

زاہد ہے تو ہی بندۂ اللہ ہم نہیں ؟
کوئی حدیث ہے کہ تجھی کو خدا ملے

دیکھو رسا چلے تو ہو تم توبہ توڑنے
در پر نہ میکدے کے کوئی پارسا ملے

بے بات وہاں ظلم ہے بے جرم سزا ہے
ایسے سے نباہ ہے بھی تو کیا کوئی نباہ ہے

برائے دل کا ستانا روا ہے کب تمکو
یہ کس حدیث میں آیا ہے کس کتاب میں ہے

مجھے کچھ اور بھی کمبخت کے سوا کہیئے
کہ یہ تو لفظ ازل سے مرے خطاب میں ہے

ہمیشہ کی ہے در یار پر جبیں سائی
یہ بندگی بھی الٰہی کسی حساب میں ہے

یہیں جو فیصلہ کرنا ہے ہمسے فیصلہ کر لو
قیامت پر نہ رہنے دو قیامت پھر قیامت ہے

الٰہی کس کی آمد ہے سر بالیں دم آخر
یہ کس کی پیشوائی کو مری جانِ حزیں نکلی

ساقی ترے کرم سے کیا لطف آرہا ہے
کوئی تو پی رہا ہے کوئی پلا رہا ہے

آئینہ خود نمائی اُنکو سکھا رہا ہے
کیا ظلم کر رہا ہے کیا قہر ڈھا رہا ہے

چوری گیا گیا دل لیکن غضب تو یہ ہے
دل کا چرانیوالا آنکھیں چرا رہا ہے

آنسو بہا رہا ہے وہ سوزِ دل پہ میرے
خود ہی لگا کے ظالم خود ہی بجھا رہا ہے

اُنکو تو ہنسنے چاہا وہ یوں ستا رہے ہیں
اے چرخ کینہ پرور تو کیوں ستا رہا ہے؟

کوچے میں دشمنوں کے ہم اور سجدہ کرتے
نقشِ قدم کسی کا سر کو جھکا رہا ہے

آزردہ غیر سے ہیں لینا ہو نہیں بلائیں
رُوٹھے ہیں وہ کسی سے کوئی منا رہا ہے

آئے تھے اُسنے کہنے اُنکے ستم کا قصہ
اِس کا علاج کیا ہے اب پیار آرہا ہے

یہ کم سنی یہ باتیں یہ سادگی یہ گھاتیں
کوئی سکھانیوالا اُن کو سکھا رہا ہے

کوچے میں اِن بتوں نے آنے دیا نہ شاید
سنتے ہیں اب رساؔ بھی کعبہ کو جا رہا ہے

یہ دیکھا ہی بُری قسمت کا رونا لوگ روتے ہیں
مجھے تقدیر روتی ہے مری تقدیر ایسی ہے

بلا سے غیر کے در پر کرینگے ہم جبیں سائی
اگر مرضی تری اے کاتب تقدیر اچھی ہے

عجب حیرت میں ڈالا ہے اس اندازِ خموشی نے
کیا تصویر ہمکو بھی تری تصویر ایسی ہے

بوقتِ ذبح قاتل کا بڑھایا دل یہ کہہ کہکر
کہ تُو قاتل ہے ایسا اور تری شمشیر ایسی ہے

کیسی ادا اگر کوئی بھا گئی
غضب آگیا اک بلا آگئی

خزاں چل بسی فصلِ گل آگئی
چلو میکشو وہ گھٹا چھا گئی

مدت سے اپنی جان پہ کھیلے ہوئے ہیں ہم
یہ سر جدا ہے جسم سے یا تم رقیب ہے

وفا کرتے ہیں ہم پھر بھی ہمیں تم سے ندامت ہے
اِسے کہتے ہیں اُلفت بندہ پرور یہ محبت ہے

کسی دن دیکھیو تیرے ہی قدموں پر یہ سر ہوگا
جو قاتل ہم سلامت ہیں جو قاتل تو سلامت ہے

سو بار صدقہ ہوکے بھی چاہتا ہے جی
سو بار اور آپکے قربان جائیے

سب قصۂ حسن کے عرضِ تمنا پہ یہ کہا
بس ہو گیا دماغ پریشان جائیے

ہوکے شمشیر بکف سیر گھڑی بھر دیکھو
مرنیوالونکی وفا تیغ کے جوہر دیکھو

سنگدل تم تھے تو دل بت سے لگانا ہی نہ تھا
پڑ گئے ہائے مری عقل پہ پتھر دیکھو

جی میں پچھتاؤگے برباد اگر مجھکو کیا
ہوگا پھر چاہنے والا نہ میسر دیکھو

وعدۂ حشر ہے پھر وہ بھی زمانے بھر سے
کوئی دامن نہ پکڑ لے سر محشر دیکھو

انکو دشمن سے جو الفت ہے تو پروا نکرو
اے رسا تم بھی کسی اور پہ مرکر دیکھو

ممکن نہیں کہ دل سے نکلجائے آرزو
یہ میرے دم کے ساتھ ہے یہ میرے جی کیساتھ

رخ سے پردہ نہ اٹھا دیکھ پڑا رہنے دے
اے پری ہوش زمانے کے بجا رہنے دے

تیر کھینچا ہے تو پیکاں بت سفاک نہ کھینچ
اسکو تو میرے کلیجے سے لگا رہنے دے

دل کو پامال نہ کر روح کو بے چین نہ کر
ایسی بیداد نہ کر ایسی جفا رہنے دے

ان تک تو رسائی نہیں کہنے کو رسا ہے
کمبخت نے یہ نام بھی بدنام کیا ہے

ہو شکوۂ بیداد رسا کی ہے یہ طاقت؟
یہ اس سے مری جان نہوگا نہ ہوا ہے

عدو کے گھر نہیں آتی بلائے ناگہاں کوئی
وہاں کیا یا الٰہی دوسرا ہے آسماں کوئی

ستانے کا نتیجہ اس ستمگر کو بھی ملجائے
ملے اس آسماں کو بھی الٰہی آسماں کوئی

نہ تھے بیداد گر تم کس طرح ہم حشر میں کہدیں
عدالت ہے یہاں کیونکر ملائے ہاں میں ہاں کوئی

کسی کا دل چرالو تم تو یہ کیسی قیامت ہے
تمہارے بھولے پن پر کر نہیں سکتا گماں کوئی

ذرا دیکھے تو ہمسے جاں نثاروں کی وفاداری
ذرا خنجر تو لے لیتے تو بیٹھے امتحاں کوئی

مجھے دشمن سے ملنے کا کسی سے ہے یہی رونا
کہیں رسوا نہو جائے نصیب دشمناں کوئی

رسا کی داستان غم کا سننا کوئی آساں ہے
سنانیکے لئے نوکر تو رکھ لو قصہ خواں کوئی

یہ بھی کیا طرز دلربائی ہے
دلکی فریاد دلربا نہ سنے

نصیحت اپنی رہنے دے رہ الفت میں اے ناصح
پڑی ہے تجکو سمجھانے کی اپنا دم نکلتا ہے

دو قدم چلکے دکھا دو تو قیامت کا مزا
حشر سے پہلے ہی اک محشر بپا ہونے لگے

حشر میں بولے انھیں دیکھ کے مرنیوالے
وہ چلے آتے ہیں دل لیکے مکرنیوالے

وہ عالی ظرف ہے یا ہم ہیں کھلجائیگا دم بھر میں
ہمیں زاہد پلا دیکھے ہمارے ساتھ پی دیکھے

ہم بتائیں کسکو ہمدم کیا کریں
ہم سے برگشتہ ہے عالم کیا کریں

وہ بھی تنگ آئے ہیں اپنے حسن سے
مر رہا ہے ایک عالم کیا کریں

آگ لگ جاتی ہے دونی چارہ گر
زخم دل پر رکھکے مرہم کیا کریں

مری فریاد پر انجان بنکر مسکراتے ہیں
قیامت ہیں وہ اس انداز سے جھوٹا بناتے ہیں

قیامت سے نہیں کچھ کم خرام ناز بھی اُن کا
قدم لیتے ہوئے آتے ہیں فتنے جب وہ آتے ہیں

کدورت مرنیوالے سے نہیں رکھتا ہے کوئی بھی
مری ہستی مٹاکر کیوں وہ تربت کو مٹاتے ہیں

گھڑی بھر کے لیئے تو اپنے دلکو میں تسلی دوں
ذرا اے بیخودی دم لے تصور میں وہ آتے ہیں

نہ کیونکر رشک آئے ہمکو اُن لوگوں کی قسمت پر
وہاں جنکی رسائی ہو وہاں جو آتے جاتے ہیں

نخوت بھی ان بتوں کی عجب دلپسند ہے
اُتنا ہی پیار آتا ہے جتنا غرور ہو

کوچہ تمھارا چھوڑ کے جنت میں جائے کیوں
تم ہو تو کیا کسیکو تمنائے حور ہو

جی چاہا جدھر چھوڑ دیا تیر ادا کو
چٹکی میں اُڑاتے ہوئے پھرتے ہیں قضا کو

سجدوں کا بھی موقعہ نہ رہا اہل وفا کو
پھر پھر کے مٹاتے ہیں وہ نقش کف پا کو

یوں ہمنے چھپائی ہے ترے وصل کی حسرت
جس طرح چھپاتا ہے خطاوار خطا کو

اب چھوڑ رسا عشق بتاں دیکھ کہا مان
کمبخت تجھے منہ بھی دکھانا ہے خدا کو

کہتے ہیں لاکھ بار تصور میں آئیں ہم
کوئی ہمارا دل سے طلبگار بھی تو ہو

بہر عیادت آئے وہ میری تو یہ کہا
دیکھیں کسی کو کیا کوئی بیمار بھی تو ہو

اشک سے یارب مرے طوفان برپا کیوں نہو
قطرۂ ناچیز تو چاہے تو دریا کیوں نہو

شام ہی سے وصل کی شب کا سویرا کیوں نہو
آپ جس گھر میں ہوں اُس گھر میں اُجالا کیوں نہو

دلکی خواہش پر ہمارا اُن کا جھگڑا کیوں نہو
جب انھیں پیارا ہے دل پھر ہمکو پیارا کیوں نہو

دن ہے کم اور داستان غم ہماری ہے بہت
روز محشر اپنے جی میں تھوڑا تھوڑا کیوں نہ ہو

نیچی نظروں سے نہ دیکھو سر محشر دیکھو
داد خواہوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھو

ہو گئے ضد سے مری سینکڑوں تیرے عاشق
میں نہ ہوتا تو کوئی چاہنے والا ہوتا ؟

کیا سنبھالو گے کسی کے دلِ بیتاب کو تم
اپنے اُبھرے ہوئے جوبن کو سنبھالا ہوتا

اپنی محفل سے مجھے تم نے نکالا تو کیا
کوئی ارمان مرے دل کا نکالا ہوتا

شکر ہے دیجئے اُنھیں دل کوئی جھگڑا نہوا
میرا تیرا نہوا، اپنا پرایا نہ ہوا

خواب میں بھی تو نظر بھر کے نہ دیکھا اُنکو
یہ بھی آدابِ محبت کو گوارا نہ ہوا

غیر نے بات تو کی بات تو پوچھی میری
خیر سے تم کو تو اتنا بھی سلیقہ نہوا

محوِ حیرت ہیں تو دونوں ہیں تری محفل میں
ہم سے پردا ہوا آئینہ سے پردا نہوا

اُنکی یہ خوبیٔ اخلاق کہ وعدہ تو کیا
میری یہ شومیٔ تقدیر کہ ایفا نہوا

ہم سے ای پیرِ مغاں عظمتِ میخانہ نہ پوچھ
تُو سلامت ہے تو کعبہ ہے یہ میخواروں کا

نگۂ یاس سے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں
حال دیکھا نہیں جاتا ترے بیماروں کا

اُسکو جنت بھی عطا ہو تو جہنم سمجھے
جسپہ سایہ ہے ترے کوچہ کی دیواروں کا

حشر کے روز بھی اپنا نہیں کوئی افسوس
کیا ٹھکانا ہے رسا اُنکے طرفداروں کا

آیا نہ رحم سُنکے تجھے ماجرائے دل
پہلو میں تیرے دل ہے کہ پتھر بجائے دل

حیران ہو کے رہگئے وصفِ عدو سے ہم
تصویر بن گئے ہیں تری گفتگو سے ہم

تُو قتل گر کرے تو مریں آبرو سے ہم
ہوں تجھسے سرخرو جو نہائیں لہو سے ہم

ساقی ہمارے صبر کی ہے شرم تیرے ہاتھ
بیٹھے ہیں دور ساغر و جام و سبو سے ہم

جب ڈھونڈنے پہ آئے تو کعبہ ہے کتنی دور
کیوں تھک کے بیٹھ جائیں تری جستجو سے ہم

اُنکو جفا سے کام ہے ہمکو وفا سے کام
لاچار اپنی خُو سے ہیں وہ اپنی خُو سے ہم

مایوس ہو کے وصل سے اُس بُت کے ای رسا
کرتے ہیں التجائے سفارش عدو سے ہم

ایکدل ناز تھا جسپر وہ کیا نذرِ بتاں
ہائے اب کس کا سہارا ہے جو فریاد کریں

مجھ سے دیکھا نہیں جاتا کہ ستم ہو اُسپر
میرے آگے وہ مرے دل پہ نہ بیداد کریں

اِن سے ملاقات ہوئی تھی، اکثر علیل رہتے ہیں، فالج کی وجہ سے چلنے پھرنے سے قدرے معذور بھی ہیں اور ہاتھ میں رعشہ بھی ہے مگر طبیعت کی شوخی کلام میں رنگ دیئے ہی جاتی ہے پڑھنے کا انداز بہت اچھا اور دلکش ہے، عاشقانہ مضامین بہت اچھے اسلوب سے باندھتے ہیں بندش چست اور روزمرہ بہت صاف ہے، مشاق بھی اعلیٰ درجے کے ہیں اور فی البدیہہ بھی خوب کہتے ہیں، نواب فصیح الملک داغ مرحوم کے تلامذہ میں حضرت بیخود دہلوی اور سائل کے ہم پلہ ہیں۔ اکثر اشعار حضرت داغ کے رنگ میں ایسے ملتے ہیں کہ اُن پر حضرت داغ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے افسوس کہ نظر ثانی تذکرہ کے ایام میں انتقال کر گئے - ۸۴ھ - ۹۴ برس کی عمر پائی - کلام ملاحظہ ہو :-

اُنکی خدمت میں رسا بھی ہوگا — کبھی یُوں حکمِ خدا بھی ہوگا
مجھ پہ جو تُو نے ستم ڈھایا ہے — کہیں دنیا میں ہُوا بھی ہوگا
آپ سا کوئی نہیں دُنیا میں — آپ نے یہ تو سُنا ہی ہوگا
رازِ اُلفت کا چھپاتے ہو عبث — یہ چھپائے سے چھپا بھی ہوگا
صبر والوں کا بھی دن آئیگا — ایک دن روزِ جزا بھی ہوگا
محفلِ شعر میں ہو آئیں چلو! — آج سُنتے ہیں رسا بھی ہوگا

ساقی جو دیئے جائے یہ کہکر کہ پئے جا — تو میں بھی پیئے جاؤں یہ کہکر کہ دیئے جا
جانے کی جو ضد ہے تو مجھے زہر دیئے جا — اتنا تو کہا مان لے اتنا تو کیئے جا
کچھ اور نکر مجھپہ جفائیں تو کئے جا — کچھ اور نہ لے میری دُعائیں تو لیئے جا
گستاخ نہ ہو وصل میں اے دستِ تمنّا — کچھ دیر ابھی اُنکی بلائیں تو لیئے جا
کہنا ہے کسی شوخ کا مجھ سے یہ لڑکپن — ارمان کیئے جا ابھی ارمان کیئے جا
کیا لذتِ تعزیر نے مجبور کیا ہے — آتا ہے یہی جی میں کہ تقصیر کیئے جا
کمبخت رسا تیری رسائی نہیں اُن تک — تو خُوب سا اس نام کو بدنام کیئے جا
آہ ہوتی مرے لب پر نہ یہ نالا ہوتا — ایک بھی تُو نے جو ارمان نکالا ہوتا

کرتے ہیں کبھی ہم جو دعا ہاتھ اٹھا کر
وہ کہتے ہیں منظورِ خدا اور ہی کچھ ہے

وہ تاب کہاں صاعقہ طور ہیں موسیٰ
برقِ نگہ ہوش رُبا اور ہی کچھ ہے

مرنے کو مرے جان کے غش دیتے ہیں چھینٹے
سمجھے ہوئے کچھ ہیں وہ ہوا اور ہی کچھ ہے

مرنے جو لگا آکے وہ بولے سرِ بالیں
کہتے ہیں جسے شرطِ وفا اور ہی کچھ ہے

کچھ اور ہی شکوا تھا ملے تھے جو سرِ شام
اب صبحِ شب وصل گلا اور ہی کچھ ہے

عشق کا داغ مرے خانۂ دل کا ہے چراغ
روشن اِس شمع سے ہے بزمِ محبت انکی

چٹکیاں لیتے ہیں وہ نیچی نظر سے دل میں
شرم کے پردے میں رہتی ہے شرارت انکی

کیوں گلِ داغِ عشق ہو نہ عزیز
آتی ہے اِس چمن سے بُو تیری

رسا **رسا**۔ میر علی احمد رسا شاگرد میر علی اوسط رشک جہانتک تحقیق ہوا رامپور کے رہنے والے تھے

جگر ہے خشک تو ہے چشم ابر تر کی طرح
ہمارا ظاہر و باطن ہے بحر و بر کی طرح

کس آب و تاب کی ناف و کمر تمہاری ہے
کوئی گہر ہے کوئی رشتۂ گہر کیطرح

گلے وہ عید کو آکر ملے خفا بھی ہوئے
بڑھا گھٹا میں اِسی چاند میں قمر کیطرح

یہ کیسے بدر ہو دم بھر کو آئے گھر میرے
اڑھائی دن تو رہو ایکجا قمر کی طرح

عیاں نہاں ہو تم ای یار دوست دشمن سے
صفا ہو شیشہ میں پتھر میں ہو شرر کیطرح

تمہارے جھانکنے سے دل کبھی نہیں بھرتا
سمائے دیدۂ روزن میں ہو نظر کی طرح

وہ باتیں چھانٹتے ہیں پانا ہو نہیں نشو و نما
رسا عداوتِ احباب ہے تبر کیطرح

رسا **رسا**۔ بلبل شاخسارِ معانی عندلیب گلشن خوش بیانی منشی حیات بخش رسا مصطفےٰ آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں استعدادِ علمی رسمی ہے مگر ذہانت و طباعی نے اُس کمی کو جیسا کہ چاہئیے پورا کر دیا ہے کلام میں انتہائی شوخی اور معاملہ بندی کا پیرایہ بیشل ہے ۴۰۔۴۲ سال کی عمر ہے، حضرت داغ کی وفات کے بعد سے انکے کلام میں پختگی اور رنگینی کی ایک خاص شان پیدا ہو گئی ہے اور اب مشہور کہنے والوں میں انکا شمار ہے، بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دہلی کے مشاعرے میں

دل جگر داغدار کرتے ہیں
سینے کو لالہ زار کرتے ہیں
آئینہ دیکھ کر بہت کم سن
عکس کو اپنے پیار کرتے ہیں

چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر تمھاری یاد میں
تیری ہی شوخی کے ہیں انداز تیری یاد میں

بوسے لے لیکر لبِ زخمِ جگر نے لے لیا
تھا مزہ جو کچھ زبانِ خنجرِ جلاد میں

اللہ رے ضعف یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو
روؤں تو میری آنکھ سے آنسو رواں نہ ہو

مہماں جو آکے سینے میں پیکانِ یار ہو
صدقہ ہو دل، جگر ہو فدا جاں نثار ہو

پہلے تو دل کو لیتے ہیں نیچی نگاہ سے
پھر پوچھتے ہیں کس لئے تم بیقرار ہو

انگڑائیاں وہ لیتے ہیں تن تن کے بار بار
کیونکر نہ جوشِ حسرتِ بوس و کنار ہو

دل ستمکش ہے مرا گر تم ستم ایجاد ہو
ہاں ستم پر ہو ستم، بیداد پر بیداد ہو

ہاتھ میں تصویر تیری جیب میں تیری مثال
آنکھ میں تیرا تصور دل میں تیری یاد ہو

دل میں گر شیخ و برہمن کے نہ تیری یاد ہو
کیوں اذاں کا شوق ہو ناقوس کی فریاد ہو

پائے ساقی پر گرائے نشۂ صہبائے عشق
میکدے میں حسن کے یوں مست کی افتاد ہو

دولتِ بیدار تم کو مل گئی کیا اے رسا
آج خوش خوش ہو بہت بشاش ہو دلشاد ہو

کوئے دلبر میں نجانا چاہیے
دل کے کہنے میں نہ آنا چاہیئے
وقت یہ تیوری چڑھانے کا نہیں
پھول مرقد پر چڑھانا چاہیئے
دیکھنا ہے صورتِ دلبر اگر
دل کو آئینہ بنانا چاہیئے

مری جاں کیا کہوں فرقت میں نالہ کیوں نکلتا ہے
خیال اکثر ترا سینہ میں دل چٹکی سے ملتا ہے

ترا خنجر بھی تیری طرح ہے مجھ سے خفا قاتل
گلے سے جب لگا لیتا ہوں میں رک رک کے چلتا ہے

اگر پیرِ مغاں کا یہ نہیں اعجاز اے ساقی
تو میخانے میں ساغر کیا سبب بے پاؤں چلتا ہے

جگر تیری شراکت ای دلِ پر داغ کیوں کرتا
سمجھ ناداں پرائی آگ میں کوئی بھی جلتا ہے

کڑی ہے عشق کی منزل سمجھ کر رکھ قدم ای دل
کہ اس رستہ میں رہرو ٹھوکریں کھا کر سنبھلتا ہے

بخت کوتاہ ہے بنتا نہیں کچھ کام رسا	گو کہ ہے فکر رسا ذہن رسا، نام رسا
محفل میں انکی آج ہے آفت کا اہتمام	وہ آپ کر رہے ہیں قیامت کا اہتمام
بجلیاں دیکھنے والوں پہ گراتے آئے	تم جدہر آئے اُدھر آگ لگاتے آئے
ہزار اُن سے محبت کا میں کروں اظہار	وہ میری بات کا لیکن نہیں یقیں کرتے
وصل کی شب دیکھنا دشمن کی باتوں کا اثر	بات بھی وہ کی جو دشمن کی تھی سکھلائی ہوئی

رسا - رسا، منشی غلام محی الدین شاگرد ڈاکٹر احمد حسین خاں مائل - دکن کے خوش مذاق لوگوں میں ہیں، اشعار ملاحظہ ہوں ؛

دکن کی جان ہندوستان کا دل	نظام الملک آصف جاہ عادل
تڑپ کر یار کو تڑپائے گا دل	شرارت میں ہی بجلی سے سوا دل
اک آفت تھی بلا تھی روگ تھا دل	بہت اچھا ہوا جاتا رہا دل
مزا رگ رگ میں دردِ عشق کا ہے	کہ ہر ہر عضو میرا بن گیا دل
مزا جب ہی کہ یوں کایا پلٹ ہو	مرا تجکو ملے تجکو میرا دل
نظر تو مل گئی لیکن ہے جب لطف	کہ دلسے بھی ملے یوں ہی ترا دل

رسا - رسا - محمد وجیہ الدین خان باشندۂ حیدر آباد دکن خلف بہار الدین خان ۱۹۲۶ء میں چوبیس پچیس برس کا سن تھا اُس وقت سے برابر شعر و سخن کا مشغلہ ہے، علمی استعداد اور معلومات اچھی ہیں - ذکی اور قابل شخص ہیں طبیعت شوخ اور بچپن پائی ہے اور اسکی جھلک کلام میں بھی صاف مترشح ہی، صفائی روزمرہ، چستی بندش، اسلوب بیان اچھا ہے، ہر شعر میں مضمون پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دکن کے موجودہ شعرا میں سب طرح اچھے ہیں اور اپنے اُستاد ڈاکٹر مائل کے ارشد تلامذہ میں انکا شمار ہے، اکثر رسالوں میں انکا کلام نظر سے گذرا، کچھ اشعار ضیافت طبع شایقین کے لئے درج کئے جاتے ہیں ؛

وقتِ آرایش نظر پڑتے ہی مضطر ہو گیا	خود تڑپ کر عکس آئینہ سے باہر ہو گیا

جو ہوگئی معاف وہ غیروں کی تھی خطا — بخشا گیا نہ جو وہ ہمارا قصور تھا
مشہور ہے جو عشق وہ تھا میرا انکسار — کہتے ہیں جسکو حسن تمہارا غرور تھا
او بُت اللہ سے کیا شکوہ بیداد کریں — اجی میں آتا ہے تجھی سے تری فریاد کریں
راہ اسواسطے رکھتے ہیں عداوت سے — ایک گر ظلم کرے ایک سے فریاد کریں
دشمنی غیر کی رکھنے کو تو رکھیں دل میں — یہ ہو کیونکر کہ اُسی سے تجھے پھر یاد کریں

نہو گا خلد میں جا کر شباب کا احساں — یہ بات خوب ہے مرنے میں نوجواں کے لئے
جو دل دُکھاؤ تو آہیں بھی ہمکو کرنے دو — ستم کرو تو اجازت بھی دو فغاں کے لئے
نہ آئی گھر مرے کیا جانے کیا سمجھ کے قضا — یہاں تو جان بھی حاضر ہے میہماں کے لیے
دیکھئے دیکھئے پھر آپ چلے جاتے ہیں — اب نہ کھیے گا مرے دل سے سنبھلنے کے لئے
وہ بھی کمسن ہیں ابھی دل بھی ہے میرا ناداں — ایک سے ایک زیادہ ہے مچلنے کے لئے
جفائیں کیں جو مجھے طالبِ وفا دیکھا — وفائیں کیں جو مجھے خوگرِ جفا سمجھے

عداوت جو مجھ زار سے آگئی — فلک نے مٹایا زمیں کھا گئی
بُلاتا تھا دونوں کو اک عمر سے — وہ ابتک نہ آئے اجل آگئی
یہ کیوں ناامیدی سے بدلی اُمید — الٰہی مرے دل میں کیا آگئی
مرے پھول اچھی طرح ہو گئے — کسی کو سوم میں ہنسی آگئی

دیگا تڑپ تڑپ کے دلِ مضطرب خبر — مجھسے چھپا چھپا کے نہ مہمان جائیے
غیروں کے منہ سے ہی کبھی آپ آئیے کہیں — اُنکا یہ ہم اُٹھا لینگے احسان جائیے
میرے تو قتل میں بھی بر آئے گی آرزو — کہنا رقیب ہی کا کہیں مان جائیے
ہم عاشقوں کے خون سے مکرنا ہیں آپکو — محشر میں اس طرح نہ پریشان جائیے
جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں بُت زمانے میں — فلک بھی مفت میں بدنام ہے مقدر بھی

کہتا ہے دل کہ کچھ تو ہو تسکین ہجر میں ÷ جھوٹے ہی اُنکے وعدہ کو سچ جان جائیے

رسا ۔ منشی رحیم بخش رسا دہلوی منہر حم نظارہ مقیم گورکھپور چند شعر نتائج افکار سے درج ہیں ۔ رسا

تمکو ہے ناز اپنی صورت پر
ہمکو ہے ناز اپنی اُلفت پر
شُکر کرنا پڑا اب مجھے اُلٹا
وہ بگڑنے لگے شکایت پر

ناصحا رونے سے آزردہ رہا تُو میرے
دیکے تسکین نہ پونچھے کبھی آنسو میرے
اُلفتِ نرگس فتاں کا تماشا دیکھو
دشتِ وحشت میں قدمبوس ہیں آہو میرے

رسا

رسا۔ میر عابد حسین خلف اصغر جناب میر وزیر علی صبا لکھنوی، آپ کو حضرت بقا لکھنوی سے تلمذ ہے جو جناب صبا کے خلف اکبر اور انکے برادر بزرگ ہیں، حالات کے لیئے بارہا لکھنو لکھا مگر کچھ جواب بجز سکوت نہ ملا۔ اشعار ذیل اُنکے ہیں:

تُو نے جسے ظالم نگہ قہر سے تاکا
فی الفور نشانہ وہ ہوا تیر قضا کا
حیراں ہوا ششدر رہا بیتاب ہوا وہ
تمنے جسے دیکھا جسے جھانکا جسے تاکا
ہوتے صفت آئینہ حیراں دمِ زینت
انداز اگر دیکھتے تم اپنی ادا کا
واقف ہی جہاں میں جو قناعت کے مزے سے
بس بھیک کا کاسہ ہے اُسے ہاتھ دعا کا

رسا

رسا۔ نواب مرزا شبیر علیخاں لکھنوی، آپ لکھنو کے ایک موقر خاندان کے رکن تھے اور نواب بندہ علیخاں زیبا مرحوم سے تلمذ تھا۔ شوخ اور چلبلی طبیعت پائی تھی۔ استعداد علمی کے ساتھ ساتھ شعر کا مذاق بھی اچھا تھا، مشاقی اور پختہ کلامی بھی تھی۔ تین چار برس کا عرصہ ہوا بطریق سیر بمقام پورنیہ بنگال گئے ہوئے تھے وہاں کسی دشمن نے بضرب گولی انکا کام تمام کردیا۔ ۵۰ برس کے قریب عمر پائی، دو صاحبزادے یادگار چھوڑے مگر باوجود دس بارہ مرتبہ استفسار حال کرنے کے مفصل حالات نہ ملے۔ اب کلام ملاحظہ ہو۔

جفائیں کرکے تنہا کس لیئے بدنام ہوتے ہو
ستم کرنے لگے جب آسماں تم بھی ستالینا
مُکر جانا، نہ تم اقرار ہی کرنا قیامت میں
ہماری موت کا جب ذکر آئے سر جھکا لینا
مشکل کہیں خدا سے بتو نکلی تھی بندگی
دیکھا جو بُتکدہ کو حرم سے بھی دور تھا
ایجان حسن و عشق کا سارا فتور تھا
میرا قصور تھا نہ تمہارا قصور تھا

پوچھتے ہیں مجھ سے جب جناب رو دیتا ہوں میں
کیا کہوں اُن سے گذر اس انجمن میں کیوں نہیں

ملتی خبر نہیں دلِ خانہ خراب کی
پوچھیں نشاں کس سے کہاں جستجو کریں

یارب یہ دل، یہ جوشِ ہوس خاک میں ملے
کبتک ہر ایک بات کی ہم آرزو کریں

تیر نگاہِ یار سے دونوں کو عشق ہے
دل سامنے کریں کہ جگر رُو برو کریں

ہائے گھبرا کے وہ خلوت میں کسیکا کہنا
لیکے آئے ہو رسا آج کہاں تم مجھکو

گزری کسی کے دل میں جہاں وہ نگاہِ ناز
پہنچی وہیں اجل بھی برابر لگی ہوئی

کھلا ہے اے رسا باب اجابت
مگر فرصت نہیں مجھکو دعا کی

فسردہ دل چمنِ روزگار میں آئے
خزاں کو ساتھ لیئے ہم بہار میں آئے

اُف اُف سے سوزِ عشق یہ آتش فشانیاں
اک آگ سی جہاں میں ہے گھر گھر لگی ہوئی

شکستِ رنگ پہ اپنے نثار ہوتا ہوں
یہ میرے پاس نشانی ہے اُنکی محفل کی

اس لیئے اُس کا تصور بھی نہیں کر سکتا
وہ پریشان نہ کہیں خاطرِ برہم میں رہے

رسا رسا قاضی عوض علی باشندۂ مارہرہ مرزا حاتم علی مہر کے شاگرد ہیں یہ چند شعر اُنکی یادگار ہیں۔

جاں نثار آپکے دم آپکا بھرنیوالے
شکوۂ رنج و مصیبت نہیں کرنیوالے

لاکھ سکھلائیں اُنھیں ہم روشِ مہر و وفا
وہ قدم بھی نہیں اس راہ میں دھرنیوالے

وقت ہو وصل ہو غم اُلفت ہو شب فرقت ہو
ڈھونڈ لیتے ہیں بہانہ کوئی مرنیوالے

رسا رسا حکیم عبد اللہ خان صاحب دہلوی۔ غدر سے پہلے دہلی میں زندہ تھے یہ دو شعر اُن کے ہیں

ہے دیدہ فرش راہ کہ آتا ہے کوئی بُت
دلکو ہے انتظار کہ ہوں پائمال کب

اطلاق ہے شراب کا دونوں پہ زاہدا!
یہ ہے اگر حرام تو وہ ہے حلال کب

رسا رسا۔ صاحبزادۂ محمد ابراہیم شاہ رسا خاندان ٹیپو سلطان میسور سے تھے اور کلکتہ میں رہتے تھے مولوی سیّد علی حیدر، حیدر سے تلمذ تھا ۱۸۸۰ء میں ۳۰ برس کی عمر تھی کلام کا رنگ اشعار ذیل سے ظاہر ہے۔

مولٰنا عبد العلی مدراسی فروغ تخلص انکے رشید شاگرد تھے بالآخر ۲۰ شوال ۱۲۹۲ھ میں بمقام لکھنؤ سفر آخرت اختیار کیا ؎

تاریخ او نوشت فروغ از سر الم　　احمد علی چہ صاحب فضل و کمال بود

منشی محمد امیر اللہ صاحب تسلیم مرحوم نے بجواب عریضہ ۷ محرم ۱۳۰۹ھ سال وفات تحریر فرمایا تھا رامپور میں انکے بیسیوں شاگرد تھے۔ صاحبزادے اوج تخلص کرتے ہیں۔

ہائے نیچی وہ شرمگیں آنکھیں　　اور حیرت سے دیکھنا میرا

رنگ لائیگی در اندازی خدنگ ناز کی　　دل جگر کا، اور جگر دل کا عدو ہو جائیگا

کوئی شکل بہر تسکیں دل بدگماں نکلتی　　مجھے بات کا کسی کی اگر اعتبار ہوتا

کبھی فرش راہ دل ہی کبھی سوئے در ہیں آنکھیں　　نہ وہ مجھ سے وعدہ کرتے نہ یہ انتظار ہوتا

قسمت اُس کان ملاحت سے جدا کرتی ہی　　کون اب زخم جگر پر نمک افشاں ہوگا

رہگئی شرم فرشتوں کے اٹھائے نہ اٹھا　　یہ گرانبار میرا نامۂ اعمال ہوا

ارمان وصل دل سے نکلنا محال ہے　　آنسو نہیں کہ دیدۂ تر سے نکل گیا

سنیگے وہ مقرر میرے درد دل کا افسانہ　　جگر تھامے ہوئے بیٹھے ہیں اہل انجمن اپنا

ملایا خاک میں تو نے سپہر خانہ خراب　　وہ دل مرا جو تمنائے یار کا گھر تھا

کیوں اس عتاب کا میں سزاوار ہو گیا　　کیا تیری بندگی سے گنہگار ہو گیا

المدد اے نگاہ ہوش ربا　　جوش ہے شکوۂ تغافل کا

نہ تھا وہ میں کہ مجھے تاب ناز بیجا ہو　　یہ کیا ہوا کہ ترا میں نیاز مند ہوا

بہار عشق میں چہرے سے اُڑ گئی رنگت　　یہ فصل گل میں نیا موسم خزاں دیکھا

وہ ہائے رخصت سحر آئی قیامت لیکے ساتھ　　صور کا نالہ ہوا اللہ اکبر کا جواب

بہکے ہوئے کلام ہیں مرتا ہوں غم سے میں　　آتی نہیں خیال میں پیغامبر کی بات

نہ انتظار کی تکلیف پوچھئے مجھ سے　　گذر گئی جو گذرنی تھی جان مضطر پر

ہر ایک بات کا میری انکو یقین تھا	نہ تھے مجھ سے یوں بدگماں اول اول

رزم

رزم۔ شیخ خورشید حسن قدوائی لکھنوی، باوجود تلاش حالات میسر نہ ہوئے۔ چند شعر پیش کش ہیں۔

کیا گلہ گر وہ آشنا نہ ہوا	اپنی قسمت ہیں جو نہ تھا نہ ہوا
اسی حیلہ سے ہوتی پابوسی	وائے تقدیر میں حنا نہ ہوا
نہ سہی وصل دید تو ہوتے	یہ بھی اے بخت نارسا نہ ہوا
تم جو کہتے ہو میں ہوا بدنام	کیا مراد کر جا بجا نہ ہوا

رسا

رسا۔ مرزا کریم الدین رسا گورگانی شاگرد حافظ غلام رسول شوق پرانے سخن سنج تھے، اسّی برس کی عمر پاکر غدر سے پیشتر انتقال کیا انکے بڑے صاحبزادے میرزا رحیم الدین حیا بڑے نامی شاعر گذرے ہیں انکا مفصل ذکر جلد دوم میں چھپ چکا ہے، رسا صاحب دیوان تھے مگر کلام غدر کی لوٹ کی نذر ہوا۔ یہ چند شعر ملے درج کیئے جاتے ہیں ؂

بیوفاؤں سے اے رسا تمنے	سچ کہو دل لگا کے کیا پایا
پریشاں حالونکی حب قدر جانو	جو اِس طرح ہو دل پریشاں تمہارا
دل ودین وقرار وہوش تک تو دیدیا تم کو	سوا اسکے وہ کیا تھا اور جو ہمنے چھپا رکھا
تم کہو دل لیکے دکھلاؤں نہ اپنی شکل میں	ہم کہیں دیکھا کریں صورت تمھاری رات دن
باز آ ستا تو ہمکو بہت عشوہ گر نہیں	کرتا کسی پہ ظلم کوئی اسقدر نہیں

رسا

رسا۔ سرآمد اذکیا میر احمد علی رسا ابن میر امام الدین رامپوری شاگرد رشید علی بخش بیمار۔ انکے بزرگ رامپور میں ملتان سے آئے تھے، خوش فکر، رنگین طبع وارستہ مزاج شخص تھے ۱۸۵۶ء میں ۵۶ سال کی عمر تھی، لیاقت علمی بہت اچھی تھی اور مدام مشغلۂ سخن رہتا تھا مگر وارستگی مزاج کے باعث کلام کے فراہم کرنے کی نوبت نہ آئی ورنہ کافی ذخیرہ چھوڑا تھا۔ کلام میں متانت اور پختگی بندش کے علاوہ استادانہ رنگ کی جھلک موجود ہے

لیاقتِ علمی خاصی تھی۔ خوشنویسی سے بسر اوقات کرتے تھے یہ چند شعر نعتیہ کلام سے منتخب ہوئے

اُس ذات کو آتا نہ اگر جوشِ محبت	ظاہر ہے کہ ہوتا نہ ظہور ارض و سما کا
آدم کو جو سجدہ نہ کیا حکمِ خدا سے	ابلیس ہوا کِبر سے پابند بلا کا
رزاق سے رزاق کی ہر دم ہے تمنا	کر مجکو سلامی نہ کسی شاہ و گدا کا

رزم　**رزم** ۔مہاراج بینی مادہو قنوجیہ متوطن برج راجپور۔ زخمیؔ کاکوروی کے تلمذ سے بہرہ ور ہیں۔ پیام عاشق ۱۲۸۵ھ سے یہ چند شعر منتخب ہوئے۔

آئینہ کو دیکھا نگہ غور سے ہم نے	صاف اُس سے زیادہ ترا زانو نظر آیا
ہیں شمع منور کہوں اِسکو تو بجا ہے	سانچے میں ڈھلا یار کا بازو نظر آیا
اے رزم ہیں سمجھا کہ ہے تقدیر کا کچھ بل	برہم جو مجھے یار کا گیسو نظر آیا

رزم　**رزم** ۔سید محمد حنیف رضوی بلگرامی، آپ کو اوائل سن شعور سے شاعری کا شوق ہے حضرت حمد بلگرامی کے خرمنِ فیض سے بہرہ ور ہیں۔ کلام ہم رسیدہ کا انتخاب یہ ہے۔

جور و ستم کا کیوں نکروں شکوہ کیا سبب	کچھ آپکا اجارہ ہے میری زبان پر
تڑپا رہے ہو کس لیئے بیمار ہجر کو	یہ ظلم کیا روا ہے کسی ناتواں پر
بدلی گھری ہوئی ہے شرابی ڈٹے ہیں خوب	میلا ہے آج پیرِ مغاں کی دُکان پر
دامن ہیں توڑ توڑ کے پھولوں کو بھر لیا	بلبل کا صبر بھی نہ پڑا باغباں پر

رزم　**رزم** ۔صاحبزادہ محمد محمود علی خان نائب تحصیلدار رامپور۔ جناب بزمؔ اکبر آبادی سے مشورہ سخن کرتے ہیں ۱۸۹۹ء ہیں زندہ و سلامت موجود تھے۔

غیر سے لکھوا کے بھیجا ہی میرے خط کا جواب	کیا کہوں اے ہمدمو لکھا مری تقدیر کا
یہ مزا یہ لطف دنیا کی کسی شے میں نہیں	کیوں نہ کھائیں شوق سے عشاق پھل شمشیر کا
صبح ہوتے ہی چلے آئے جگر تھامے حضور	یہ اثر ہے عاشقوں کے نالۂ شبگیر کا
پھر ترحم کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ مجھے	ہی چمکنے کو ستارہ رزم کی تقدیر کا

کے زیر تربیت رہکر فارسی انگریزی شروع کی، فارسی کی تحصیل تو معمولی تکمیل کو پہنچ گئی۔ پندرہ برس کی عمر میں اُردو میں مڈل پاس کر کے آپنے شعر و سخن کا شوق کیا اِس زمانے میں ارمغان نام ایک گلدستہ حضرت احسان شاہجہاں پوری کے زیر اہتمام نکلتا تھا چنانچہ آپ حضرت احسان شاہجہانپوری کے شاگرد ہوگئے پہلے رسوا تخلص تھا پھر بہ تجویز اُستاد رخشاں تبدیل کر لیا۔ ١٩٠١ء میں عدالت حجی گوالیار میں مولانا مقصود حسن حیرت کے نائب تھے پندرہ بیس غزلوں کا جو رسال کی تھیں مندرجۂ ذیل خلاصہ ہے۔

لے لیا جو بوسہ میں نے بندہ پرور کیا ہوا
پہلے جس پر اک نظر پڑتی تھی ہوتا تھا نثار
حضرتِ موسیٰ نے غش کھایا تھا جسکو دیکھکر
یہ مریضِ عشق سے کہنا کسی کا وقتِ نزع
لیکے دل جب آپنے عشاق کو بوسے دیئے
دیکھ لی اپنے سے بڑھکر مہِ کنعاں کی شبیہ
اے شہِ حسن فقیروں کو بھی خیرات ملے
تمنے خوش ہو کے دیا تھا تو لیا تھا ہمنے
قیامت کو دکھاؤنگا اثر جب سوزِ پنہاں کا
خیال آتا نہیں یارب وفائے عہد و پیماں کا
عبادت میں بھی رہتا ہے تصوّر حور و غلماں کا
خموش اے واعظِ ناداں یہاں جنت ہے نظروں میں
عزیز الدین ہوں رخشاں تخلص ہے وطن جیور

کوئی دنیا میں نہیں ایسا جو اس سے کہے خوش نصیب
اس بیچارے کو بھی لے لو جو ... یاد رہو

پیار میں لب رکھ دیئے پیارے لبوں پر کیا ہوا
وہ کرشمہ تیرا اے چشمِ فسونگر کیا ہوا
اے صنم وہ جلوۂ روئے منوّر کیا ہوا
زندگی کیوں ہو رہی ہے تمکو دوبھر کیا ہوا
آپ کا احسان پھر کہئیے کسی پر کیا ہوا
اب حسینوں میں کبھی نام نہ لینا اپنا
دیدے اک بوسۂ رخسار ہی صدقہ اپنا
دیکھے ناخوش ہو تو اب پھیر لو بوسہ اپنا
جہنم کو جلا دیگا شرارہ آہِ سوزاں کا
بُت کافر پہ سایہ پڑ گیا کس نامسلماں کا
خدا ہی ہے نگہباں شیخ تیرے دین و ایماں کا
تصور نے میرے کھینچا ہے نقشہ بزم جاناں کا
سخن گوئی میں ہوں شاگرد حسانِ سخنداں کا

رزاق

رزاق۔ حاجی محمد عبد الرزاق خان مرحوم خلف اسحٰق خان، خاندان حافظ الملک رحمت خان سے تھے، دیوان گلشن نعت اِنکی تصنیف سے شائع ہو چکا ہے ١٨٨٢ء میں انتقال کیا

کیا پہنچے تو فرشتہ کا جس جا گذر نہ ہو
بیت الصنم ہے شیخ خدا کا یہ گھر نہ ہو

چل کر خرامِ ناز سے برپا کرے وہ حشر
گر بازپرس کا اُسے خوف و خطر نہ ہو

رخشاں جو آتے آتے ابھی رُک گئے ہیں اشک
آنکھوں میں آ گیا کوئی لختِ جگر نہ ہو

کر کے نومید ہمیں قتل سے پہلے تکبیر
خون رُلوا چکے کیا خون کا دعویٰ کیجے

بعد اک عمر جو آئے تو خجل ہوں کیونکر
آنکھیں پتھرائی ہوئی اُنکی تڑپا کیجے

ہے تصور مرا اُس خاطرِ نازک پہ گراں
جتنا ہو اپنے کو ہر غم سے گھلایا کیجے

نقش بر سنگ ہے وعیان اپنا تمھارے دلپر
خوش ہوں مٹنے کا نہیں لاکھ مٹایا کیجے

بوالہوس اور بھی مرنے کی کرینگے خواہش
لیکے گل قبر پہ رخشاں کی نہ آیا کیجے

چاک تکبیر مرا گریباں سے ہے
دل کا محضر میرا گریباں ہے

لاغری میں بریدہ ناخن سے
مختصر تر میرا گریباں ہے

رات سینہ سے سینہ کس کا ملا
کہ معطر میرا گریباں ہے

سینہ کا چاک کرنا سکھلایا
میرا رہبر مرا گریباں ہے

رخشاں
رخشاں منشی خیرات علی خاں رخشاں باشندۂ فرخ آباد ۱۳۶۹ھ میں تذکرہ سراپا سخن کی ترتیب کیوقت حیات تھے، غالباً منیر شکوہ آبادی سے تلمذ تھا۔

گردش میں ایسے آ گئے مجھ بیوطن کے پاؤں
پھرنے سے باز رہ گئے چرخِ کہن کے پاؤں

عکسِ شفق ہے پائے بلوریں میں اے پری
مہندی لگی نہیں ہیں عقیقِ یمن کے پاؤں

کیونکر اُٹھائیں رنگِ حنا کے وہ بار کو
نازک زیادہ گل سے ہیں اُس گلبدن کے پاؤں

ہے بعد مرگ بھی رہی رخشاں کو بے کلی
اندر کفن کے ہاتھ ہیں باہر کفن کے پاؤں

رخشاں
رخشاں - محمد عزیز الدین صاحب رخشاںؔ آپ قاضی محمد حسام الدین آزردہ ساکن قدیم قصبہ جیور ضلع بلند شہر کی اولاد میں سے ہیں۔ کارخانۂ تجارتِ نیل کی بدولت قاضی محمد رفیع الدین انکے جد امجد نے خاصا نام پایا ۱۸۸۲ء سال پیدایش ہے، اپنے ماموں حکیم منشی فضل احمد

رہجائے، آپکے بڑے صاحبزادے نواب شہاب الدین احمد خاں کا انتقال آپکی حیات ہی میں ہوگیا تھا اُنکے بیٹے جناب سائل دورِ موجودہ کے مشہور کہنے والوں میں ہیں۔

ممنوں نہیں ہے برق وسموم وشرار کا / رکھتا ہے حکم جلنے میں عاشق چنار کا
جب اپنے شغل سے دلِ خونیں نہ باز آئے / پھر کیا گناہ دیدۂ خونابہ بار کا
آنکھوں میں بوالہوس کی کھٹکتا ہوں مثلِ خار / احسان ہے یہ مجھپہ مرے جسمِ زار کا

سر پیٹے، سینہ کوٹے، کہ فہوس میں ملے / عاشق کو ہاتھ چاہئیں ناچار چار چار
زہے سر بلندی شہیدِ وفا کی / کہ اس دور پہ سر ہو چڑھانے کے قابل
جب چاہو آؤ دل میں کہ ہی آپکا مکان / یہاں خوفِ شحنہ و خطرِ پاسباں نہیں
گر انتہا نہیں ستم و جورِ یار کی ÷ / شوقِ زیادہ جو کو مرے بھی گراں نہیں
حیرت میں ہوں کہ نوکِ مژہ نیشتر مثال / کُھبتی ہے گر جگر میں تو کیوں خونچکاں نہیں
ہی دوست صدق دشمن و دشمن دروغ دوست / کیا رشک صلح جس میں صفا درمیاں نہیں
نکلے آنکھوں سے وہیں جذب ہوئے دامن میں / بجز اشکوں کے کوئی گوہرِ نایاب نہیں
جتنے ہو نغمہ سرا اُتنے ہی خونریز بھی ہو / چھیڑ نشتر کی چلی جائے جو مضراب نہیں
کعبے کو دیر سے چلے سنکر شراب میں / مستوں کو کیا تمیز عذاب و ثواب میں
دار القضا کہاں رہی میخانہ بن گیا / ہیں مست جمع محکمۂ احتساب میں
پیری میں مفلسی میں نہ لو نام مے کا اب / لطف ارتکاب میں نہ اجر اجتناب میں
پیکے گرنے کا ہے خیال ہمیں / ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر / گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
تیرے غصے نے ایک دم میں کیا / مُردۂ صد ہزارہ سال ہمیں
دل میں مضمر ہیں سو معمے باقی / کسی صورت نہیں زوال ہمیں
طالعِ بد سے مہرِ رخشاں / اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

اُنکی وفات کے بعد اُنکے بلند نام صاحبزادے نواب علاؤالدین خان مسند نشین ہوئے اور نواب ضیاءالدین خان صرف جاگیر وار نسلاً بعد نسلٍ تصور کیے گئے، نواب صاحب مدوح رؤسائے شاہجہاں آباد میں نہایت ذی اقتدار اور بارسوخ تھے۔ انکی اعلیٰ خاندانی ذاتی شرافت اور علم وفضل کیوجہ سے حکام وقت اِن پر خاص توجہ مبذول فرماتے تھے نواب صاحب اعلیٰ درجے کے سخن سنج اور سخن فہم اور تاریخی معلومات کا سرچشمہ مانے جاتے تھے۔ اور بڑے غیور اور پابند وضع رئیس تھے۔ بلوۂ غدر کے بعد انکی ذات والا صفات دہلی میں غنیمت سمجھی جاتی تھی، چنانچہ جو شخص کسی فن کا ماہر یا کامل دہلی آتا تھا تو آپکے فیض صحبت سے ضرور مستفید ہوتا تھا، علم تاریخ سے نہایت ذوق رکھتے تھے چنانچہ جس وقت الیٹ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے اپنی ضخیم تاریخ ہند مرتب کی تو فراہمی حالات و تواریخ قدیم میں نواب صاحب نے بڑی امداد کی، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں گاہ گاہ فکر سخن فرماتے تھے، اُردو میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص کرتے تھے ۱۳۰۳ھ میں انتقال فرمایا اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح واقعۂ مہرولی میں دفن ہوئے تاریخ وفات مولوی رضی الدین خان دہلوی نے جو سلسلۂ حضرت امیر پنجہ کش خوشنویس میں ایک بے بدل خوشنویس تھے صوری ومعنوی تاریخ کہی ہے اور بے مثل مادہ ہے جس پر مصرع مولانا حالی نے لگائے ہیں وہو ہذا

چون ضیاءالدین احمد خان کشید	رخت از دنیا سوئے دارالسلام
گفت ہاتف بارضی سال وفات	روز شنبہ سیزدہ شہر صیام ۱۳۰۲ھ

حضرت نیر رخشاں کا کلام متانت سے پُر۔ عالمانہ مذاق سے معمور ہے اپنے اُستاد والاقدر کے تلمیذ رشید تھے، چنانچہ کلام میں بھی اُنھیں کی طرز کا اتباع ہے اِنکی اور اِنکے خاندان کی زبان دہلی میں مستند مانی جاتی ہے۔ پاکیزہ اور نازک خیالات کی بندش خاص انھیں کا حصہ ہے کاش نواب احمد سعید خان صاحب طالب کہ خود بھی اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اپنے والدِ مغفور کا کلام چھپوا دیں تاکہ نوابصاحب مرحوم کی پُر فیض زندگی کی دوامی یادگار

رتبہ اپنا اب زمیں پر آسماں سے کم نہیں ‏— دل میں نقشہ کھنچ گیا ہے چاندسی تصویر کا
شبِ ہجراں کو موت آئے تو روزِ وصل پیدا ہو ‏— الم نکلے تو رستہ ہو خوشی کے دل میں آنیکا

بام پر ہمنے رُخِ یار کا جلوہ دیکھا ‏— سحر آنکھوں کا نگاہوں کا کرشمہ دیکھا
چشم تر، خاک بسر، چاک گریباں دل زار ‏— عشق کا ہم نے یہ دنیا میں نتیجہ دیکھا
اب ڈھٹائی سے مکرنے کا نتیجہ کیا ہے ‏— دلکو مٹھی میں چھپا رکھا ہے دیکھا دیکھا
وصل کی شب میں ترقی ہوئی ارمانو نکی ‏— حوصلے بڑھ گئے جب یار کو تنہا دیکھا
افسوس کہ بالیں پہ اجل آ ہی پکاری ‏— آیا نہ عیادت کو مگر یار ہمارا
کل تلک داغ کلیجہ پہ نظر آتا تھا ‏— آج اُس داغ میں ناسور ہوا خوب ہوا
مجھ مریضِ عشق کو تُو نے اگر اچھا کیا ‏— نام تیرا بھی مسیحائے زماں ہو جائیگا
نہ رکھوں تاجِ شاہی سر پہ میں اُسکے مقابل میں ‏— اگر مجکو میسّر آئے تکیہ اُسکے زانو کا
سر سے عدو کے رشک کے شعلہ نکل گئے ‏— مہندی لگاکے پاؤں میں نکلے جو گھر سے آپ
فرقتِ یار میں مرجائیں گلا کاٹ کے ہم ‏— ملک الموت کا دیکھا کریں رستہ کبتک
آنکھ کا لگنا بُرا ہوتا ہے دیکھا تُو نے ‏— اب بھلا رات تو نکو ہم رہتے ہیں بیدار کہ تو

رخشاں

رخشاں۔ عالیجناب نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر مرحوم جاگیردار ریاستِ لوہارو خلف اصغر فخر الدولہ نواب احمد بخش خان والی ریاستِ فیروزپور۔ نواب احمد بخش خان نے اپنے عینِ حیات بڑے لڑکے شمس الدین احمد خاں کو اپنا جانشین مقرر کردیا تھا اور پرگنہ لوہارو جو مہاراجہ الور نے بطور انعام دیا تھا اپنے چھوٹے صاحبزادوں امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کو بطور مددِ معاش دیدیا تھا۔ چند سال بعد نواب شمس الدین احمد خان کی حرکاتِ زبوں کے باعث ریاستِ فیروزپور ضبط سرکار ہوئی مگر ریاستِ لوہارو بحال رہی نواب صاحب ممدوح نواب اسد اللہ خاں غالب سے علاوہ قرابتِ قریبہ کے سلسلۂ تلمذ رکھتے اور انکے خلیفہ اول تھے، انتظامِ ریاست شروع سے نواب امین الدین خاں کے سپرد رہا اور

وہ مجھسے کہتے ہیں غصّہ میں جان جائے تری	مَیں کہہ رہا ہوں مگر جان تو ہے تو میری
روٹھ کر چل تو دیئے ہیں مگر اب حال یہ ہے	راہ تکتے ہیں کہ پھر ہمکو بلائے کوئی

رحیم

رحیم منشی رحیم بخش ٹھیکہ دار انار کلی لاہور۔ آپ کو حضرت بیان ویزدانی رئیس میرٹھ کے فیض صحبت سے شعر وسخن کا شوق ہوا، اور انھیں کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ۱۸۹۵ء میں لاہور کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ کلام کا خلاصہ ہے۔

پروانہ میرے جلنے کی اُس شمع رونے کی	کیا موم دل تھی شمع دل اُس کا پگھل گیا
گلزار آگ کیسے ہوئی تھی خلیل پر	دِل اپنا کیسے آتشِ ہجراں سے جل گیا
بہارستانِ داغِ دل ہے موسم تیر باراں کا	گلِ داغِ جگر پھر کھل رہا ہے غنچہ پیکاں کا
نہ سیکھا ڈھنگ اب تک نالہائے گرم کا میرے	سبق گو میں نے بلبل کو دیا برسوں گلستاں کا
ہیں وہ عاصی کہ ہے فیض ایک جہاں پر اپنا	ابر رحمت ہوا دامن جو ہوا تر اپنا
گو ترے عشق میں غارت ہوا برباد ہوا	نہ ہوا پر نہ ہوا دل میں ترے گھر اپنا
خوف ہے گرمیٔ خورشید قیامت کا کسے	تیرے دیوار کے سایہ میں ہے بستر اپنا
زندگی بحرِ جہاں میں ہے بشر کی ایسی	بلبلا پانی میں جس طرح اُٹھا بیٹھ گیا
پھول نقشِ پا ہوئے جب وہ خراماں ہو گیا	جس روش پر وہ چلا رستہ گلستاں ہو گیا
داغِ دل گل بن گئے سینہ گلستاں ہو گیا	شاخ ناوک ہو گیا اور غنچہ پیکاں ہو گیا
مر گئے ہیں ہم خیالِ دیدۂ مخمور میں	چاہیئے تربت ہماری سایۂ انگور میں
ایک موسیٰ تھا وہاں یاں سینکڑوں غش ہو گئے	ہے تفاوت شمع رُومیں اور چراغِ طور میں
ہیں وہ یا زاہد ہو دونوں ایک ہی سے ہیں تباہ	ہیں فراقِ یار میں اور وہ فراقِ حور میں

رحیم

رحیم۔ مولوی سید محمد عبد الرحیم شاہ خلفِ مولوی سید حبیب اللہ شاہ نام کنجپورہ وطن بہ اقتضائے شوق طبعی صاحبِ دیوان اور کلام میں جابجا مذاقِ سلیم کی جھلک پائی جاتی ہے، چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں ❖

نیک بندے ہیں خدا کے آپ تو — شیخ صاحب آپکی کیا بات ہے

جگر پہ تیر لگانا جتا جتا کے مجھے — ستم کے لطف تمھیں آئیں کچھ جفا کے مجھے

تمام عمر اُٹھاؤں نہ میں جبین نیاز — ملیں نشان اگر تیرے نقشِ پا کے مجھے

نہیں ہے وجہ وہ مجھ سے کھنچے ہیں — عدو نے کچھ نہ کچھ اُن سے جڑی ہے

رحیم

رحیم منشی بھگو خان خلف ویاری خاں زمیندار مرزا پور ضلع قنوج سنہ ۱۸۸۶ء میں قصبۂ قنوج سے انھوں نے ایک شعر و سخن کا گلدستہ پیام عاشق نامی جاری کیا جس میں گرد و نواح کے شعرا کے علاوہ کبھی کبھی اُساتذہ کا کلام بھی درج ہوتا تھا عطر کا کارخانہ بھی اُسکے ساتھ تھا۔ دس بارہ برس جاری رہکر وہ رسالہ بند ہوگیا۔ طبیعت دار شخص تھے زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا۔ کلام یہ ہے

اگر پاکباز آئینہ ہے تو کیا ہے — ترے پاس مطلب ہی کیا ہے کسی کا

تم اپنے ہاتھوں سے بدنام خود ہی ہوتے ہو — یہ کیا کہ نام مرا سُن کے سر جھکا دینا

ہماری موت کو بھی ہائے نیند سمجھے ہیں — وہ بھولے پن سے یہ بولے اسے جگا دینا

لال غصہ میں جواب ہے رخ جاناں کب تھا — چاند تھا چودھویں کا مہر درخشاں کب تھا

آتے آتے رہگیا وہ مہ جبیں بالائے بام — کیا چمک کر رہگیا اختر مری تقدیر کا

ایک بوسہ کا ہوں طالب لف کا ہوں شیفتہ — سمجھے اب مطلب مری اُلجھی ہوئی تقریر کا

دل بہلنے کا نہیں حوران جنت میں رحیم — مر گئے پر بھی تصور ہے بت بے پیر کا

نگہ پھیرو نہ اُلفت کو بڑھا کر — گلا کاٹو نہ یوں ملکر کسیکا

ایک کروٹ بھی نہ بدلی صبح تک اللہ تری نیند — آپ کا سونا مگر میرا مقدر ہوگیا

ضعف سے جان بھی اپنی ہے گرانبار مجھے — بوجھ ہے سینکڑوں من کا بدن زار مجھے

آنکھ کمبخت سے ڈر رہتا ہے ہر بار مجھے — کہیں رسوا نکرے حسرت دیدار مجھے

تو مری جان ہے اور جان ہے ہر اک کو عزیز — کو سنا اب نہ خبردار خبردار مجھے

جب کہا میں نے اُٹھائے نہیں جاتے ہیں ستم — بولے جھنجھلا کے تو پھر کرتے ہو کیوں پیار مجھے

دکھا کر وہ گئے ہیں جب اپنی زلفِ شبگوں کو
بلائیں آ رہی ہیں میرے سر پر دیکھتے جاؤ

کریں نہ کے سیئے دعائے قاتل
زخموں کا کھلا دہن ہمیشہ

رحیم

رحیم - مرزا رحیم بیگ رحیم شاہ جہاں آبادی الاصل ولد میرزا امیر بیگ، میرٹھ میں رہتے تھے۔ حکیم بوعلی خاں کے طب میں اور محمد بخش نادان کے شعر و سخن میں شاگرد تھے پہلے شر تخلص تھا، ۱۲۷۰ھ ہجری میں حسب فرمایش حکیم احسن اللہ خاں قصص الانبیا کو نظم کیا تھا، ۱۲۸۴ھ میں حیات تھے شعر و سخن کا مذاق شستہ تھا فارسی شعر بھی خوب کہتے تھے - چند غزلوں کا انتخاب درج ذیل ہے

دو دل ہیں کس کسکو کہ اک جان کے خواہاں ہیں بہت
غم جُدا، فکر جُدا، درد جُدا، یار جُدا

خدا جانے کہ وقتِ ذبح کیا اندازِ قاتل تھا
کہ نعرہ ہے لبِ ہر زخم سے اللہ اکبر کا

جو لکھتا ہوں بیاں اپنے دلِ بیتاب و مضطر کا
تڑپتا ہے بہ رنگِ نبضِ عاشق تار مسطر کا

بل بے گرمی آبلوں کی آب کیا تیزاب تھا
پاؤں پڑتے ہی مرا خارِ بیاباں جل گیا

کہنے ہی کی بات ہے کہنے دو لائے تو کوئی
مجھسا عاشق دیکھکر، معشوق تم سا دیکھکر

پس مردن بھی ہم بار ندامت لیچلے سر پر
کہ اُڑ کے خون کے چھینٹے پڑے دامانِ قاتل پر

ابتک تو ہجر میں ہیں فقط تن پہ کھائے گل
نقدیر دیکھیں آگے کو کیا کیا کھلائے گل

ایک سینہ ہے روکے کس کسکو
تیر کو، تیغ کو، کہ خنجر، کو

رحیم

رحیم - محمد عبد الرحیم خاں رحیم باشندہ پٹنہ حضرت داغ دہلوی سے اصلاح لیتے تھے اور پندرہ سولہ سال ہوئے اجمیر کے آڈٹ آفس میں اکونٹنٹ تھے، اُسکے بعد کا کچھ حال معلوم نہ ہوا۔

پڑ گیا شاید کچھ اُس پر میری قسمت کا اثر
ہے دگرگوں رنگ ہر دم عالمِ ایجاد کا

آج پھر وعدہ کیا ہے وصل کا کل کیطرح
دیکھئے اللہ مالک اب ہی اُنکی یاد کا

شاعری کو فخر حاصل ہے جنابِ داغ سے
مدعی پڑھنے لگے کلمہ مرے استاد کا

اُنکو جب مجھ سے کچھ نہیں مطلب
پھر وہ کیوں امتحان لیتے ہیں

اُنکا اک کھیل ہے اعجازِ مسیحا کیسا
بات کی بات میں مُردے کو جلا دیتے ہیں

جو زندگی میں اپنی آیا نہ کام یارو!
کیا قبر پر وہ ہوگا پھر نوحہ خواں ہمارا
ہوتی مغائرت کم جو اک زبان ہوتی
شاید بنے وسیلہ اُردو زباں ہمارا
ہم جان جانتے ہیں تم غیر جانتے ہو
حالانکہ جانتا ہے تم کو جہاں ہمارا

قطعہ

ایک کے ہیں تو ایک ہو جائیں
ایک ہی کے جہاں ہیں دونوں
نہ سہی رشتہ یہ تو رشتہ ہے
ایک گھر میہمان ہیں دونوں
رستے دو ہیں الگ مکینوں کے
اک گلی میں مکان ہیں دونوں
وہ ہمارے نہ ہم انکے ہم گویا
بیکسی کے نشان ہیں دونوں
کر کے باہم لڑائیاں جھگڑے
ہو گئے ناتواں ہیں دونوں
پیس ڈالیں گے پاٹ چکی کے
یہ زمیں آسمان ہیں دونوں
گو ہیں دور راز تو اک ہو
جیسے دل اور زباں ہیں دونوں
آئیں آپس میں فیصلہ کر لیں
مفت کیوں دیتے جاں ہیں دونوں
مل کے ہم دونوں ایک جاں ہوں اگر
پھر تو اپنے جہان ہیں دونوں

رحمتی

رحمتی۔ کنور سکھراج بہادر رئیس اعظم و میونسپل کمشنر عظیم آباد پٹنہ کنور صاحب موصوف کنور ہیرالال صاحب ضمیرؔ مرحوم خلف الصدق راجہ پیارے لال اُلفتیؔ دہلوی کے فرزند رشید تھے شعر و سخن سے طبیعت کو لگاؤ تھا آپنے ۱۸۷۰؁ء متعدد مشاعرہ پٹنہ میں کیئے۔ ذی مروت صاحب اخلاق اور لئیق رئیس تھے اور شعرا کے بڑے قدر دان تھے، اُردو و فارسی دونوں زبانوں میں مشق سخن کرتے تھے۔ کنور صاحب موصوف کے دادا راجہ پیارے لال جو قوم کے کایستھ تھے شاہ عالم ثانی کے عہد میں دہلی چھوڑ کر عظیم آباد میں قیام پذیر ہوئے تھے، عرصہ ہوا انتقال کر گئے، اِنکے کلام کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

جب آپ ہی کو پاس نہیں رسم و راہ کا
کیا فائدہ جو ہو بھی ارادہ نباہ کا
جب سلسلہ جنباں یہ تری زلف سیاہ ہو
عاشق ترا کس طرح نہ زنجیر بپا ہو

کہاں سے لاؤں اتنے دِل خدایا
ادا اِدھر ایک اُسکی ولستاں ہے

بگڑنے کا سبب پوچھا تو بولے
ہمیں چاہا یہ کچھ تھوڑی خطا کی

ایک ہی پردہ کے اُٹھنے سے ہوئے بیخود کلیم
سامنے بے پردہ وہ آسئے تو کیا ہونے لگے

رحمت

رحمت ۔ منشی محمد رحمت اللہ رحمتؔ برادر خورد میر نادر علی برترؔ غازی پوری شاگرد رشید حضرت ظہیرؔ دہلوی، حالات باوجود کوشش نہیں ملے مجبوراً صرف کلام درج کر دیا گیا ۔

آئے ہیں دن شباب کے رحمت کیولسطے
اِسکو اُٹھا رکھو نہ قیامت کیواسطے

جنت سے کیا غرض ہمیں کوچہ میں آپکے
دو گز زمین مل گئی تربت کیواسطے

گل شمع کے اُدھر ہیں اِدھر داغ دِل مرے
اچھی بہار آئی ہو تربت کیواسطے

پُورا ہوا نہ وعدہ فردا کسی طرح
کیا کیا دِلائے اُنکو قیامت کیواسطے

بولے وہ عرضِ حال پہ جھنجھلا کے اِسطرح
نہ کر رکھو اسے تو قیامت کیواسطے

یارب بتوں کو رحم بھی دینا ضرور تھا
سیرت بھی ہونی چاہیئے صورت کیواسطے

رحمت کسی کے نقشِ قدم کو نہ چھوڑنا
تعویذ کوئی چاہیئے تربت کیواسطے

رحمت

رحمت ۔ مولوی رحمت علی صاحب فرسٹ اورنیٹل ٹیچر مدرسۂ سرکاری ڈیرہ غازیخان دَور موجودہ کے شاعر اور بڑے زود فکر اور پُرگو ہیں ابتدائی چند غزلیں حضرتِ داغؔ مرحوم کو دکھائی تھیں مگر ہنوز مشقِ سخن پختگی کو نہ پہونچی تھی کہ اُنکا انتقال ہو گیا۔ اُس وقت سے بطور خود کہتے ہیں زیادہ تر طرزِ جدید میں طبع آزمائی کرتے ہیں، کلام رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے چالیس پچاس برس کا سن ہے، ایک ضخیم مثنوی موسومہ "وفائے رحمت" بطور تاریخ ہندوستان و انگلستان جشن تاجپوشی کی تہنیت میں شائع کرا چکے ہیں اُس سے اِنکی کثرتِ مشق کا اندازہ ہو سکتا ہے شعر کا مذاق بھی بُرا نہیں ۔ جو کلام بہم پہنچا اُس کا انتخاب درج ذیل ہے ۔

ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستان ہمارا
کہنے کی بات ہی یہ ہے یہ کہاں ہمارا

رہتے ہیں دیس میں یوں پردیس میں ہیں گویا
ہے یہ زمیں ہماری نے آسمان ہمارا

دن کو رو رو کے روز شام کیا
کام کا پر نہ کوئی کام کیا

حیف دو روزہ زندگی کے لیئے
ہمنے کیا کیا نہ اہتمام کیا

یہ تو کہیئے کہ آپ نے رحمت
کچھ وہاں کا بھی انتظام کیا

ستارا اوج پہ ہی بخت ہے رسا دل کا
کہ آج پوچھتا ہے حال بے وفا دل کا

نہ تجھ سے ملتے نہ سہتے اذیتیں شب و روز
برا کیا جو کہا ہمنے کر دیا دل کا

وہ آئے بھی تو خفا بیٹھے بھی تو چین بجبیں
بہار میں بھی نہ غنچہ مرا کھلا دل کا

یہ کیا خبر تھی کہ ہو جائے گا وہ بد ظن اور
برا کیا جو کہا اس سے ماجرا دل کا

خدا جانے وہاں پر ہو وہ کیا سامان دلچسپی
کہ آتا ہی نہیں واپس گیا شہر خموشاں کا

کون کہتا ہے کہ وہ دل لیگیا دل لے گیا
دل تو ہے پہلو میں پر کیا جانے کیا جاتا رہا

عشق میں اس چشم میگوں کے بہت بہکے تھے ہم
ترشرو جب وہ ہوا سارا نشہ جاتا رہا

خوب ہم روئے اپنی مستی پر
قہقہہ مسکے رات بوتل کا

بیفائدہ کرتا ہے یہ تعریف جناں کی
واعظ نے ابھی کوچہ جاناں نہیں دیکھا

سب سے موافقت کریں اپنا یہ فرض عین ہے
لائے کسی کو رو برو دور زماں کو کیا غرض

آپکو جب مٹا دیا جیتے ہی جی۔ تو بعد مرگ
سنگ لحد لگائیں کیوں نام و نشاں کو کیا غرض

یار کے بزم عیش میں بار ملے۔ تو کس لیئے
چھوڑ کے سنگ آستاں جائیں جناں کو کیا غرض

جبکہ بہار باغ عمر رہگذر فنا میں ہو
نکلے چلے تباہ کیوں باد خزاں کو کیا غرض

جہاں کی عارضی راحت کا کھل گیا عقدہ
ہنسی کے ساتھ جو آنسو بھر آئے آنکھوں میں

درد مرض عشق جو ٹلجائے تو جانیں
یہ پھانس کلیجے سے نکلجائے تو جانیں

دشوار ہے اس زلف کے پھندے سے نکلنا
سر سے یہ بلا اپنے جو ٹلجائے تو جانیں

کر فصل بہاری میں کرم اتنا تو صیاد
لٹکا دے قفس ہی کو مرے صحن چمن میں

دونوں میں ایک نور کا پر تو ہی جلوہ گر
اپنے حساب ذرہ ہو یا آفتاب ہو

مقتل میں تشنہ کام شہادت ہوں شوق سے
قاتل پلا دے گر ترے خنجر میں آب ہو

سبزۂ خط ہو چلا آغاز کیوں حیراں ہو تم
بیٹھنے والا ہے اب ہالے کے اندر آفتاب

اِسکے سایہ سے بچا ناچور ہے لے باغبان
صاف اُڑا لیجائے گا رنگِ گُلِ تر آفتاب

ہو کے کاہیدہ بنے اندوہ سے شکلِ ہلال
یار کے بدلے ہوئے تیور جو دیکھے آفتاب

ہوش و حواس کیا ہوئے عشاق سے نہ پوچھ
بیخود ہوئے ہیں جلوۂ دیدار دیکھکر

دلمیں کھٹک رہا ہے سرِ خار آرزو
اسکو نکال دیجئے بہت بیقرار ہوں

کہا جب آپ ابتو آفت جاں ہوتے جاتے ہیں
تو فوراً ہنسکے فرمایا کہ ہاں ہاں ہوتے جاتے ہیں

غضب کرتے ہو تم اُبھرا ہوا جوبن دکھاتے ہو
دلِ رحمت میں پیدا اور ارماں ہوتے جاتے ہیں

جوبن اُبھر کے کہتا ہے اُنکا شباب میں
تم لاکھ رکھو میں نہ ہوں گا حجاب میں

کرتے ہو آج شیخ جی ہمکو نصیحتیں
کیا کیا کیا نہ ہوگا تمھیں نے شباب میں

جہاں میں رسمِ سحر اُس آنکھ کے کاجل نے نکلیگی
یہ عالمگیر ظلمت نور کی مشعل سے نکلیگی

یوں چاند سے تو بڑھکے ہیں یوں اُس سے سوا ہے
اُس میں کوئی انداز نہیں تجھ میں ادا ہے

اقرار یہ تم وصل کا کرتے تو ہو لیکن
مانع نہ ہو وہ۔ شرم سے بھی پوچھ لیا ہے

جب اُن سے کہا لینے دو زلفوں کی بلائیں
کس ناز سے بولے کوئی دیوانہ ہوا ہے

کیا پوچھتے ہو عشق میں مشہور رہے رحمت
ہاں جان بھی دیدیگا وہ۔ دل دے ہی دیا ہے

رحمت

رحمت تخلص نام تاریخی ظفر علی مشہور محمد رحمت اللہ خلف شیخ عبد اللہ خان نقشہ نویس میرٹھ اصلی وطن ابتدائی تعلیم و تربیت دلّی میں پائی۔ عربی فارسی بقدر ضرورت مولوی شاہ محمد عبد الحکیم صاحب صدیقی المتخلص بہ جوشش یکیم سے پڑھیں اور اُنھیں سے فن شعر میں تلمذ حاصل کیا شعر میں روزمرّہ کے دلی جذبہ کا مطلب بآسانی ادا کر لیتے ہیں پہلے میونسپل بورڈ غازی آباد میں کلرک تھے فی الحال ایکاؤنٹنٹ آفس میرٹھ میں ہیڈ کلرک ہیں انتخاب کلام یہ ہے۔

اِدھر پہلو سے وہ اُٹھا اُدھر پہلو میں درد اُٹھا
جفا پیشہ جسے سمجھے تھے وہ آرامِ جاں نکلا

ہوا گھٹ گھٹ کے دلمیں خون ارمان و تمنّا کا
نتیجہ تجھ سے گر نکلا تو یہ ضبطِ فغاں نکلا

بتاؤ تو مہر ہی یا مدعی کی ۔۔۔ بتو تمکو بھی الفت ہے کسیکی
جو دل سے دوستی نے بھی دشمنی کی ۔۔۔ کوئی امید رکھے کیا کسیکی
زمانے کے ہوئے ارمان پورے ۔۔۔ مگر نکلی نہ حسرت میرے جی کی
کہو تو کیا یہی لازم تھا تمکو ۔۔۔ ہمارے دشمنوں سے دوستی کی
وہ مہر وفاتحہ پڑھنے جو آیا ۔۔۔ چڑھی مرقد پہ چادر چاندنی کی
عدو سے حالِ دل خود کہہ رہا ہوں ۔۔۔ بڑھی ہوتی ہے حالت بیخودی کی
سنبھالے دلکو اپنے خاک ناصح ۔۔۔ طبیعت ہو جو بے قابو کسی کی
کہو تو کیوں ہے یہ بننا سنورنا ۔۔۔ مریجاں جان لوگے کیا کسی کی
خدا کی یاد بھی کچھ کر لو رحمت ۔۔۔ بہت تم نے بتوں کی بندگی کی
عدو کے نام سے انکو پیام بھیجا ہے ۔۔۔ جو آگئے تو مزا ہوگا دل لگی ہوگی

یہاں کے مرنے والے بھی مزا پاتے ہیں جینے کا ۔۔۔ کہیں فردوس سے بڑھکر زمینِ کوئے قاتل ہے
محشر کا نمونہ وہ بتِ ہوش ربا ہے ۔۔۔ انداز قیامت کے ہیں قیامت کی ادا ہے
لیتی تو ہر اک شخص کی جاں اسکی ادا ہے ۔۔۔ بدنام مگر مفت زمانے میں قضا ہے

رحمت

رحمت محمد رحمت اللہ خلف حافظ محمد عبد اللہ خاص بلند شہر کے متوسط الحال باشندوں میں سے ہیں عمر تقریبًا ۲۸ سال ہے مذاقِ شعر اگرچہ جدید ہے مگر دو چار سال ہی کی کثرتِ مشق نے قریبًا پرگو کر دیا ہے منشی سید محمد ناظر حسین صاحب ناظر سکندر آبادی ملازم ریاست ٹونک کے شاگرد ہیں اور مدرسۂ اسلامیہ بلند شہر میں مدرس ہیں۔ کلام درج تذکرہ ہے ✤

جو آئی تیرے آنیسے وہی رونق تھی محفل کی ۔۔۔ اُڑا جو تیرے جانے سے وہی تو رنگِ محفل تھا
ستمگر مجھ سے لیکر کیوں اسے پامال کر ڈالا ۔۔۔ بڑے نازوں کا پروردہ یہ مجھ ناشاد کا دل تھا
دلِ ناشاد کی میرے نہ سمجھی قدر کچھ تم نے ۔۔۔ یہ گلدستہ نظر کے سامنے رکھنے کے قابل تھا
اِک لفظِ کُن سے کی ہے معمور بزمِ عشرت ۔۔۔ دو حرف سے ہے ظاہر سب کچھ کمال تیرا

تو نہیں ملتا جو مجھ سے کیا ہوا
نیر تو تیرا مرے دل سے ملا

بے وفا مشہور عالم میں ہوئے
بس یہ تمکو عہدِ باطل سے ملا

اب ہے رحمت ہاتھ دل پر کس لیئے
اور آنکھیں شوخ قاتل سے ملا

تیغ کھنچکر رہ گئی خنجر نکل کر رہگیا
آج قاتل محجبہ کیوں تیور بدل کر رہگیا

دِل سے کہتے تھے نکر ضبطِ فغاں مانا نہیں
آپ اپنی آگ میں کمبخت جل کر رہگیا

سچ بتا اے شمع محفل کس لیئے روتی ہے تو
یہ پڑی ہے راکھ کسکی کون جل کر رہگیا

جب اُٹھائی یار نے روئے منور سے نقاب
کوئی غش کھا کر گرا کوئی سنبھل کر رہگیا

پا گیا اچھی جگہ لیتا نہیں جانے کا نام
دل مرا مُٹھی میں اُس بُت کی مچل کر رہگیا

وحشتِ دل! مجھے گھر جانے دے
اے جنوں چھوڑ دے داماں میرا

کیا کہوں دلکے عوض کیا یہ صنم دیتے ہیں
رنج دیتے ہیں، الم دیتے ہیں غم دیتے ہیں

ہوا ہے دامنِ دل پُرزے پرزے
کسی سے چاک یہ کیونکر سیئے جائیں

تری تصویر گر دیکھیں تو ہو وہ بیخودی طاری
نہ آئیں ہوش میں حورانِ فردوسِ بریں برسوں

وقتِ زینت چھیڑنے پر میرے ہو ہو کر خفا
ہائے یہ کہنا کسیکا بال سُلجھانے بھی دو

دِل جگر مائل ہیں دونوں اُسکی چشم مست پر
لطف ہے میکش بھی دو ہیں اور میخانے بھی دو

حیا کیا کام ہے خلوت میں تیرا
ترا اس وقت میں آنا ستم ہے

عجب حال ہے اِس دِلِ مضطرب کا
کبھی رہنما ہے کبھی راہ زن بھی

قیامت کے اے بت ہیں انداز تیرے
فدا تجھپہ ہیں شیخ بھی برہمن بھی

موسمِ گل ہے یہ حسرت ہے مجھے ای ساقی
توبہ توڑوں ترے ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

یقیں تیری باتوں کا کیونکر نہ کیجئے
کہ برسوں سے وعدہ وفا ہو رہا ہے

بے طرح آج تم سنورتے ہو
ہیں ارادے کہاں کے جلانے کے

درد سینے میں لب پہ آہ و فغاں
یہ نتیجے ہیں دل لگانے کے

رحمت

رحمت پنڈت گنگا پرشاد ولد پنڈت موتی لال کشمیری لکھنوی شاگرد حضرت امانت ۱۲۶۹؁ میں بروقت ترتیب تذکرہ سراپا سخن انکا عالم شباب تھا۔ عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔ کلام ملاحظہ ہو:

ہم رند کس طرح نہ دعا دیں اُٹھا کے ہاتھ
دیتا ہے جام پینے کو ساقی بڑھا کے ہاتھ

ملتا ہوں غم سے میں کفِ افسوس راہ میں
چلتے ہیں ساتھ غیر کے جب وہ ملا کے ہاتھ

اے غیرتِ مسیح ترا عشق لے گا جان
ہے موت میری اِس مرضِ لادوا کے ہاتھ

رحمت خوشی سے پاؤں نہ پھیلاؤں کس طرح
دیکھوں گلے میں اپنے جو اُس مہ لقا کے ہاتھ

رحمت

رحمت حکیم حافظ محمد رحمت اللہ رحمتؔ باشندۂ بنارس اوائل مشق میں برسوں خلیل الدین حسن طاہر بنارسی سے اصلاح لیتے رہے پھر جب ۱۸۹۸ء میں حضرت داغ حضور نظام کے ہمراہ بنارس گئے اُنکی خدمت میں حاضر ہو کر شرف تلمذ حاصل کیا۔ بڑے پُر گو کہنے والے ہیں کچھ تلامذہ بھی کر لیے ہیں، دیوانِ غیر مطبوعہ تیار ہے، شعر گوئی میں اچھی مہارت ہے۔ صفائی مضمون اور زبان کا خیال رکھتے ہیں، بندش بھی چست ہے، تعقید سے بھی احتراز کرتے ہیں الغرض بدرجہ اوسط تمام خوبیاں اُنکے کلام میں موجود ہیں۔

ہے اہلِ حشر کو بھی قصد کیا لبھانے کا
کیا جو وعدہ قیامت میں مُنہ دکھانیکا

ایک ہی جلوہ میں غش کھا کے گرے تم رحمت
کونسی بات یہ تھی دل کو سنبھالا ہوتا

میرے پہلو سے وہ اُٹھ کر چل دیئے
اور کیا بینائیِ دل سے ملا

ہائے اب دل کھو کے پچھتاتا ہوں میں
کیوں کسی زہرہ شمائل سے ملا

ہو نہ ہو اس میں بھی کوئی چال ہے
وہ نہ جانے ہمسے کس دل سے ملا

لیکے آئے داغِ حسرت دل میں ہم
خوب تحفہ اُن کی محفل سے ملا

دوست دشمن کو بُرا کہیئے تو سہی
کون کس دل کون کس دل سے ملا

حق کا ملنا تو بہت آسان ہے
آدمی البتہ مشکل سے ملا

جان کر دوں اُنکے قدموں پر فدا
جب وہ سمجھیں گے کہ یہ دل سے ملا

رات کی باتوں کا جب اُن سے کیا کچھ تذکرہ	اُٹھ گئے شرما کے کچھ ایسی پشیمانی ہوئی
باغ میں پھول سے رخسار دکھا کے تم نے	گل و بلبل کا کیا خون لڑا کے تم نے
آنکھوں میں سُرمہ کا دنبالہ غضب ڈھاتا ہی	پر لگائے ہیں نئے تیر قضا کے تم نے
اچپلاہٹ میں ہی سنجیدگیٔ اہلِ شباب	ڈھنگ سیکھے نئے شوخی میں حیا کے تم نے
یاد آئی ہی تھیں گرمیٔ صحبت کس کی	کس لئے کھولدیئے بند قبا کے تم نے
کاٹ دی شاخِ طرب مزرعِ دل سے میرے	لُطف دیکھے نہ ذرا نشو و نما کے تم نے
دیکھئے جسکو وہ پڑھتا ہے تمھارا کلمہ	کیا سکھایا ہے یہ بندوں کو خدا کے تم نے

رحمٰن رحمٰن - منشی ضیاء الرحمٰن شاگرد معجز بریلوی - قاضی محمد خلیل صاحب کے مشاعرے کی غزل سے چند شعر درج ہیں ✤ جوان آدمی ہیں اور یہ کلام ہے -

جسے کہتے ہو تیر آہ دنیا سے نرالا ہے	یہ جسکے دل سے نکلا ہو اسی کے دل میں بیٹھا ہی
نہ جاؤ اُسکی بالیں سے کوئی حسرت نہ رہجائے	تمھارے سامنے ہی دم نکلجائے تو اچھا ہے
بُرا تم جسکو کہتے ہو وہ اچھا ہو نہیں سکتا	جسے کہتے ہو تم اچھا بُرا ابھی ہو تو اچھا ہے

رحمت رحمت - رحمت علی رحمت قرابتدار و شاگرد امام بخش صہبائی - مثنوی نالۂ بلبل - حدیقۂ رحمت و مثنوی شکایتِ فلک، اِن سے یادگار ہیں - فارسی شعر بھی کہتے تھے - کتب درسیہ و رسائل عروض کو بہت تحقیق و تدقیق سے پڑھا تھا - ۶۰ھ ہو انتقال کیا - یہ چند شعر اُنکے طبعزاد ہیں -

دِل ہی بیتاب بہت شوخیٔ جاناں کی قسم	ہدفِ تیر ہے جاں کاوشِ مژگاں کی قسم
طعنے ابتک ہیں کہ رُخ کی مرے کیا قدر تھی	میں نے اک روز کہیں کھائی تھی قرآں کی قسم
تھا غمزہ تیز مے سے ہوا اور تیز تر	رُوش میں تیغ کی ہے بہت دخل آپ کو
رحمت یہ عمر اور ورع خیر ہے تجھے	بٹتا تو کیوں لگائے ہے عہد شباب کو
ابر بہار کی سی مجھے چشم تر ملے	جوں برقِ مضطرب مجھے یارب جگر ملے
تیر ہی کچھ یہ طور نرالا جہان سے ہے	ورنہ یہ رسم ہے کہ بشر سے بشر ملے

رحم

رحم - راجہ نیم چند - حیدر آباد دکن کے منصبدار اور با وقار رئیس ہیں، شعر و سخن کا بھی گاہ گاہ مشغلہ ہوجاتا ہے عمر ۳۵ سال کے قریب ہے، بارہا کلام اور حال کے لیئے لکھا مگر جواب نہ آیا ؎

تم نہ سننا کبھی ہیں درد انگیز — دلِ اُمیدوار کی باتیں
ہے لگاوٹ کا یہ نرالا ڈھنگ — ظلم کے ساتھ پیار کی باتیں
اِسی واسطے ناصحا دل بنا ہے — خطا کیا ہوئی گر کسیکو دیا ہے

رحمٰن

رحمٰن - محمد عبد الرحمٰن خان مرحوم رحمٰن تخلص ۸ رجون ۱۸۵۷ء کو فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس تک تعلیم پائی سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں پہلے منصرم حجی خفیفہ ڈیرہ دون ہوئے پھر ۱۹۰۵ء میں ڈیرہ دون سے بعہدۂ مترجم حجی فرخ آباد کو تبادلہ ہوا۔ اور یہاں بعارضۂ تپ دق ۱۳ ستمبر ۱۹۰۶ء کو انتقال فرمایا۔ ناول نویس بھی تھے، حکام نے خوش ہوکر آپکے لئے تحصیلداری کی سفارش کی مگر حیات نے وفا نہ کی۔ فن بنوٹ کے کامل اُستاد تھے، فقیروں سے خاص ارادت تھی ایک کتاب وظائفِ رحمانی لکھی تھی جس میں عملیات وغیرہ درج ہیں۔ اخباروں کی نامہ نگاری بھی کی آپکے دو صاحبزادے بھی موجود ہیں ایک جدت اور دوسرے فطرت تخلص کرتے ہیں۔ اُنھوں نے آپکی چند غزلیات بھیجیں جن کا انتخاب درج ذیل ہے۔

ماہ کامل سے جبیں کو ترے اچھا دیکھا — رشکِ خورشید منور رُخِ زیبا دیکھا
رات کے آنیکو کہتا ہوں تو وہ کہتے ہیں — شب کو خورشید کہیں تمنے نکلتے دیکھا
بارِ احسان سے جرّاح کے چھوٹا صد شکر — دلِ مجروح میں ناسور ہُوا خوب ہوا

کسیکی نوکِ مژہ کے نشتر لگے ہوئے ہیں ہزاروں دلپر — بہا ہی حسرت کا خون ہوکر ہیں غرق خنجر کی آب میں ہوں
یا الٰہی وہ رہے فرمانروائے ملکِ حسن — کشورِ دل کی ہمارے جس سے ویرانی ہوئی
دست بستہ جب کہا کچھ عرض کرنا ہے حضور — ہنسکے بولے کیا کہوگے بات ہی جانی ہوئی
مسی محرم بند ٹوٹے نیلگوں رخسار ہیں — غیر کے گھر آپ کی کیا خوب مہمانی ہوئی
بہ گیا آنکھوں کا سُرمہ لاکھا ہونٹوں سے اُڑا — آئینہ دیکھا تو سخت اُنکو پشیمانی ہوئی

غل ہے کہ ہاتھ ہاتھ کو آتا نہیں نظر
محشر میں دھوم ہے مرے روزِ سیاہ کی

سب بیگناہ رحمتِ غفار دیکھکر
حسرت سے شکل تکتے ہیں اہلِ گناہ کی

زمیں جگر میں آتی آسماں زیر و زبر ہوتے
ہمارے نالہ ہائے دِل جو کچھ بھی با اثر ہوتے

ہدف تیرِ ستمگر کے جو دونوں دِل جگر ہوتے
ہجوم شوق کے ساماں اودھر ہوتے اُدھر ہوتے

ترکِ مے سے کیا بُری گت ہوگئی
توبہ کیا کی ہمنے آفت ہوگئی

جو ضطرابِ دل میں جو سوزش جگر میں ہے
سیمابِ موج میں ہے نہ برق و شرر میں ہے

یوں مفت یہ شوخی نہیں پائی ہے خدا نے
سینچا ہے اسے مدتوں خونِ شہدا نے

یہ عشق وہ ظالم ہے کہ اللہ بچائے
برباد کیئے اسنے گھرانے کے گھرانے

چُھپ جاؤگے کیا غیر کے پہلو میں ہاں بھی
سُنلی کبھی عاشق کی جو محشر میں خدا نے

یا ہمنے سکھائے تھے انھیں حسن کے انداز
یا ہمکو پڑے ناز حسینوں کے اُٹھانے

لو تیر و کماں ہاتھ میں دل یہ ہے جگر یہ
ہاں دیکھیں تو تم کیسے اُڑاتے ہو نشانے

ہے کچھ تو جو بلبل سے چٹکنے لگے سب گل
کیا پھونکدیا کان میں غنچوں کے صبا نے

ابرِ نیساں کی طرح ہجر میں رُلواتی ہے
یاد تیری دلِ مضطر سے کہیں جاتی ہے

شوخیٔ خامۂ بہزاد بھی چکراتی ہے
رنگ بنکر تری تصویر اُڑی جاتی ہے

جب اُلٹ جاتا ہے گیسو رُخِ نورانی سے
شبِ تاریک میں بجلی سی چمک جاتی ہے

رابط **رابط**۔ شیخ امام الدین ساکن قصبۂ کانٹ ضلع شاہجہانپور۔ کریم بخش فرقت سے ۱۸۹۴ء سے اصلاح لیتے تھے اُس زمانہ کا کلام پیامِ عاشق سے نقل ہوا۔

دہانِ زخم کو یہ آرزو ہے اے سفاک
نمک چھڑک کے تڑپ کا مزا چکھا دینا

نہ پھر جڑے گا جو ٹوٹا ہمارا شیشۂ دل
کہیں نظر سے نہ اے سنگدل گرا دینا

سُنا ہے فتنۂ محشر ہے آپکی رفتار
یہ آرزو ہے کہ چلکر ذرا دکھا دینا

نکلجائے تر ادم ہچکیوں میں مدعا یہ ہے
اِسی باعث سے تو اے رابط اُنکو یاد آیا ہے

رئیس مراد آباد ان کے بزرگ بڑے صاحب جاہ و ثروت تھے، انقلاب زمانہ سے وہ حالت نہیں رہی پھر بھی آسودگی سے بسر اوقات کرتے ہیں، رات دن شعر و سخن کا مشغلہ رہتا ہے۔ معمر آدمی ہیں کلام کا انتخاب حاضر ہے۔

مرادوں کے دن ہیں جوانی کی راتیں
امنگوں پہ آیا ہے جوبن کسی کا

لاکھ قرباں کریں ہم تجھ پہ دل و جاں اپنا
تو نہ ہوگا کبھی غارتگرِ ایماں اپنا

یہ تری زلف پہ واریں گے وہ چہرہ پہ ترے
لائے ہیں نذر کو دل گبر و مسلماں اپنا

رو روئے یاد آتے ہیں دندانِ یار آج
ہے صبح سے بندھا ہوا اشکوں کا تار آج

لائی شمیمِ گیسوئے جاناں مگر صبا
کیوں کوڑیوں کے مول ہے مشکِ تتار آج

ہنس ہنس کے وارِ تیغ کے قاتل نے جو کیے
زخموں کی بدھی بن گئی پھولوں کا ہار آج

اٹھا نقاب تو خورشیدِ حشر کا چمکا
جو بکھری زلف تو آئی بلا مرے سر پر

بہار آئی جنوں خیز ہے چمن کی ہوا
رگوں نے کر لیا گھر اپنا نوکِ نشتر پر

ہوا نہ رتبۂ شہادت کا ہمکو ربط نصیب
گلا اٹھا کے رکھا بار بار خنجر پر

لگا دیں آگ تیرے دل میں ظالم
دکھا دیں آہِ سوزاں کا اثر ہم

چمک کر داغِ الفت ہیں یہ کہتے
چراغِ طور ہم شمس و قمر ہم

وہ بلبل ہوں رہا ہوں میں پسندِ باغباں سو سو
نہالِ عیش پر اپنا رہا ہے آشیاں برسوں

کسی پہلو نہ نکلا میں ترے زندانِ الفت سے
لیے قیدِ محبت نے نہ کیا کیا امتحاں برسوں

صبا نے خاک اڑائی جستجو میں تیری قدرت تک
پھرا ابر باد موجِ بوئے گل کا کارواں برسوں

چین آتا ہی نہیں دم بھر فراقِ یار میں
کب تلک تڑپا کروں میں یا الٰہی کیا کروں

حلقۂ گیسوئے پرخم سے رہائی نہ ہوئی
پیچ پر پیچ دیئے زلفِ دوتا نے ہمکو

ربط طاقت تھی رسائی کی ہمیں تا ملکوت
پھینکا اسفل کی طرف مکر و ریا نے ہمکو

اُن پر نظر کرے گی نہ رحمت اللہ کی
کچھ واعظوں نے قدر نہ جانی گناہ کی

کیونکر نہ باندھوں کھا کے ہیں خمِ جگر کمر — ملکِ عدم کو باندھ گئے ہمسفر کمر
مانی سے کھنچ سکے تری تصویر کس طرح — ہوش و حواس ہوگئے گُم دیکھ کر کمر
یہ جوشِ گریہ یادِ کمر میں ہے اندنوں — رویا میں جس جگہ ہوا پانی کمر کمر
بدزیب یہ ردیف ہے راوی نہ فکر کر — ایسے ہی باندھ لائینگے اہلِ ہنر کمر

ربط

ربط منشی دیبی پرشاد خلف منشی موہن لال کالیستھ بھٹناگر، عدالتِ دیوانی ضلع مراد آباد میں ۱۸۸۰ء میں پیشکار تھے اور ملک الشعرا شیخ مہدی علی خان ذکیؔ کے ارشد تلامذہ میں گنے جاتے تھے انکے بھائی منشی کنھیالال بھی شاعر تھے اور ضبطؔ تخلص کرتے تھے۔ تذکرہ شعرائے ہنود سے کچھ کلام انتخاب کیا گیا، بڑے ذکی، فہیم، اور طباع نکتہ سنج تھے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اجل بھی تو نہیں آتی بُرا ہو سخت جانی کا — الم کبتک اُٹھائیں یار کی نا مہربانی کا
یہی ہیں لذّتیں تو ہجر یقیں کیا کیا نہ رو ینگے — اگر یاد آئیگا پیری میں عالم نوجوانی کا
بہیں وہ نشترِ مژگاں ہر عضو کو زدید شکنتے ہیں — ہوا ہے عشق اُنکو آپ اپنی نوجوانی کا
اُٹھا کر آنکھ بھی حوروں کو جنت میں نہ دیکھیں گے — رہا دھڑکا جو ایسا ہی کسی کی بدگمانی کا
نہ پوچھ اے ربط حالِ دل غضب میں جان آئی ہے — بُرا ہو عشق کا یارب بھلا ہو نوجوانی کا

رباعی

ہر طرح سے آپ تو ستائیں کیا خوب — ہم شکوہ زبان پر نہ لائیں کیا خوب
دیں گالیاں آپ ہم ہنسی میں ٹالیں — اور آپ ہنسی میں روٹھ جائیں کیا خوب

جو مصرع ایک ہی عشوہ تو غمزہ ایک مصرع ہے — تمھاری شانِ محبوبی عجب دلچسپ مطلع ہے
جہاں ہے وہ قصیدہ پڑھنا ہیں حمدِ باری کا — ازل مطلع ہے جس کا اور ابد جس کا کہ مقطع ہے
مشابہ ہے مگر اس میں کہاں ہے یہ دل آویزی — ثریا کیا ہے جو کچھ آپ کا جھومر مرصّع ہے
ادا و عشوہ و ناز و غمزہ ہیں یہ چار رکن اسکے — قدِ موزونِ جاناں بھی عجب برجستہ مصرع ہے
اُسی کے ہیں یہ سب نقش و نگار اے ربط کھول آنکھیں — مصوّر ہے وہ ممدوحِ زماں عالم مرقع ہے

ربط

ربط نواب مظفر علیخان صاحب برادر و تلمیذ حضرت حسان الہند نواب رضوان علی خان رضوان

برسوں گذر گئے یہی سُنتے کہ آؤ گے	وعدوں کی انتہا ہے نہ حد انتظار کی
وصل ہویا اور ساماں کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور	آرزوئے عاشقِ دلگیر کچھ کہتی تو ہے
رات سے مضطرب ہے دِلِ راقم	دیکھیے آیا یہ بے قرار کسے
ڈھونڈھا کئے جہاں میں کوئی باوفا ملے	جتنے ملے ہیں وہ غرض آشنا ملے
مقتل میں آج آؤ چھُری سے گلا ملے	اُلفت کا امتحاں ہو جفا سے وفا ملے
اِک ہم ہیں بے نصیب کہ دشنام بھی نہیں	اک وہ ہیں جنکو بوسہ بغیر التجا ملے
ہونیکو ہے شاید کوئی سامان خداساز	جو شام سے ہی اور ہی رونق مرے گھر کی
واعظ ڈرا نہ تو ہمیں روزِ حساب سے	کر لینگے توبہ مرنے سے پہلے شراب سے
خضر کو دیکے یارب عمر کی کیوں رائگاں تونے	کسی عاشق کو دی ہوتی یہ عمرِ جاوداں تونے

رام پرشاد

رام پرشاد۔ منشی رام پرشاد کایستھ سکسینہ لکھنوی داروغہ سرکار نواب سر محسن الدولہ بہادر نواسۂ حضرت غازی الدین حیدر داماد حضرت محمد علیشاہ، بڑے طبّاع، صاحب لیاقت اور سلیقہ شعار اہلکار تھے۔ اِنکے آقا کا اعتمادِ کلّی اِن پر تھا۔ اور جملہ انتظام انھیں کے ہاتھ میں تھا، حسین آباد کے امام باڑے کا بھی (چونکہ نواب صاحب اُسکے متولّی تھے) تمام نظم و نسق سالہا سال اِنکے ہی ہاتھ میں رہا۔ اور تمام متعلّقین اُنکی نیک نیتی اور حسنِ سلوک کے مدّاح رہے ۲۵ برس کے قریب ہوئے انتقال کیا ؂

ہائے اِس مہانسرا سے ہاتھ خالی گھر چلے	بارِ عصیاں مفت ہمتو اپنے سر پر دھر چلے
غور کر کے خوب دیکھا کوئی بھی اپنا نہیں	خوابِ غفلت میں عبث ہم عمر ضائع کر چلے
گو کہ ہونا ہے وہی لکھا ہے جو تقدیر میں	ہر بشر کو چاہئے کچھ کام اچھے کر چلے
رام پرشاد اُن کو جنت میں پلا جامِ طہور	تشنہ لب جویاں سے بہر ساقی کوثر چلے

راوی

راوی۔ مصاحب علی خلف منشی اکرام علی ساکن قصبۂ نادون متصل بلگرام۔ مرزا مہدی کوثر کے صاحبِ دیوان شاگرد اور وقتِ ترتیب تذکرۂ سراپا سخن زندہ تھے۔

تھم ہجوم نا اُمیدی! اب جواب آنیکو ہے
مژدہ تسکیں! ابکے قاصد کامیاب آنیکو ہے

لذّتِ قتل کہاں بُرشِ صمصام میں ہے
عشرتِ مرگ تو کچھ عشوۂ اصنام میں ہے

ایسی ہوگی نہ کسیکی شبِ غم کی صُورت
صبحِ محشر میں نہ ہوگا وہ مری شام میں ہے

خوب کٹتی ہے شبِ ہجر کہ بیکار نہیں
دل کسی یاد میں ہے نالہ کسی کام میں ہے

یاں بہار آئی ہے ساقی ابھی آرام میں ہے
آنکھ ساغر پہ ہے دِل بادۂ گلفام میں ہے

بار کیا صحبتِ یارانِ مے آشام میں ہے
بیقراری سے جو شب بھر دلِ ناکام میں ہے

وعدۂ یار وفا ہوگا نہ گھبرائے دِل
وہ بھی دن ہوگا اگر گردشِ ایام میں ہے

عاشقی کھیل نہیں خاک نہ سمجھے راقِمؔ
رخصتِ جان بھی آغاز کے انجام میں ہے

کہتے ہو کہ ہم غیر سے ملتے نہیں حاشا
کہہ دو گے قسم کھا کے یہ اغیار کے آگے

"کسی سے نہیں ملتے" کہتے تھے تم تو
یہ کیا کر رہے ہو، یہ کیا ہو رہا ہے

حقیقت مری آپ کیا پُوچھتے ہیں
مقدر کا پُورا لکھا ہو رہا ہے

جانتا ہوں کہ اُسے دیکھ کے دم جاتا ہے
پھر اُسے دیکھنے جاتا ہوں یہ سودا کیا ہے

تیر سینے میں نہیں، پھانس کلیجے میں نہیں
پھر خلش کیسی ہے، یہ دِل میں کھٹکتا کیا ہے

تم رہو غیر رہے، تم کو مبارک عشرت
ہم چلے جائیں گے محفل سے ہمارا کیا ہے

اللہ رے خوئے شوخ اُلٹ کر نقاب آپ
لینا صبا کا نام بگڑ کر عتاب سے

ساماں نئے نئے ہوں شبِ وصلِ یار میں
مے ابر سے برستی ہو جام آفتاب سے

عیش کی رات مقدر سے اگر ہوتی ہے
بات کرنے نہیں پاتے کہ سحر ہوتی ہے

حُسنِ زیبا لاکھ نظروں سے چھپاتے جائیے
اور کھُلتا جائے گا جتنا چھُپاتے جائیے

تجھسے ملنے کو وہ آتے ہیں کھلے تیرے نصیب
مژدہ ہو اے دلِ بیمار قیامت آئی

اُن کو اغماض کہ پیکاں کو نہ ضائع کیجے
یاں جگر تشنۂ بیداد نشانی مانگے

ہائے راقِمؔ نہ رہے حضرتِ غالبؔ سر پر
قدر فرزند کی ہوتی ہے پدر کے ہوتے

امید وصل کی رکھیں اور آپ سے رکھیں
گویا کہ عمرِ خضر کی ہم آرزو کریں

تم سے نہ کہیں حال تو پھر کس سے کہیں ہم
یا اُسکو بتا دو کوئی تم سے جو سوا ہو

وفاداروں میں ملتے ہو دکھاؤ کچھ وفا کر کے
اسی بیگانہ داری پر کہیں ہم - با وفا تم ہو

تمھارے گھر سے ہم نکلے خدا کے گھر سے تم نکلے
تمھیں ایمان سے کہدو کہ کافر ہم ہیں یا تم ہو

مقصد تمھارے ہاتھ ہی قسمت خدا کے ہاتھ
جو کچھ خدا سے ہو وہ تمھاری زباں سے ہو

کیا ہو گا مسیحا سے کسی اور کو لاؤ
جس نے کہ علاجِ دلِ بیمار کیا ہو

وہ کام نہیں یاں کہ بنے چارہ گروں سے
وہ درد نہیں یاں کہ مسیحا سے دوا ہو

[illegible]

خوشامد سے بگاڑا آپ ہم نے اُسکی عادت کو
بنایا اپنا دشمن خود جتا کر منہ سے اُلفت کو

کہتے ہیں آنے کو وہ آئیں نہ آئیں دیکھئے
شوق میں کبتک ہمیں رستہ دکھائیں دیکھئے

کام تدبیر نہ تاثیرِ دعا کرتی ہے
وہی ہوتا ہے جو تقدیر خدا کرتی ہے

آہ کو سمجھے تھے تسکیں کی دوا کرتی ہے
کیسی تسکیں مری حالت کو سوا کرتی ہے

ایک دن وصل ہوا تھا یہ قیامت آئی
آج تک لیتی ہے بدلے شبِ ہجراں ہمسے

غیر دن رات وہاں رہتے ہیں اب لطف گیا
کل چھٹا آج چھٹا کوچۂ جاناں ہمسے

ایک دن رسم ورہِ غیر میں جائیگی ضرور
آبروِ عشق کی، شرم آپکی غیرت میری

یادگاروں میں اسد کی ہے یہ بندہ راقم
کیا ہوا بزمِ سخن میں نہیں شہرت میری

جاتے ہیں گلہ کرنے گلہ کر نہیں سکتے
ہلتے نہیں لب شوخیٔ گفتار کے آگے

تاثیر تو ہی میری نگاہوں میں بھی لیکن
چلتی نہیں اُس شوخ فسونکار کے آگے

حسینوں سے نکر الفت دلِ ناشاد کہتے تھے
لہو رلوائیں گے کافر ستم ایجاد کہتے تھے

کس کا جواب نامہ مگر پارہ ہائے خط
اُڑتے ہوا پہ دیکھنا دو چار آئیں گے

نازِ دلدار بھی نہیں اُٹھتا
ناتوانی سے ناتوانی ہے

ہاں کلک کوئی زمزمۂ دلستاں رہے
اندازِ دلفریبیٔ اہلِ زباں رہے

دیکھا ہوا ہی اپنا وہ باغِ نعیمِ خلد
جز انبساطِ خاطرِ اربابِ دیں نہیں

زاہد نجات کے لیئے طاعت نہیں ضرور
کچھ بندگی ہی ذریعۂ عفوِ خطا نہیں

مفت ملجائے تو کعبہ میں مئیں یہ واعظ
یاں حریفِ می و میخانہ بنے بیٹھے ہیں

کہتے ہیں دینے کو وہ دیکھئے کیا دیتے ہیں
وہ بھی یاں دیتے ہیں یا روزِ جزا دیتے ہیں

کیا دھرا ہے نرگسِ بیمار میں
مستیاں ہیں اور چشمِ یار میں

حسن وہ حسن جسے دیکھنے کی تاب نہیں
جلوہ وہ جلوہ کہ چھپتا پسِ جلباب نہیں

دہر میں عیش کے سامان ہیں مہیا سب کچھ
ایک تم جلوہ گرِ عالمِ اسباب نہیں

کیا سبک ہو گئے عریانیٔ تن سے مر کر
دوش پر جاتے ہیں اور زحمتِ احباب نہیں

ہنگامِ بے حجابی یہ شمع بھی بجھا دو
رہنے نپائے کوئی بیگانہ انجمن میں

تیرِ نظر سے تیری دونوں چھدے پڑے ہیں
دیوانہ رہگذر میں فرزانہ انجمن میں

ہوگی اب وہ حالت ہجو دلِ بیتاب و مضطر میں
کہ گل پر رقصِ شبنم جلوۂ خورشید انور میں

لبِ غیر آج تھا ساغر پہ دورِ آتشِ تر میں
کہ موج مے گریزاں ہی لبِ ساغر سے ساغر میں

نہیں معلوم کس کس کا لہو خنجر نے چاٹا ہے
کہ ہر جوہر برنگِ گل ہی موجِ آبِ خنجر میں

تقاضا شن کے کہتے ہیں یہ صورت ہی بلا کی
کوئی منہ پھیلے ہوا ئے بلائے پھرتے ہیں گھر میں

ہمیں نسبت ہی صہبا سے کہ ہم ہیں نسلِ آدم میں
ہمارا حصہ ہے راقم شرابِ حوضِ کوثر میں

زبانی مرنیوالے سینکڑوں عیار ہوتے ہیں
محبت کرنے والے لاکھ میں دو چار ہوتے ہیں

قیامت ہی زلیخا اور یوسف کی خریداری
غضب ہے حسن کے سودے سرِ بازار ہوتے ہیں

دعائے وصل وہ مانگے کہ جسکے ہاتھ خالی ہوں
مرے ہاتھوں میں دامانِ خیالِ یار رہتے ہیں

خوب نکلے جستجوئے یار میں
خار دامن میں ہیں دامن خار میں

ہمتو اپنی حسرتوں کو ایک دن
دفن کر آئیں گے کوئے یار میں

کچھ ایسی بن گئی تصویر اُسکے دستِ قدرت سے
رہا حیراں بنا کر آپ صورت آفریں برسوں

لوگ ایسا نہ ہو سمجھیں کچھ اور
دیکھکر مجھکو نہ شرمائیں آپ

کبتک لیئے پھرےگی مجھے جستجوئے دوست
کبتک کنوئیں جھکائیگی ای آرزوئے دوست

قیس و فرہاد کی شہرت ہو خدا کی قدرت
حوصلہ عشق کا کس کسنے کیا میرے بعد

اے دل گلہ کی یار سے اب گفتگو نکر
آزردہ اور خاطر آزردہ خو نہ کر

کعبہ ہو صنم خانہ ہو تفریق سے کیا بحث
سر ہمکو جھکانا در جانانہ سمجھکر

جان مٹھی میں دھری ہے کوئی تمکو دیدے
جھوٹے وعدوں پہ غلط آپکے اقراروں پر

کبھی سایہ میں کھڑا ہوں تو سرک جاتا ہے
یار کے کوچے میں دیکھے در و دیوار کے ناز

گھر بھی اپنا نہ ہوا خانۂ دلدار کے پاس
باتیں سنتے ہی کبھی بیٹھ کے دیوار کے پاس

ہم ڈاک بٹھا دینگے شب وعدہ نظر کی
آنکھوں پہ بٹھا کے انھیں لے آئینگے گھر تک

ناخن بڑھے ہوئے ہیں اگر چارہ گر نہیں
کرلینگے اچھے زخم جگر اس دوا سے ہم

کیوں ہمکو کوئی پوچھے تعلق نہیں جسے
اچھے ہیں یا برے ہیں کسی کی بلا سے ہم

اے نالہ ہائے ہجر تمھیں جانتا ہوں میں
جب کچھ گئے ہو آگ لگا کر رہے ہو تم

جس بزم میں گئے ہیں ہنسا کر اٹھے ہیں ہم
جب تم سے بات کی ہے رولا کر رہے ہو تم

کل کون جیئے کون مرے کسکو بھروسا
ملجاؤ بس اب وعدۂ فردا نکرو تم

اللہ رے لاغری کہ تہ آسمانوں میں ہم
اتنے گھلے کہ رل گئے روحانیوں میں ہم

وہ بلا مجکو مقدر جو مقدر میں نہیں
محفل یار میں ہوں گردش ساغر میں نہیں

کسی سے دل لگانا ہو تو سودا اسکو کہتے ہیں
مرض بیٹھے بٹھائے مول لینا اسکو کہتے ہیں

جب ان ناکامیوں پر منحصر ہے زندگی اپنی
خدایا مرگ کیا ہوگی جو جینا اسکو کہتے ہیں

جفا کر لو، ستا لو، دیکھنا محشر کے میداں میں
کہ دامن ہاتھ میں کسکے ہے کسکا منہ گریباں میں

ہیں وہ ناکام ازل ہوں کاتب تقدیر نے
مجھ سے پوچھا کیا لکھوں میں نے کہا کچھ بھی نہیں

جوش مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو خانۂ خمار نہیں

رہنے دو زخم دل کو امانت ہی یار کی
احسانِ چارہ ساز اُٹھایا نہ جائیگا

کس دل سے کہتے ہو کہ تجھے خاک میں ملائیں
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نجائیگا

قدرت سے نقشہ قدِ دلدار بن گیا
اللہ سے بھی اب تو بنایا نجائے گا

کس کی بیتابیٔ دل حالِ پریشاں کسکا
تم چُھری پھیر بھی دو چارۂ درماں کسکا

مجکو وہ یاد کرے ہوش کی بنوا قاصد
جسکے لب پر نہ کبھی نام خدا کا آیا

آنکھ میں سحر ہے کافر کی کہ اُسکے گھر میں
جو تماشے کو گیا بن کے تماشا آیا

آجاؤ پھرتے چلتے کبھی غمکدہ میں تم
آنکھوں سے ہم بھی دیکھ لیں آنا بہار کا

لکھ دیتا وصلِ یار جو میرے نصیب میں
کیا اِس میں کچھ بگڑتا تھا پروردگار کا

کیا پوچھتے ہو حال کبھی دل میں بیٹھکر
آنکھوں سے دیکھو لطف مرے انتظار کا

آئے تھے اگر ملنے دم بھر تو ٹِکے ہوتے
کچھ میری سُنی ہوتی کچھ آپ کہا ہوتا

محشر کی عقوبت کا اندیشہ نہیں ہمکو
وہ ہو لیا یاں ہمپر جو روزِ جزا ہوتا

پُوچھا ہی مزاج آپنے آہا مرے دل کا
مدّت میں کُھلا آج نصیبا مرے دلکا

کیا بہارِ عمر اپنی کیا نشاطِ زندگی
جب مدارِ زندگانی حسرتوں پر رہگیا

پروانہ چیز کیا ہے فدا شمع پر ہوا
مَرنا تمھیں دکھائیں گے جینا اگر ہُوا

وہ تو مہمان تھے رہتے نہیں آخر جاتے
تجکو بدنام مگر وقتِ سحر ہونا تھا

آنے دو محتسبِ شہر اگر آہی گیا
اب تو لب پر قدحِ آتشِ تر آہی گیا

وہ ایسے دِل میں آگئے ہیں بیخبر رہا
دیدار جو نظارہ سوئے رہگذر رہا

ہم ہیں اور کشمکشِ مشکل و دشوار میں دل
عشق کا لطف بھی آساں نہیں حاصل نہوا

طور پر جلوہ ہُوا موسیٰ کو جس تنویر کا
تھا وہ اک سرمایہ اپنی آہِ آتش گیر کا

عین شبِ وصال تھا ساماں فراق کا
کچھ شام ہی سے عالمِ صبحِ نشور تھا

واعظ کے روکے رک گئے ہیں ہم سے حریف سے
جنت میں جا پئیں نہ ملے یاں اگر شراب

نے دیر میں کچھ ہے نہ حرم میں کچھ ہے دنیا ہے طلسمات عجائب راقم	رباعی	نے ہستی میں کچھ ہے نہ عدم میں کچھ ہے دم میں کچھ ہے اور ایک دم میں کچھ ہے

راقم

راقم۔ منظفر علی راقم خلف شیخ رستم علی متوطن چار کلیانہ سنہ ۱۲۷۰ھ میں ستر برس کی عمر تھی غدر کے دوران میں انتقال کیا مولانا عبدالباقی مغفور سے زبان فارسی اور فن سخن کی اصلاح کی تھی فارسی شعر بھی کہتے تھے ؎ یہ کلام کا نمونہ ہے۔

غیر تدو بیر نہیں ہیں بتِ عیار کے کار		دم نہیں دیتے ہیں اور ہوتے ہیں اغیار کے یار
تیغ مت کھینچ میاں ہاتھ کو پہنچے نہ ضرر		تیرِ مژگاں ہے خود آزار دلِ بیمار کی مار
آفریں دست جنوں تجکو کہ دم کے دم میں		کر دیئے خوب مرے جامہ و دستار کے تار
اِک جہاں قتل کیا جنبشِ ابرو نے تری		کیا ستم دیکھیئے دکھلائیں گے تلوار کے وار
آج صحرا میں بہے دیدۂ تر سے دریا		وار کے وار رہے اور رہے پار کے پار

راقم

راقم۔ خواجہ قمرالدین خان خلفِ اکبر خواجہ بدرالدین خان عرف خواجہ امان مترجم بوستانِ خیال، حضرت غالب دہلوی مرحوم کے رشتہ میں بھتیجے ہوتے تھے، مدۃ العمر خاندانی اعزاز کے لحاظ سے گورنمنٹ انگلشیہ کے پنشن خوار رہے اور ریاستِ جیپور سے بھی مہاراجہ رام سنگھ جی کے وقت سے روزینہ دار تھے اور دہلی چھوڑ کر وہیں جا رہے تھے، فن سخن کا موروثی مذاق تھا اور بڑے مشاق اور پُر گو سخنور تھے۔ جوانی میں بڑے وجیہہ شکیل، جامہ زیب شخص تھے حضرت غالب، مؤمن، نیر، آزردہ۔ سالک۔ شیفتہ۔ ظہیر، کی صحبتیں دیکھے ہوئے تھے دیوان موسوم بہ "نغمۂ اردو" سنہ ۱۲۹۸ھ میں چھپا تھا۔ جس کا نسخہ عطیۂ مصنف راقم کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے، درجہ دوم کے شعرا میں اعلیٰ پایہ رکھتے تھے مضمون آفریں طبیعت پائی تھی۔ زبان و بیان میں سلاست اور بندش میں چستی، ترکیب کی استواری انکے اشعار کا خاص جوہر ہیں، ستر برس سے زیادہ عمر پا کر چھ سات برس ہوئے انتقال کیا۔

شق ہو گیا ہی سینہ جفاؤں سے یار کی		اب رازِ عشق ہمسے چھپایا نجائیگا

"ولیکن بلند فکر ہست" انکا اندازِ کلام خود اِس بات کا شاہد ہے، انتخاب ملاحظہ ہو ؂

نامے کا میرے اُس سے لیکر جواب پھرنا — پر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھرنا
اک وہ بھی دن تھے راقم جو تھا ہمیں میسّر — گلشن میں ساتھ اُسکے پیتے شراب پھرنا

کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے — اُڑا دیتے ہیں اُسکی بات ہنس کر

اے عشق مجھے تو اس طرح مار — تا یار کہے کہ "ہائے عاشق"

قطعہ

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں — کہنے کی ہی یہ بات کہ "مقدور ہی نہیں"
کہتا تھا کون یہ کہ خوشی ہی جہاں کے بیچ — اسباب کا تو یاں کہیں مذکور ہی نہیں
ای باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض — مجھسے قسم ہے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں
اتنا میں چاہتا ہوں کہ بس اور عندلیب — آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھکر کہیں

مری بد بختیوں سے کریں توبہ میگساراں — زہے وہ عمل کہ ہووے سببِ نجاتِ یاراں
سُنا کن نے حال میرا کہ جوں ابر وہ نہ رویا — رکھے ہے مگر یہ قصہ اثر دعائے باراں
یہاں تنک قبول خاطر کیجے تری جفا کو — تا سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کو

قطعہ

مژگاں سے دل بچے تو ٹکڑے کرے ہی ابرو — یہ کہہ کے میں نے اُس سے جب اپنی داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جسدم کہ ہووے خالی — تلوار گر نہ کھینچے پھر کیا کرے سپاہی

راقم۔ خلیفہ غلام محمد راقم دہلوی۔ لکھنؤ جانے سے بیشتر حکیم قدرت اللہ خان قاسم سے عربی فارسی کی انشا پردازی کے سبق لیئے تھے اور شاعری میں بھی ان ہی کے شاگرد تھے، علم پیشہ تھے اور طب میں دخل تھا۔ خوشنویسی میں فرد تھے، فارسی شعر کا بیشتر اور اُردو کا کمتر شوق تھا۔ راقم

فرقت میں تری جو مر گئے ہم — عشاق میں نام کر گئے ہم
بس عاشقی کر چکے میر جاں — غصہ سے ترے جو ڈر گئے ہم

ہاتھ میں اُسکے کچھ تو چمکے ہے — تیغ ہے یا کٹار ہے کیا ہے

جب میں نے کہا تم نے ملاقات اُٹھا دی — تو اُسنے ہنسی میں یہ مری بات اُڑا دی

لوگ کہتے تھے کہ راقب تو فرشتہ خو ہی	وہ تو دلدادۂ اندازِ حسیناں نکلا
دونوں طرف سے جان پڑی ہی عذاب میں	قابو میں دلربا ہے نہ دِل اختیار کا
جھک گئیں اُنکی نگاہیں شرم سے صبحِ وصال	کچھ تو تھکیں کچھ اور بھی بیمار آنکھیں ہو گئیں
یہ ستم دیکھو کہ کہتے ہیں سن مجھے	اُنکو کیوں بوسے ندوں جنکے لیے
سب بجا، سب سچ، کہ میں بدنام ہوں	یہ تو فرماؤ ہوا کن کے لیے
ایک کے دس دس بتانے وہ لگے	ہائے کیوں بوسے نہ گن گن کے لیے
خیال ہٹتے ہٹے گا کسی کی اُلفت کا	مرض یہ گھٹتے گھٹے گا بہت پرانا ہے
چھپایا تیرے رخساروں کو بڑھکر تیرے بالوں نے	غضب ہے توڑ ڈالا مورچہ گوروں کا کالوں نے
لے لیا ہے دِل تو لیلے جان بھی	مہربانی بھی ترا احسان بھی
اِن لبوں سے ایکدن نکلی نہ ہاں	وہ گل لالہ ہیں نافرماں بھی
مرگیا تو مرمٹیں سب حسرتیں	میزباں بھی لُٹ گیا مہماں بھی
سامنے بیٹھ کے دلکو جو چرائے کوئی	ایسی چوری کا پتہ خاک لگائے کوئی
وہ تو روٹھے ہی تھے لو موت بھی آنیسے رہی	اِس بُرے وقت میں کس کسکو منائے کوئی

راقم

راقم۔ لالہ بندرابن صاحب راقم دہلوی۔ اِنکے سلسلۂ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے، اکثر ان کو مرزا رفیع سودا کا اور بعض مرزا مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر مرزا مظہر کی شاگردی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اوائل مشق میں انھوں نے میر صاحب سے ضرور صلاح لی تھی جس کی بابت خود میر تقی میر اپنے تذکرہ میں اشارہ کرتے ہیں کہ "بندرابن راقم از شاہجہاں آباد دست مشق سخن از مرزا رفیع میکند، قبل ازین با فقیر نیز مشورت شعر می کرد" میر صاحب کی تحریر کی تائید قدرت اللہ خاں نے بھی اپنے تذکرہ میں کی ہے۔ راقم، فنِ سخن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور شعر خوب کہتے تھے، چنانچہ میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں انکی رسائی طبع کا بدین الفاظ اعتراف کیا ہے "بندرابن راقم بسیار پست قد

ہمقیں واسطہ بھلا غیر سے	سراپا مجھی پر تو یہ چھا گئی
نہ بگڑو بہت اب بناوٹ سے تم	وہ ہونٹوں پہ دیکھو ہنسی آگئی
تُو اے شیخ یاروں سے اُلجھا اگر	سمجھ لے کہ شامت تری آگئی
اَور کے وصل سے ظالم تری حسرت اچھّی	لاکھ آرام سے اک تیری مصیبت اچھی
جب گیا میں درِ دولت پہ یہی فرمایا	اِن سے کہدو کہ نہیں آج طبیعت اچھّی

رافت **رافت** منشی محمد عبد الغنی خان حیدر آبادی سکن شاگرد جناب فصیح الملک داغ دہلوی۔ یہ چند شعر انکے نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں۔

بعد میرے قاصدِ خانہ خراب آیا تو کیا	کامیاب آیا تو کیا نا کامیاب آیا تو کیا
گھر خدا کا ہے نہیں اس میں اجارہ شیخ کا	کوئی مسجد میں اگر پیکر شراب آیا تو کیا
اب چھین کے پی جاتے ہیں زندانِ خرابات	ہاں ساقی بدست الغیں سر پہ چڑھا اَور
آئے تھے جب ہم تو خالی ہاتھ آئے تھے یہاں	جب یہاں سے ہم چلے تو داغِ حسرت لیچلے
برابر لگے آگ دونوں طرف سے	اگر ہے تو سوزِ محبت وُہی ہے

راقب **راقب** منشی امام الدین نام راقب تخلص اپریل ۱۸۷۳ء میں قصور ضلع لاہور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی والد ماجد کا نام شیخ امر بخش صاحب تھا۔ تعلیم معمولی ہوئی مگر حصول شاعری و زباندانی کے شوق میں اکثر دہلی و آگرہ میں رہے۔ ۱۸۹۲ء میں اپنا کلام حضرت تسیم بھرتپوری کو دکھایا، بعدہٗ فصیح الملک بہادر نے خود مزین با اصلاح کیا۔ قصائد وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں، مہاراجہ فرید کوٹ کے دربار میں کئی سال سے قصیدہ پیش کرتے ہیں اور اس ریاست سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہے۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

گھر کیا سینے میں غم نے تو ہوئی جاں رخصت	میزباں جانتے تھے ہم جسے مہماں نکلا

رافت

رافت۔ مولوی محمد عبدالرؤف خان راز باشندۂ اندور ۱۹۰۸ء میں موجودہ والیۂ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم کے بچوں کے اتالیق تھے اور انھیں ایام میں سرکار عالیہ کے پرائیویٹ سکرٹری کے خدمات بھی انجام دیتے تھے، کچھ عرصہ ریاست اندور میں بھی ملازم رہے، حضرتِ داغ سے شعر و سخن میں مشورہ کرتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ پیسہ اخبار لاہور کے سب اڈیٹر رہے، اب معلوم نہیں کہاں ہیں، یہ چند شعر اُنکے نتائج افکار سے درج کئے جاتے ہیں ❖

ہم جس جگہ کھڑے ہیں وہیں کے وہیں تو ہیں
ہمسے ہماری قوم کا کیا کام بن پڑا

بغض و حسد کا حال یہ ہی جل مرے وہیں
یاں بھائی ڈوب جائے جو آنکھوں کے سامنے

کس توقع پر سُنائیں حالِ دل
وہ سمجھتے ہیں اسے بھی اک ہنسی

ایک تو ظلم کرو اور پشیماں بھی نہ ہو
خود نہیں مجھ سے طلب کرتے وہ یہ چاہتے ہیں

آفتیں سارے جہاں ہیں ہیں ہمارے دم سے
لیجائے چھین کے دل آئے تھے مہمان بنکر

باخدا اسلئے وہ کہتے ہیں ڈرانا کیا ہے
تو بناتا ہی نہیں یا کہ وہ سچ مان گئے

میری دعوت پہ وہ فرماتے ہیں لو اور سنو

ق

اُٹھنا بھی ہی جو پاؤں تو پیچھے ہٹا ہوا
کیا فرض اپنے ملک کا ہمسے ادا ہوا

دیکھا کسیکا باغ جو پھولا پھلا ہوا
دیکھا کرے گا بھائی تماشا کھڑا ہوا

پھر وہی کہدو گے تم "ہم کیا کریں"
رو کے ہم اے چشمِ پرنم کیا کریں

اور پھر اُسپہ یہ طرّہ کوئی نالاں بھی نہو
دل کا دل ہاتھ لگے اور کچھ احسان بھی نہو

ہم زمانے میں نہوں تو شبِ ہجراں بھی نہو
آپکی طرح کسیکا کوئی مہماں بھی نہو

تو سہی حشر میں تیرا کوئی پرساں بھی نہو
نامہ بر سچ تو بتا ہم ترے قربان گئے

تمنے دیکھا ہی کبھی ہم کہیں مہمان گئے

بھلے اور بُرے پر نہیں حصر کچھ
یہ میری جبیں پر عرق آگیا

طبیعت تو ہے آگئی آگئی
یہ میری ہی تو آنکھ شرما گئی

تیرِ نظر کی قیمت کیا دوں اُسے الٰہی — بہ نقدِ جان و دل تو بیعانہ ہو گیا ہی

دل پلک مارنے میں سینہ سے باہر آیا — یہ کشش تجھ میں ہے ای جنبشِ مژگاں کیسی

ہائے مسجد ہے یہ میخانہ نہیں اے واعظ — کیا بتاؤں تجھے ہے توبۂ رنداں کیسی

دلِ سوزاں تجھے کس شمعِ شبستاں کی ہی یاد — تجھ میں لَو ہے یہ چراغِ تہِ داماں کیسی

التجا یار کی پھر کیوں ہو جو قابو میں ہو دل — وہ جو بس میں ہو خوشامد تری درباں کیسی

تری صورت سے یوں ظاہر ترے صانع کا جلوہ ہے — کہ جسنے تجکو دیکھا ہے خدا کو اُسنے دیکھا ہی

مری چپ سے زمانہ بھر میں رازِ عشق افشا ہے — خموشی ترجمانِ آرزو و شرحِ تمنّا ہے

ترے خارِ مژہ سے ربط اب تو جیتے جی کا ہے — کہ ان کانٹوں سے دامن جامۂ ہستی کا اُلجھا ہے

رافت۔ شاہ رؤف احمد رافت خلف شعور احمد شیخ احمد سرہندی کی اولاد میں۔ اور جرأت کے شاگرد تھے فارسی و ریختہ دیوان اور مثنوی یوسف زلیخا ان سے یادگار ہیں ۱۲۷۰ھ میں بعمر پینسٹھ برس راہِ کعبہ میں وفات پائی، شعر گوئی میں مشاق تھے اور بڑے زبردست عالم تھے، رامپور میں پیدا ہوئے لیکن کئی مرتبہ دہلی آکر برسوں یہاں رہے خاندانِ شاہ غلام علی صاحب میں بیعت کر لی تھی رافت

رقیبوں سے مِل مِل کے وہ نازنیں — مجھے خاک و خوں میں ملانے لگا

ہوئے جو چاہت کے اپنے چرچے تو شک بھر آئے چشمِ تر میں — کنارہ کش ہو سبھوں سے بیٹھا وہ اپنے گھر میں میں اپنے گھر میں

یہ کسکے مژگاں کے آہ یا رب بھرے ہیں تیر ہماری بر میں — کہ بشکلِ غرباں پڑ گئے ہیں ہزاروں روزن دل و جگر میں (۱۰)

وصل کی شب ہی ہی گھڑیاں کیسی بے آئین ہیں — تب آ یا وہ راحتِ جاں جب نہیں پہر پہر تین ہیں

ادا و انداز و ناز و عشوہ جو کچھ ہی اُس شوخِ فتنہ گر میں — نہ وہ پری میں نہ حور میں ہی نہ ہی وہ غلمانیں نے بشر میں

لگا نہ جرّاح اسپہ مرہم کہ داغ جل وے تو جائیں مرہم — یہ رکھتے ہیں سوختہ جگر ہم چراغ اُجڑے ہوئے نگر میں

جس نے بالوں میں ترے عطر بسا دیکھا ہی — اُس پہ آئی ہے بلا ہمنے بسا دیکھا ہے

ترا مجنوں ہوں ای پیارے اگر تو رشکِ لیلیٰ ہے — گیا جنگل کو تھا وہ میں نے بھی صحرا کی لئی ہے

تری دریا دلی مشہور ہے عالم میں اے ساقی
مجھے تھوڑی سی مے ملجائے صدقہ تیری دوکان کا

سفر درپیش ہے ملکِ عدم کا
کمر کی جستجو ہے اور میں ہوں

کوئے صنم کی دیکھ لی جس روز سے بہار
باغِ بہشت گر گیا اپنی نگاہ سے

جادو بھرا ہوا ہے عجب چشمِ یار میں
دل سینکڑوں کے چھین لیئے اک نگاہ سے

دونوں جہاں میں اُس کا ٹھکانا کہاں رہا
تُو نے جسے گرا دیا اپنی نگاہ سے

دیکھا ہے جب سے عارضِ تابانِ یار کو
خورشید و ماہ گر گئے اپنی نگاہ سے

خواب میں آ کے ذرا شکل دکھائے کوئی
میری سوتی ہوئی تقدیر جگائے کوئی

ہو کے بے پردہ اگر بام پہ آئے کوئی
جلوۂ حُسن سے پھر تابِ لائے کوئی

دیکھکر آئینہ کس ناز سے فرماتے ہیں
میں بھی دیکھوں تو مرے سامنے آئے کوئی

اپنے گیسو کی درازی کا اگر دعویٰ ہے
میرے طولِ شبِ فرقت سے ملائے کوئی

نجائیگی شبِ غم بیقراری
یہی کہتا ہے درد اُٹھکر جگر سے

کیئے دیتا ہے مُرغِ دل کو بسمل
کسی کا دیکھنا ترچھی نظر سے

وُہی دشمن ہوا راغب تمہارا
جسے دیکھا محبت کی نظر سے

ایک نیا شعبدہ قاتل کا عیاں ہوتا ہے
دہنِ زخم میں تیر آ کے زباں ہوتا ہے

رُخِ پُرنور سے کس طرح جدا ہوں زلفیں
کب الگ شعلۂ آتش سے دُھواں ہوتا ہے

راغب

راغب منشی محمد یعقوب بخش ساکن بدایوں، دورِ موجودہ کے کہنے والوں میں ہیں رسالۂ نیرنگ رامپور سے کلام منتخب ہو کر نقل ہوا، بریلی کے مشاعرے میں اِنھیں دیکھا تھا۔ کلام درج ذیل ہے ؛

کسقدر جوہوش مجھسے بیگانہ ہو گیا ہے
دیوانگی پہ اپنی دیوانہ ہو گیا ہے

دیوانوں کا تمہارے کچھ ہی عجیب عالم
دیکھا جسے انھوں نے دیوانہ ہو گیا ہے

ساقی کی یاد میں جب بھر آئے اشکِ میگوں
آنکھوں کا ہر پیالہ میخانہ ہو گیا ہے

مجھے محفل میں اپنی گر بٹھاؤ گے تو کیا ہوگا — گھڑی دو چار اگر مکھڑا دکھاؤ گے تو کیا ہوگا
نہ ہوگا فرق کچھ صاحب تمہاری قدر و عزت میں — کسی رُوٹھے کو اپنے گر مناؤ گے تو کیا ہوگا

ہم ہوں اور تم ہو اور شب مہتاب — ہو گزک اور شراب خواری ہو
وہ ہو اور ناز و غمزہ و عشوہ — میں ہوں اور درد و آہ و زاری ہو
غیر سے چاہ جب تمہاری ہو — دیکھیے شکل کیا ہماری ہو

کیا تم سے کہوں میں نے دیا دل اُسے کیسے — الفت سے، مروّت سے، محبت سے، نہ ایسے

راغب

راغب منشی احمد حسین شاہجہاں آبادی برادر زادہ حافظ محمد بخش عرف حافظ ممو، ترتیب تذکرہ مرزا صابر کے ایام میں جوان خوش فکر تھے، اور تیز طبعی اور خوش اخلاقی کے باعث اپنے اقران میں ممتاز۔ طبیعت کی روانی کا نمونہ اشعارِ ذیل ہیں۔

چھٹ گئے آرام سے راحت کا ساماں ہو گیا — بڑھتے بڑھتے دردِ دل آخر کو درماں ہو گیا
یارب اسے تو چین دے مجھکو نہ دے نہ دے — جلتا ہے میرے حال پہ دل غمگسار کا
کیا فہم ہے وہ اپنی شکایت سمجھتے ہیں — شکوہ اگر کروں روشِ روزگار کا
آوے بھی وہ اگر تو نہ آوے اسے یقین — کیا حال ہو گیا دلِ اُمیدوار کا
اس کو ہے کیا صبا نے جہاں سے اُٹھا دیا — چھوڑا نہ ایک ذرّہ ہمارے غبار کا
ترغیب خلد اور مجھے راغب خدا سے ڈر — کیا کم ہے لطف خلد سے کچھ کوئے یار کا
میں نے کہا سر کٹتے ہیں کیا کیا نہ ملے لطف — کہنے لگے لے آؤ اگر ہے کوئی سر اور

راغب

راغب۔ جناب محمد عثمان خاں صاحب برہانپوری شاگرد مولانا فقیر الدین صاحب چشتی برہانپوری، حالات معلوم نہ ہو سکے، یہ کلام ہے

ازل سے عاشقِ صادق ہوں میں تو کوئے جاناں کا — سمائے گا مری نظروں میں کیا گلزار رضواں کا
مہِ کنعاں کے پلّہ سے گراں نکلا بہت پلّہ — جو تولا حسن میزانِ نظر میں حسنِ جاناں کا
لیا بوسہ جو میں نے تو حیاتِ جاوداں پائی — ہوا گویا دہانِ یار چشمہ آبِ حیواں کا

ای دل یہ کمر کی جستجو ہے	یا سیر عدم کی آرزو ہے
مٹ جانیکی تجھپہ آرزو ہے	کھو جانیکی اپنی جستجو ہے
کیوں ذبح میں سختیاں یہ قاتل	پتھر تو نہیں مرا گلو ہے
دم ہجر میں کیوں نہیں نکلتا	یہ بھی کوئی دلکی آرزو ہے
سب نذر ہے تیری اے غم یار	جتنا مرے جسم میں لہو ہے
وہ کہتے ہیں چہ خوش تیرے لیے گھر چھوڑ دیں اپنا	سکھاتا ہے ہمیں ای خانماں برباد یہ کیسی
اِسی مُنہ سے مسلمانی کا دم بھرتے ہو کیا کہنا	خدا کی یاد میں راضی بتوں کی یاد یہ کیسی؟

راغب

راغب ۔ مرزا سبحان قلی بیگ ایران اصلی وطن اور دہلی جائے پیدائش تھی، یہیں تعلیم اور تربیت پاکر شاہ عالم ثانی کے زمانے میں جوان ہوئے، سعادت یار خان رنگین کے بے تکلف یار اور اُنھیں کے شاگرد تھے، اور باوصف اسکے کہ انشاء اللہ خاں و رنگین محب یکرنگ تھے انکے اور سید انشا کے ہمیشہ مناظرے ہوا کئے اور نوبت ہجو تک پہنچی ۔ چند شعر ملے درج ہوئے۔

ہوتا ہے تازہ آہ سے ہر دم جو داغ دِل	روشن ہے بادِ گرم سے اپنا چراغ دِل
ای شام غربت آہ کدھر ڈھونڈیئے اسے	پایا نہ ہمنے زلف میں بھی کچھ سراغ دل
مُنہ دوپٹے میں چھپایا اُسنے	دل کو پردے میں لُبھایا اُسنے
رشکِ چمن جو اُٹھ گیا، آج ہمارے پاس سے	اپنے برنگ گل یہاں، اُڑ گئے کچھ حواس سے

راغب

راغب ۔ حافظ یار خان خلف الصدق نواب ذوالفقار خان ابن حافظ الملک حافظ رحمت خان نصیر جنگ، جوان وجیہہ صاحب حوصلہ، مجمع قابلیت، صاحب علم و فن، خوشنویس، انشا پرداز، کبھی کبھی شعر فارسی اور ریختہ میں کہہ لیتے تھے ۔ یہ چند شعر اُنکے کلام سے تذکرۂ قدرت اللہ شوق سے منتخب ہوئے۔

بسان شانہ گر کوئی کرے سو ٹکڑے اپنا دل	وہ جانے مُو بمو احوال اُس زلفِ پریشاں کا
کل مجھے دیکھکر مرا گل رُو	اپنی مجلس میں کیا ہی لال ہُوا
مَیں تو اُسکے عشق میں ہر لحظہ دُکھ پاتا رہا	اور وہ بیدرد اک بوسہ پہ ترساتا رہا

بھول جاتا ہے آپ کو کم اصل — کچھ بھی گر اقتدار ہوتا ہے
حسن تسخیر سے نہیں خالی — عشق بے اختیار ہوتا ہے

راضی

راضی ۔ منشی یعقوب خان آپ کو خواجہ وزیر لکھنوی سے تلمذ تھا۔ قاضی محمد خلیل صاحب کی بیاض سے ایک شعر نقل ہوا ؛

جو سر ترے قدموں پہ مر بیجاں نہیں رکھتے — کچھ اور بلا رکھتے ہیں وہ سر نہیں رکھتے

راضی

راضی ۔ مولوی خلیل الدین احمد راضی صدیقی مقیم تلہراوده، حضرت احسان شاہجہانپوری کے شاگردوں میں نامور ہیں اور مولوی نذیر الدین احمد صاحب کے بیٹے ہیں چالیس بیالیس برس کا سن ہے، شعر صاف اور اچھا کہتے ہیں، یہ انکے کلام کا انتخاب ہے ؛

کیا کیا لگاوٹیں جگر و دل لئے گئیں مگر — ناوک فگن کا رخ نہ اِدھر سے اُدھر ہوا
کہتے تھے سب ہی حشر کی منزل بہت کڑی — دیکھا تو آنکھ مُوندتے یہ طے سفر ہوا

عرصۂ حشر میں دیوانہ ترا کیا آیا — اہل محشر کے لئے ایک تماشا آیا
پاؤں کس شوق سے نرگس نے لئے آنکھوں پر — سیر گلزار کو جب وہ گل رعنا آیا
ایسی رچتی کہ کبھی رنگ نہ زائل ہوتا — تیری مہندی میں مرا خون جو شامل ہوتا
ماہ و خورشید کو جب طاقت نظارہ نہیں — تاب پھر کسکی تھی جو تجھ سے مقابل ہوتا

اللہ رے ظلم دوست کہ لاکھوں ستائے دل — پھر بھی یہ فکر ہے کہ کوئی ہاتھ آئے دل
ہمسے بھی تو کہو کہ محبت کے جرم پر — تجویز کی ہے کونسی تم نے سزائے دل
جتنی حیا تھی وصل کی شب ہمنے لوٹ لی — اب جھینپنے کی وہ نگہ شرمگیں نہیں
نرگس میں کب وہ بات جو ہے چشم یار میں — آنکھیں وہی ہیں چوٹ کریں جو ہزار میں
میں بھی ہوں بیقرار مرا دل بھی بیقرار — دو بیقرار دفن ہوں اک مزار میں

تماشا کیجئے کس کس کا اے سراپا ناز — پکارتی ہے ادا ایک ایک ادھر دیکھو
ہائے چالیں یہ تمہاری یہ تمھارے انداز — دل میں تو آؤ نظر کو نہ خبر ہونے دو

مفت رسوا ہیں چاہ میں تیری
کوئی چڑھتا نہیں ہے آنکھوں میں
کھینچ لیتا ہے دل کو آنکھوں میں
نکر دیر سیراب کرنے میں قاتل
بُرائی سے اچھوں کو ہوتی ہے نفرت
ہماری خرابی کا باعث عزیزو
وہ ہے حال خورشید کا اُسکے آگے
پَرہ وہ جو رُخ سے دور مرا دلربا کری
بیوفاؤں سے دوستی کرکے

کچھ نہ ٹھیرے نگاہ میں تیری
ہے جو صورت نگاہ میں تیری
ہے وہ جذبہ نگاہ میں تیری
ترے آبِ خنجر کا پیاسا گلا ہے
تُو اچھا ہی پھر کیوں ترا دل بُرا ہے
یہ حسن و جوانی یہ ناز و ادا ہے
جو خورشید کے سامنے ماہ کا ہے
ہر ذرّہ مہر بن کے قیامت بپا کرے
کیوں دلا مُفت خوار ہوتا ہے

سیلِ اشک اپنا اگر یوں ہی رواں ہے کچھ دنوں
دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اگر سچ ہی یہ بات
کتاب سے مجھے اُلفت ہے اِس لیئے راضی
خطا ہے اُسکے رُخ کو قرآں کے برابر کر دیا
ہمارا دل تو وہیں رہتا ہے جہاں دلبر
دوبارہ پیر جواں ہوئے دیکھ کر جسکو
جیا ہے ترے عشق میں جو موا ہے
مشکل ہے زندگی ترے بیمارِ عشق کی
ہے وصل میں موجود مگر ہجر میں غائب
آرام سے جاہل کی گذرتی ہے ہمیشہ

ایک دن کا رُخِ فلک تم دیکھنا مسمار ہے
تو مرا محبوب مجھ سے کس لیئے بیزار ہے
نہیں کتاب سا کوئی رفیقِ تنہائی
ورنہ اس قرآن کو حاجت نہتی تفسیر کی
یہ جسمِ زار اگرچہ پڑا کہیں پہ رہے
فریفتہ جو رہے ایسے نازنیں پہ رہے
موا ہی ترے عشق میں جو جیا ہے
چاہے کوئی دعا کرے چاہے دوا کرے
دل سا بھی جہاں میں کوئی خود کام نہیں ہے
عاقل کو یہاں ایک دم آرام نہیں ہے

شیخ جی آپ کی نصیحت سے
ماہ سے یار کو نہ دو نسبت

عشق اور اُستوار ہوتا ہے
ماہ تو داغدار ہوتا ہے

چھپاتی ہے بدی سیرت کی ،، صورت
مکاں سے عیب چھپتا ہے مکیں کا
سو بوسہ دوگے ہو کے جو ناخوش تو کچھ نہیں
اِک بوسہ لاکھ بوسے ہیں دوگے جو پیار کا
دیکھنا ترچھی نگہ سے اُس بتِ بے پیر کا
کام کرتا ہے دلِ عشاق پر شمشیر کا
ہمنشیں رُخ کو عرق میں وہ نہاں رکھتے ہیں
دیکھئے آب میں آتش کو عیاں رکھتے ہیں

مشرک ہیں کہیں جو مجکو مشرک
ہَیں ایک صنم کو مانتا ہوں
تُو چاہ نچاہ مجکو مَیں تو
جی جان سے تجکو چاہتا ہوں

یکساں ہے مجکو یادِ رُخ و زلفِ یار کی
اپنی نظر میں شام و سحر دونوں ایک ہیں
رہی تلاش بنارس میں کو بکو مجکو
ملا نہ کوئی وفادار خوب رُو مجکو
ضرور نکلے گی میرے مزار پر نرگس
کہ دیدِ یار کی ازبس ہے آرزو مجکو
ہجرِ جاناں میں لہو پیتا ہوں غم کھاتا ہوں
نہ غمِ آب ہے مجکو نہ غمِ ناں مجکو
گردشیں میں نے اُٹھائی ہیں تری آنکھوں کی
کیا ڈرائیگی بھلا گردشِ گیہاں مجکو
مارنا منظور ہے گر عاشقِ دلگیر کو
چھوڑ ابرو کی کماں سے اُس مژہ کے تیر کو
پست ہمت روتے رہتے ہیں سدا تقدیر کو
صاحبِ ہمت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو
غیر ممکن ہے کہ ہوویں صاف صورت نرم دل
سخت رکھتا ہی بایں نور و صفا دل آئینہ
اُس رخِ صاف و لبِ گلگوں کا گر پڑ جائے عکس
ہے یقیں گل طوطیا چاہیں عنادل آئینہ
اب رحم نکر قتل میں زخمی جو کیا ہے
تکلیف ہی بسمل کو ترحم میں زیادہ

زلف و رخ کا دھیان جب آیا مجھے
رات دن آئے نظر یکجا مجھے
کیوں دکھایا کرتے ہو چاہِ ذقن
چاہتے ہو چاہ میں ڈالا مجھے
مست رہتا ہوں خیالِ چشمِ یار
رات دن ہے ساغرِ صہبا مجھے
اُس پری چہرہ نے سایہ ڈال کر
کر لیا ہے اپنا دیوانہ مجھے
تجکو لاثانی کہا ہے اے پری
دیکھکر آئینہ مت شرما مجھے

نہیں کی تھی، پیرانہ سالی میں ہیں۲ برس ہوئے انتقال کیا، اِنکی زود گوئی اور پُرگوئی قابلِ تعریف تھی - اکثر زمینوں میں چوغزلہ کہتے تھے، تلاشِ مضمون اور الفاظ اچھی تھی - حکام کی تعریف میں قصائد بھی اچھے اچھے کہے ہیں - جن سے اُنکی قابلیت مسلّم ہے، اخلاقی مضامین نظم کرنے کا شوق تھا باایں ہمہ بعض مقامات پر فحش کے قریب پہنچ جاتے ہیں - دیوان کا انتخاب ملاحظہ ہو -

کروں شکوہ میں کیا اُس شوخ کی نامہربانی کا
دمِ رخصت دیا مجکو نہ اک چھلا نشانی کا

یہاں تک اب ہوا ہے زور مجھپر ناتوانی کا
کہ تن کو جان اور جاں کو ہی تن موجب گرانی کا

رُو نما گلزار میں وہ غیرتِ گل ہو گیا
ہر چراغِ گل ہوائے رشک سے گُل ہو گیا

جس سے جیتے جی بنایا تھا مرگھر نے شرف
شکر ہے اُس سے جنازہ کا تجمل ہو گیا

دیکھنا راضی ذرا تاثیر عکسِ گلعذار
تیل میں اُسنے دیکھا روغنِ گُل ہو گیا

رُخِ تاباں سے اُسکے کیا ہی نسبت مہرِ تاباں کو
شعاعِ مہر سے بہتر ہی عالم اُسکی چلمن کا

اثر اچھوں کے دل میں کر نہیں سکتی بُری صحبت
نہیں ہوتا اثر من میں جیسے سانپ کے پھن کا

جدا ہمسے وہ رہسکتا ہی پر ہم رہ نہیں سکتے
ہمارا عشق جاناں سے ہی جیسے جان سے تن کا

کوئی مارا ہوا تیروں کا بچ جائے تو بچ جائے
مگر بچتا نہیں تاکا ہوا اس ترچھی چتوں کا

وہ سجدہ پیشِ بُت کرتا ہے یہ محراب کے آگے
خدا ہر جا ہی قضیہ ہے عبث شیخ و برہمن کا

جستجو نے گر کوئی پیغامبر پیدا کیا
رشکِ دیدارِ صنم نے دل میں ڈر پیدا کیا

کیوں نہ اچھوں کو بُرے گھیرے رہیں اللہ نے
خاروں میں گُل پتھروں میں سیم وزر پیدا کیا

نہ دوا فائدہ کرتی ہے کیکی نہ دُعا
چشمِ بیمار نے کیسا مجھے بیمار کیا

کافور ہے گورا گال اُس کا
فلفل ہے سیاہ خال اُس کا

کب بسترِ گل پہ آتی ہے نیند
گل تکیہ نہ ہو جو گال اُس کا

امتحاں کر خوشی سے خنجر کا
بار ہے دوش پر مرے سر کا

دل بھی دشمن ہوا اُس دشمنِ جاں کی خاطر
ہم جسے سمجھے تھے اپنا وہ بھی اپنا نہ ہوا

راشد

راشد - مرزا بختاور شاہ راشد ابن مرزا خدا بخش گورگانی، سادہ کاری، کارچوبی، سوزنی کا کام اپنے ہاتھ سے خوب بناتے تھے۔ چھالیا کی انگوٹھی۔ چھلّے، ڈبیاں وغیرہ بڑی صنعت سے بنا کر تیار کیا کرتے تھے، موزونی طبع کی بدولت کبھی کبھی مشاعروں کی طرحوں پر طبع آزمائی کر لیتے تھے ۱۹۱۰ء میں قریب ۵۰ برس کے سن میں انتقال کیا۔

وہ حال پوچھتے ہیں تبلائے کون یارب
جو عاشق ہو گیا تیرا کسی کا ہو نہیں سکتا
جسے زندہ کیا عیسیٰ نے وہ قدرت کا مارا تھا
حسیں لاکھوں ہیں دنیا کے ہزاروں ماہوش دیکھے
جو بندہ ہے وہ بندہ ہی جو مولا ہے وہ مولا ہی
بھلا اُس بے وفا کے وعدہ پر اتنا یقیں راشد
کتنے ہی وعدے کیئے لیکن نہ آئے ایکدن
اور اگر سچ ہے سپئے تسکین دل کچھ تو بتا

کم گوئی نے بُھلایا یہاں ربط ہی سخن کا
اگر چہ حورِ جنت ہو پہ شیدا ہو نہیں سکتا
جسے مارا بتوں تم نے وہ زندہ ہو نہیں سکتا
تمھارا سا کسیکا حسنِ زیبا ہو نہیں سکتا
سبھی کچھ ہو گیا بندہ پہ مولا ہو نہیں سکتا
جو پورا کرنا بھی چاہے تو پورا ہو نہیں سکتا
کیونکہ جانوں ہے یہ مستحکم ترا اقرار خوب
تیرے تو اقرار میں بھی ہی بھرا انکار خوب

راصنی

راصنی دیوان جانی بہاری لال جی مرحوم، آپ ذات کے ناگر برہمن اور آگرہ کے قدیم رئیس تھے آگرہ کالج میں تعلیم پائی تھی اور فارسی انگریزی کے علاوہ عربی سے بھی ماہر تھے، پہلے اعظم گڈھ کے مدرسہ میں ماسٹر رہے پھر آٹھ برس بنارس کے مدرسہ میں پڑھاتے رہے وہاں سے ۱۸۶۶ء میں پلٹن نمبر ۶۲ میں میر منشی ہو کر سات برس تک بنگالہ، ڈھاکہ، کلکتہ، الہ آباد، اٹاوہ میں رہے بعد میں ریاست بھرتپور میں وکیل رزیڈنسی راجپوتانہ مقرر ہوئے، پھر مہاراجہ سجن سنگھ بہادر والیٔ میواڑ کے کئی برس اتالیق رہے، اکثر جلیل القدر حکام اُردو فارسی میں انکے شاگرد تھے۔ مرزا غالب مرحوم کے دوست قلبی تھے، آخر عمر میں کچھ دیوان ہو گئے تھے، ان کا دیوان ۱۲۸ صفحوں پہ مطبع دربار کچھ واقع بھاؤ نگر میں ۱۲۷۷ھ میں چھپا تھا۔ علاوہ ازیں گلستان بوستان انوار سہیلی کا اُردو نظم میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ بڑی ذکی، فہیم، ذ تعلیم بزرگوار تھے، شادی

سلامت نہیں رہتی توبہ کسی کی	حسینوں سے صاحب سلامت بُری ہے
جام ٹوٹے ترے سر پر تو بلا سے واعظ	میکدہ سے تری توبہ تو سلامت آئی
کس سے وعدہ ہے مری جان کہاں جاتا ہے	تیرے صدقے ترے قربان کہاں جاتا ہے
کوچۂ زلف سے روکا ہے یہ کہکر دل کو	بیٹھ کمبخت، کہا مان، کہاں جاتا ہے
خم کے خم پی کے بھی ہمنے تو نہ دیکھا زاہد	کس طرح جاتا ہے ایمان کہاں جاتا ہے
تیر سینے میں چبھو کر یہ کہا قاتل نے	رستہ نکلا ہے تری جان نکلنے کے لئے
تُو نے دیکھی ہے اک پری واعظ؟	شیشے میں لال لال ہوتی ہے
نیّتِ شب حرام ہے زاہد	دِن کو پی لے حلال ہوتی ہے
حسرت کے یہ معنی ہیں کہ مر کر بھی نہ نکلے	اُمید اُسے کہتے ہیں جو ہرگز نہ بر آئے
وہ ہاتھ مجھے چاہیئے وحشت تری قرباں	جو ہاتھ گریباں سے چلے تا جگر آئے
الٰہی ہم گنہگاروں کا محشر ہو الگ سب سے	قیامت ہے یہ رُسوائی سرِ بازار کیسی ہے
خنجرِ یار سلامت رہے دم خم تیرا	تو نے میعادِ قضا نامتناہی کردی
مہر کی آنکھ سے اُس چہرہ کی یکتائی پر	حسنِ خط نے خطِ طغرا میں گواہی کردی
ہوں شہیدِ خطِ لب میرے کفن کی رنگت	آسماں نے کبھی خونی کبھی کاہی کردی
غیر بنا بر کبھی پہنچا کبھی قاصد بنکر	میری صورت تری چاہت نے جو چاہی کردی
اِدھر تو آنکھ ملاؤ کہاں گذاری رات	تمہاری نیچی نگہ سے ہے انفعال مجھے
ہمیں کو تم سکھاتے ہو ہمیں کو	ہمیں سے سیکھ کر چالیں ہمیں سے
بشر کو چاہیئے پاسِ دلِ بشر رکھے	کسی کا ہو کے رہے یا کسیکو کر رکھے
بتانِ شعلہ رُو سے گرمِ محفل ہم بھی رکھتے تھے	کبھی تھی جان ہم میں بھی کبھی دل ہم بھی رکھتے تھے
بوسہ مانگا تو بولے وہ [illegible]	شامت آئی ہے موت آئی ہے
قتل کِسکو کر دیا ظالم کہ چہرے پر ترے	چار چلو خون ہے اور دو دو اُنگل نور ہے

عاشق و معشوق میں ایسی ایسی باتیں کیوں [illegible] قیل و قال ہوتی ہے

چولی مسکی ہے گریبان پھٹا پڑتا ہے
دیکھنا ہوتی ہیں غیروں کی نگاہیں رہزن
ٹکڑے ہوجائینگے گر آئیگی میخواروں میں

ہوش تو تم نے سنبھالا نہ سنبھالا جوبن
لٹ نجائے کہیں یہ ناز کا پالا جوبن
کام توبہ کا نہیں ایسے گنہ گاروں میں

راسخ تفتہ جگر بوئے کباب آنے لگی
وہی راسخ تو ہیں کل تک جو تبخانے کے درباں تھے
مبارک بادہ خواروں کو کہ دن ساون کے آتے ہیں

خوش بیاں تجھ سے بہت آتش بیاں گنتی کے ہیں
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے ویں پناہوں میں
ہوا بدلی ہے بادل ریش قاضی بنکے آتے ہیں

میرے مرنے کا وہ ماتم کیا کریں
مرنے والا مر گیا غم کیا کریں

کام پھرنے سے ہی تھیں گھر گھر
شام دیکھو نہ دوپہر دیکھو

ادھر حوروں کا دعویٰ ہو ادھر نیر تقاضا ہو
"خدا چاہے تو آئینگے" عبث کہتے ہو عدوں پر
تمنا ہے پڑے بھرپور سر پر ہاتھ قاتل کا

تماشا ہے شہید ناز پر جنت میں جھگڑا ہو
ہمیں معلوم ہے صاحب خدا چاہے نہ تم چاہو
الٰہی جو مری تقدیر کا لکھا ہے پورا ہو

بحر وحدت نے دیا رتبۂ "قلزم" مجکو
حیرت حسن تجلی نے کیا گم مجھکو
کاش پنہاں رہیں دونوں کی نظر سے دشمن
بیتاب دلکو قول کے چھلّے سے باندھ لو
دنیا نہیں یہ حشر ہے رہجاؤگے الگ
نزع میں جب حال راسخ غیر ہو

مجھ میں گم تمکو کیا تم میں کیا گم مجھکو
صف محشر میں عبث ڈھونڈتے ہو تم مجھکو
میں ہی میں تمکو دکھائی دوں نہیں تم مجھکو
مٹھی میں گر نہ رہسکے پلّے میں باندھ لو
تم پلّہ کھینچکر مرے پلّے سے باندھ لو
یا الٰہی خاتمہ بالخیر ہو

الٰہی ابکے ساون میں اگر برسے نمک تر سے
ہمارے زخم پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں اُن کو

پھیر لو بوسے لب گلفام کے
حشر کے دن سکۂ خون شہید

غیر کے جھوٹے مرے کس کام کے
بیٹھ جائے گا دوپٹہ تھام کے

سیکھ لے ہمسے کچھ آداب تلاوت واعظ
یا صنم لب پہ رہے ہاتھ میں قرآن رہے

پلادے پیاسوں کو اے تیغِ یار دو دو گھونٹ
کہ ہے سبیل لگانی ثواب میں داخل

نہیں ہیں جن کے معاصی شمار کے قابل
وہی ہیں رحمتِ پروردگار کے قابل

واعظ سے سُن چکے ہیں قیامت کی پیاس ہم
بوتل بغل میں لینگے کفن میں گلاس ہم

قاتل نمک چھڑک کے تماشا تو دیکھ لے
کہتے ہیں زخمِ دل کہ نہیں ناسپاس ہم

سبُو سے کام ہے، بوتل سے کام جام سے کام
وہ رند ہم ہیں کہ رکھتے ہیں اپنے کام سے کام

قطعہ

کہتا ہے یہ ہند لاکھ کھا کر قسمیں
گوروں میں ہیں قتلِ بے گنہ کی رسمیں

سنتا ہی نہیں کوئی فغانِ درویش
سچ ہے کہ نہ ہو کوئی کسی کے بس میں

گرہ دِل کی کھُلے یارب صفِ محشر برا تی ہو
وہ بُت پلے سے پلہ باندھ کر نکلے قیامت میں

نظر آتی ہے آئینہ میں اُنکی شانِ یکتائی
رلا دیتے ہیں صورت دیکھنے والے کی صورت میں

راسخ اِس سینے میں اللہ کا دیا ہے سب کچھ
آگ ہر داغ میں ہے داغ ہیں ہر سو دل میں

کروٹیں سینکڑوں لیں سینکڑوں پہلو بدلے
چین سے درد نہ بیٹھا کسی پہلو دل میں

پرتو فگن ہے عارضِ ساقی شراب میں
دو آفتاب ڈوبے ہیں اک آفتاب میں

گذری سیاہ کاری میں یارب تمام عمر
آدھی شباب میں کٹی آدھی خضاب میں

مجھ سے گناہ گار کو دوزخ میں ڈال کر
دوزخ کو ڈال رکھا ہے ناحق عذاب میں

راسخ اُمید عفو یہ کہتی ہے بار بار
دھوئے گئے گناہ ہمارے شراب میں

راسخ کی فاقہ مستی سے اللہ کی پناہ
کھاتا ہے سُوکھے ٹکڑے بھگو کر شراب میں

میرے سینے میں نہیں یار کے خنجر میں نہیں
دم بھی کیا چیز ہے دم بھر میں ہے دم بھر میں نہیں

عشق تجھ سے زلفِ پرخم کیا کریں
چھیڑ کر برہم کو برہم کیا کریں

قیامت کی ہے برپا آئینہ میں عکس کاکل نے
بلائیں لینے جاتے ہیں پریشاں ہوتے جاتے ہیں

تپ غم سے سنبھلنے کا نہیں اے چارہ گر راسخ
سنبھلنا جسکو سمجھا ہے سنبھالے ہیں سنبھالے ہیں

نوجوانی ہے نئے تم ہو نرالا جوبن
بالا بالا نہ اُڑا لے کوئی بالا جوبن

چوڑیاں سبز تیرے ہاتھوں میں　　شاخِ طوبےٰ رہی ہری ہوکر

نکتہ گیری کے سبب نکتہ نوازی کے طفیل　　خُلد سے شیخ ہے دوزخ سے ہے کافر باہر

بھوں چڑھی، غصہ چڑھا، تیور چڑھے　　یہ چڑھائی! عاشقِ دلگیر پر؟
قاتل اوچھے وار پہ ہے منفعل　　زخم منہ آنے لگے شمشیر پر
تم لڑے مجھ سے کہ قسمت لڑ گئی　　مرمٹا میں خوبیٔ تقریر پر

بل کی لینے لگیں زلفیں ترے رخساروں پر　　سانپ کے منہ میں کبھی ہوں کبھی انگاروں پر
چشم و ابرو کے شہیدوں کی ولادت ہے نیاز　　تیر کے ٹکڑوں پہ ٹوٹی ہوئی تلواروں پر
لڑکھڑاتے ہیں قدم زُہد کے اے پیرِ مغان　　توبہ اب ٹوٹ کے گرنے کو ہے میخواروں پر

رندوں پیو پلاؤ کہ آئی ہے صبحِ عید　　توبہ کو پھینکدو سرِ بازار توڑ کر
آ بتکدہ میں زاہدِ مغرور ایک دن　　زنارِ کبر اور بُتِ پندار توڑ کر
دم نہیں، جان نہیں، حال نہیں، تاب نہیں　　درد پہلو سے اُٹھے لیجے سہارا کس کا
تُربتِ حضرتِ راسخ پہ چڑھائے تیور　　تمنے غصہ بھی اُتارا تو اُتارا کس پر
زاہد خیالِ حور ہے مکرِ خدا سے بھی　　ناحق شناس فکرِ مکافات اب تو چھوڑ
مرکے بھی ہیں تیرے بسمل تشنہ کام　　مانگتے ہیں تیغ کا پانی　　ہنوز

پھرتی رہیں گی دِلّی کی گلیاں نگاہ میں　　راسخ بہشت میں بھی رہونگا وطن کے پاس
میرے جنازے پر یہ لبِ گور نے کہا　　مرمر کے پہنچا ہے یہ مسافر وطن کے پاس
دل میں ہزار تیر جگر میں ہزار زخم　　راسخ یہ خار زار ہے میرے چمن کے پاس

میں مسلماں ہوں فرض ہے بوسہ　　مصحفِ لاجواب ہے عارض

نہ اُٹھا آپ سے خنجر اُٹھوں دنیا سے میں کیونکر　　مجھے ناطاقتی تم کو نزاکت ہوگئی مانع
لگائی تھی ستمگر تیغ جھوٹے ہاتھ سے تو نے　　عدو کو خلد سے جھوٹی شہادت ہوگئی مانع
کے شباب میں جتنے گناہ عفو ہوئے　　سُنا ہے میں نے جوانی ہی خواب میں داخل

اپنے جنوں کا آپ ہی کرتے ہیں ہم علاج
تعویذ دھو کے پیتے ہیں مجنوں کی گور کا

کچھ تم بھی بولتے ہو چلا کوڑیوں کے مول
نیلام کر رہا ہوں دلِ نا اُمید کا

اپنے بیگانے ہیں، بیگانے ہیں اپنے راسخ
وہ یگانہ ہوں میں۔ اپنوں کا نہ بیگانوں کا

تیری دشنام کے مزے ہے ہے
مُنہ میں تیری زبان ہے گویا

ٹھوکریں مارتے ہیں نعش پہ وہ
پسِ کشتن بھی جان ہے گویا

خشک و تر کو تری چاہت نے سکھایا کیا کیا
ڈوبنا مچھلیوں نے شمع نے جلنا جانا

مفت بکتا نہیں فردوسِ بریں محشر میں
ہاتھ خالی نئے بازار میں کیسا جانا

حوروں کے واسطے مرتا ہوں میں کیا فرمایا
کچھ نہ سمجھا جو مجھے مردہ دل ایسا جانا

ہم بھی ہیں، تم بھی ہو، محشر بھی ہے، اللہ بھی ہے
بڑے سچے ہو تو کل معرکہ میں آ جانا

رس کس نے لیا تری مسی کا
نیلم کا ہے رنگ پھیکا پھیکا

صدقہ ہے یہ غیر کی خوشی کا
جلتا ہے مری لحد پہ گھی کا

گلشن میں مسی ملی جو تُو نے
دم گُھٹنے لگا کلی کلی کا

ہے چھوٹی سی عمر میں قیامت
فتنہ ہے وہ چودھویں صدی کا

پرچھائیں سے ڈر کے کہتے ہیں وہ
سایہ نہ ہو یہ کسی پری کا

پہلو میں ہے گا تیر قاتل
یہ یار ملا ہے دل لگی کا

راسخ کی خبر وہ سن کے بولے
حوروں میں تھا دھیان جنتی کا

ترے جھوٹے وعدوں سے ہوں نیم بسمل۔ تڑپنے کو ہے جاں پھڑکنے کو ہے دل
مگر تجھکو شاباش بے رحم قاتل۔ نہ کچھ اس سے مطلب نہ کچھ اُس سے مطلب

کوچۂ زلف میں پھر دل ہے ڈھٹی دینے کو
بوسے لے دیکھے بلا کو کہیں ٹالو جھٹ پٹ

تو فندقیں لگائے ہیں دس ٹکڑے دل کروں
ایک ایک کو اُتاروں تری پور پور پر

آنسو ذرا تھمے تھے کہ آنکھیں اُبل پڑیں
ڈُوبیں گی کشتیاں لبِ دریائے شور پر

یہی جنوں ہے تو دیکھ لینا رہیں گے مر کر بھی دشت پیما
نکال پھینکے گی قبر ہمکو ہماری وحشت سے تنگ ہو کر

مصرع تاریخ وفات "ہائے راسخ فرد کامل کم ہوا" کہہ کر ادا کیا، بعارضۂ بواسیر ۲۹ ستمبر ۱۹۰۷ء کو بعمر ۵۵ سال انتقال فرمایا۔ تین بیٹیاں صغرسن اپنی یادگار چھوڑیں۔

کہہ دو بسمل سے کہ اک ہاتھ جگر پر رکھے
اور اک ہاتھ سے تھامے رہے دامن اُن کا

قاتل وہاں زخم سے آتی ہے یہ صدا
بیرحم ایک ہاتھ میں قصہ تمام تھا

کیا چھپاتے ہو ڈھل گیا جوبن
وہ جو چوری کا مال تھا نہ رہا

دلِ عاشق میں داغ ہے کِسکا
کعبہ میں یہ چراغ ہے کِسکا

ملا کے لائے تھے زمزم میں مُغبچے لیکن
جناب شیخ کی قسمت ہی میں ثواب نہ تھا

جینا ہے خضر بتوں پہ مرنا
مرنے میں ہے لطف زندگانی کا

الٰہی حور ہو حصہ کسی سید سے مسلماں کا
ہمیں وہ چاہیئے معشوق جو بانکے سے ہو بانکا

کسی میکش کو دیجئے تختہ انگور کی خدمت
جنابِ شیخ ٹھیکہ لیجئے ہیں باغِ رضواں کا

لہُو بھی چار چُلو بڑھ گیا مشقِ ستم ہو کر
ترے چہرے پہ قاتل رنگ ہی خونِ شہیداں کا

ملا لو قیس سے فرہاد سے مری تصویر
یہ حال کس کا ہوا ہے یہ حال کسکا تھا

مرنیوالو نکا الٰہی کہیں پردہ ڈھک جائے
دھجیاں ہو کے پڑے لاش پہ دامن اِنکا

دل سے یادِ دوستاں جاتی نہیں
بار ہا سمجھا چکا ہوں بار ہا

فکر نقا ہوتی ہے کیونکر مفت کی یار طلال
قاضی صاحب کے سبب یہ مسئلہ حل ہو گیا

رکھدیا گلشن میں بلبل کا قفس
مرحبا صیاد کیا کہنا ترا

کچھ دکھاتا ہے کچھ چھپاتا ہے
شعبدہ ہے یہ اُنکے آنچل کا

سرِ حشر چھپتے پھرو گے کہاں
دلِ زار مُنتہ مچل جائے گا

قیامت ڈھائی مجھپر حشر توڑا اُس ستمگر نے
عدو کو قبر پر لایا ستم ٹوٹا غضب آیا

ہمنے جان و دل کے حصے کر دیئے
وہ خدا کی۔ یہ تمھارے نام کا

پی بھی لے ناصح ناداں مری خاطر سے
یُوں سمجھ جسنے پلائی وہ گنہگار رہا

بہت سے نمونے اِن پرچوں میں موجود ہیں، کملائے دلی سے مختلف علوم و فنون میں سبق لیکر ایسی استعداد پیدا کر لی کہ خود ایک زبردست اور جیّد عالم سمجھے جانے لگے، وعظ بالخصوص بہت اچھا کہتے تھے۔ فقہ، معقول، منقول، اور کتب حدیث پر کامل عبور تھا، مثنوی مولانا روم کی جو شرح مرحوم نے لکھی وہ صوفیائے کرام میں بڑی وقعت اور عظمت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور درحقیقت انکی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ یہی ہے۔ اوائل مشق سخن میں مرزا آرشد، سیف الحق ادیب، پنڈت جواہر ناتھ ساقی وغیرہم کے ہم مشق اور ہم صحبت رہے، اور اپنی میانہ روی خوش مذاقی۔ اور صلح کل پولیسی سے علمی صحبتوں میں امتیازی نظر سے دیکھے گئے، میدانِ مناظرہ میں کئی بار مولانا شوکت میرٹھی وغیرہ سے مباحثہ ہوا، مرحوم کے دو دیوان تھے جس میں سے دوسرا ہنوز غیر مطبوعہ انکی بیوی کے پاس موجود ہے، دیوان اول مرآۃ الخیال جو ۱۳۱۳ھ میں چھپا شوخی زبان، مضمون، بلندی فکر، جدتِ خیال، تازگی مضمون کا ایک قابلِ قدر آئینہ ہے۔

۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۷ء تک کامل ۴۲ برس دہلی میں اُستاد مانے جاتے رہے، ساٹھ ستر تلامذہ بھی تھے جس میں بابو وناٹک پرشاد طالب بنارسی مقیم بمبئی۔ چندی پرشاد شیدا، پیارے لال رونق دہلوی بڑے باعقیدت تلامذہ اور قابلِ ذکر ہیں۔ دہلی کے مشاعروں کے رکن سمجھے جاتے تھے۔ حضرت داغ مرحوم نے انکے اکثر اشعار کی داد دی اور متعدد موقعوں پر دہلی کے نوآموز شعرا کو تحریک کی کہ راسخ کی دہلی میں موجودگی میں غزل انہیں کو دکھاؤ۔ دہلی سے باہر شاعری کی شہرت کی ابتدا "رسالہ زبان" جاری کرنے کے بعد ہوئی اور تلامذہ کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ دوسرے دیوان پر مولانا کو خاص طور پر ناز تھا کیونکہ یہ اُنکے پختہ غور و فکر اور قادر الکلامی کا نتیجہ تھا۔ اُس کی غزلوں کے اکثر اشعار نہایت پھڑکتے ہوئے تھے، اسقدر شہرت اور ناموری حاصل کر لینے کے بعد یہ حیرت انگیز بات ہے کہ مولانا نے وفات سے چار سال پیشتر عاشقانہ شاعری سے توبہ کر کے درس و تدریس اور وعظ کو اپنا مشغلہ بنا لیا مگر تلامذہ کی اِصلاح کا سلسلہ بدستور جاری تھا توبہ کے بعد سے تادمِ مرگ مولانا نے عشقیہ شعر نہیں کہا۔ آغا شاعر نے حقِ ہم وطنی و دوستی

رودِ دلِ وحشی کو ہے خارِ غمِ ہجراں سے آسایش
علاجِ خونِ فاسد رنگ آخر نوکِ نشتر ہے

عبورِ بحرِ آفت خیز ہستی ہے بخترّ و ہیں
شبکدوشی تعلق سے مری کشتی کا لنگر ہے

بے دیدۂ گریاں ہو کہاں دل کی صفائی
روشن نفساں رہتے ہیں ہر وقت وضو سے

راسخ ۔ میاں عنایت محمد خاں راسخ، خلف عادل شاہ خاں باشندۂ رامپور ۱۲۸۹ھ میں نواب غوث محمد خان رئیس بھوپال کی نواسی نصیر بیگم سے عقد ہو جانے کے باعث بھوپال میں سکونت اختیار کی ۔ فنِ سخن میں شیخ احمد علی رسا سے تلمذ تھا، چند غزلیں منیر شکوہ آبادی کو بھی دکھائی تھیں، انکی تالیف سے ایک رسالہ واجب العمل مطبع نظامی میں چھپ چکا ہے ۔ شاہجہاں بیگم صاحبہ بھوپال کی قدردانی سے بزمرۂ اخوان الریاست وظیفہ خوار ہیں ۱۳۰۷ھ میں سینتیس برس کی عمر تھی، یہ کلام کا رنگ ہے ۔

سرِ تسلیم خم ہر کافر و دیندار رکھتا ہے
بڑھا طاقِ حرم سے رتبہ کیا محرابِ ابرو کا

حرم کی پردہ پلکیں ہیں شریف کعبہ مردم ہیں
دکھایا آنکھ نے اُس بُت کی رتبہ طاقِ ابرو کا

راسخ ۔ منشی سعادت علی خان دہلوی تربیت یافتہ حکیم مومن خان ۔ نیک طینت، خلیق اور طباع نوجوان تھے اور غدر سے پہلے زندہ و سلامت تھے ۔ یہ دو شعر انکے طبعزاد ہیں ۔

ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر
سُرمہ ہُوں، یا غبار ہوں، کیا ہوں

ہیں بنائے جہاں سہی لیکن
جبکہ ناپائدار ہوں کیا ہوں

راسخ ۔ شاعرِ باکمال سخنور عدیم المثال مولٰنا عبد الرحمن راسخ دہلوی الملقب بہ خلّاق المعانی خلف مولوی محمد حسین صاحب فقیر بانی مدرسۂ حسینیہ دہلی ۔ فقیر استاد ذوق کے شاگرد اور صاحبِ دیوان نعتیہ تھے جو چھپ گیا ہے ۔ حضرت راسخ قصبۂ نبت نواح پانی پت کے رہنے والے تھے مگر جناب راسخ کی عمر کا بڑا حصہ دہلی ہی میں گذرا اور یہیں تعلیم و تربیت پاکر بڑے ہوئے اوائلِ عمر سے مطالعہ اور کتاب بینی کا شوق بیحد تھا ۔ ابتدائے شباب میں "افضل الاخبار، بمثیال پنچ دہلی پنچ ۔ چلتا پرزہ، و خیر خواہ عالم" کے برسوں ایڈیٹر رہے ۔ انکی ظرافت پسند طبیعت کے

راسخ۔ نواب ظفریاب خان راسخ مقیم لکھنؤ خلف مُلّا میاں حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں والی کھیٹر کی اولاد میں اور صاحبِ دیوان تھے ۱۲۷۵ھ میں انتقال کیا، نواب منصور خان مہر سے تلمذ رکھتے تھے، فنِ شعر سے عشق تھا، شبانہ روز یہی مشغلہ رہتا تھا، خواجہ آتش اور شیخ ناسخ کے ہمعصر تھے اور اپنی کثرتِ مشق کے باعث عزو وقار کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ طرزِ سخن میں ناسخ کے مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی تلاش سے کچھ کلام ہاتھ آیا اُس کا انتخاب حاضر کیا جاتا ہے۔ راسخ

منزلِ مقصود کا پایا سراغ
خضر میرے پاؤں کا چکر ہوا

گو مگو اُس شوخ کا اقرار ہے بھی اور نہیں
میرے ملنے سے اُسے انکار ہے بھی اور نہیں

لاغری سے ضعف ایسا ہے کہ شکلِ عکسِ خس
بسترِ غم پر ترا بیمار ہے بھی اور نہیں

چین بے دیکھے نہیں اور دید سے جاتی ہے جان
وہ تجلّی قابلِ دیدار ہے بھی اور نہیں

خامشی سے دل جلے کہنے سے جلتی ہے زبان
حال اپنا قابلِ اظہار ہے بھی اور نہیں

گہہ اُٹھا لیتا ہے گہہ سینہ پہ رکھتا ہے وہ ہاتھ
سانس لینا اب ہمیں دشوار ہے بھی اور نہیں

اُس آبِ حیات سے جُدا ہوں
مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

دکھایا صانعِ قدرت نے اب تیرے کفِ پا کو
سُنا کرتے تھے ہم اعجازِ روشن دستِ بیضا کو

دلِ بے آرزو کون و مکاں کا ہے تماشائی
رکھا خالی ازل سے ہم نے آغوشِ تمنّا کو

تیور چڑھا کے رہ گئے تم کیوں اُٹھا کے ہاتھ
چھوٹا ہے نیچہ تو لگاؤ بڑھا کے ہاتھ

دریائے حسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا
انگڑائی اُس نے نشہ میں لی جو اُٹھا کے ہاتھ

مفتونِ صنم یہ دلِ دیوانہ ہوا ہے
یہاں کعبہ نثارِ درِ میخانہ ہوا ہے

دیکھنے نکلا جو وہ خورشید منظر چاندنی
دھوپ سے بھی ہے چمک میں آج بہتر چاندنی

اب اندھیرے اور اُجالے پھرتے ہیں وہ دربدر
دھوپ دکھلاتا پدر جن کو، نہ مادر چاندنی

خیالِ زلفِ پیچاں شامِ غربت کی سیاہی ہے
تصور روئے تاباں کا خیالِ صبح گاہی ہے

وقت چلنے کے علاقوں کی خلش تا نہ رہے
اسلیئے جی کو ہر اک شے سے اُٹھایا ہمنے

خواہشیں جمع تھیں دل میں سو کیا اُنکو وداع
کوچ سے آگے ہی سامان لُٹایا ہمنے

مثنوی

اے عشق امام ہے تو میرا
دیں ہے اسلام ہے تو میرا

تُو جاں ہے جسمِ ناتواں میں
ہوئے جو نہ تو تو پھر کہاں میں

ہے اک کفنی سوز عفرانی
اشکوں کا ہے رنگ ارغوانی

کپڑوں کے نہ بند میں رہا میں
اس قید سے ہوگیا رہا میں

پوشش سے تو میں نے ہاتھ اُٹھایا
عریانی کو پیرہن بنایا

جب سے ہوئی تجھ سے آشنائی
بیگانگی بسکہ مجھکو بھائی

ہے طرفہ مزا تیری جفا کا
جی جانتا ہے مری وفا کا

تُو حاکمِ کشورِ وفا ہے
محمُود شہاں ترا گدا ہے

تھے وے جو بہت لطیف و رعنا
چھنوائی اُنھیں سے خاکِ صحرا

آتش دی دلوں کو آہ تو نے
گھر لاکھوں کیئے سیاہ تو نے

شعلے سینوں سے گہہ اُٹھائے
گاہے جگر آب کر بہائے

شاہوں کی تباہی تو نے چاہی
کشکول بنائے تاجِ شاہی

وارفتہ کفر تجھ سے دیندار
تسبیحیں بنائیں تو نے زنار

سجادوں سے خلوتی اُٹھائے
صحرا میں برہنہ پا پھرائے

درہم ہوا دہر تیرے ہاتھوں
برہم ہوئے شہر تیرے ہاتھوں

پانی میں بھی آگ تو لگا دے
گرمی تری وحشت کو جلادے

تو عقل کے ہوش کھو سکے ہے
جو چاہے سو تجھسے ہو سکے ہے

تجھ سے ہوا دستِ کفر بالا
تو چاہے اگر تو دختِ ترسا

دیں چھین لے سارے زاہدوں کا
عمامہ اُتارے زاہدوں کا

تمہاری التفاتِ خاص ہی وجہ جنوں تھی یاں — تماشا ہم نہ بنتے گر تماشائی نہوتے تم
نہ پہنچے حیف دل تک ای مقیمانِ درِ کعبہ — جو یاں آتے تو واں محوِ جبیں سائی نہوتے تم
جہاں ہے قحبۂ رعنا تمہیں گر ہوتی بینائی — تو اے اہلِ جہاں اسکے تمنائی نہوتے تم

جز داغ ہے کیا دلِ حزیں میں — لالہ ہی اُگے ہے اِس زمیں میں
گالی میں بھی اُنکی جو مزا ہے — کب ہے وہ حلاوت انگبیں میں

اب اور لگا ہوئے ایجاد گلستاں میں — راتوں کو لگا رہنے صیّاد گلستاں میں

کافی ہے لے ابر ہائے دیدہ میری چشمِ تر — دامن آگے تم سمندر کے نہ پھیلایا کرو
آغوش کے بھی جا لگیں ہماری کہیں نصیب — کیا ہو کبھو جو لگ کے گلے سو رہا کرو
ملتا ہوں اُنکے حسرتِ پابوس میں جو ہاتھ — کہتے ہیں بیٹھے ہاتھ تم اپنے ملا کرو
راسخ علاقہ دل کا ہو دلبروں کے ساتھ — تم اہلِ دل ہو حق میں مرے یہ دعا کرو
گردوں نے طرفہ قلبِ درد آشنا دیا ہے — یعنی ہمیں یہ شیشہ ٹوٹا ہوا دیا ہے
کتنی گراں بہا ہے پاؤں کی اُنکے ٹھوکر — قیمت میں اُسکی سر کو ہمنے جھکا دیا ہے
کبتک غبار ہمسے جی میں رکھوگے صاحب — ان نے تو خاک ہی میں ہمکو مِلا دیا ہے
سنتے تھے ہوش افزا جلوہ کو ہم تمہارے — سو ہمکو تو دوانا ان نے بنا دیا ہے

آہ عالم کی ہم اس وضع سے حیران ہوئے — دشت یاں شہر ہوئے شہر بیابان ہوئے
کیوں نہ وے مدعیٔ معرفتِ حق ہووے — جو شناسندۂ ماہیتِ انسان ہوئے
دم میں آزاد کیا قید سے ہستی کی ہمیں — تیغِ قاتل کے تو ہم بندہ احسان ہوئے
عبث اُس سے بیٹھے ہو دل لگا چلو راسخ اب کہیں یاں سے تم — روش اُن عزیزوں کی خوب تھی جو دل اس چمن سے اُٹھا گئے
ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے — پلک پر اپنی آنسو صبحِ پیری کا ستارا ہے

قطعہ

شرف میکدہ بیاں کیا ہو — یہاں کے رند افضلِ زمانہ ہوئے
غم شریفِ حرم کو یہ ہے کہ حیف — نہ گدائے شرابخانہ ہوئے

قطعه

دیکھتے سر پہ کمینے کے اگر زر کا تاج / کفش پا سے بھی ٹھہرتا تھا نظر میں کمتر
خاک آلودہ نظر اہلِ ہنر گر آتا / اسکو دیتے تھے بتوقیر جگہ آنکھوں پر
کیا زمانہ تھا کہ تھی اہلِ لیاقت کی قدر / سنگ گوہر سے نہو سکتا تھا ہرگز ہمسر
وضعداروں سے سبک وضع دبے رہتے تھے / دخل کیا سفلہ چلے محترموں سے بڑھکر
وہ نسق ہی نہیں بالعکس ہے اس کا اب تو / بے ہنر خوش ہیں خراب اور ذلیل اہلِ ہنر
ننگ ہیں وے جو حقیقت میں صفِ پائیں کے / بزم میں صدر نشیں ہوتے ہیں جاکر اکثر
قابلِ صدر نشینی ہیں مجالس میں جو لوگ / سخت مشکل سے ہے تا صفِ نعال انکا گذر
چغد اور بوم نے پایا ہے ہما کا رتبہ / زاغ کے آگے ہے طوطی یوں ہیں اک مشتِ پر
اس زمانے کے بھی کیا مرتبہ داں ہیں امیر / فہم کا انکی بھلا وصف نہ کیجے کیونکر
قلتباں کے تئیں دیں بخش کہ تا نامی ہوں / ہے سلیمان کی انگشت کا گر ام انگشتر
کوئی محتاج جو سائل ہو تو ہوں چیں بجبیں / دیکے دشنام کہیں اسکو نکالو باہر
بوعلی سامنے گر آکے سلام انکو کرے / سرسری سے ہوں اسے دیکھ کے کچھ دست بسر
آوے ملنے کو اگر کوئی سفاہت پیشہ / تا درِ خانہ اسے لانیکو جاویں اُٹھ کر
سنکے ان باتوں کو مجھ سے لگا کہنے وہ دوست / جو کہا تو نے نہیں فرق ہے اس میں یکسر
چشم قربان کی مانند ہوں حیران ہمہ تن / دل ہوں مفلس کا پریشاں ہوں میں سر تا سر
ربط کچھ بالش و بستر بھی باقی نہیں اب / سوؤں ہوں اوڑھ کے مہتاب کی شب کو چادر
آہ صدموں سے غموں کے ہوں زخود رفتہ سدا / محوِ اندوہ ہوں ایسا کہ نہیں اپنی خبر
ہے نشہ طرفہ مرے سر میں کہ ہشیار ہوں میں / ہر سحر اُٹھ کے ہے مے خون جگر کا ساغر
کثرتِ غم سے دل از بسکہ ہے ویران خراب / کیا کہوں گذرا ہے اس راہ سے گویا لشکر
داغ پر داغ ہیں سینہ میں ستاروں کی طرح / آسماں غم کا غرض ٹوٹ پڑا ہے مجھپر

غموما کاش محو جلوہ فرمائی نہوتے تم / جگہ دل میں مرے کرتے جو ہر جائی نہوتے تم

وے رہے ہم شراب غیر کے ساتھ		راسخ اپنا جگر کباب رہا
راسخ کو ہے میر سے تلمذ		یہ فیض ہے اُنکی تربیت کا
دشمنی ور پردہ کی ای وائے تمنے کیا کیا		آپ تو پردے میں بیٹھے اور ہمیں رسوا کیا
کب میرا خریدار ہو موجد وہ جفا کا		بندہ تو ہوں ہی عیب وے مجھ میں وفا کا
سونپا ہوا داغ اُنکا تازہ ہی سدا رکھا		ہمنے اِس امانت کو چھاتی سے لگا رکھا
ملیں حضرتِ راسخ ہمسے اگر تو یہ پوچھینگے اُنکی جناب میں ہم		کہو قبلہ و کعبہ وہ کیسا تھا گل بغیض کا نٹا سا جسکی ہوا نے کیا
علائق سے آزادگی تھی میسر	قطعه	جنوں جن دنوں اپنا زنجیر پا تھا
نہ تھی فکر پوشش کی دیوانگی میں		اِس اندیشہ کو میں نے تہ کر رکھا تھا
نہ بالیں کی خواہش نہ بستر کی حسرت		نہ پروا کُلہ کی نہ فکرِ قبا تھا
فقط گرد کی تہ تھی پیراہن تن		نہ کچھ پاس اپنے کچھ اسکے سوا تھا
کیا ہائے کیا تو نے ای ہوشیاری		لباس اپنے تن پر وہی خوشنما تھا
حیا کے پردے میں مارا ہے ایک عالم کو		شہید میں تو ہوں اُن شرگیں نگاہوں کا
گذرے جو وہ خیال میں تو نازکی سے ہائے		یہ رنگ ہو کہ پھول ہو جیسے مَلا ہوا
ہو ضبطِ آب ٹوٹے ہوئے ظرف میں کہاں		دِل چاک ہو گیا ہی جو آنسو رواں ہے اب
راسخ اِس عہد میں متاعِ وفا		کیمیا کی طرح سے ہے نایاب
صورت ہمارے حال کی بگڑی سی دیکھ کر		قاصد نے اُنکے آنیکی ولسے بنائی بات
زندہ ہے نامِ میر راسخ سے		کوئی ہے شاعروں میں ایسا آج
کہاں کا دام فقط ہے تری نظر صیّاد		جو چاہے صید ہوں ہم دیکھ ٹک ادھر صیاد
جفا یار کی گر ہو مخصوص تیری		تو ہرگز نہ شاکی ہو شکرِ جفا کر
فلک تجھ سے خواہانِ شاہی نہیں ہم		ہمیں کوچۂ یار کا تو گدا کر
کب خذف ریزۂ بیقدر کو ہے کہتے تھے لعل	شہر آشوب	پوتھ کو پوتھ سمجھتے تھے گہر کو گوہر

دل سے آگے کیوں بڑھا تو اے طلبگارِ وصال
پھر اُدھر ہی جا وہی گھر جلوہ گاہِ یار تھا

کفر بھی اک شان جلوہ کی اُسی دلبر کی ہے
شیخ کیوں تو برہمن سے برسرِ انکار تھا

کب دیت خواہ اپنا راسخ اپنے قاتل سے ہوا
وہ تو دستِ تیغِ قاتل ہی کا جانبدار تھا

شوق کی باتوں کا کس نامہ میں اظہار نہ تھا
ہمنے کب خط اُنھیں لکھا کہ وہ طومار نہ تھا

دُکھ سہے ہے ترک جو نظارۂ دلدار کیا
آہ پرہیز نے دُونا ہمیں بیمار کیا

برسوں رہا ہے صدمہ کشِ رشک آہ دل
یہ نسخہ ہے کچھ آب زدہ کچھ جلا ہوا

ہوا دیوانہ ہر فرزانہ تیرا
بہت فرزانہ ہے دیوانہ تیرا

دل قیمتی ہوا جو شکست آشنا ہوا
یہ شیشہ ٹوٹنے سے جواہر بہا ہوا

مت پوچھیے مجھ سے حال میرا
حیرت زدہ کیا بیاں کرے گا

جاں جسم پہ اب گراں ہوا اے غم
کتنا مجھے ناتواں کرے گا

آتا ہے نظر کچھ اور رنگ آہ
کیا دیدۂ خونفشاں کرے گا

غافل تو بھی تو رفتنی ہے
کبتک غمِ رفتگاں کرے گا

شاگرد ہیں ہم میر سے اُستاد کے راسخ
اُستادوں کا اُستاد ہے استاد ہمارا

ہے بندگی آزادی میں ایجاد ہمارا
کرتے ہیں ادب مردمِ آزاد ہمارا

دل کی قیمت شکستگی سے بڑھی
قلب تھا کامل العیار ہوا

معمورِ طرب رکھے دل دوست نے دشمن کے
آنکھوں کو محبوں کی آنسو سے بھر رکھا

عقل والوں کے نہ آیا پیچ میں راسخ کبھو
یہ بھی اُسکی ذی شعوری تھی کہ سودائی رہا

پیشتر تم تھے جہاں اب سببِ تسکین ہے
اِس مکاں کے در و دیوار کو دیکھا کرنا

اپنے دیوانوں کا سرخیل بنایا مجکو
ہوا پر اُنھیں منظور تماشا کرنا

متصل دل کو اضطراب رہا
جان پر تجھ بن اک عذاب رہا

بے حجابی کے بعد بھی مجھ سے
اسکو اک طور کا حجاب رہا

وے تھے خواہاں مری خرابی کے
میں اِسی واسطے خراب رہا

کی طرف مراجعت کی، اُس زمانہ میں پٹنہ مرجعِ اربابِ کمال تھا اور شاعری کا تمام امیرزادوں اور رئیس زادوں میں رات دن چرچہ تھا، ایسی پُر لطف صحبت پاکر یہیں کے ہو گئے، اور عمر کا بقیہ حصّہ یہیں گذرا۔ آپ میانہ قد، گندمی رنگ، آزاد طبیعت انسان تھے عظیم آباد پٹنہ کے اکثر مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ سخن دیتے رہے، بزمِ سخن میں دو زانو بیٹھے رہتے تھے اور جب شعراء غزلیں پڑھتے تھے تو یہ آنکھیں بند کئے جھوما کرتے تھے، اپنی غزل پڑھتے وقت آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دو چار ہی شعر پڑھکر رک جاتے تھے۔ بیشتر کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جس سے آپکے صوفی المشرب ہونے کا پتہ چلتا ہے، بعہد پیرانہ سالی ۷۶ برس کی عمر پاکر ۲۲ جمادی الآخر ۱۲۳۸ھ میں واصل بحق ہوئے اور محلہ لودی کٹرہ عظیم آباد میں دفن ہوئے ۱۳۱۱ھ میں انکا کلیات خیر المطابع عظیم آباد سے چھپکر شائع ہوا ہے۔ ۶ و ۷ مثنویاں بھی اِن سے یادگار ہیں، جملہ اصنافِ سخن میں دسترس تھی۔ مثنویوں کی وہی زبان ہے جو میر کی ہے۔ فصاحت و شیریں زبانی، مضمون کی پاکیزگی و سلاست بیان انکی شاعری کا خاص جوہر ہیں اور زبان اور مضمون کی متانت دوش بدوش ہے، حضرت راسخ بڑے آزاد مزاج تھے مرتے دم تک کرایہ کے مکان میں رہے، موسیقی سے کچھ لگاؤ تھا۔ چنانچہ سنا ہے کہ جبتک سُروں سے دل گداز نہو جاتا شعر گوئی کی طرف متوجہ نہوتے تھے، یہ بھی سنا ہے کہ جب مہین کُرتہ پہنے ہوتے تو اِنکے قلب کی تڑپ لوگوں کو محسوس ہوتی۔ مشاعرہ میں غزلخوانی کے وقت شاعر کی تعریف کرنا خلاف دابِ مشاعرہ سمجھتے تھے، البتہ بعد اختتامِ صحبت کلمات تحسین و آفرین ادا کرنے میں دریغ نفرماتے اولیاء اللہ کے مزاروں سے بھی بڑی عقیدت تھی اور اکثر گھنٹوں ایسے مقامات پر اپنا کلام پڑھا کرتے تھے، کلام کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے۔

رُخِ زیبا دیا گل کو، دلِ بے صبر بلبل کو
نہالِ حُسن کو کس کس روش بخشی ہے زیبایش

اسے خنداں کیا پیدا اُسے نالاں کیا پیدا
چمن میں عشقبازی کے گلِ حرماں کیا پیدا

مدّعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا
دید کو اپنی یہ آئینہ اُسے درکار تھا

میر صاحب مغفور کی عقیدتمندی کا دم بھرتے رہے جسکا نیازمندانہ اعتراف انکی غزلیات کے متعدد مقطعوں سے ہوتا ہے، میر صاحب موصوف کی خدمت میں پہلی مرتبہ شرف باریابی حاصل کرنے کا حال بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مشہور ہے کہ جب شیخ صاحب دلّی میں وارد ہوئے اور میر صاحب کے اشتیاق ملاقات میں اُنکے درِ دولت تک پہنچے تو باریابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ کیونکہ میر صاحب جس طرح سخنوری میں بیعدیل تھے اسی طرح نازک دماغی اور تنک مزاجی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے پھر شیخ صاحب جیسے گمنام مسافر کی رسائی انکے حضور تک کیونکر ممکن تھی، آخر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو شیخ صاحب نے یہ شعر بہ تقریب حصولِ ملاقات ایک ماما کے ہاتھ لکھکر ارسالِ خدمت کیا۔

خاک ہوں پر توتیا ہوں چشم مہر و ماہ کا	آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا

میر صاحب ہزار مغرور اور مستغنی المزاج آدمی تھے مگر کمال اور اہلِ کمال کے قدر دان تھے۔ بیتابانہ باہر نکل آئے، ڈیوڑھی میں بوریہ کا فرش بچھایا گیا اور دونوں باکمال ایک جا ہوئے۔ راسخ مرحوم نے اپنا دیوان بنظر اصلاح پیش کیا۔ میر صاحب نے جابجا سے دیکھکر فرمایا "وہ بھی تم سمجھے بوجھے آدمی ہو تمھیں اصلاح کی کیا ضرورت"، شیخ صاحب نے اصرار کیا کہ کچھ تو دستِ مبارک سے بناکر عزت افزائی فرمایئے۔ صاحب "نوائے وطن" لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے دستِ خاص سے اس شعر کو ؎ مرتے دم اُن کا ذکر جب آیا زبان پر ٭ نیند آگئی ہیں تب اسی داستان پر ٭ یوں اصلاح فرمائی ؛

تا خوابِ مرگ ذکر تھا اُن کا زبان پر	نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پر

اور اپنا دیوان عنایت کرکے کہا کہ "یہی تمھاری اصلاح کیا کرے گا"

حضرت راسخ ۱۱۶۲؁ھ میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ایک یہ بھی روایت ہی کہ موضع "سائیں" جو پٹنہ سے دس کوس کے فاصلہ پر ہے آپکا مولد ہے۔ ۱۲۲۱؁ھ تک مختلف مقامات مثلاً کلکتہ غازیپور، لکھنؤ اور دہلی کی سیاحت میں مصروف رہے، آخرکار ۱۲۲۲؁ھ میں اپنے وطنِ مالوف

نہ آئے دیکھنے کو، آیئے جنازے پر وہ دل جلا ہوں چھری پھیریے جو گردن پر	نیاز مند کی کوئی تو آرزو نکلے کٹیں رگیں تو عوض خوں کے دھواں نکلے
پان کھا کر جو کوئی آتا ہے کس سے پوچھے کوئی حقیقتِ عشق چل بسا اب ترا مریض فراق	خون ہنس ہنس کے وہ رُلاتا ہے دیکھئے جس کو اپنی گاتا ہے اور دم بھر وہ آیا جاتا ہے
نشۂ مے سے نہ تھے ہوش بجا بھول گئے میرا افسانہ اُنھیں اور تو سب یاد رہا میری قسمت! میری تقدیر! مقدر میرا!	رات کی بات بھی کچھ یاد ہے یا بھول گئے حرف مطلب پہ جب آئے تو کہا بھول گئے دل کے دیتے ہی وہ سب عہد وفا بھول گئے

یہ جو فسوں ناک حالت ہے کھینچکر تیغ وہ یہ کہتے ہیں	حضرت عشق کی بدولت ہے کون آمادہ شہادت ہے	دیکھے نالوں سے اُنکی کوچہ ہیں اک ذراسا سوال ہمت ہے	شور ہنگامۂ قیامت ہے اور نہ کچھ عرض ہے نہ حاجت ہے

راز **راز**۔ جناب علی احمد صاحب راز سکندرہ حال باوجود کوشش نملا طبیعت کا رنگ کلام سے ظاہر ہے

آنکھیں تو گئیں ہائے مگر دیدۂ دل ہیں آندھی کی ہوا برق کا دم دیکھ چکے ہیں وہ چور ہے نخوت ہیں کسے چھیڑ رہے ہو اے راز ضعیفی ہے مگر جی کو نہ ہارو	باقی ہے وہی حسرتِ دیدار کسیکی آگے نہ بڑھی عمر سے رفتار کسیکی مانے گا نہ مستِ مے پندار کسیکی دیکھو آئیں چلو گرمی بازار کسیکی

راسخ **راسخ**۔ سخن سنج باکمال شیخ غلام علی صاحب راسخ عظیم آبادی، شاگرد رشید ملک الشعرا میر تقی میر دہلوی، نامور شعرائے سلف میں سے گذرے ہیں، صاحب دیوان تھے اور اپنے وقت کے استادوں میں شمار کیے جاتے تھے، بزرگوں کا وطن شاہجہاں آباد تھا۔ لیکن انکی ولادت پٹنہ عظیم آباد میں ہوئی، ابتدائے مشق میں میر و سودا کے ہمعصر، شاہ گھسیٹا عشق کے شاگرد میرزا محمد علی فدوی اور میرزا اشرف کو غزلیں دکھائیں لیکن خدائے سخن میر تقی میر سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے بعد اس امر کا اعلان پسند نہ کیا اور تا دمِ آخیر

چمن میں اے جنوں بے ساختہ گل کو ہنسی آئی
کوئی ٹانکا جو ٹوٹا بخیۂ چاکِ گریباں کا

پسِ مُردن چڑھائے بیکسی نے پھول حسرت کے
بندھا تربت پہ سہرا تارِ اشکِ شمعِ گریاں کا

دل وجاں کوچۂ کاکل میں ہم اے راز کھو بیٹھے
لُٹا تاریک شب میں قافلہ اُمید وارماں کا

خیر ہے یہ آپ کیوں گھبرا گئے ہنگامِ حشر
ہاتھ میں مجنوں کے لیلیٰ کا گریباں دیکھکر

کیا کریں کیونکر بچیں میناو مے سے ناصحو
ٹوٹ ہی جاتی ہے توبہ بزمِ رنداں دیکھکر

کیسے وہ دن تھے یہ اپنی زندگی کی کائنات
صبحِ محشر ہمنے دیکھی شامِ ہجراں دیکھکر

شہر سے گھبرا کے نکلا تھا کہ آفت آگئی
پاؤں پھیلانے لگی وحشت بیاباں دیکھکر

بات کیا ہے کوئی پوچھے تو مسیحا سے ذرا
روئے دیتے ہیں رُخِ بیمارِ ہجراں دیکھکر

غضب ہی جان لے لیتے ہیں یہ بت دلربا ہوکر
الٰہی دی یہ قدرت تو نے بندوں کو خدا ہوکر

یہ کیا آخر ہوا ناکام کیوں شرما کے جاتے ہو
بڑے دعوے سے تم تو آئے تھے تیغ آزما ہوکر

تھی امید لیکن بعدِ مردن روحِ عاشق کو
کیا مسرور بارے رونقِ بزمِ عزا ہوکر

بس اِس اُمید پر عاشق تمہارے مرمٹے آخر
کہ شاید ہو کبھی اپنی رسائی خاکِ پا ہوکر

وہ بت اور اے دلِ پسیجے کسی سے
یہ ہم ہیں کہ پتھر کو پگھلا رہے ہیں

عدم کے جانیوالو اک ذرا دم بھر ٹھہر جاؤ
کہ ہم بھی ساتھ چلنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں

بہت کچھ دلمیں لیکر آئے تھے لیکن کہیں کیونکر
کوئی اپنا نہیں محفل میں سب اغیار بیٹھے ہیں

پُوچھا جو میں نے دلکا پتہ کچھ بتایئے
بولے مجھے خبر نہیں ہوگا یہیں کہیں

اے نیند ایک چشم زدن کو تو آ کبھی
شاید کہ آئے خواب میں وہ نازنیں کہیں

دل سے چلے ہیں اشک بجھانیکے واسطے
سوزِ جگر سے آگ لگی بالیقیں کہیں

چلا جب خاک اُڑانے تیرا سودائی بیاباں کو
پکاری روحِ مجنوں چاک کر وحشی گریباں کو

پسِ مردن وہ کب آئے لحد پر فاتحہ پڑھنے
فلک جب بے نشاں بھی کر چکا گورِ غریباں کو

نہ جنت سے غرض اے راز مطلب ہے نہ دوزخ سے
یہ کس کافر کے پیچھے چھوڑ بیٹھے دین و ایماں کو

بہت دیکھا مگر اے بیوفا تجھسا نہیں دیکھا
حسینوں میں حسیں کوئی جوانوں میں جواں کوئی

یہ سچ ہے راز تم کو اس بت بد خو سے الفت ہے
بھلا بے وجہ کھاتا ہے کسی کی گالیاں کوئی

راز

راز: حکیم محمد باقر صاحب لکھنوی شاگرد جناب رشید لکھنوی - بار بار احباب لکھنو سے اِن کے حالات دریافت کئے اور خود انکو بھی رشید صاحب کی معرفت خط بھیجے مگر کوئی جواب نہ ملا- لاچار صرف کلام منتخب پر اکتفا کیا جاتا ہے، ذکی، طباع اور خوش کلام سخنور معلوم ہوتے ہیں اور استاد کے فیضانِ صحبت کا اثر بھی کلام سے پیدا ہے-

کافی ہے یہ کہ آپ پہ دل مبتلا ہوا
اب کیا بتائیں آپ سے ہم اور کیا ہوا

دلپر جو ہاتھ آپنے رکھا تو کیا ہوا
پہلے سے اور دردِ محبت سوا ہوا

اُٹھ اُٹھ کے خفتگانِ زمیں دیکھنے لگے
کس کے خرام ناز سے محشر بپا ہوا

یارب یہ کیسی آگ بھی دل میں کہ روزِ حشر
نکلا مزار سے مرا لاشہ جلا ہوا

ہے دل کا حال چہرے کی زردی سے آشکار
اے راز دردِ عشق چھپایا تو کیا ہوا

جو چُپ ہوگی زبانِ تیغ محشر میں تو کیا ہوگا
پکاریگا شفق بن کر لہو قاتل کے داماں کا

تغافل کی کوئی حد ہے لحد پر فاتحہ پڑھنے
وہ کب آئے نشاں جب مٹ گیا گورِ غریباں کا

الٰہی خیر ہو کیوں خود بخود دل منہ کو آتا ہے
بندھا ہے ہچکیوں کا تار گھبراتا ہے دم میرا

کہوں ای شمع کس سے قصۂ سوزِ دروں اپنا
نہیں جز بیکسی کوئی انیسِ شامِ غم میرا

یہ بہار خار بنکر تری آنکھ میں کھٹکتی
جو ہماری طرح نرگس تجھے انتظار ہوتا

کشتگانِ نرگسِ مخمور کو ہنگامِ حشر
فرشِ خوابِ مرگ سے اُٹھنا گراں ہو جائیگا

وقتِ پیمان وفا اتنا بھی اُسنے کہدیا
دل سلامت ہے تو اک دن امتحان ہو جائیگا

تیرِ جاناں جبکہ کھٹکا دلمیں مجھسے بولی موت
اب علاجِ شدّتِ دردِ نہاں ہو جائیگا

کہیں سودائیانِ عشق بھی پابند ہوتے ہیں
بچھائے لاکھ کوئی سلسلہ زلفِ پریشاں کا

الٰہی کیوں مرے دلمیں خلش رہ رہ کے ہوتی ہے
ملا ہے خارِ حسرت میں مزہ کیا تیرِ جاناں کا

لہ امیر مینائی کے مشہور مطلع سے مضمون لڑ گیا ہے +

اُن کو آنکھوں میں جو رکھا ہے تو نظریں لوٹ ہیں	ایسے للچائے ہُوں سے بھی نگہبانی ہوئی
بے سبب اُس در پہ اپنی جبہہ فرسائی نہ تھی	مٹ گیا قسمت کا لکھا صاف پیشانی ہوئی
دشت سے جاتا ہوں گھر کو کچھ تو تحفہ چاہیئے	خاک تھوڑی سی گرہ میں باندھ لوں چھانی ہوئی
ہوش میں آیا دلِ بے خود تو وحشت بڑھ گئی	ڈوب کر کشتی مری اُچھلی تو طوفانی ہوئی
دِل جگر دونوں کو غم اُس دوست کا چٹ کر گیا	خانہ ویرانی ہوئی اچھی یہ مہمانی ہوئی
رو رہا ہوں دوستوں کی سرد مہری دیکھکر	جسقدر گاڑھی چھنی تھی اُتنی ہی پانی ہوئی
اللہ اللہ آپ کی زلفِ پریشاں کا اثر	مَیں نے گر سر کی قسم کھائی پریشانی ہوئی
کھنچ گئے دِل سب کے کچھ ایسی کھنچی تصویر یار	صدقے خاموشی ہوئی قربان حیرانی ہوئی
راز نے کیا کہدیا چپکے سے اُنکے کان میں	اُٹھ گئے شرما کے کچھ ایسی پشیمانی ہوئی
جمی جب ون سے آکر خانہ دل میں نہیں نکلی	کسی پردہ نشیں کی یاد بھی پردہ نشیں نکلی

راز **راز** - منشی محمد حسین خاں راز جلال آبادی شاگرد حضرت احسان شاہجہاں پوری باوجود تلاش حال نہ ملا۔ یہ غزلوں کا خلاصہ ہے ۔

ہمیں وہ خانۂ صیاد میں مِلا آرام	خیال دل میں نہ آیا کبھی رہائی کا
تمنّا اُن کی بر آئے الٰہی	بلا سے جان جائے عاشقی میں
فصلِ بہار میں تو اسیروں کو چھوڑ دے	صیّاد تیرے دل میں ترحم ذرا نہیں
کرو تم گرفتار زنجیرِ گیسو	کہ ہم وحشیوں کی سلاسل یہی ہے
دیوانہ ہوا جاتا ہے مجنوں کی طرح دل	یہ چھینی کسی صاحبِ محمل کے لئے ہے

راز **راز** - جناب شیخ عنایت اللہ صاحب سکندر آبادی تلمیذ حضرت خورشید سکندر آبادی - رسالۂ "ید بیضا" میں چند غزلیں نظر سے گذریں اُن کا انتخاب ضبط تحریر میں آیا۔

اذیت پاک باطن کو نہیں ہوتی ہے دشمن سے	کہ داماں نگہ کسدن ہے اُلجھا خارِ مژگاں میں
غضب ہے راز اتنی بات پر تم جان دیتے ہو	کہ بہر فاتحہ وہ آئیں گے گورِ غریباں میں

پڑی پھر دستِ نازک پر مصیبت کنگھی چوٹی کی
وہ بولے کبھا ہی جلکر وصل کی شب جب ذرا چھیڑا
کوئی حسرت نہیں نکلی کوئی ارماں نہیں نکلا
میں اس امِ الفت کے صدقے ہوں میں اس نفرت کے قرباں ہوں

وہ کیا چھپتائے ہیں مہندی چھڑا کر ہاتھ ملتے ہیں
الٰہی ٹوٹ جائیں ہاتھ ظالم کیسے چلتے ہیں
محبت میں حسینوں کی فقط آنسو نکلتے ہیں
جگر ہمراز کی دل میں مگر صورت سے جلتے ہیں

اِنکارِ وصل جان ہی لیکر رہیگا آج
آئینے ہم انکے آپ ہی میں ہم نہیں رہے
اب کیا کروگے آکے وہ جھگڑا ہی مٹ گیا
ہے اپنے بعد بھی وہی رنگ انکی بزم کا
عکسِ رُخِ نگار ہے جامِ شراب میں
جب کہا "جان ہو قربان" تو جلکر بولے
یہ جو منہ پھیرے دمِ نزع الگ بیٹھے ہیں
صدقے ساقی چشم مے آشام کے
راز کو سب دل میں دیتے ہیں جگہ
چاہنے والے کی ہر ایک تمنا ہے بھلی
لاکھ جانیں مری قرباں ہوں اس رونے پر
وہ عجب در ہے کہ مانگے نہیں عزت جاتی
بٹھایا ہے کس کسکو پہلو میں انکے
بُرا ہو ترا گردشِ آسمانی
دمِ واپسیں منتظر ہوں کسیکا

ابکے "نہیں" زباں پر آئی کہ ہم نہیں
جب وہ نہ تھے تو ہم تھے جو وہ ہیں تو ہم نہیں
جو کبھی ڈھونڈتی تھیں تھیں انمیں دم نہیں
جلسے وہی ہیں لوگ وہی ایک ہم نہیں
یا آفتاب ہے قدحِ آفتاب میں۔
"جاں تو ہم ہیں تمھاری ہمیں قربان کرو"
اُسنے کہدی کوئی وہ مشکل مری آساں کرو"
ایک دو گھونٹ اِس چھلکتے جام کے
آپ کیوں دشمن ہیں میرے نام کے
آپ پورا جسے کردیں وہ سوال اچھا ہے
آپ آنسو نہ بہائیں مرا حال اچھا ہے
اپنے اللہ سے ہر ایک سوال اچھا ہے
اُٹھاتا ہے حشر آسمان کیسے کیسے
کہ وہ پھر گئے پھر یہاں آتے آتے
تھمیں اس لئے ہچکیاں آتے آتے

قتل کر کے میرے قاتل کو پشیمانی ہوئی
شغلِ مے نے رنگ و روغن شیخ کا چمکا دیا

نیچی نظریں کہہ رہی ہیں سخت نادانی ہوئی
لوگ سمجھے ذکرِ حق سے شکل نورانی ہوئی

پرانی رسم ہے زاہد نچھوڑنا اسکو
ارے بہشت میں بھی کچھ گناہ کر لینا

عصا بھی چاہیئے بیمار کے سہارے کو
اُٹھے جو آنکھ تو نیچی نگاہ کر لینا

وہ دل میں آتے ہیں اے چشمِ خاک آلودہ
بہا کے اشکِ طرب صاف راہ کر لینا

کسی کا آنکھ چرانا وہ چھپ کے غیروں سے
وہ مجھکو دیکھ کے نیچی نگاہ کر لینا

سلام

عباس کو دریا کی لڑائی تھی تماشہ
پانی میں نظر آتے تھے خنجر تہِ خنجر

بلبل کیطرح مست تھا قاتل بھی مہک سے
حضرت کا گلا تھا کہ گلِ تر تہِ خنجر

ڈوبے جو لہو میں شہِ دیں شمر پکارا
مریخ بنا مہرِ منور تہِ خنجر

حضرت کا گلا موج تھا دریائے کرم کی
فوارۂ رحمت ہُوا آکر تہِ خنجر

اے راز ہے یوں مصرعِ روشن تہِ مصرع
جس طرح چمکتا ہوا خنجر تہِ خنجر

لپٹے تھے ایک روز کسی کی کمر سے ہم
ابتک چھپے ہوئے ہیں خود اپنی نظر سے ہم

دب دب گئے ہیں ضعف میں بارِ نگاہ سے
کٹ کٹ گئے ہیں جنبشِ تیغِ نظر سے ہم

آکر شبِ وصال اجل کیا بنائیگی
چھپ جائینگے لپٹ کے تمہاری کمر سے ہم

حسرت نہ تھے رقیب کے دل کی گرہ نہ تھے
حیراں ہیں کیوں نکالے گئے اُنکے گھر سے ہم

گیسو نہ تھا جو سر پہ چڑھا یار رقیب کو
آنسو نہ تھے جو گر پڑے اُنکی نظر سے ہم

وہ وہ سنائی ہیں کہ بہت ہی کرے گا یاد
اے راز آج خوب ہی دشمن پہ برسے ہم

ستم میں بھی تو پہلو اُنکی زینت کے نکلتے ہیں
ہمارے خوں شدہ دلکو حسیں تلووں سے ملتے ہیں

سہارے سے کسی کے ناتواں رستے میں چلتے ہیں
عصا تھامے مژہ کا آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں

شگافِ سینہ، سوراخِ جگر، چاکِ دلِ عاشق
محبت کی گلی سے سیکڑوں رستے نکلتے ہیں

تمہاری مانگ کے عاشق ہیں شیخ و برہمن دونوں
یہ وہ رستہ ہے جس میں دوست دشمن ملکے چلتے ہیں

یہ کس بدمست کی ہے پیشوائی کون آتا ہے
کہ اُٹھا ابر نکلی شیشے سے مے جام چلتے ہیں

کھٹک آج آنسوؤں کی دے رہی ہے یہ خبر مجھکو
چُھپے تھے دلمیں جو کانٹے وہ آنکھوں سے نکلتے ہیں

ہے۔ کبھی شاذ و نادر شعر کہہ لیتے ہیں، ہاں اپنے تلامذہ کو برابر اصلاح دیتے ہیں۔ آپ مشاعرہ میں کبھی شریک نہیں ہوتے اور اپنے کلام کی شہرت سے بہت بچتے ہیں، آپ نے کلام کے جمع کرنے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی، جس دوست یا شاگرد کے ہاتھ لگا وہ لیگیا، بڑی کوشش سے جسقدر ہاتھ لگا اُس کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے۔

ہوا ازل میں جو تقسیم حسن اعضا کو — تری کمر کے بھی حصہ میں بال بھر آیا
خیال میں بھی جو آئی ہو شکل عاشق کی — جھجک کے کہتے ہیں تُو کون ہو کدھر آیا
خبر بتوں کی جو لایا ہزاروں سجدے کیئے — صنم کدے سے خدا ہو کے نامہ بر آیا
نکل کے شانہ کی گلیوں سے جب چلا گیسو — اُلٹ کے شانے پہ دل میں مرے اُتر آیا
یہ کون حشر میں فریاد کرنے آتا ہے — پکارتی ہے خموشی ارے کدھر آیا
قصور عشق درم قتل بخشوانا ہے — لٹک کے سر مرا قاتل کے پاؤں پر آیا
ہوائے شوق میں دونوں بنے تیز رو لیکن — تمہارے کوچے میں پہلے قدم سے سر آیا
اُٹھے جو بزم سے در پر لگا لیا بستر — کہ راز دل سے نکل کر زبان پر آیا
ضیائے رُخ نے چڑھائی ہو نور کی چادر — مرادیں مانگنے یہ کون قبر پر آیا
ہوئی جو راہِ خودی طے تو یار تک پہنچے — بڑھے جو آپ سے آگے تو اِن کا گھر آیا
باہیں گلے میں ڈالکے منہ چوم ہی لیا — فرمائیے وہ آپ کا اِنکار کیا ہوا

رولا کر مجکو وہ سب بے درد بولا — ہنسی کی بات کا شکوہ نکرنا
وہ منت سے ترا محشر میں کہنا — ترے صدقے مجھے رسوا نکرنا
محبت راز کی تم دل میں رکھنا — کبھی اِس راز کو افشا نہ کرنا
اے عشق قبر حسرتِ مردہ کی یوں بنا — چھوٹا سا آبلہ ہو دلِ بیقرار کا
لڑے جو اُن سے نظر ضبط آہ کر لینا — کلیجہ تھام کے نیچی نگاہ کر لینا
بُرے ہیں ہم تو پھر اچھا بُرے کہاں جائیں — بُرُوں سے بھی ہے مناسب نباہ کر لینا

یہ کس کے کوچے سے پامال ہو کے اُٹھی ہے	کہ چھا رہی ہے مری خاک آسماں ہو کر
اُلجھائے ہوئے چلتے ہیں دل زلفِ سیاہیں	ہم لوگ لگاتے ہیں گرہ موجِ ہوا میں
کھینچے تو بہت زور سے کعبے میں موذن	پر اُسکے نکلتا رہا ناقوس صدا میں
اُٹھ چلنے کو جوبن نے اُنھیں اور اُبھارا	آئی جو جوانی تو بھرے اور ہوا میں
کس پیار سے کس شوق سے سو بار بُلایا	اے راز نہ آیا اثر آغوشِ دعا میں
سب نہ دینا فلکِ پیر مرے دشمن کو	تھوڑی تھوڑی رہے ہر رنج میں شرکت میری
تیغِ نظر سے پھولوں کے ٹکڑے اڑا دیئے	لڑوا گئے چمن میں مجھے عندلیب سے
اظہارِ دردِ دل پہ کہا مسکرا کے یہ	کہدینگے جا کے حال تمھارا طبیب سے
جلوہ کسیکی برقِ تجلی کا اے کلیم	دیکھا ہے تمنے دور سے ہیں نے قریب سے
حضرتِ دل مچلے ہیں جنکے لیے	کچھ تو کریں وہ بھی علاج انکے لیے
شیخ جی! تقوی جوانی میں ہو کیا	ہے تقدس آپکے سن کے لیے
مرغوب کسی بُت کو ہے فریاد کسیکی	محبوب کسی دل کو ہے بیداد کسیکی
تُو بھی کوئی معشوق ہے شوخی و ادا میں	تجھ میں بھی ہے خوبوئے دلِ ناشاد کسیکی

راز — **راز** منشی امتیاز احمد خاں صاحب عرف پیارے خاں رامپوری، ریاستِ رامپور وطن ہے اور وہیں رہتے ہیں۔ آپکا عرف بہت مشہور رہے، آپ پہلے میاں احمد علی صاحب رسا سے تلمذ رکھتے تھے، پھر منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ آپ مدتوں منشی صاحب مرحوم کے رفیق و ہم صحبت رہے اور مشاعروں میں ساتھ شریک ہوئے ہیں آپنے جسقدر اپنے اُستاد سے فیض حاصل کیا ہے چند خاص تلامذہ کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہوا، آپکے کلام کا رنگ امیر مینائی کے کلام سے بہت ملتا ہے اور چستی بندش اور شوکتِ الفاظ بہت ہی ہے ہمیشہ مضمون لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ آجکل ٹھیکہ داری دیہات کا شغل ہے۔ کسی خاص وجہ سے آپنے پانچ چھ سال سے شاعری کی طرف توجہ کم کردی

راز

راز- عالیجناب نواب مرزا عباس علیخان بہادر رازؔ عرف نواب سلطان صاحب خلف نواب محمد رضا خان عرف نواب شمشاد الدولہ بہادر رئیس لکھنؤ شاگرد حضرت جلال لکھنوی- کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں موزوں طبع بیشک ہیں- دس برس ہوئے انتقال کیا-

تجھے بھی کچھ خبر او بے خبر ہے	کہ کیا کیا تیرے چرچے ہیں جہاں ہیں
خدایا خیر ہو دل آج میرا	لیئے جاتا ہے پھر کوئے بتاں ہیں
نظر ملتے ہی پہلو میں نہ تھا دل	غضب کا سحر ہے چشمِ بتاں ہیں
وفا کے نقش بھی دل سے مٹائے دیتے ہیں	مجھے وہ یاد سے اپنی بھلائے دیتے ہیں
میں باز آیا نصیحت سے آپ کی ناصح	مرا تو آپ کلیجہ پکائے دیتے ہیں
خیال اُنکا کروں یا گناہ کو دیکھوں	لبوں سے وہ مرے ساغر ملائے دیتے ہیں
جسکو تلووں سے تو نے مل ڈالا	تھی اُسی دل میں آرزو تیری
یُوں کیا ایک بے گناہ کو قتل	مچ گئی دھوم چارسُو تیری

راز

راز- سید فیاض احمد رازؔ سب انسپکٹر پولیس کھیڑی، منشی طفیل احمد کے بیٹے اور ریاضؔ خیرآبادی کے حقیقی بھائی خیرآباد کے قدیم باشندے اور منشی امیر مینائی کے تلامذہ میں ہیں ۱۸۶۰ء سالِ ولادت ہے، آدمی ذہین اور خوش فکر ہیں- یہ کلام کا انتخاب ہے-

تم جو اُٹھے جگر میں ٹیس اُٹھی	درد بھی اُٹھ کھڑا ہوا دل کا
دلِ عاشق میں ناز سے آؤ	لطف خلوت میں آئے محفل کا
سخت جانی یہ تھی کہ مان گئی	تیغ لوہا تمہارے بسمل کا
کوچۂ دشمن میں دل اے دلربا جاتا رہا	ہاتھ سے میرے تمہارا آشنا جاتا رہا
خونِ دشمن کی ملی مہندی نہ تو نے ہاتھ میں	بعد میرے کیا تجھے شوقِ حنا جاتا رہا
طور پر بیخود ہوئے موسیٰ تو کیا اے برقِ طور	دیکھنے والوں کا اُسکے حوصلہ جاتا رہا
ہے آج شب وصلِ عدو اس کی سحر ہو	راضی ہوں نہ ہو میری شبِ غم کی سحر آج

کوچۂ و بازار میں جن کے سبب رسوا ہوا
پھر اُسی غمازِ تنگ دل پر یہ دل شیدا ہوا

جان و دل دونوں فدا کر دیئے اُسپر ہمنے
اِس طرح کوئی سہے گا نہ جفا میرے بعد

میرے ہی دم تلک آباد رہے گا گلشن
کو بکو خاک اُڑائے گی صبا میرے بعد

راز

راز۔ عالیجناب صاحبزادہ محمد عبید اللہ خاں صاحب بہادر فیروز جنگ، سی، ایس، آئی فیلو پنجاب یونیورسٹی متخلص بہ راز خلف نواب وزیرالدولہ مرحوم والی ٹونک ایس پریسیڈنٹ کونسل و مدار المہام ریاست ٹونک، نواب ابراہیم علیخاں بہادر والی حال ٹونک کے عم بزرگوار تھے جنگِ کابل ۱۸۷۹ء میں جبکہ ان کی صرف تیس ۳۰ برس کی عمر تھی صاحبزادہ موصوف نے سرکارِ انگلشیہ کی نمایاں خدمات کی تھیں۔ جس کے صلہ میں خلعتِ فاخرہ و خطاب دولت انگلشیہ نے عطا کیئے، صاحبزادہ موصوف غالباً فنِ شعر میں منشی سلیمان خان اسد لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ نواب صاحب کی اپنی ذاتی جاگیر اُنیس ۱۹ ہزار سالانہ کی تھی علاوہ ازیں آٹھ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ ریاست سے ملتا تھا۔ سر نیویل چیمبرلین کی سفارت کے ہمراہ ۱۸۷۸ء میں کابل گئے واپسی پر ریاست کی طرف سے افتخار الامرا فخر الملک فیروز جنگ کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔ ستمبر ۱۹۰۰ء میں انتقال فرمایا۔ تا دمِ رحلت وزارت کے عہدے پر فائز رہے پچاس برس سے کچھ کم عمر پائی۔

جو دوست تھے دلی وہ سب اغیار بن گئے
بہکانے والے آپکے سب یار بن گئے

روئے جو ہم تصوّرِ دندانِ یار میں
آنسو کے قطرے موتیوں کے ہار بن گئے

بیٹھے بٹھائے رنج اُٹھائے ستم سہے
دِل دیکے تم کو مفت گنہگار بن گئے

چتون وہاں پھری کہ یہاں دل ہوا دو نیم
ابرو وہ میرے واسطے تلوار بن گئے

مجھسے کس روز ہوئی آپکی چتون سیدھی
کس دن انداز ادھر کج نظری کے نہ رہے

یا کلیم ایک ہی جلوہ نے یہ ہیبت چھائی
دل میں پھر حوصلے باقی ارنی کے نہ رہے

آبِ خنجر نے ترے پیاس بجھائی دمِ نزع
شاکی اُو ترک ہم اب تشنہ لبی کے نہ رہے

اے مسیحا ہو بُرا اِس حسرتِ دیدار کا
دم لبوں پر آگیا آخر ترے بیمار کا

کبتلک اے قاتل نہ نکلے گی تمنا قتل کی
حشر تک دامن نچھوڑوں گا تری تلوار کا

خشک کاماں شہادت کے گلے ہو جائیں تر
پانی اے قاتل جو ملجائے تری تلوار کا

ترے مجروح کو شبِ مہ میں
ذوقِ جامِ شراب نے مارا

ق

چاندنی گو ہے مہلکِ زخمی
پر مجھے آفتاب نے مارا

مُنہ اگر چوم لیا کیجئے عفوِ تقصیر
جُرم ہوتے نہیں دنیا میں بشر سے کیا کیا

طفلِ اشک آنکھ میں میری ہی کبھی دامن میں
ناز کرتا ہے پسر اپنے پدر سے کیا کیا

بیکسی روئی سرِ تربت مجاورِ غم ہوا
دُھوم سے اُسکے شہیدِ ناز کا ماتم ہوا

اُس کا حامی ہو ساقیٔ کوثر
مجھکو دے جو بجائے آب شراب

شرم تھی آنکھ میں پردے سے نکلتے کیونکر
نہ سہی شرم نزاکت سہی چلتے کیونکر

نہ نزاکت سہی مہندی وہ لگائے ہونگے
آکے تلووں سے دلِ زار کو ملتے کیونکر

نہ سہی مہندی کسی غیر سے وعدہ ہوگا
صادق القول ہیں وہ عدے کو بدلتے کیونکر

نہ سہی وعدہ لٹیں شانوں پہ لٹکی ہونگی
بوجھ اُٹھا کر جو وہ چلتے تو سنبھلتے کیونکر

نہ کُھلی لٹ سہی گیسو کو بناتے ہونگے
کنگھی چوٹی کے وہ پیچوں سے نکلتے کیونکر

لو فرضنا کہ نکلتے بھی تو دانائی سے
مونگ چھاتی پہ رقیبوں کی وہ دلتے کیونکر

ساغر و شیشے کو کیوں توڑتا ہے عہد شکن
توڑنا ہے جو تجھے تو دلِ اغیار کو توڑ

بجھائیں تشنگانِ دشتِ اُلفت پیاس مقتل میں
سبیل اک فی سبیل اللہ رکھدی آب خنجر کی

راز **راز**۔ مرزا حاجی راز گورگانی دہلوی۔ مرزا رمضانی کے بیٹے اور مرزا صابر کے شاگرد تھے نظام الدین اولیا کی درگاہ کے قریب رہتے تھے۔ کئی برس ہوئے انتقال کر گئے۔

پھر دل سودائی کو اُس زلف کا سودا ہوا
بیٹھے بٹھلائے یہ کیسا درد سر پیدا ہوا

اب تو میری طرح بے چین وہ رہنے لگے
یہ ہمارے آہ و نالہ کا اثر پیدا ہوا

راحت

راحت - سیّد عابد حسین صاحب بریلوی سنہ ۱۸۷۰ء میں زندہ تھے اِس سے زیادہ کچھ حال معلوم نہوا یہ چند شعر انکے ہیں -

حشر کے دن یہ کہونگا میں خدا سے پہلے
شکل محبوب دکھا اپنی لقا سے پہلے

پہلے مُنہ چوم لوں ہیں گالیاں دینا پیچھے
چاہیئے جرم کا اثبات سزا سے پہلے

عارضِ حور کی تعریف نکر اے واعظ
کر مقابل مرے گل کے کفِ پا سے پہلے

راحت

راحت - محمد نثار علی صاحب رامپوری آجکل کے شعرا میں ہیں، تلمذ کا حال معلوم نہوا کہ کس سے ہے - یہ کلام ہے -

کہتے ہیں جسکو محشر وہ دن بھی آرہا ہے
بیداد کرنے والے کیا تو سُنا رہا ہے

رنج والم مصیبت دردِ فراق، الفت
وہ کیا ہے جو تنے صدمے اُٹھا رہا ہے

مَیں نے ہی اُنکو چاہا دنیا سے کیا نرالا
مجھ پر ہی یہ ستم کیوں ای چرخ ڈھا رہا ہے

ناز و نیاز دونوں ک لطف دے رہے ہیں
وہ تیغ اُٹھا رہا ہے یہ سر جھکا رہا ہے

ویران ہوگئے ہیں ان روزوں دیر و کعبہ
جو ہے وہ انکے در پر چکّر لگا رہا ہے

راحت

راحت - محمد رئیس الدین خان، حضرت فیروز شاہ خاں فیروز رامپوری سے مشورۂ سخن کرتے ہیں سنہ ۱۸۹۸ء میں جوان تھے -

اُدھر سے محتسب جب آج پھر احتساب اُٹھے
تماشا ہوا دھر سے رند بھی پیکر شراب اُٹھے

بھلا دُنیا میں کیا مذکور ہی اب اُسکے اُٹھنے کا
جو اُٹھے بھی ترا مقتول تو روزِ حساب اُٹھے

کوئی تدبیر ایسی ہو کہ وہ خلوت میں کھُل کھیلے
ادھر دل سے حجاب اُٹھے اُدھر رُخ سے نقاب اُٹھے

راحم

راحم - منشی شیخ رحیم بخش راحم تاجر باوقار و رئیس شہر کانپور وطنِ آبائی لکھنؤ ہے، مگر اب مدّت سے کانپور مسکن ہے انکا کارخانہ تجارت اسباب چرمی مشہور دیار و امصار ہے، اوائل عمر سے فن سخن کا ذوق رہا ہے منشی سیّد آغا علی شمس شاگرد ملک الشعرا قاضی محمد صادق خان سے تلمذ اختیار کیا، صاحب دیوان مطبوعہ ہیں شعرا کانپور میں اچّھے ہیں موزونی طبع اور خوش زبانی کلام سے آشکارا ہے، انتخاب دیوان ہدیہ ناظرین ہے -

شمع ساں ہو فدائے بیداری | اشک سوتے میں بھی رہیں جاری
ہو نمک پاش زخم پر ہر دم | پر نہ دکھلائے صورتِ مرہم
سر میں ہر دم جنوں کا جوش رہے | دشمنِ صبر و عقل و ہوش رہے
ہر گھڑی صیدِ چشمِ یار رہے | چنگلِ باز کا شکار رہے
الغرض عشق ہو ترا یارب | اپنا سودائی تو بنا یارب
طاقتِ زورِ عشق دل پر دے | بے پر و بال ہوں مجھے پر دے
جبتلک اپنے تن میں جان رہے | راتدن بس ترا ہی دھیان رہے
دل میں اس لطف سے سما جائے | جس طرف دیکھوں تو نظر آئے
پی کے مے ساغرِ محبت سے | مست ہو جاؤں جامِ وحدت سے
عاشقِ زار اب ترا ہوں میں | ترے کوچے کا بس گدا ہوں میں
رائگاں کر نہ میری محنت کو | ذوق دے اپنے غم سے راحت کو

راحت

راحت۔ دہلی کے ایک نامعلوم ریختی گو تھے، کچھ منتخب کلام درج تذکرہ کیا جاتا ہے۔

جب سے وہ بانکا سجیلا دل کو ہی بھایا ہوا | انگ لگتا ہی نہیں گوئیاں مرا کھایا ہوا
میں اپنی ایڑی چوٹی پہ صدقہ کروں اسے | یہ مردوا نگوڑا تو لٹھ ہے گنوار کا
رو گی تم تو وہ آجائیگا بیٹا پھر ابھی | تم جو چپکی ہو رہی ہو آکے ہتوا پھر گیا

دودھ لینے کا ارادہ تھا جو دوڑا آیا تھا نتھ | نوچ لی انگیا مری دیکھو موئے بندر کی بات
جورو بیٹی ماں بہن کا کچھ نہیں کرتے خیال | گھر میں آکر صاف کہدیتے ہو تم باہر کی بات
گونگی بہری کب تلک لوگو بنی بیٹھی رہوں | نند کی باتیں سنوں ہے ہے کہیں دیور کی بات
پوتی پوتوں والی ہو کر لال جوڑا پہنوں میں | مجکو تو بجی یہ بڈھا چونچلا آتا نہیں

کھلا تو بوتا ، ہوئی پوری آرزو تیری | دوگانا لعل سا بیٹا جنی بہو تیری
لحاظ آیا کسی کا نہ تجکو عصمت جان | غلام سے گئی پکڑی جنم میں تھو تیری

بحرِ الفت میں آشنا ہو کر کشتیٔ درد کا بنے لنگر
مثلِ غواص بیدھڑک ہو کر جی پہ کھیلے وہ اپنے آٹھ پہر
اسقدر عشق میں فنا ہو جائے اپنے خالق کا آشنا ہو جائے

دامنِ دشت میں اڑائے خاک بیکلی سے کرے گریباں چاک
آبلوں سے نقش اپنا جمائے ہر سرِ خار سے پتا لمجائے
غم سے ہر داغ لالہ زار رہے درد و حرماں سے دردوزار رہے

جوش پیدا ہوا اس قدر غم کا گلِ سوسن ہو باغ ماتم کا
زلفِ خوباں ہو پاؤں کی زنجیر حلقۂ طوق ہو گریباں گیر
چشم سے اسقدر ہو خوں فشاں رشکِ گلزار ہو تنِ عریاں

وہ ترقی پہ زورِ سودا ہو جسکے نالے میں شورِ دریا ہو
وہ مزہ کوہ و دشت کا پائے رشکِ فرہاد و قیس بن جائے
عاشقِ رنگ عارضِ گل ہو گلشنِ درد و غم کا بلبل ہو

عشقِ زہرہ جبیں ہو دامن گیر مثلِ ہاروت چاہ میں ہو اسیر
سرو قد پر فدا ہو سو سو بار مثلِ قمری کرے نہ طوق سے عار
اشک برسائے چشم گریاں سے برق چمکائے آہِ سوزاں سے

آتشِ عشق سے جلے ہمہ تن خرمنِ ننگ پر ہو شعلہ فگن
فخر سمجھے سدا ملامت کو کھوئے سرمایۂ ندامت کو
شکل دولاب چرخ سی بنجائے درِ جاناں پہ روز چکر کھائے

ایسا سوزِ دروں سے ہو بیتاب غم سے بنجائے ماہیٔ بے آب
کوئے دلدار کو حرم سمجھے جائے سجدہ درِ صنم سمجھے
اسکے کوچے میں جب گذر ہو جائے صاف مرمر کے خاکِ در ہو جائے

صاحب علم و فضل و نازک خیال و طبیعت دار شخص تھے، آپنے مثنوی "زہرہ و بہرام" اور مثنوی "تُلدمن" لکھی تھیں جواب کمیاب ہیں۔ بعد تلاش ایک مثنوی "سوزِ عاشقانہ" دستیاب ہوئی۔ جس کا انتخاب ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے واجد علیشاہ کے زمانہ سلطنت میں حیات تھے بعد غدر انتقال کیا۔

مظہرِ عشق یا خدا ہو دل
مصدر صدمۂ جفا ہو دل

کوچۂ عشق کا ہو رسوائی
روئے زیبا کا ہو تماشائی

گُل پہ گُل روز سینکڑوں کھائے
بے کلی سے ذرا نہ گھبرائے

لاکھ زخمی ہو خنجرِ غم سے
سیکڑوں کوس بھاگے مرہم سے

سیچے ہر دم لہو سے خاروں کو
خار دیتا رہے ہزاروں کو

گُل پہ گُل کھا کے مایۂ غم ہو
سبزۂ شاخ نخلِ ماتم ہو

زخم اُس کا ہو رفو برسوں
اور ٹپکا کرے لہو برسوں

بس رہے غم کی آرزو برسوں
عیش کی ہو نہ جستجو برسوں

قبلۂ رُخ کے روبرو برسوں
چشمِ تر سے کرے وضو برسوں

بدلے رونے کی پھر نہ خو برسوں
پائے اشکوں سے آبرو برسوں

مثلِ گل روئے زخم خنداں ہو
سوزشِ عشق سے نمک داں ہو

تڑپے اِس طرح خاک پر مضطر
طعن کی جا ہو رقص بسمل پر

روز ٹھنڈا ہو تیر مژگاں سے
ہوئے سیراب آب پیکاں سے

آب شمشیر سے بجھائی پیاس
چاہ سے غرق خوں ہوئے وسواس

بیٹھے بیٹھے خدنگ مژگاں کھائے
تودۂ خاک شوق سے بن جائے

شمع رخسار کا خیال رہے
غم سے پروانۂ جمال رہے

زلفِ خمدار کا خیال رہے
غم سے پروانہ جمال رہے

نہایت ہی سخت اسکو پہنچا گزند
مددِ غیب سے اُسکی فوراً ہوئی
لیا اپنے مالک کو فوراً اسنبھال
سپہدار کا پھر نہ پایا نشاں

جُھکا اپنے گھوڑے پہ وہ ارجمند
یکایک غلام آن پہنچا کوئی
کسی پہ نہ ہرگز کھُلا اس کا حال
نہ آیا نظر کوئی غیز میں جواں

جس باغ میں مہاراجہ سردار سنگھ صاحب بہادر جودھپور کی برات اُتار گئی تھی اُس باغ کی تعریف

مقام اِک جداگانہ ہے شہر سے
تمام اُس کا سبزہ ہے زیر نظر
نئے رنگ کا ہے وہانکا چمن
نمودار ہیں صاف قدرت کے کھیل
گلاب اور گیندے کی رونق ہی خاص
نمودار نرگس کا ہے امتیاز
صحن میں نمایاں ہے حوضِ کلان
لگے اُس میں فوارے ہیں بیشمار
غرض ایسا ہے پُر فضا وہ مقام

سہیلی کی باڑی سے موسوم ہے
کھڑے جھومتے جابجا ہیں شجر
کہیں پر ہے نسریں کہیں نسترن
کہیں ہے چنبلی کہیں رائے بیل
چمن میں ہی حاصل اُنھیں اختصاص
عیاں چشم ہے اُسکی واں نیمباز
وہ ایسا ہے جیسے کہ دریا رواں
نئے طور کے ہیں وہاں آبشار
ہُوا دولھا کا اِس جگہ پر قیام

راحت

راحت سید عابد حسین بریلوی ۱۸۲۰ء میں زندہ تھے اِس سے زیادہ کچھ حال معلوم نہ ہوا، یہ چند شعر اُنکے ہیں۔

حشر کے دن یہ کہونگا میں خدا سے پہلے
پہلے مُنہ چوم لوں ہیں گالیاں دینا پیچھے
عارضِ حور کی تعریف نکرائے واعظ

شکلِ محبُوب دکھا اپنی لقا سے پہلے
چاہیئے جرم کا اثبات سزا سے پہلے
کر مقابل مرے گل کے کفِ پا سے پہلے

راحت

راحت لالہ بھگونت رائے راحت ولد منشی دیندیال رئیس قصبۂ کاکوری نواح لکھنؤ آپ کو حضرت آغا حسن امانت لکھنوی سے تلمذ تھا اور فنِ سخن میں اچھی مہارت حاصل تھی

ہے اس وجہ سے کسی اور صنف شاعری میں طبع آزمائی نہیں کرتے۔ انتخاب کلام حسب ذیل ہے

مہاراج پرتھوی راج اور سلطان شہاب الدین غوری کی پہلی معرکہ آرائی نہر سرستی پر

لگی چلنے باہم چھُری اور کٹار — ہوئے سر تنوں پر ہزاروں نثار
پٹرا زن سے خنجر چلی سن سے تیغ — ہزاروں ہی کشتہ ہوئے بیدریغ
جواں زخم پر زخم کھانے لگے — شجاعت کے جوہر دکھانے لگے
کسی نے رنگے خون میں اپنے ہاتھ — عدم کو گیا کوئی آقا کے ساتھ
زمیں پر تھا کشتوں کا پُشتہ بندھا — ہر اک سمت تھا خون کا دریا بہا
بدلنے لگا جب لڑائی کا طور — کیا اپنے لشکر پہ راجہ نے غور
یکایک بڑھی ہاتھیوں کی وہ صف — جواں نکلے پیچھے سے نیزہ بکف
وہ تھے قوم کے سب کے سب راجپوت — وہ بانکے دلاور بہادر سپوت
گرے فوجِ شہ پر وہ سب ایکبار — ہوئے قلب تیروں سے انکے فگار
کمانوں نے گوشہ لیئے اپنے موڑ — دیا تیروں نے اپنے ترکش کو چھوڑ
جو افغاں تھے فوراً وہ پیچھے ہٹے — اُدھر خلجیوں نے بھی گھونگٹ لئے
لڑائی کا جب یہ ہوا بند و بست — ہوئی فتح سے شاہ کی پھر شکست
شکستہ ہوا میمنہ میسرہ — ہوا قلب کی فوج کا فیصلہ
لڑائی سے تیروں کی عاری ہوئے — نمک خوار سارے فراری ہوئے
تہ مطلق ہوا شاہِ غزنیں ملول — گھرا ایسا تھا جیسے کانٹوں میں پھول
نظر کھانڈے راؤ کی اُس پر پڑی — سپہدار کی آنکھ اُس سے لڑی
سپہدار نے بھی بجرأت تمام — کیا رستمی کا وہاں پر یہ کام
دیا ہاتھی کے منہ پہ نیزہ لگا — حریفوں کو دی اپنی جرأت دکھا
کیا کھانڈے راؤ نے پھر اُسپہ وار — تو شانہ نشانہ بنا ایک بار

اشک آنکھوں سے نکلکر زیرِ مژگاں تھم گیا
دم نہ لے سایہ میں کیونکر تھا مُسافر دور کا

ہم سے وہ بھی چھٹے اور یہ دلِ شیدا چھوٹا
یاد کس کس کو کریں خیر جو چھوٹا چھوٹا

نے گیا رات کو باتوں میں لگا کر اُن کو
کیونکہ قائل نہوں راحت تری تقریر کے ہم

اجل پہلے آوے کہ وہ پہلے آویں
یہی راہ مدت سے ہم دیکھتے ہیں

روئے قاتل سے خجالت کیوں نہو روزِ جزا
ساتھ میرے ایک عالم ہولیا فریاد کو

آنکھیں بھر آئیں مہر سے اُس رشکِ ماہ کی
سینے پہ رکھ کے ہاتھ جو اک میں نے آہ کی

قاتل تو ایک بوسہ مجھے دے کے قتل کر
لازم ہے کچھ تو دینی دیت بے گناہ کی

راحت **راحت** منشی بشیر محمد خاں صاحب دِلّی کے رہنے والے اور حکیم ثناء اللہ خان صاحب کے پڑوتے ہیں سنہ ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے دادا حکیم محمد علیخاں صاحب کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی اور اُنھیں سے فنِ سخن میں اصلاح لینے لگے۔ کچھ دنوں ریاستہائے جودھپور اور بانسواڑہ میں بتقریب ملازمت بسر اوقات کی۔ اب ریاستِ اودیپور میں اہلکار چشم ہیں۔ آپکی طبیعت میں تاریخی واقعات کے نظم کرنے کا شوق خداداد ہے اور اس صنف میں معقول دسترس بہم پہنچائی ہے، کئی مثنویاں آپکی تصنیف کردہ ہیں جن میں ایک موسومہ "شادیانہ سخن" سنہ ۱۹۰۸ء میں مہاراجہ سردار سنگھ بہادر والئے جودھپور کی تقریب کتخدائی پر تصنیف کی تھی۔ ایک اور ضخیم مثنوی بھی آپ نے لکھی ہے جس میں اُنیس ہزار اشعار ہیں اور ابتدائے آفرینش سے خاندانِ لودھی تک کے حکمرانوں کے واقعات نظم ہیں، مثنوی ہذا کا نام "شاہنامہ جدید" ہے اِسکے پانچ حصے ہیں۔ غزنین نامہ، غوری نامہ، خلجی نامہ، تغلق نامہ، لودھی نامہ، آپنے اِس مثنوی میں قدیم راجگان ہند کے طرزِ حکومت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور رزم و بزم کے واقعات اور مسلمان حملہ آوروں سے ہندو راجاؤں کی معرکہ آرائیوں کو بوضاحت قلم بند کیا ہے۔ آجکل سلطنتِ مغلیہ اور زمانہ موجودہ کی تاریخ کہہ رہے ہیں۔ چونکہ آپکی طبیعت کو وقائع نگاری سے مناسبت خاص

انساں چلے وہ چال کہ جو ہو جہاں پسند
مہماں سے ہو وہ کام جو ہو میزباں پسند

دِل بیچنے کھڑے ہیں ترے گھر کی راہ پر
ارزاں ہے مول بے جو اسے اک نگاہ پر

ہے نمودِ سبزۂ خطِ عارضِ جاناں کے پاس
آئے خضر تشنہ لب یا چشمۂ حیواں کے پاس

کس طرح ہم نہوں اُس ابروئے خمدار سے خوش
جو دلاور ہیں سدا رہتے ہیں تلوار سے خوش

آپ ہی آپ کچھ اغیار جلے مرتے ہیں
خود بخود وہ اب جو ہوا آپ کو ہے ہم سے اخلاص

روشنی ہے عاشقوں کے دم سے بلغ دہر میں
بلبلوں کو اے گلو سمجھو گلستاں میں چراغ

پامال آج وہ ہیں جو کل تک نہال تھے
کھلتا نیا ہے روز تری انجمن میں گُل

یاد آئی جو اُسکی جنت میں
بال کھوسے ہیں کسنے چوٹی کے

حور کو دھیان میں نہ لائینگے ہم
کیا پریشان دن گذرتے ہیں

صغرسن میں پہنو پھولوں کے نہ ہار
تم ابھی ایجانِ من خود پھول ہو

یار کے پاس اُڑ کے چلا جائے گا نامہ
ابتو خود سیکھ گیا کار پیمبر نامہ

بے یار کیا بیان ہو تقریر خواب کی
یُوسف سے چلکے پُوچھئے تعبیر خواب کی

راحت ۔مرزا محمود بیگ خلفِ مرزا احمد بیگ سپاہی پیشہ تھے۔آبا و اجداد کا اصلی وطن روم تھا مگر دلّی میں رہتے تھے، غدر سے پیشتر فوجی ملازمت ترک کرکے خانہ نشین اور علائق سے دست بردار ہو گئے تھے، فنِ سخن میں مومن خاں دہلوی سے تلمذ تھا۔ایک مثنوی موسوم بہ دہشت عدل اور ایک واسوخت علاوہ غزلیات کے اِن سے یادگار ہیں، یہ اُنکے پاکیزہ اور صاف شستہ کلام کا انتخاب ہے۔ راحت

کچھ جان سی آتی ہے مریجان میں قاتل
پانی ترے خنجر میں ہے کیا آبِ بقا کا

کھلایا مجھے غم پلایا مجھے خون
ہوا جب میں ناکام مہماں تمھارا

غیروں سے جو اشارے محفل میں ہیں نگار کے
سمجھیں وہ یا نہ سمجھیں پر یہ غلام سمجھا

صبر و قرار تاب و تواں رفتہ رفتہ سب
آجائیں گے کہیں سے دلِ فتنہ گر ملا

توجہ ہوجاتی تھی اور کثرتِ اشغال اور عدیم الفرصتی کے دیکھتے یہ امر کچھ کم باعثِ حیرت نہیں ہے کہ آپکے اشعار اسقدر صاف شستہ فصیح و بلیغ ہیں، کلام بہم رسیدہ کا انتخاب حاضر ہے۔

تیری صورت دیکھکر لیلیٰ کو آئیگا حجاب
میری صورت دیکھ کے مجنوں بہت شرمائیگا

گئے وہ دن کہ حسینوں کو پیار کرتے تھے
نہ ولولے رہے اپنے نہ وہ شباب رہا

خم کھلے، شیشے کھلے ہی میکدہ کا در کھلا
مغبچوں ہم پر نہ مضمونِ خطِ ساغر کھلا

خوابِ مخمل جن گل اندامون کو فرشِ خار تھا
موت نے تربت میں انکو خاک بستر کردیا

گیا صحبت میں جب سے مفسدوں کی
مزاج اصلاح پر آیا نہ اُس کا

اے صبا ہے کسی عارض کا انھیں بھی سودا
باغ میں ہوتے ہیں گل چاک گریباں پیدا

اللہ غنی حُسن پہ کسقدر جو ہے مغرور
وہ اپنا کبھی پاؤں زمیں پر نہیں رکھتا

راجہ بھلا ہے دزدِ حنائی کا کیا قصور
دل اپنا اپنے ہاتھ سے خود ہمنے کھودیا

حُسن سے عشق نہ ہو جسکو وہ انسان کیسا
منکرِ قدرتِ حق صاحبِ ایماں کیسا

عشق میں تیرے ہوا ہے اے صنم
ایک مذہب کافر و دیندار کا

رنج و غم دلکو مرے دیتے ہو یہ تو سمجھو
ہمنے کس ناز و نعم سے اسے پالا ہوگا

ہم جو گھر اُسکے گئے جاتے شبِ تاریک میں
شعلۂ دل آگے آگے مثلِ مشعل ہو گیا

مجھے بھی ہر گھڑی کی بدمزاجی خوش نہیں آتی
کہونگا پھر جو میں کچھ طبعِ نازک پر گراں ہوگا

اپنی نظر بھی اکثر انسان کو لگی ہے
آئینہ میں نہ دیکھو منہ بار بار اپنا

جیسی کہوگے ہمکو ویسی سنوگے ہمسے
کب چُپ رہیگا وہ جو حاضر جواب ہوگا

دیکھ کر لیلیٰ کو یہ خوش ہو کے مجنوں نے کہا
دو گھڑی دم سے ترے جنگل میں منگل ہوگیا

نام مشہور ہوا رشکِ مسیحا راجہ
پڑ انھیں فکرِ علاجِ دلِ بیمار ہی کب

محتسب ٹوٹیں گے ساتھ اُسکے کئی کاسۂ سر
سُن لے رندوں پہ بہت کچھ ہی حقِ جامِ شراب

کیا تلون ہے مزاجِ یار میں
شام کو اقرار تو انکارِ صبح

بھی کر لیا، ۱۸۵۸ء میں جب سرکار نے دوبارہ گونڈا فتح کیا، مہاراجہ فیمروں سے ملے اور چونکہ تلسی پور اور بانسی کے راجہ باغی ہو گئے تھے اُن کا علاقہ بھی بطورِ انعامِ خیر خواہی حاصل کیا اور لکھنؤ کے ۱۸۵۹ء کے دربار میں اول نمبر کی کرسی پائی، سات ہزار کا خلعت اور مہاراجہ بہادر کا خطاب عطا ہوا، اور اختیارات دیوانی وکلکٹری بھی عطا ہوئے، برٹش انڈین ایسوسی ایشن (انجمن تعلقہ دارانِ اودھ لکھنؤ) کے روزِ اجرا سے آخر زمانۂ حیات تک وایس پریسیڈنٹ رہے اور جملہ مہمات ملکی وانتظامی میں حکّامِ وقت کے معتمد علیہ اور ممتاز مشیر سمجھے جاتے تھے خود مختار والیانِ ملک سے بھی اچھے مراسم قائم کیے، ویسرائے کی کونسل کی ممبری کا اعزاز بھی عنایت ہوا، الغرض اودھ کے تعلقہ داروں میں اپنی دوراندیشی، حزم واحتیاط، نکتہ رسی، قابلیت حسنِ انتظام کی بدولت سربرآوردہ رکن تھے، علوم وفنون کے بھی بڑے قدر دان تھے، چنانچہ لکھنؤ کی سلطنت کے مٹنے کے بعد اکثر پرانے رئیسوں کی خاندانوں کی پرورش اور باکمال لوگوں کی غور وپرداخت آپکی سرکار سے ہوتی رہی، اپنے حسن انتظام سے علاقہ کا بندوبست بھی بہت اچھا کیا اور اس میں معقول اضافہ کرتے رہے۔ اُردو شعر وسخن کی طرف بھی توجہ تھی اور صاحبِ دیوان تھے منشی جواہر سنگھ جوہر شاگرد خواجہ وزیر سے جو آپکے مصاحب تھے تلمذ تھا شکار کا بیحد شوق تھا، اُنکی قدر اندازی اور دلیری کے بڑے بڑے انگریز معترف تھے، تمام اوقات فرصت اِس مشغلے میں صرف فرماتے تھے، بلرامپور جو ایک گاؤں تھا اُنکے حسن انتظام سے ایک شاندار قصبہ بن گیا، اسی طرح اپنے علاقہ میں جابجا چاہات، تالاب۔ پُل اور سرائے بنواکر اولوالعزمی کے ثبوت کے علاوہ علاقہ کو آباد اور رعایا کو خوش کیا ۱۸۸۲ء میں مہاراجہ نے (جن کا صلبی فرزند انکی حیات ہی میں قضا کر گیا تھا) لاولد انتقال کیا اور دو مہارانیاں بیوہ وارث چھوڑیں جن میں سے مہارانی خورد نے حسب وصیت مہاراجہ مرحوم مہاراجہ صاحب حال کو متبنّٰی بنا لیا اور مہاراجہ کی ریاست کو برقرار رکھا۔ احسن التواریخ اور چند اور کتابیں بلرامپور کے متعلق آپکی زیر سرپرستی شائع ہو چکی ہیں، موزونی طبع کے اقتضا سے شعر کی طرف بھی کبھی کبھی

راجہ **راجہ** - مہاراجہ سر دگبجے سنگھ صاحب بہادر کے، سی، ایس، آئی - والیٔ ریاستِ بلرامپور و
تلسی پور اودھ آپ قوم کے جوار راجپوتوں میں سے تھے، اور انکے بزرگ گجرات چمپانیر سے اودھ
آنکر یہاں کے علاقہ جات کے بزورِ شمشیر مالک ہوئے، تاج الدین غوری کے وقت میں سرکار
شاہی سے اِنکے بزرگوں کو بہرائچ کا علاقہ واسطے آبادی و کاشت کے انتظام، خراج پر
عنایت ہوا، یہاں اکونہ کا قصبہ اُنھوں نے آباد کیا اور ریاست کی بنیاد ڈالی - راجہ جے نراین سنگھ
برادر سر راجہ صاحب کے وقت تک ۱۸ راجہ یکے بعد دیگرے مسند نشین ہوئے - آبائی زمینداری
پر مسند نشینی کے وقت مہاراجہ صاحب عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی - اترولہ کے تعلقہ دار
راجہ محمد خاں نے اِن پر فوجکشی کا ارادہ کیا تو یہ خود اُسپر جا چڑھے اور اُسکی گڑھی کو لوٹ لیا،
سمت ۱۸۹۷ میں راجہ درشن سنگھ شاہ اودھ کی طرف سے ناظم مقرر ہوئے اُنہیں مہاراجہ
سے پرخاش تھی، انھوں نے انکے نائب گجادر سنگھ سے بذریعۂ تہدید بلرامپور خالی کرالیا
مہاراجہ اُن ایام میں اپنی شادی کرنے بالسنی گئے ہوئے تھے، یہ سنکر بہت مغموم ہوئے اور
نیپال چلے گئے، وہاں مہاراجہ جنگ بہادر نے بہت مدارات سے رکھا اور امداد کا وعدہ کیا
رزیڈنٹ نیپال کی تحریک پر شاہِ اودھ نے درشن سنگھ کو معزول کردیا اور مہاراجہ پھر اپنے
علاقہ پر قابض ہوگئے، سمت ۱۹۰۵ میں ملتی پور کے راجہ وگراج سنگھ کو اُسکے بیٹے دگ نراین سنگھ
نے معزول کردیا، واجد علیشاہ کے حکم سے مہاراجہ نے اُنکی امداد کرکے وگجراج سنگھ کو پھر قبضہ
دلادیا اور اپنا حق مقررہ معہ ایک گانو کے لے لیا - اِسی طرح سے مختلف معرکوں میں مہاراجہ
نے اپنی بہادری اور اولوالعزمی کے جوہر دکھائے - سنہ ۱۸۵۶ء میں سرکار اودھ پر انگریزی
تسلط ہوگیا انہوں نے فوراً چارلس ونگ فیلڈ کمشنر بھرائچ کے پاس حاضر ہوکر علاقہ بلرامپور
کی قبولیت داخل کردی اور اپنی حسن خدمات سے صاحب کو ازحد رضامند رکھا - تھوڑے دن
بعد جب غدر ہوا، مہاراجہ حسب الطلب پانچسو سوار لیکر کمشنر کی امداد کو گئے اور قریباً سو انگریزی
خاتون اور بچوں کو اپنی زیر حفاظت رکھکر سرکاری علاقہ میں بھیجدیا، اور قلعہ پٹوہان کا قبضہ

شعر چوٹی کے شکے کہتا ہے

میں نے دشمن بغل میں پالا تھا | میرے پیچھے بلا پڑی کیسی
سرخ ہاتھوں کو کر چکے خوں سے | آہ اس دل نے کی دغا کیسی
مٹ گئی شکل نقش پا کیسی | اور پھر چاہیے حنا کیسی
| پس گئی چال پر حنا کیسی

اقلیم کبھی زیر نگیں رہتی تھی راجہ | اب حرف بھی غالب ہو نگیں پر نہ رہیں گے
دست مشتاق نے زلفوں کو بنایا افعی | صاف پید اکف موسیٰ کا اثر ہاتھ میں ہے
دانتوں پر موتی تصدق کرکے جانی بھیجئے | جاں بلب ہوں اب تو آب زندگانی بھیجئے
کشتۂ ابرو کو کیجے دفن بیت اللہ میں | قیدیٔ گیسو کو صاحب کالے پانی بھیجئے
ہنستے ہی ہنستے یقیں ہے مجکو شادی مرگ ہو | آپ اگر اپنا دوپٹہ زعفرانی بھیجئے
ہیں بے خبر ایسے کہ خبر ہم نہیں رکھتے | دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے
جس جا پہ گرے تھک کے وہی گھر ہے ہمارا | دیوانے ہیں، سودائی ہیں، گھر ہم نہیں رکھتے
کیا مثبہ تصدق کریں کیا نذر دیں تمکو | دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے
کس تاک پہ آتا ہے تو اے درد محبت | دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے
رولائے روئے لیلیٰ جان کر دوڑا عبث مجنوں | بھلا کب چاند مہتاب راجہ ہاتھ آتی ہے

زلف کی یاد حکایت آئی | اور شب بڑھ گئی آفت آئی

وہ پیام یار لایا اسنے کھولی فال نیک | پائے قاصد چومئے اور دست عامل چومئے

یہ سچ ہے کہ تلوار کی ہوتی ہی بڑی آنچ | کیا قہر ہے تیغ نگہ یار کی گرمی
بت اگر سنگدل ہے اے راجہ | کرلے باتوں میں اسکو تو پانی
دوستوار شک کے ہم خوب معانی سمجھے | سایۂ یار کو بھی دشمن جانی سمجھے
نامہ لکھے کوئی کیا، کیا کوئی قاصد بھیجے | وہ نہ خط سمجھے نہ پیغام زبانی سمجھے
سن کے افسانۂ حال دل مضطر بولا | قصہ خواں دور ہو چل تیری کہانی سمجھے

شیخ ناراض ہو ہم سے کہ برہمن روٹھے
ہونگے پابند نہ ہم سبحۂ و زنار کے پر

موتی پہ گماں ہوتا ہے سبزے کا ہر اک کو
ہے عکس خطِ سبز سے شبنم کا گہر سبز

میں ابرِ تنک کا کبھی احسان نہ لونگا
کر دشعر سے صحرا کو تو اے دیدۂ تر سبز

اک جھاڑ زمرد کا بنا سرو چراغاں
داغ تن سم خوردہ ہوا راجہ یہ سر سبز

مانی اُس نے منگائی ہے تصویر
کھینچدے جائے جسم لاغر خط

اُسکی صورت تو جا کے دیکھے گا
ہیں ندوں گا تجھے کبوتر خط

بعد مُردن بھی کُھلی رہ گئیں آنکھیں میری
تھا مری چشم کو از بس ترے دیدار کا حظ

ہم تو حیران رہیں صورت کو تری پردہ نشیں
آئینہ روز اُٹھائے ترے رخسار کا حظ

میر و سودا و حزیں، آتش و ناسخ ہوتے
روبرو اُنکے نہ تھا راجہ ترے اشعار کا حظ

معلوم نہیں ہاتھ کریگا وہ کدھر صاف
تلوار ملی جاتی ہے ہوتی ہے سپر صاف

مرغانِ قفس کو نہ تو دانا ہے نہ پانی
ضیاد گذرتے ہیں انھیں آٹھ پہر صاف

شاید کہ بہار آگئی جو مرغانِ گرفتار ٭ منقار سے لگے کرنے ہیں پر صاف

یہ کسکو ڈھونڈتی پھرتی ہے اضطراب میں برق
گھسے زمیں گھسے گردوں گھسے سحاب میں برق

کسی کے نُورِ رُخ مہروش پہ عاشق ہے
یہ گرتی پڑتی جو پھرتی ہے اضطراب میں برق

اسے قضا اور دے دو چار قدم کی مہلت
مجھ تنِ زار سے ہے کوچۂ جاناں نزدیک

ضعف سا ضعف ہے اب چاک نہیں ہو سکتا
دست وحشت سے ہے ہر چند گریباں نزدیک

چشمِ بد دُور تری آنکھوں سے نسبت کیا ہے
چل و کھادوں میں ہرن یاں ہے بیابان نزدیک

مرنے کا تو کچھ غم نہیں پر غم ہے یہ راجہ
مہمان ہے دردِ جگری اور کوئی دم

آستانِ یار پر ہم جبہہ سائی کرتے ہیں
دیکھیں کیا ہوتا ہے قسمت آزمائی کرتے ہیں

کوئی مرتا ہے کوئی جیتا ہے اُنکے حکم سے
اللہ اللہ آجکل بت بھی خدائی کرتے ہیں

شہر بڑھے گا روٹھنے ہیں راجہ صاحب خیر ہے
آپ معشوقوں سے بھی اب میرزائی کرتے ہیں

کیا جانئے کہاں تھا قافلہ ہمسفراں ہے
یارانِ عدم کی نہیں آتی ہے خبر کچھ

جیتے جی حال پوچھا نہ بیمارِ عشق کا
ہونٹوں پہ جان شوقِ شہادت سے آگئی
گردش لکھی ہی سر میں تو چکر ہی پاؤں میں

اُٹھتی ہے نعش اب تو ذری چل کسی طرح
قاتل دکھاوے مجکو تو مقتل کسی طرح
اِک قصہ بر زمیں ہی تو اک داستانِ چرخ

عاشق کا رنگ زرد ہے پوشاکِ یار زرد
کیسا خیالِ ہجر شبِ وصل آگیا
عاشق کا رنگ زرد نہ ہو کیونکہ ہجر میں

پھولی بسنت باغ میں آئی بہار زرد
یا سرخ تھا ہیں یا کہ ہوا ایکبار زرد
کر دیتی ہے خزاں شجر و برگ و بار زرد

کچھ مزا دیگی جو بوسہ کی حلاوت لب پر
حالتِ نزع میں ہی قند کی حکایت لب پر
ضعف کیسا ہی یہ کیسی ہی نقاہت مجھ کو
عزم بوسہ کا تصور میں اگر میں نے کیا
عشوہ و ناز اس انداز کا دیکھا نہ سُنا
دل پہ صدمہ ہو کہ ہو جاں پہ اذیت راجہ

جاں دمِ مرگ رہیگی کئی ساعت لب پر
دم نکلنے نے مچائی ہی قیامت لب پر
نالہ دل سے نہیں آتا ہی سلامت لب پر
پڑ گیا نیل ہوئی ختم نزاکت لب پر
شوخی آنکھوں میں ہی ظاہر ہی شرارت لب پر
آنے پائے نہ مگر حرفِ شکایت لب پر

اے آئینہ رُو جھانک کے غرفہ سے ذرا دیکھ
قاتل سے کہیں کیا دلِ افگار کا احوال

ایک خلق کھڑی نقش بدیوار ہے باہر
ہر وقت وہاں میاں سے تلوار ہے باہر

کہتے ہیں جسکو دخترِ رز میری جان ہے
ہوتے ہو تلخ اب لبِ شیریں کے بوسے سے
اے راجہ باغبان نے صیاد سے کہا

دل کا گمان ہے مجھے بوتل کی ڈاٹ پر
تم نے ہی دل کو پہلے لگایا تھا چاٹ پر
قمری کا سر اُڑا دے عنادل کی کاٹ پر

صرفِ بالِش نہ ہوئے بلبلِ گلزار کے پر
وہ سیہ بخت ہوں روشن ہو اگر شمعِ مزار
شش جہت میں ہی یہی ظلم عنادل کے نصیب
اب کبوتر کو مرے طاقتِ پرواز نہیں

کچھ بھی کام آئے نہ اس طائرِ بے کار کے پر
جمع پروانے ہوں گُل کردیں اُسے مار کے پر
دو کے پر باندھے گئے کترے گئے چار کے پر
گر پڑا چونچ سے خط ڈال دیئے ہار کے پر

کالا ہے ماہتاب کہ گورا ہے ماہتاب
پردہ نشیں سے پوچھیں گے کیسا ہے ماہتاب

یہ پیر چرخ خادمِ دیرینہ ہے ترا
دستِ فلک میں پھول کا پنکھا ہے ماہتاب

حسرت سے قیس دیکھتا ہے چاند کیطرف
کیا نقش پائے ناقۂ لیلیٰ ہے ماہتاب

آنچ تھی تلوار کی برقِ غضب
ہو گیا کشتہ ترا قاتل کباب

آیا وہ مہوش تو سینکے شمع پر
ہو گئے پروانے سرِ محفل کباب

کیا سوتی ہے لیلیٰ تو پڑی خوابِ لحد میں
روتا ہے کھڑا قیس بچارا سرِ تربت

اے قیس تری جاں کی نہیں خیر نہیں خیر
خالی ہے کھڑا ناقۂ لیلیٰ سرِ تربت

حلال کرتا ہے کسکو ہلال شام کیوقت
فلک پہ خون ہی کچھ لال لال شام کیوقت

نصیبِ اعدا نہ ہو سایۂ پری سر پر
چمن میں پھرتے ہو تم کھولے بال شام کیوقت

خیالِ زلف میں راجہ نگہ کے مرتا ہوں
تو ایسی باتیں نہ منہ سے نکال شام کیوقت

مطیع خوبوں کی خلق پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
صنم بھی کرنے لگے خدائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

جنھیں تھا دعوائے میرزائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
نصیب ہے اب برہنہ پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

صنم کدے سے کسے تھی فرصت حرم میں آنا ہی اتفاقاً
غضب ہے ہم اور پارسائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

شروع کی ہیں نے چھیڑ اُسنے تو مجھ سے تیوری چڑھا کے بولے
تجھے ہے مجھ سے کرنا ہی ہاتھا پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

مری تو قسمت میں گالیاں ہیں رقیب کو ہو نصیب بوسہ
مجھے تو ہم دے کے اُسے مٹھائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

فقط مجھی کو نہیں ہے اُلفت مطیع شاہ و گدا ہیں راجہ
صنم بھی کرنے لگے خدائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

کعبہ نہ گئے دیر سے تکفیر کے باعث
اللہ کو بھولے بتِ بے پیر کے باعث

بے یار کوئی کام ہو ممکن نہیں ناصح
جی لگ گیا فرہاد کا تصویر کے باعث

روشنی داغِ جدائی کی فقط کافی ہے
ڈھیر مجنوں کا نہیں شمع لگن کا محتاج

آبلہ گنبدِ مرقد ہے کفن دامنِ دشت
نہ تو ہیں طالبِ تربت نہ کفن کا محتاج

عرقِ آلودہ رخِ یار کو لے راجہ دیکھ
گلِ جنت نہیں یہ نہرِ لبن کا محتاج

راجہ نے اِن اُمور کو اپنی مقدور سے خارج پاکر عذر کئے جو مسموع نہ ہوئے اور وارن ہسٹنگز گورنر جنرل خود اس معاملہ کے تصفیہ کے لیے بنارس آئے اور راجہ کی گرفتاری کا قصد کیا، اِس امر سے تہلکۂ عظیم مچ گیا اور چار و ناچار جانبین سے فوج کشی کی نوبت آئی آخر الامر والی بنارس مہاراجہ چیت سنگھ نے ۱۷۸۱ء میں شکست پاکر گوالیار کو پناہ گاہ مقرر کیا تو عالیجاہ نے طریقۂ مہمانداری کا مسلوک کر کے پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر علٰحدہ کر دی۔ بعد وفات مہاراجہ چیت سنگھ مہاراجہ بلوان سنگھ چالیس سال تک آگرہ میں تشریف فرما رہے، نظیر اور مرزا حاتم علی مہر کے شاگرد تھے بڑے قادر الکلام، مشاق، ذکی اور طباع سخنور تھے تلاشِ مضامین نو کی طرف میل خاص تھا اور اُسکے ساتھ ہی زبان کی صفائی کا اسقدر خیال تھا کہ کیا مجال کہ اسلوب بیان میں ذرا بھی دقت یا اُلجھاؤ پیدا ہو، مشکل زمینوں میں خوب خوب شعر نکالتے تھے شاعروں کے بڑے قدردان تھے ہمیشہ دولتخانے پر مشاعرے ہوا کرتے تھے اور شعرا سے ہر طرح سے مسلوک ہوتے تھے قوم کے ترکرما برہمن تھے انکے مورثِ اعلیٰ راجہ منسارام کو محمد شاہ نے پندرہ لاکھ سالانہ خراج پر علاقہ جات جونپور-غازیپور، بنارس کا صوبہ دیا تھا، سرکار انگلشیہ سے دو ہزار روپیہ ماہوار پنشن مقرر تھی، ۱۷۹۹ء سال پیدایش تھا۔ صاحب دیوان مسمّٰی بہ گل ریاض مطبوعہ عظیم الاخبار پریس آگرہ ۱۲۷۰ھ تھے، ایک کتاب موسوم بہ چتر چندر کا بھی اِن سے یادگار ہے، دیوان نہیں ملا، البتہ تلاش سے بیس پچیس غزلیں ہم پہنچیں اُنکا انتخاب حاضر ہے اُنکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف و مشکل زمینوں میں کس قابلیت اور ذہانت سے فکر کیا ہے، اِنکی قادر الکلامی اور مشاقی قابلِ داد تھی۔ کیوں نہو استعداد علمی کے علاوہ ذہانت اور خوش فکری خداداد تھی۔ انتخاب کلام سے لُطف اُٹھائیے ؛

تُو ہے وہ گل کہ نام ترا باغِ دہر میں	دو دو پہر وظیفۂ مرغ سحر ہُوا
خانۂ دل میں خدا دخل بتوں کا نکلا	کعبہ ہم سمجھے تھے جسکو وہ کلیسا نکلا
صاف قاتل سے ہُوں ا تنا کہ یقین ہے دمِ قتل	میرے خوں کا بھی نہو تیغ پہ دھبّہ پیدا

ردیف رائے مہملہ

راجہ **راجہ**۔ راجہ راج کشن مغفور رئیس کلکتہ، آپکے والدِ مرحوم مہاراجہ نبا کشن بہادر جو کلائو کے دیوان اور اپنے وقت کے مقتدر اور معزز امرا کے سرتاج تھے، مرزا جان طپش دہلوی سے تلمذ تھا۔ نساخ اور مولنا حبیب الرحمن کا بیان ہے کہ انکا ایک ضخیم دیوان اُردو میں تھا، مگر جس تذکرہ کو دیکھا اُس میں صرف ایک ہی شعر نظر سے گزرا، انکے بیٹے راجہ انوپ کشن بہادر بھی شعر کہتے تھے اور کنور تخلص کرتے تھے۔

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤگے صاحب	تو مجکو سحر تک نہ یہاں پاؤگے صاحب

راجہ **راجہ**۔ راجہ بہادر نام خلف راجہ شتاب رائے صوبہ دار پٹنہ عظیم آباد۔

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے	ہم اُن تلک نہ پہنچے وہ ہم تلک نہ پہنچے

راجہ **راجہ**۔ بلاس رائے پسر دیوان مانر ائے۔ شوق لکھتے ہیں کہ صاحب اقتدار عالی ہمت از شاگردان حسن علی شوقؔ، طبیعت مناسب اور موزوں پائی تھی۔ یہ اُنکا کلام ہے۔

اِس واسطے کسی کی نہ تجکو نظر لگے	انجم بنے سپند بنا مجمر آفتاب
سُنکر ترے جمال کو اب ڈھونڈتا پھرا	لیکر سحر سے شام تلک گھر گھر آفتاب
یہانتک ہی تیرے چہر کیا اب دلمیں سکے از رشک	آتش میں جل کے ہو گیا جوں اخگر آفتاب

راجہ **راجہ**۔ رئیس با تمکین مہاراجہ بلوان سنگہ بہادر راجہ خلف ارشد مہاراجہ چیت سنگہ تاریخ میں انکا حال اس طرح درج ہے کہ جب راجہ چیت سنگہ کے والد راجہ بلونت سنگہ نے وفات پائی نواب شجاع الدولہ نے تمام عہد ناموں کے برخلاف چاہا کہ علاقہ بنارس پر اپنا دخل کرلیں لیکن سرکار انگلشیہ نے قدیم شرائط کی پابندی ملحوظِ خاطر رکھکر راجہ چیت سنگہ کو مسندِ موروثی پر متمکن کردیا۔ راجہ موصوف حسب قرارداد سابقہ سالانہ زرِ خراج معینہ ادا کرتے رہے لیکن ۱۷۷۸ء میں سرکار انگریزی نے کچھ فوج کمکی طلب کی اور اخذ زر بھی کرنا چاہا

جب چٹکتی ہے کلی تو صاف آتی ہے صدا
عرضِ مطلب میں رکھو ہر جا خیالِ اختصار
ای خرد و دل بدست آور کہ حج اکبر است
چاہیئے تمکو مخاطب کے مراتب کا لحاظ
جس سے کچھ جائے مخاطب ہے وہ بیجا گفتگو

ہے گلِ راحت خموشی اور ایذا گفتگو
بارِ خاطر بارہا ہوتی ہے بیجا گفتگو
جس سے دلکو رنج پہنچے وہ بھی ہے کیا گفتگو
سوچ لے پہلے سے کرنا چاہیئے کیا گفتگو
جو نہ کھینچے دلکو سامع کے تو وہ کیا گفتگو

زندگانی کا زمانے میں بھروسا کیا ہے
پاک نیت ہے تو سب کام سنور جائیں گے
اشرف الخلق ہو کچھ پاس بھی ہے عزت کا
منعمو ابیع و شری سمجھے ہو احسان کو تم
حق نے پیدا کیا طاعت کے لیئے انساں کو
سخت دشوار ہے انسان کی پہچان ذہین

جز فنا ہونے کے انساں میں رکھا کیا ہے
تم خطاوار نہیں تو تمھیں کھٹکا کیا ہے
کام کیا کرتے ہو تم اور تمھیں زیبا کیا ہے
نہیں منظور جو شہرت تو یہ چرچا کیا ہے
جو نہ طاعت کرے خالق کی وہ بندا کیا ہے
دوست کہتے ہیں کسے آپنے سمجھا کیا ہے

بھلائی کیئے جا شرافت یہی ہے
نکوئی میں کر نام شہرت یہی ہے
وہ کوشش ہی کیا ہے جو اپنے لیئے ہو
کسی سے نہ مکر و دغا کر جہاں میں
نکر دشمنی دوستی کی ہے جس سے
جو اعلیٰ ہو اپنے کو سمجھے وہ ادنےٰ
ہر چیز کو فنا ہے یارب تجھے بقا ہے
احساں میں جب غرض ہو احسان ہی وہ کیا ہے
گر ہو نہ آدمیت وہ آدمی ہی کیا ہے
چشمِ کرم میسر سے؟ ذلت کا سامنا ہے

اطاعت یہی اور طاعت یہی ہے
بھلائی کے کر کام راحت یہی ہے
تو غیروں کے کام آ کہ ہمت یہی ہے
یہی آبرو پاسِ عزت یہی ہے
یہی ہے مروّت محبت یہی ہے
یہی خاکساری شرافت یہی ہے
تو مالکِ حقیقی دُنیا جہان کا ہے
کیوں نام کی ہے خواہش کس کا نشاں رہا ہے
جو بیکسوں کو پوچھے کیا اُسکا پوچھنا ہے
اللہ سے طلب کر جو تجھکو مانگنا ہے

ہونا ہے جو وجود کا میرے کمال کا کس نے سر اپنا ہے * ہے غم تیری کشتی عمر میں ہستا ہے *

لالہ کو بے ثباتیٔ عالم کا داغ ہے گل کی طرح گذاریئے یاں نبکے زندگی		یوں دیکھنے کو باغ میں خنداں ہے چندروز باغ جہاں میں صحبتِ یاراں ہے چندروز
جیسا ظاہر ویسا باطن اسکا ہو کیونکر یقیں دیکھکر صورت کو ہو ظاہر کسیکے دلکا حال بعض مکار اپنا ظاہر گو بنا لیتے ہیں خوب آزمانے پر مگر ہوتا ہے ظاہر اسکا حال ظاہری اخلاق پر لوگوں کے کیا ہو اعتبار ایسی لذت ہی نہونے میں کہ ہونے میں نہیں بُعدِ فرقت گر نہو تو لطفِ قربت میں نہیں پاس جو ہو دولت اُسکی قدر کم کرتے ہیں ہم ہے یہی باعث وطن میں قدر جو ہوتی نہیں ہمکو اچھی ہی نظر آتی ہے ہر شے دُور سے	....	ہو نہ جبتک امتحانِ ظاہر و باطن ہمیں ہو نہ جبتک اُسکی سیرت کا ہمیں علم و یقیں اور کُھلتا ہی بمشکل ہو جو انکے دلنشیں جلساز اُنسے زیادہ کوئی دنیا میں نہیں ہو نہ باطن کی بھی جبتک آزمایش انکو ہمیں لطف جو دوری میں ہے قربت میں آتا ہی کہیں اور عسرت گر نہو تو لطف عشرت میں نہیں دُور جو ہو یاد اُسکی ہر گھڑی کرتے ہیں ہم کوئی ہم میں سے نکلتا ہی جو فرد بہتریں ہے جو پنہاں شاد ہم ہوتے ہیں ذکر حور سے
سب ہیں فانی کیا زمیں کیا آسماں کچھ بھی نہیں آہ سے مظلوم کی ڈر ظالم نخوت پرست ظاہری احسان سے جب ممنون کرنا ہے غرض	فنا	اک خدا کو ہے بقا دونوں جہاں کچھ بھی نہیں سامنے جسکے زمین و آسماں کچھ بھی نہیں مہربانی یہ تو اے نامہرباں کچھ بھی نہیں
جہاں میں ہے یہ دلیلِ شرافتِ انساں گزارے عمرِ دو روزہ وہ نیک نامی سے		اُمیدِ خیر پہ مبنی ہو عادتِ انساں یہی ہے باعثِ آرام و راحتِ انساں
ہو جو چھوٹا تم سے اُسپر چاہیئے لطف و کرم جو بُری ہے بات نفرت اُس سے ہو جائیگی خود		جو بڑا تم سے ہے خاطر اُسکی اور عزت کرو نیک کاموں ہی کی تا مقدور تم عادت کرو
کرتی ہے عیب و ہنر کو آشکارا گفتگو غور پہلے کرتے ہیں بعد اُسکے دانا گفتگو		جوہر انساں کا ہے آئینہ گویا گفتگو تا نہ آفت میں پھنسائے بے محابا گفتگو

سبب امن و اماں کا عہدِ شاہِ عدل گستر ہے
زمانہ جارج پنجم کا ہے آرام و راحت کا

سبب آرام و راحت کا عدالت ہے کہ سلطاں کو
اسی کی ہی ضرورت ہے یہی شیوہ حکومت کا

رعایا پر رعایت کی نظر ہے شاہ پر واجب
اطاعت شاہ کی کرنا فریضہ ہے رعیت کا

عدالت ہی ہے تالیفِ قلوبِ خلق کا باعث
عدالت ہی سبب ہے حق تعالیٰ کی عنایت کا

سمجھنا حق کو حق ناحق کو ناحق سخت مشکل ہے
اہم ہے کام سب کاموں میں انصاف و عدالت کا

زمانہ جارجِ پنجم کا کیا اچھا زمانہ ہے
کہ باعث امن عالم کا ہے دَور اسکی حکومت کا

مُرقعے ہمنے شاہانِ سلف کے غور سے دیکھے
نظر آتا نہیں قیصر کوئی اِس شانؔ و شوکت کا

ہوتے ہیں اپنے مقاصد میں وہ اکثر کامیاب
نامرادی میں بھی ہوتے ہیں جو ہمت آشنا

طالبِ دُنیا پریشاں حال رہتے ہیں مدام
ہیں بڑے آرام و آسایش میں عُزلت آشنا

انسان ....

او بشر او خاک کے پُتلے تجھے اتنا غرور
تیرے ہمجنس اور پھر تُو ہی رہے اُن سے نفور

نشۂ زر نشۂ رز کی طرح کیوں چڑھگیا
ہو گئی اُلٹی سمجھ کیوں؟ کیا ہوا تیرا شعور

تجھسے ہیں محروم سائل سہکے ذلت کا بھی غم
مفلسوں کو کب سمجھتا ہے تو او منعم! غیور

اے بشر تجھ پر نہوتا فضل اگر اللہ کا
تجکو کب ملتی یہ عزت، یہ شرافت، یہ شعور

کر خدا کا شکر کیا تھا کیا سے کیا تُو ہو گیا
جو ہو کرنا آج کر لے کل تو ہے روزِ نشور

ہو کے انسان پھر کرے تو ہی جفا انسان پر
کیا یہی ہے آدمیت کا شعار اے بے شعور

زمانہ سازی

نکالا کرتے ہیں جو لوگ مکرو زور سے کام
سمجھنے لگتے ہیں وہ آپ کو زمانہ ساز

کچھ ایسے کاذب و مکار و چلتے پُرزے ہیں
کہ خیر و شر کو بنا لیتے ہیں نشیب و فراز

سمجھتے ہیں وہ یہ معنے زمانہ سازی کے
کہیں رہینِ تملق کہیں بنیں غمّاز

بُرائیوں پہ عمل کر کے پھر یہ کہتے ہیں
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

جو ایسے لوگ ہیں وہ سرخرو نہیں ہوتے
بُرا ہو اُنکا جو کرتے ہیں اِس بُرائی پہ ناز

مصیبتوں میں جو رہتے ہیں صابر و شاکر
وہی ہیں قابلِ تکریم و لائقِ اعزاز

اک تو کرنا ظلم اُس پر پوچھنا کیا حال ہے	اب نہ مُنہ کھلوائیے سرکار رہنے دیجئے

مثنوی

خط کو پڑھتا ہوں گو میں سو سو بار	سیر ہوتی نہیں طبیعت یار
کل تھی شادی کی دھوم دھام جہاں	صفِ ماتم بچھی ہے آج وہاں
مُنہ جو ڈھک کر کبھی نہ سوتے تھے	تنگ گوشے میں گورکے ہیں پڑے
کل جہاں تھا بہار کا جوبن	آج بادِ خزاں کا ہے مسکن
اب نہ شیریں ہے اور نہ ہے فرہاد	اب نہ وہ باغ ہے نہ ہے شداد
ہے کہاں قیس اور کہاں لیلیٰ	قبر تک کا پتہ نہیں لگتا
موت کے آگے گیا بشر کی چلے	پیر و پیغمبر اس سے جب نہ بچے

ذہین

ذہین - مولوی سید واجد علی لکھنوی شاگرد محمد مصطفےٰ خورشید لکھنوی مرحوم - یہ چند شعر انکے ملاحظہ ہوں -

نہ سنگدل کوئی تم سا ملا زمانے میں	ہزار دیکھے جفا پیشہ بھی ستمگر بھی
خدا بچائے یونہیں روز قتل کرتے تھے	کمر میں آج تو شمشیر بھی ہے خنجر بھی
اس ایک تیر نظر نے کیے ہیں دو بسمل	جگر کے ساتھ تڑپتا ہے قلبِ مضطر بھی

ذہین

ذہین - منشی سید غلام مصطفےٰ مخزن اور ادیب وغیرہ رسالوں میں انکی نظمیں شائع ہوتی ہیں عموماً اخلاقی مضامین نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ حق شاعری ادا کر دیتے ہیں، الفاظ صاف و شستہ و تراکیب دلنشیں اور مناسب موقع مسلسل نظمیں جن میں قوتِ فکر کا پورا امتحان ہوتا ہے اکثر بہت اچھی لکھتے ہیں، ایک نظم موسومہ "شعور" قابل دید ہے - معرفت اور تصوف کے رنگ میں اکثر طبع آزمائی کرتے ہیں اور فرائض انسانی و طرز معاشرت و تمدن وغیرہ کے مسائل پر بھی انکی متعدد نظمیں ہیں ۳۵، ۳۶ برس کی عمر اور یہ کلام کا انتخاب ہے -

عہد قیصری

جسے تو چاہے عزت دے جسے تو چاہے ذلت دے	کسی کی فہم میں کب راز یہ آتا ہے قدرت کا

ہیں کامل دخل رکھتے ہیں۔ ۴۶-۴۷ برس کی عمر ہے، نواب مرزا باقر علیخاں صاحب بہادر دام اقبالہم نواب صاحب شیش محل کے منجھلے صاحبزادے ہیں۔ آپنے ایک مثنوی بھی تصنیف فرمائی ہے ۱۹۰۸ء میں ولایت تشریف لیگئے وہاں سے جون ۱۹۱۰ء میں بیرسٹری پاس کرکے تشریف لائے، آپ کو پولیٹیکل معاملات میں نہایت دلچسپی ہے، راقم تذکرہ کے محب بے ریا ہیں، بارہا ہنگام قیام دہلی اور لکھنؤ میں صحبتیں رہیں۔ خلیق، زندہ دل، متواضع، امیرزادے ہیں۔ کچھ کلام آپنے عنایت فرمایا اُس کا انتخاب حاضر ہے*

دیا دل ذہینؔ اُس ستمگر کو اپنا	کہا ہائے تم نے نہ مانا کسی کا
تیرے ہی در کے ہیں گدا، مالِ جہاں کا ذکر کیا	اور تو کچھ نہیں رہا، نذر کو تیری لائیں کیا
نزع میں آئے ہیں عیادت کو	اے قضا تو ذرا توقف کر
مَیں تو حرم میں زاہدا راہ بھٹک کے آگیا	پھر خدا نہ جی جلا، یاں ہے کہاں دو دو دل
چشم و رُخ و دہانِ یار، سب کریں دل طلب ہزار	ایک تھا کر دیا نثار، اتنے کہاں سے لائیں دل
ترس کھانا تو کیسا رقصِ بسمل کی ہوں تعریفیں	خدا شاہد بڑا ہی ظلم یہ صیاد کرتے ہیں
ہے وقتِ نزع میرا آرہی ہے آخری ہچکی	ذرا تو اے قضا تھم جا وہ مجکو یاد کرتے ہیں
مسیحا ہو اگر آؤ کہو تم میری میت پر	نہیں کہدو کہ سب کچھ یوں ہی ہم ارشاد کرتے ہیں
بے سبب کب فلک کو گردش ہے	میری تقدیر اس میں شامل ہے
دِل نہیں، پُوچھتے ہو کیا یارو	میرے پہلو میں مرغ بسمل ہے
کوہکن! کیوں؟ وہی ہوا آخر	ہم نہ کہتے تھے چاہ مشکل ہے
رات کا حال جھوٹ کہتا ہوں	آنکھ مجھ سے ملایئے تو سہی
کیا ذہینؔ پھر کسی پہ دل آیا	چُپ ہیں کیوں کچھ بتایئے تو سہی
مَیں تو ہندو نہ تھا مسلمان تھا	بت کو سجدہ کرا دیا کس نے
تڑپتا ہوں میں اک مدت سے دختِ رز کی خواہش میں	پلادے آج تو تھوڑی مجکو یار تھوڑی سی

شعلہ ہوں برق کا جو مجھے چھیڑے وہ جلے
ہستی کا نقش میری مٹایا نجائے گا

عشاق صدمہ ہائے قیامت اٹھائینگے
جب تک فلک زمیں پہ گرایا نجائے گا

ذہین

ذہین۔ حافظ مولوی حکیم نور الحسن صاحب کیرت پور نہٹور ضلع بجنور کے سادات رضوی سے آپکے والد ماجد مولانا محمد ظہور الحسن صاحب مشہور اور بے مثال فضلا میں تھے، آپ پیدائش کے پانچویں سال نابینا ہو گئے تھے پھر بھی قرآن مجید حفظ کر لیا۔ کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد علم طب حکیم مولوی رحیم اللہ صاحب بجنوری سے حاصل کیا۔ عربی۔ فارسی، اُردو و تینوں زبانوں میں نظم و نثر تحریر فرماتے ہیں، کلام بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے اُن کا بیان ہے کہ کئی برس اخبار کے اڈیٹر بھی رہے ہیں۔

فتنے پس پس گئے دب دب گئے محشر کیا کیا
فتنۂ قامت جو مرے گھر سے خراماں نکلا

آبلے پھوٹ کے روئے مری تنہائی پر
کفِ پا سے جو کوئی خارِ مغیلاں نکلا

بعد مُردن وہ عیادت کے لیئے آتے ہیں
جان نکلی ہوئی آئی میرا ارماں نکلا

ترے فراق میں دریا بھی قتل کرتا ہے
دکھائی موجِ صبا نے حباب میں تلوار

فتنہ زا ہے تری دزدیدہ نگاہی کیسی
لاتی ہے مملکتِ دل پہ تباہی کیسی

مجھ سیہ بخت کا جب نام لکھا دفتر میں
پھیلی تقدیر کے دفتر میں سیاہی کیسی

حسرت و یاس و الم ساتھ چلے قبر میں بھی
دیکھنا میرے رفیقوں نے نباہی کیسی

کیا اسی رات سے ہی صبح قیامت کی نمود
شبِ فرقت میں ہے اللہ سیاہی کیسی

سیر نازل لن ترانی آج موسیٰ دیکھیے
طور پر جو کل نہ دیکھا تھا وہ جلوہ دیکھیے

میرا رونا دیکھیے اور اُنکا ہنسنا دیکھیے
مینہ برسنا دیکھیے بجلی کا گرنا دیکھیے

جمائی دم بدم لیتے ہیں وہ آنکھوں کو مل مل کے
اشارہ ہے مری جانب کہ آؤ سو رہیں چل کے

دل و جان و دین و ایماں اک ادا میں چھین لیتا ہے
کوئی دیکھے کرشمے اُس بت کافر کی چھل بل کے

ذہین

ذہین۔ نواب مرزا کاظم علیخاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ آپ انگریزی، عربی، ناگری وغیرہ

سید ذوقی نے بھی شیرینی کے ذکر سے اپنے کلام میں حلاوت پیدا کی اور دیوان کا نام شکرستانِ خیال رکھا، وہ دیوان چھپ بھی گیا ہے دو چار شعر اُس میں سے ضیافتِ ناظرین کے لئے لکھے جاتے ہیں ؎

ببیں بسوئے چپاتی بدیدۂ انصاف	کہ بے وصالِ شکر حالتِ نزاراں چیست
غرض ز موسم برسات اولہ بندی است	وگرنہ ایں ہمہ تمہیدِ ابر و باراں چیست
در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست	اہمال در تناولِ فرنی چرا کنید
مزعفر با یدم بر خوانِ نعمت	مُرَبّا گر بود نورٌ علٰی نور

غرض اِس طرز میں کہتے کہتے اُردو کی طرف بھی عنانِ توجہ مبذول کی، اِن دنوں ریختہ غزل سرائی کی ابتدا تھی، خانِ آرزو، آبرو وغیرہ کا زمانہ تھا۔ جناب ذوقی خود صاحبِ منصب تھے، اور قصبۂ راہون ضلع لدھیانہ میں حاکم تھے، اُنھیں ایام میں زمینداروں سے کسی معاملہ میں تکرار ہوگئی اور ۱۱۴۳ھ میں مارے گئے، یہ اُن کا اُردو کلام ہے۔

عشق کا دل پر ستم اچھا ہوا	مر گیا بیمارِ غم اچھا ہوا
بہ نہ ہوگا یہ دوا سے اے طبیب	جب کیا اُسنے کرم اچھا ہوا
زور ہی آباد تھا دل کا نگر	کر گیا تاراج غم اچھا ہوا

ذہین - حافظ محمد اسمٰعیل خان ذہین دہلوی نبیرۂ حافظ محمد داؤد خاں مرحوم داروغۂ نذر و نیاز حضرت بہادر شاہ ثانی (جن کا ذکر داؤد تخلص کے تحت میں آچکا ہے) شاگرد حافظ غلام دستگیر مبین، بڑے وجیہ اور شکیل جوان تھے مگر صحبتِ بد نے ایسا خراب کیا کہ چند ہی روز میں اپنے دادا کی ہزار ہا روپیہ کی املاک برباد کر کے تباہ و خستہ ہو گئے، بیگم صاحبہ بھوپال کی سرکار سے کچھ وظیفہ ملتا ہے اُس سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ بازار چاوڑی میں جو وسیع دیوانخانہ اب نواب دوجانہ کی ملکیت ہے اُنکے دادا کا تعمیر کردہ ہے۔ ذہین

نام اُس صنم کا دل سے بھلایا نجائیگا	ہے نقش کالحجر یہ مٹایا نہ جائے گا

اپنی یہ چاہ اسکی وہ صورت ... اے عزیزاں نگاہ کیجئے گا
اُسکے دیوانہ پن کے عالم کو ... دیکھ کر واہ واہ کیجئے گا
اپنے ذوقی کے گھر میں شفیقِ من ... گہ کرم گاہ گاہ کیجئے گا

ہے ہاتھ کماں اُسکے اب تیر ہے اور میں ہوں ... تدبیر ہے لاحاصل تقدیر ہے اور میں ہوں
ہر شب وہ کماں ابرو کہتا ہے سرِ مجلس ... کل صبح کو میداں میں نخچیر ہے اور میں ہوں
رکھ ہاتھ وہ قبضہ پر برہم ہو لگا کہنے ... اب تُو ہے ترا سر ہے شمشیر ہے اور میں ہوں
یوں ریختہ کہنے کو عالم میں ہزاروں ہیں ... بدنام پر اے ذوقی اک میر ہے اور میں ہوں

جلد آمل جو تجھکو آنا ہے ... ورنہ کوئی دم میں دم روانہ ہے
تمکو ڈھونڈے کہاں کوئی ذوقی ... نہ ترا ٹھور نے ٹھکانا ہے

ترے کوچے میں ہم بھی آج لے تلوار بیٹھیں گے ... رقیبِ روسیہ کو بیدھڑک ہی مار بیٹھیں گے
جو غیروں کو تم اپنے منہ لگاؤ گے تو بولیں گے ... نہیں تو مثلِ نے خاموش ہو لاچار بیٹھیں گے
یہ ذوقی بھی ترے غصہ سے ڈرنیکا نہیں ہرگز ... اُٹھاؤ گے جو در سے جا پسِ دیوار بیٹھیں گے

عشق میں نہ سیم نہ زر چاہیئے ... آہ میں کچھ اپنی اثر چاہیئے
ذوقی آوارہ ترے قتل کو ... خاص کوئی تیغ و تبر چاہیئے

ذوقی۔ سید عبد الواحد خلف سید اشرف درگاہی بلگرامی، ولادت اُنکی ۲۹ ربیع الاول سنہ ۱۱۱۷ھ بمقامِ بلگرام واقع ہوئی۔ مولوی سید محمد مؤلف تذکرہ تبصرۃ الناظرین خلف الصدق علامۂ بعدیل میر عبد الجلیل بلگرامی لکھتے ہیں کہ سید ذوقی خوش طبع اور شیریں زبان تھے طبعیت برجستہ رکھتے تھے۔ فارسی شعر خوب کہتے تھے اور تخلص اپنا واحد کرتے تھے آپنے اور ایک دیوان ابو اسحاق اطعمہ ولایتی کے مذاق میں لکھا ہے (ابو اسحاق ایک ولایتی شاعر ہے جس نے اپنے اشعار میں کھانوں کا بہت تذکرہ کیا ہے، یہ اُنھیں کا شعر مشہور ہے ؎

پس از سی سال برُ اسحاق شد تحقیق این معنی ... کہ بورانی ہست بادنجان و بادنجان بورانی)

راتوں کو نہ ہُو حق کرائے شیخ مناجاتی		سوتے ہوئے چونکیں گے رندانِ خراباتی
بیقراری کا سبب ہر کام کی اُمید ہے		نا اُمیدی ہو تو پھر آرام کی اُمید ہے
شب ہجراں بسر نہیں ہوتی		نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
ہوس میں کعبہ کی کیوں شیخ بتخانہ سے گمرہ ہے		یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے
مری طاعت سے اب تو معصیت بھی عار کرتی ہے		مری توبہ پہ توبہ توبہ استغفار کرتی ہے
باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی		کالا کرے گا منہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی
مرچیں سی لگ رہی ہیں زخم جگر کو میرے		مصروفِ چارہ دیکھا کیا چارہ گر کو میرے
نہ پُوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے		نہیں یہ بھی معلوم ہے یا نہیں ہے
گل تو کھل کھلکر بہار اپنی صبا دکھلا گئے		حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کِھلے مرجھا گئے
لاشے کو پھینک دیجے میرے کہ دفن کیجے		مردہ بدستِ زندہ جو چاہیئے سو کیجئے
اے ذوق بس نہ آپ کو صوفی جتائیے	ق	معلوم ہے حقیقتِ ہو حق جناب کی
نکلے ہو میکدے سے ابھی منہ چھپا کے تم		دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی
تُو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق	ق	ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجکو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے		کیوں بُرا کہنے سے تو اُسکے بُرا مانتا ہے
ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے		کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

ذوقا۔ ذوقا شاہ بنارسی مجذوب تھے غدر سے پیشتر شرف الدین احمد کے پاس میرٹھ میں آ کر رہے تھے عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔ ذوقا

نے بام کی ہیں زیب نہ زینت کسی در کے	ہم باٹ کے روڑے ہیں اِدھر کے نہ اُدھر کے
قدر تم نے صاحب نجانی ہماری	گئی رائگاں جانفشانی ہماری

ذوقی۔ شاہ ذوقی درویش خانہ بدوش شعر دردمندانہ کہتے اور صاحبِ تصوف و اخلاق برگزیدہ تھے اٹھارھویں صدی کے وسط میں حیات تھے، یہ چند شعر اُنکے ہیں۔ ذوقی

اُس کا شکوہ نہ گاہ کیجئے گا	جس طرح ہو نباہ کیجئے گا

اُڑاے خوب گلچھرے نکل مجنوں نے زنداں سے
شرارے متصل نکلے یہاں تک سنگِ طفلاں سے

کہ ہر سو گلفشانی ہی شرارِ سنگِ طفلاں سے
کہ چمکے ہی سرِ مجنوں پہ بجلی سنگِ باراں سے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنسکر گذار یا اِسے رو کر گذار دے

اِس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہی
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

پئیں مے آشکارا کسکی ہمکو ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سُنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

وشاہو کالی نے جبکی ولکو تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلی
دہاں کاکُل کا تیری مارا نہ مُنہ سے بولی نہ سر سے کھیلی

دردِ دل سے لوٹتا ہوں کسکو میرا درد ہے
ہوں میں لفظِ درد جب پہلو سے اُٹھو درد ہے

کھلتا نہیں دل بند ہی رہتا ہے ہمیشہ
کیا جانے کہ آجائے ہی تو اسمیں کدھر سے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنیکی خبر دیتی ہے

یوں نگہ نکلی ہے چشمِ یار سے
مست جیسے خانہ خمار سے

تم دو گھڑی کو آؤ تو ہیں لب پہ جان کو
ٹھیرا رکھوں کہ اور بھی یاں دو گھڑی سہی

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعوٰی تجھپر
بلکہ پُوچھے گا خدا بھی تو مکر جائیں گے

لائی حیات آئے قضا لیچلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
سنتے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

ہم متاعدو اپنا کسیکو نہیں پاتے
تم پاتے ہو ہمکو تو چھری کو نہیں پاتے

جا کے اکبار نہ پھرنا تھا جہاں سے ہمکو
بیقراری ہے کہ سو بار لئے پھرتی ہے

دم کو ہمارے سینے میں اک دم نہیں قرار
یہ وہ غریب ہی کہ مسافر وطن میں ہے

ہمارے سینہ میں وہ آہِ آتشیں ہے ذوق
جو برق دیکھے تو فی النار و السقر ہو جائے

کیا لیچلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم
آئے تھے سر پہ خاک اڑانے اڑا چلے

لیجائیں تیرے کشتہ کو جنت میں بھی اگر
پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے

لیتے ہی دل جو عاشق دلسوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

نگہ کا وار تھا دل پہ پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

یہ ذوق مے پرست ہی یا ہے صنم پرست
کچھ ہو بلا سے لیک محبت پرست ہے

الفت کا نشہ جب کوئی مرجائے تو جائے
یہ درد سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم جانکر
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہمسے سیکھ جائے

زخمی ہیں ہوا ہوں تری دزدیدہ نظر سے
جانیکا نہیں چور مرے زخم جگر سے

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

گاہ ہجوم یاس میں ہے دل گاہ ہجوم حسرت میں
ہے یہ مرد سپاہی ہمیشہ پھرتا لشکر لشکر ہے

ہاتھ اٹھاؤ عشق کے بیمار سے
کوئی بچتا بھی ہے اس آزار سے

صاف اک ابر شفق آلودہ ہے
زلف اسکی سرخئ رخسار سے

لبریز صد نشاط برنگ ہلال عید
سینہ میں میرے ناخن غم کی خراش ہے

تمکو کچھ یاد بھی ہیں پہلے وہ الفت کے مزے
بے مزہ ہونیکے لطف اور شکایت کے مزے

دیکھ کر اسکو گیا عالم حیرت میں جو میں
لیک میں کیا کہوں اس عالم حیرت کے مزے

بے محبت نہیں ای ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں ای ذوق محبت کے مزے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہی

کیوں غنچہ پریشاں نہ ہو ہوتے ہی شگفتہ
اس باغ میں ہونا ہی دل شاد غضب ہے

وہ کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے
اور اس پہ بھی دلکش یہ غم آباد غضب ہے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ در توبہ باز ہے

خوب روکا شکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے

واجب القتل اُس نے ٹھہرایا
آیتوں سے روایتوں سے مجھے

کل جہاں سے کہ اُٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دلِ بیتاب مجھے

میں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو یہ باعث تھا
کہ رہا مدِّ نظر عشق کا آداب مجھے

ورنہ وہ شوخ کہ جو گل سے بھی نازک ہو سوا
لیوے اِس طرح سے زانو کے تلے داب مجھے

قسمت اُس بت سے جا لڑی اپنی
دیکھو احمق خدا سے لڑتی ہے

دیکھو اُس چشمِ مست کی خوبی
جب کسی پارسا سے لڑتی ہے

کوئی ہے کافر کوئی مسلمان جدا ہر اک کی ہے راہ ایماں
جو اسکے نزدیک رہبری ہے وہ اسکے نزدیک رہزنی ہے

زمیں پہ نورِ قمر کی گرمی میں صاف اظہار روشنی ہے
کہ جو ہیں روشن ضمیر اُنکو فروغ اُنکی فروتنی ہے

غمِ جدائی میں تیری ظالم کہوں میں کیا مجھپہ کیا بنی ہے
جگر گدازی ہے، سینہ کاوی ہے، دلخراشی ہے، جانکنی ہے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

یقیں ہے صبحِ قیامت کو بھی صبوحی کش
اُٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم
شکستِ توبہ لئے ارمغاں مغاں کے لئے

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے
سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

وہ مول لیتے ہیں جب دام کوئی نئی تلوار
مجھی پہ پہلے لگاتے ہیں امتحاں کے لئے

مثالِ نے ہے مرا جب تلک کہ دم میں دم
فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کے لئے

جو پاسِ مہر و محبت کہیں یہیں بکتا
تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لئے

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

رہائی قتل پر موقوف ہو گر ہم اسیروں کی
روانی تیغ کی پا بستۂ زنجیر جوہر ہو
ترے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنا ہو
فلک پر سنکے ہنستے ہنستے شادیٔ مرگِ عیسیٰ ہو

دیکھا دمِ نزع دلآرام کو
عید ہوئی ہو ذوق وہلے شام کو

عبث تم اپنا رکاوٹ سے مُنہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مُسکراتے ہو

ہوش و خرد گئے نگہِ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے بات اپنی سو دیوانہ پن کے ساتھ
افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

چھوڑا نہ دل میں صبر، نہ آرام، نہ شکیب
تیرِ نگہ نے صاف کیا گھر کے گھر پہ ہاتھ

ترے کوچے کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے
مجھے آتا ہے رشک اُس رندِ مے آشام پر ساقی
نہ جو دع ما کدر جانے نہ جو خذ ما صفا سمجھے
حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا
حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے

ساقیا ہوں نہ صبوحی کے جو عادت والے
شورِ محشر سے بھی چونکیں نہ ترے متوالے
کس مرض کی ہیں دوا یہ لبِ جاں بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزارِ محبت والے
نہیں جز شمع مجاور مرے بالینِ مزار
نہیں جز کشتۂ پروانہ زیارت والے
حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے
ہم نے اُس بت کو جو دیکھا ہے نہیں کہہ سکتے
کہ مبادا کہیں سن پائیں شریعت والے
کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
ہائے رے حسرتِ دیدار مری ہائے کو
لکھتے ہیں ہائے دوچشمی سے کتابت والے
ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اِس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

جاپڑا پانوں پہ قاتل کی تڑپ کر کُشتہ
سرد ہونے پہ بھی گرمیٔ وفا ہے اس میں

دین کیا ہے بلکہ دیجئے ایمان بھی اُنہیں
زاہد یہ بت خدا کی قسم ایسے شخص ہیں

خانقاہ میں بھی وہی ہے جو خرابات میں ہے
فرق پر یہ ہے یہاں منہ پہ ہے اور واں دل میں

ایک پتھر پُوجنے کو شیخ جی کعبے گئے
ذوقؔ ہر بت قابلِ بوسہ ہے یاں بتخانے میں

یہ طوق اس واسطے چھوٹا ہُوا قمری کی گردن میں
کہ تھا بلبل کی قسمت کا پڑا قمری کی گردن میں

باعثِ رشک ہُوا عشق ہمارا ہم کو
تجھ پہ بے دیکھے ہے غش جسنے کہ دیکھا ہمکو

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہمکو
آئے ہے جُز میں نظر کل کا تماشا ہمکو

کس بلندی پہ دیا عشق نے پُہنچا ہمکو
کہ فلک آیا نظر خال سے چھوٹا ہمکو

ہم تبرک ہوئے اب کرلے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لیئے آبلۂ پا ہمکو

کرتے جوں کو نہیں ہم تو سخن میں سبقت
پر وہ کچھ ہم سے سُنے گا جو کہے گا ہمکو

کھانے پینے کی قسم کھائی ہے تجھ بن ہمنے
ورنہ تھا زہر تو ہر طرح گوارا ہمکو

اِس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تونے مارا
وہ نصیب اُسکو ہوئی جو تھی تمنا ہمکو

اِک حلاوت ہے عداوت میں بھی اُس ظالم کی
کہ اگر زہر بھی دیتا ہے تو میٹھا ہمکو

سنگدل تین دن اب گور میں بھی بھاری ہیں
ہے سوم میں جو ترے آنیکا دھوکا ہمکو

دیکھا آخر کہ نہ پھوڑے کی طرح پھُوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپنے چھیڑا ہمکو

اور ہمدم تو کہاں ہو نہ ہوا حضرتِ دل
درد اب ہم کو تمھارا ہی تھا را ہمکو

موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

آتشِ فرقت میں پروانہ سا کیڑا جل مرے
آدمی سے کیا ہو لیکن محبت ہو تو ہو

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے اُس ہاتھ میں زلف سرکش ہو
پھر زلف رہے وہ دستِ موسیٰ جس میں اک اخگرِ آتش ہو

اک خون کا دریا جذب کیا ہے خاکِ کوئے قاتل نے
ہاں دفن کو ایسے کشتوں کے ایسی ہی زمین دلکش ہو

کسکو نکالوں کسکو رکھوں یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں

بحر ہیں موتی پانی پانی، لعل کا دِل خوں پتھر ہیں
دیکھو لب و دنداں سے تمہارے لعل و گہر کے جھگڑے ہیں

حضرتِ دل کا دیکھنا عالم ہاتھ اُٹھائے دُنیا سے
پاؤں پسارے بیٹھے ہیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں

ذوقؔ مرتب کیونکہ ہو دیواں، شکوۂ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے ہیں ہم نے اپنے، آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

چشمِ گریاں نے اگر کی اس برس برسات خوب
سبز ہو جائیں گی سب میری قفس کی تیلیاں

جس جگہ بیٹھے ہیں، بادیدۂ نم اُٹھے ہیں
آج کس شخص کا مُنہ دیکھ کے ہم اُٹھے ہیں

سینہ و دل پہ مرے زخمِ جگر ہنستے ہیں
ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
وہاں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

جو ہے سو پہلے میرے اُٹھانیکی فکر میں
محفل میں اُسکی میں کوئی جو سر کا ننگ ہوں

نہیں تدبیر کچھ بنتی پڑے سر کو پٹکتے ہیں
نہ دِل چھوڑے ہے اُسکو اور نہ ہم دل چھوڑ سکتے ہیں

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے میں
ہے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لیجانے میں

ہیں دہنِ غنچوں کے وا کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
شاید اُس کو دیکھکر صلِ علیٰ کہنے کو ہیں

قطعہ

ہائے کل سب آشنا تیرے مریضِ عشق کے
تھے علاجِ ضعفِ دل و ضعفِ تن کی فکر میں

آج گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں باچشمِ پُر آب
گاہ تدبیرِ لحد میں گہ کفن کی فکر میں

زاہدِ گمراہ کے میں کس طرح ہمراہ ہوں
وہ کہے "اللہ ہو" اور میں کہوں "اللہ ہوں"

کبھی کرتا ہوں فغاں اور کبھی ضبطِ فغاں
نہیں معلوم وہ خوش اس میں ہے یا ہے اُس میں

خضر ساقی ہو تو میں جام نہ لوں گر جانوں
کہ نہیں جام میں مے آبِ بقا ہے اس میں

اُس جفا کیش کے نامے کو پڑھوں کیا قاصد
جو کہ قسمت میں لکھا تھا وہ لکھا ہے اس میں

ہو جاتا دلِ ہی بیٹھ کے خود گلرخوں میں گُل
تاثیر باغِ خلد ہے تاثیر باغِ حسن

گئی یاروں سے وہ اگلی ملاقاتو نکی سب ہمیں
پڑا جس دن سے دل بس میں ترے اور دیکھے ہم ہیں

مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار اُنکے
ہزاروں دیچکے وہ قول لاکھوں کھا چکے قسمیں

مستی و نا آشنائی وحشت و دیوانگی
یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانے میں

اِس گلستانِ جہاں میں کیا گُلِ عشرت نہیں
سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں

کھا کے زخمِ تیغِ قاتل جو بجا لائے نہ شکر
کوئی بھی اُس سے زیادہ کافرِ نعمت نہیں

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا اُدھر دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

واعظا! چھوڑ ذکرِ جنت و حور
کر شراب و کباب کی باتیں

سُنتے ہیں اُن کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں
وہ پہلے بزم میں دیکھیں کدھر دیکھتے ہیں

مے ملا کر ساقیانِ سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

دیکھنا آبی ڈوپٹہ مُنہ پر اُسکے وقت خواب
بُرجِ آبی میں ہے مہ۔ یا مہرِ روشن آب میں

کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری پرسوں
ہُوئی برسوں نہ ہوئی پر وہ تمھاری پرسوں

جیتے ہی جی کیا ملکِ فنا میں ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں
مر کے اِدھر سے جبکہ چھُٹے تو جا کے اُدھر کے جھگڑے ہیں

کیسا مؤمن، کیسا کافر، کون ہے صوفی۔ کیسا رند؟
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے یہ شر کے جھگڑے ہیں

ایک ایک جور و ستم پر اُنکے سو سو داغ دل ہیں گواہ
ہم جو اُس سے جھگڑے ہیں، حق ثابت کر کے جھگڑے ہیں

غم کہتا ہے دشمن ہوں میں جلوۂ جاناں کہتا ہے ہیں

بنایا اسلئے اس خاک کے پتلے کو تھا انسان
کہ اسکو درد کا پتلا بنائیں سر سے پاؤں تک

سو ٹکڑے ہیں ایڑی کے بزنگ گل صد برگ
کیا دشت نوردی میں کرتا ہے جنوں گل

ہے روشنیٔ خانۂ دل ۔ سوز محبت
زاہد تو بتا شمع حرم کیونکہ کروں گل

بزنگ غنچۂ پیکان و غنچۂ تصویر
نہ دیکھا اپنا شگفتہ کسی بہار میں دل

کٹ سکا صید محبت کا نہ قاتل سے گلا
اُسنے پتھر سے یہ رگڑا کہ ہوا چاقو گرم

ہاں تأمل دم ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے، ہے کسی میخوار کا دل
محتسب دیکھ نکر دل شکنی، خوب نہیں

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے دل
باہم لڑا کے شیشۂ و ساغر کو توڑ دوں

احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ کے لنگر کو توڑ دوں

پھر اس مژہ کی یاد کرے ہے تو دلمیں ذوق
نشتر چبھو کے میں سر نشتر کو توڑ دوں

گو اضطراب دل کو بیاں کرتے ہم نہیں
پر جو نگاہ ہے رگ بسمل سے کم نہیں

دیتا ہے دور چرخ کسے فرصت نشاط
ہو جسکے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں

مشکل ہے میرے عہد محبت کا ٹوٹنا
اے بیوفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

رکاوُ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

کہانیاں ہیں حکایات خضر و آب بقا
بقا کا ذکر ہے کیا اس جہان فانی میں

وفور اشک اگر سر باوج ہو اپنا
فلک بزنگ گل نیلوفر ہو پانی میں

لگاتے تہمت گریہ ہیں دل جلوں کو ترے
یہ ہیں وہی جو لگاتے ہیں آگ پانی میں

مزا ہے تیغ محبت کے زخم کھانے کا
کرے جو صرفہ نہ قاتل نمک فشانی میں

ہفتاد و دو طریق حسد کے عدد ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

وہ ایک دم کہ جس میں میسّر ہو وصل یار
بہتر سمجھتے ہم اُسے عمر ابد سے ہیں

خورشید وار دیکھتے ہیں سبکو ایک آنکھ
روشن ضمیر ملتے ہر اک نیک و بد سے ہیں

وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تمنّا
بنیاد میکدہ مری خشت لحد سے ہیں

نکل کے رستہ سے چشمِ فتاں کے دِل میں بیٹھا خدنگ ہوکر
وہ چشمِ مخمور اک نظر سے، چُبھوئے لاکھوں جو نشتر سے
تو ہو رواں ہر رگِ جگر سے، لہو مئے لالہ رنگ ہوکر

کل گئے تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑکر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑکر
اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑکر
دِل تو لگتے ہی لگیگا حوریانِ عدن سے
باغِ ہستی سے چلا ہوں ہائے پریاں چھوڑکر
اِن دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑکر

کہا پتنگ نے یہ دار شمع پر چڑھ کر
عجب مزا ہے جو مریئے کسی کے سر چڑھ کر

ذبح کرنے کو مرے پوچھتے کیا ہو تکبیر
تم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لیکر

لے گیا دِل کون میرا ذوق کس کا نام لوں
سامنے آجائے تو شاید بتا دوں دیکھ کر

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

وہ کہے کون ہے قربان مری چتون پر
میں کہوں میں تو کہے "میں" کے چھری گردن پر

ہوں سرد ہو چکا نہ دوبارہ حلال کر
میں اور دم چراؤنگا یہ تو خیال کر
پوچھو اب چلے ہیں کو لئے کعبہ کو اہلِ درد
ملکِ فنا ہی جائیں ذرا دل سنبھال کر
تصویر اُنکی حضرتِ دِل کھینچ لائے گر
رکھدینگے ہم بھی پاؤں پہ آنکھیں نکال کر
قاتل ہے کس مزے سے نمک پاش زخمِ دل
بسمل ذرا تڑپ کے نمک تو حلال کر

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آہن کے پاس
بیوفا وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس
ہیں تو ایسی جھجک پہ فدا ہوں کہ کان کو
شب کیا ہٹا لیا مرے موئے دہن کے پاس
صفحۂ دہر پہ یک دل نہ ہوا ایک سے ایک
دسکنے وہ حرف ہیں وہ بھی ہیں جدا ایک سے ایک
ہم اُنکی چال سے پہچان لینگے اُنکو برقع میں
ہزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پاؤں تک
مراد ایک، دوں اُس خوش ادا کی کس ادا کو میں
کہیں وہاں تو ادائیں ہی ادائیں سر سے پاؤں تک

نالہ اس زور سے کیوں میرا دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے
جبتک نہیں آتا اسے غصہ نہیں آتا

ہمنے اُن سے دوستی کی، وہ ہیں کرتے دشمنی
دیکھو کیا سوچا تھا ہمنے اور وہاں کیا ہو گیا

تری چشم فسوں گر نے کہاں سیکھا تھا یہ جادو
کیا ہے اک نگہ میں اے پری تسخیر دل میرا

اُسنے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں ہونا اچھا
وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہنے جانا اچھا

تم نے دشمن ہی جو اپنا ہمیں جانا اچھا
یارِ ناداں سے تو ہی دشمنِ دانا اچھا

یہاں تو دم میں نہیں دم اور وہ لئے تیغ دو دم
کہتے ہیں دیکھو نہیں دم کا چرانا اچھا

آگ ہے دل میں، درد جگر میں، آنکھ میں آنسو لب پہ فغاں
عشق نے اُنکے ذوق ہمارا دیکھو یہ ہی حال کیا

ترے ہاتھوں کوئی آوارہ اے گردوں نہ ٹھیریگا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھیروں نہ ٹھیریگا

دہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی
اگر ہاتھ آئیگا گنجینۂ قاروں نہ ٹھیرے گا

کعبہ کے دیوار و در سے نور کے جلوے اُٹھیں
گر پڑے سایہ مرے میخانہ کی دیوار کا

دُنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دین گیا
وہ ہل گیا تو جانئے کچھ بھی نہیں گیا

آخر گِل اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مجنوں! بس سیاہ خیمۂ لیلیٰ کے گرد پھر
اے خوش نصیب تجکو طوافِ حرم نصیب

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

ریشِ سفیدِ شیخ میں ہے ظلمتِ فریب
اِس مکر چاندنی میں نکر ناگمانِ صبح

تھی زلف تیری سنبل صحنِ چمن کی شاخ
قطروں سے پر عرق کے بنی یاسمن کی شاخ

بد خصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک
اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

ماتھے پہ ترے چمکے ہے جھومر کا پڑا چاند
تھا وعدہ چڑھے چاند کا لا بوسہ چڑھا چاند

مُہر وہ کرتا ہے نامہ پہ مجھے آتا ہے رشک
ہائے یوں چوسے لعاب اُسکے دہن کا کاغذ

نکہ نہیں حرفِ دلِ نشیں تھا، دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر	آرام سے ہے وہ جو تکلف نہیں کرتا
گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا	یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا
تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا امید	تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا
چشم و نگہ کو تیری بدنام کیوں کریگا	مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ لے مریگا
عبث جاں منتظر ہونٹوں پہ ہے وہ شوخ کب آیا	اگر ہلچل کو بھی آیا تو ہم جانیں گے اب آیا
لگائی زلف کو شانے نے جب انگلی پکارا دل	یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی سالے بے ادب آیا
ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا	خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا
واہ کیا مرہم زخم دل بیتاب بنا	آب سے نیشتر تیز کے تیزاب بنا
تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ	اپنا آئینہ مرا دیدۂ پر آب بنا
محفل میں شور قلقل مینائے مل ہوا	لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا قتل ہوا
آنا تو خفا آنا جانا تو رولا جانا	آنا ہے تو کیا آنا، جانا ہے تو کیا جانا
کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا	کمی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا
یوں لائے واں سے ہم دل صد پارہ ڈھونڈ کر	دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا
موت نے کر دیا ناچار و گرنہ انسان	ہے وہ خودبیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
مسجد میں اسنے مجکو آنکھیں دکھا کے مارا	کافر کی دیکھ شوخی گھر میں خدا کے مارا
ہزار دم میں اسے یاد تونے دیکھا ذوق	گیا وہ غیر کے گھر مجکو ٹال کر گیا
شکر پردے ہی میں اس بت کو خدا نے رکھا	آج ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا
کر کے بسمل جب مجھے کس ناز سے کہتا ہے وہ شوخ	دیکھ تر کیجیو نہ خوں سے کہیں داماں میرا
رکھتے تھے جو کشور کسریٰ و قیصر زیر پا	ہے انھیں کا آج سر تاج افسر زیر پا
آتی ہے صدائے جرس ناقۂ لیلیٰ	پر حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا
ہنگامہ گرم ہستی ناپائدار کا	چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

قسمت ہی سے لاچار ہوں ای ذوق وگرنہ
ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

آنکھیں مری تلووں سے وہ ملجائے تو اچھا
ہے حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا

کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

آدمیت اور شے ہی علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

سبکو دیکھا اُس سے اور اُسکو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

بل بے گدازِ عشق کہ خوں ہوکے دلکے ساتھ
سینے سے تیرے تیر کا پیکان بہ گیا

تھا ذوق پہلے دہلی میں پنجاب کا سا حُسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہ گیا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا
کام جنت میں ہی کیا ہمسے گنہ گاروں کا

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا
دتبجے اک جام تو ہی یار ابھی یاروں کا

اتنا تو شور و فغاں ہو کہ چمن میں بلبل
خرمنِ گُل کی جگہ ڈھیر ہوا انگاروں کا

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسےٰ
ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

لختِ دل اور اشکِ تر، دونوں بہم، دونوں جُدا
ہیں رواں دو ہمسفر، دونوں بہم دونوں جُدا

وصل کی شب نکہت و گل کی طرح ہم اور وُہ
رہتے ہیں باہم دگر، دونوں بہم، دونوں جُدا

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہی جس سے ذوق
نامرد، مرد، مرد جواں مرد ہو گیا

کریں جُدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جُدا

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب کے مرنے سے ہے جینا سہارے کا

کہتے ہیں ذوق آج جہاں سے گذر گیا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُسکو گر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نکرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

وہ کون ہی جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا

شعر میں اپنا وقت صرف کرتے تھے، گرمی، جاڑا، برسات، تینوں موسم اس حالت میں بسر کر دیتے تھے، کسی میلے ٹھیلے، عید، تہوار سے اُنھیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اول روز بیٹھے وہیں سے مر کر اُٹھے، اِنکے اکثر اشعار قبولِ عام کی سند پا کر آجکل خواص و عوام کی زبانوں پر جاری اور دلوں میں جاگزین ہیں۔ شبانہ روز شاگردوں کے کلام کی اصلاح اور دقائق و رموز سخن کی تعلیم کے لیے وقف تھا، آخر عمر میں اکثر بیمار رہتے تھے، آخر ماہِ صفر ۱۲۷۱ھ میں مرضِ اسہال اور ضعف نے غلبہ کیا اور شب چہار شنبہ آخری کو عالم بقا کا رخ کیا، دوسرے روز جنازہ بڑے تزک و احتشام سے اُٹھا۔ خواجہ باقی باللہ کے قرب میں دفن کیا۔ بادشاہ کی تاریخ لوحِ مزار پر کندہ ہے۔ بادشاہ نے غمِ اُستاد سے اُس روز جشن موقوف کیا۔ اور اگرچہ دابِ سلطانی کے خلاف تھا قطعۂ تاریخ زبانِ الہام ترجمان سے ارشاد کیا اور بار بار مرحوم کے حقوق جان نثاری کو یاد کر کے افسوس فرماتے رہے

شب چار شنبہ بماہِ صفر		بہ حکم خداوند جان داد ذوق	
ظفر روئے اُردو بنا خن زغم		خراشید و فرمود اُستادِ ذوق	

تخمیناً چار سو تاریخیں اِنکے انتقال کی کہی گئیں جن میں نظم "واقعۂ تعجب خیز" مصنفہ عبدالکریم سوز خلف الرشید حضرت صہبائی بہت مشہور ہوئی۔ اب دیوانِ مطبوعہ کا انتخاب ملاحظہ ہو ؎

غنچہ جب گول وہ بانکا جواں سینے لگا		موت کے جی میں مزے یہ نیچاں لینے لگا
مجکو ہر شب ہجر کی ہونے لگی جوں روزِ حشر		مجھ سے یہ کس دن کے بدلے آسمان لینے لگا
تیر جھنگی میں لیا اُسنے سپئے جانِ عدو		شوق کیا کیا میرے دلمیں چٹکیاں لینے لگا

	ہاتھ تو ہلکا پڑا تھا یار کی شمشیر کا	زخم پر قسمت سے میری کارگر اچھا ہوا	
	ذوق کے مرنے کی سُن کر پہلے تو کچھ رُک گئے	پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر "اچھا ہوا"	
	پانی طبیب دے ہے ہمیں کیا بجھا ہُوا	ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہُوا	
	جینا ہمیں صلا نظر اپنا نہیں آتا	گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا	
	مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا	پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا	

زمانہ ہوئے، ذوق اگرچہ نازک خیالی اور مضمون بندی میں غالب اور حکیم مومن خاں کے رتبہ کو نہیں پہنچے مگر انکی خداداد ذہانت اور ہمہ دانی نے اس کمی کو جیسا کہ چاہیئے پورا کرد کھایا۔ اسی وجہ سے مشاعروں میں جب غزل ہم طرح پڑھتے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مذکور الصدر نامور شعرا سے پست رہے ہیں، ابتدا میں سودا کا رنگ اختیار کیا پھر شاہ نصیر اور جرأت کی طرز پر کہنے لگے حتیٰ کہ کثرتِ مشق سے اپنا رنگ پیدا کر لیا جس میں محاورے کے نظم کرنے کا اسلوب صحتِ الفاظ وزبان چستیٔ بندش، فصاحت، شگفتگی مضمون اور حسن ادائے بیان بدرجہ اتم موجود ہیں، انہیں خوبیوں کی بدولت یہ ہر طرح اپنے بلند پایہ ہمعصروں کی ٹکر تھے اور بعض وصفوں میں اُن سے افضل۔ ایک خاص وصف جن سے اِنکی اُستادی مسلّم ہوتی ہے یہ تھا کہ اکثر پامال مضامین اس خوبی سے اور ایسے الفاظ میں باندھتے تھے کہ اپنی جدت طرازی سے نئے خیال کا لطف اُس میں پیدا کرتے تھے، روزمرہ نہایت بےتکلفی اور صفائی سے برتتے تھے۔ سنگلاخ زمینوں میں اپنے اُستاد شاہ نصیر کی تحریک سے خوب خوب زورِ طبع دکھایا۔ قصیدے بھی بڑی شان اور آن وبان کے کہے اور اپنی مسلم الثبوت اُستادی کا سکہ تمام معاصرین کے دلوں پر بٹھا دیا سوائے میر ممنون کے اُنکے معاصرین یا متقدمین میں سے کسی نے اِس زور اور شان وشوکت کے قصائد نہیں کہے، نساخ۔ گارسن ڈی ٹیسی، شیفتہ، صہبائی۔ آزردہ، جیسے منصف مزاج باکمالوں نے انھیں فن شعر کا بادشاہ اور قادر الکلام اُستاد تسلیم کیا ہے۔ فنِ شعر سے ازلی مناسبت قسامِ ازل نے دی تھی اور رات دن سوائے فکرِ شعر کے کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ شاہ ظفر کی رضاجوئی عقیدت کے درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔ جسقدر کمال کا درجہ بلند ہوا اُسی قدر پندار کو پست اور خاکساری کو بلند تر کیا۔ اور اسی میں خوش تھے، قناعت وسادگی مزاج کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ متعدد مکانات اُنکی املاک میں تھے مگر خود یہ ایک تنگ وتاریک مکان میں عمر بھر رہا کیے جسکی انگنائی اسقدر مختصر تھی کہ بمشکل ایک چارپائی اُس میں بچھتی تھی دوطرفہ اتنی جگہ رہتی تھی کہ ایک آدمی بدقت چل سکے، کھرّی سی چارپائی پر رات دن بیٹھے رہتے تھے اور مطالعہ اور فکر

مسودے تکیے کے غلاف میں بھرے اور گھر میں دیکر کہدیا کہ احتیاط سے رکھنا، کبھی مٹکے میں کبھی ٹھلیا میں بھرے اور گھر میں بھجوا دیئے کہ ضائع نہو۔ اِس طرح بہت سے تھیلے اور مٹکے ٹھلیاں بھر گئے تھے۔ وفات کے چند روز بعد مَیں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں سب ذخیرہ نکالا محنت نے اُسکے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو بہایا۔ کیونکہ بچپن سے لیکر دمِ واپسیں تک کا کلام اُنھیں میں تھا، چنانچہ اول اُنکی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لیئے، یہ کام کئی مہینہ میں ختم ہوا۔ پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اِس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے شروع کیا مگر باطمینان کیا، مجھے کیا معلوم تھا کہ اِس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائیگا۔ عالم تہ و بالا ہو جائیگا۔ دفعتہً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ چنانچہ خلیفہ محمد اسمعیل اُنکے فرزند جسمانی کے ساتھ اُنکے فرزندانِ روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے" مندرجۂ بالا حال بہ تغیّر مُناسب تذکرۂ آبِ حیات سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ کلام اِس وقت چھپا ہوا ملک میں موجود ہی یہ اُس پُرگو اُستاد کے تمام و کمال کلام کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہی۔ اِسکی تدوین و ترتیب کی حقیقت یہ ہی کہ غدر کے بعد جب دہلی دوبارہ آباد ہوئی اور کسیقدر اطمینان ہوا تو اُستادِ مرحوم کے تلامذہ رشید مولانا ظہیر، حضرت انور، اور حافظ ویراں نے جمع ہو کر مشورہ کیا کہ اگر اِس وقت اُستادِ مرحوم کا کلام جمع نہ ہوا تو پھر کوئی نام لینے والا بھی نہ رہیگا۔ الغرض حافظ ویراں جو شاگرد ہونے کے علاوہ ہر وقت کے رفیق اور ہمنشین تھے اُنھوں نے اپنے حافظہ سے کلام لکھوانا شروع کیا اور مولانا ظہیر اور انور نے اُسکی کتابت کی اور ادھر اُدھر جہاں کہیں سے اشعار فراہم ہو سکے مہیا کر کے سنہ ۱۸۶۰ء میں دیوان جو آجکل رائج ہے چھاپکر شائع کر دیا۔ اُستاد ذوق کی محاورہ بندی مضمون آفرینی، کلام کی پختگی، صحتِ زبان، سلاستِ بیان، شہرت محتاجِ بیان نہیں، ہر ایک مذاقِ سخن کا لذت یاب اِس مزے سے واقف ہی اُنکے کلام میں جو زبان کے چٹخارے تھے اُسکا اثر پڑھنے والوں کے دلوں میں موجود ہے۔ خاقانی ہند کے شاگردوں میں۔ شاہ ظفر حافظ ویران، مولوی محمد حسین آزاد، ظہیر، انور، مخبر اور سب سے زیادہ فصیح الملک مرزا داغ مرحوم اشہر

عبدالرزاق نامی اُستاد مقرر ہوئے۔ اتفاقاً ایک دن یہ بھی مولوی صاحب کے ساتھ چلے گئے چونکہ ان کی تیزی طبع کا شہرہ ہوگیا تھا راجہ صاحب رام نے اِن سے کہا کہ میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک رہو، چنانچہ اس بہانہ سے اِنکی تحصیل علمی بھی مکمل ہوگئی، مولوی محمد حسین صاحب آزاد کہتے ہیں کہ "شیخ مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے سات سو دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور اُنکا خلاصہ کیا، اُساتذہ کی تصنیفات ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی صدہا کتابیں گویا اُنکی زبان پر تھیں مگر مجھے اِس کا تعجب نہیں۔ اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر اُنھیں ازبر تھے تو مجھے حیرت نہیں، گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ شعر سند میں دیتے تھے مجھے اِس کا بھی خیال نہیں کیونکہ جس فن کو وہ لئے بیٹھے تھے یہ سب اُسکے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مؤرخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں۔ خصوصاً تصوّف میں ایک عالم خاص تھا۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے، خواب کی تعبیر میں اُنھیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا اور لُطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے، علم طب کو خوب تحصیل کیا۔ مگر کام نہ کیا۔ خوف آتا کہ ایسا نہ ہو بے پروائی سے کسی کا خون ہو جائے۔ کچھ دنوں تک موسیقی کا بھی شوق رہا مگر پھر اس سے دِل برداشتہ ہوگئے"

مرزا جواں بخت کی شادی کے موقعہ پر استادِ شاہی نے وہ مشہور سہرا پیش کیا جس کا جواب مرزا غالب نے بہ تحریک نواب زینت محل بیگم تحریر کیا۔ سہرے کی ایجاد کا فخر اِس حساب سے حضرت ذوق کا حق ہے یہ دونوں سہرے اپنی نوعیت اور تازگی مضمون و خیال کے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہیں۔ مثنوی جانسوز بھی تصنیف کی تھی۔ لوگوں کو تعجب ہوگا کہ اتنا بڑا شاعر جو رات دن اسی شغل میں رہتا ہو اور اُس کا دیوان اتنا مختصر اسکے متعلق پروفیسر آزاد لکھتے ہیں کہ "اس کا بیان ایک مصیبت کا افسانہ ہے، خود شیخ مرحوم فرماتے تھے کہ بچپن میں جبکہ پندرہ سولہ برس کی عمر تھی ہم نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا اور اُسے بڑے شوق سے لکھا تھا۔ پھر زمانے نے فرصت نہ دی، جو غزل ہوتی مُسوّدا کاغذ پر لکھی جاتی اِسی طرح طاق میں رکھ دیتے کہ فرصت میں نظر ثانی کرینگے۔ جب طاق بھر گیا

ہو گئے۔ جب ظفر بادشاہ ہوئے اور میرزا مغل بیگ وزیر، تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا مگر اُستاد شاہی کا صرف تیس روپیہ مہینا مقرر رہا۔ فطرتی طور پر ذوق بہت متین و مہذب اور منکسر مزاج تھے اس لیے انھوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لیے کچھ نہ کہا۔ اور نامساعدت تقدیر سے اس رتبۂ جلیلہ اُستادی پر مشرف ہونے کے باوصف کبھی خوشحالی یا امیرانہ زندگی بسر کرنے کے وسائل میسر نہ ہوئے۔ اُنکی عادت تھی کہ فکر سخن میں ٹہلا کرتے تھے اور اسی حالت میں شعر بھی کہتے جاتے تھے، چنانچہ اُن دنوں میں جب کوئی عالی مضمون چستی اور درستی کے ساتھ موزوں ہوتا تو اُسکے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے۔

اے کمال افسوس ہے تجھپر کمال افسوس ہے	یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے

چندروز کے بعد مرزا مغل بیگ کی تزکی تمام ہو گئی، نواب حامد علیخان مرحوم مختار ہوئے تب اُستادِ شاہی کا سو روپیہ مہینا مقرر ہوا۔ ہمیشہ عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے پڑھتے تھے اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے۔ آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی اور انہوں نے ایک قصیدۂ غرّا کہہ کر پیش کیا تو خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام میں ملا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گزرانا جس کا مطلع ہے

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت	نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

حضرت ذوق کا سانولا رنگ تھا متوسط اندام اور چہرہ چیچک کے داغوں سے پُر تھا آنکھیں تیز اور روشن تھیں اور آواز بلند اور خوش آیند جس سے مشاعرے میں رنگ تاثیر دوبالا ہو جاتا تھا۔ اپنی غزل کسیکو پڑھنے کے لیے ہرگز نہ دیتے تھے، ابتدائے عمر میں شیخ مرحوم نے معمولی درسی تعلیم پاکر شعر گوئی کی طرف توجہ کر دی تھی مگر پھر رفتہ رفتہ مشاعروں کی معرکہ آرائیوں اور حریفوں کے اعتراضوں نے انھیں تکمیل علوم اور سیر کتب کی طرف متوجہ کیا اور فطری شوق کی مدد سے قلیل عرصہ میں وہ ایک جیّد فاضل ہو گئے اور معلومات کا دائرہ وسیع کر لیا جس کا قدرتی سامان یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام جو مختارِ املاک شاہِ اودھ تھے اُنکے بیٹے کے لیے ایک فاضل کامل مولوی

سکہ بٹھایا اور کچھ اسباب ایسے فراہم ہوئے کہ مرزا کاظم حسین بیقرار جو مرزا ولی عہد کی غزل شاہ نصیر کے دکن چلے جانے کے باعث دیکھا کرتے تھے الفنسٹن صاحب کے میر منشی ہو کر چلے گئے اور میرزا ابوظفر انکے شاگرد ہو گئے، ابتداءً سرکار ولیعہدی سے شیخ مرحوم کا مشاہرہ چار روپیہ ماہوار مقرر ہوا۔ مولٰنا آزاد نے جوش عقیدتمندی میں آب حیات میں یہ ذکر بھی کر دیا ہے کہ نواب الٰہی بخش خان معروف جو شاہ نصیر کے پُرانے شاگرد اور اس وقت ۶۶ سال سے زائد انکی عمر تھی اُنہوں نے حضرت ذوق کو جو بمشکل اٹھارہ برس کے تھے اپنا اُستاد بنایا اور اپنے دونوں دیوان درستی کے لیئے دیئے۔ اس واقعہ کی تکذیب نواب ضیاءالدین احمد خان نیر و رخشان اور نواب احمد سعید خان صاحب طالب نے خود مولانا آزاد سے مباحثہ کر کے بہ براہین قاطع کر دی تھی، مگر افسوس کہ مولانا نے اقرار کر لینے کے باوصف طبع ثانی میں اس بیان کی تردید نہ کی بلکہ جب کئی برس بعد دیوان ذوق خود شائع کیا تو اُس میں فخریہ اس عبارت کو نقل کر دیا۔

اگلے سال شیخ مرحوم نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں سنایا کہ جسکے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدایع صرف کئے تھے اِس قصیدہ پر بادشاہ نے "خاقانی ہند" کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی عمر بقول حضرت آزاد اُنیس ۱۹ برس کی تھی، اِن ایّام میں میر کلو حقیر حضرت ذوق کے بڑے ممد و معاون رہے۔ ۳۶ برس کی عمر میں آپنے جملہ منہیات سے توبہ کر لی تھی اور اُسکی تاریخ یہ کہی ع "اے ذوق بگو سہ بار توبہ"

مرزا ابوظفر بادشاہ ہوئے تو اُنہوں نے یہ قصیدہ پہلے گزرانا۔

ہے ذرہ تیرا پر تو نورِ سحر رنگ شفق		رو کش ترے رُخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگ شفق	

اِس قصیدہ کی فصاحت اور پرواز تخیل و شوکتِ الفاظ و نزاکتِ خیال قابلِ داد ہے۔ اگرچہ مرزا ابوظفر ہمیشہ انھیں دل سے عزیز رکھتے اور دلی رازوں کے لیئے مخزنِ اعتبار سمجھتے تھے مگر ولیعہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے، جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کا موقعہ آیا تو اُستاد ذوق کے لیئے یہ ہوا کہ چار روپیہ مہینے سے پانچ روپیہ ہو گئے پانچ سے سات روپے

فال سمجھوں، مگر ان دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی اُس مزہ کو کبھی نہیں بھولا۔ غرضکہ شیخ مرحوم اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔ اسی محلے میں میر کاظم حسین نام ایک اِن ہی کے ہم سبق تھے اور نواب سید رضی خاں وکیل سلطانی کے بھانجے بیقرار تخلص کرتے تھے، اور حافظ غلام رسول سے اصلاح لیتے تھے، ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی، شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی، خوب گرم شعر نکالے ہیں، اُنھوں نے کہا کہ ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے، شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور اُنکے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد غزلوں کی اصلاح میں بے توجہی اور علی الخصوص تمنیر خلف شاہ صاحب کے کلام میں انھیں مضامین کے بندھنے سے شاہ نصیر سے بگاڑ ہو گیا۔ اِنکی طبیعت بھی قادر الکلامی کا سارٹیفکٹ حاصل کر چکی تھی رُو در رُو مشاعروں میں مقابلہ ہونے لگا۔ اور اصلاح کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اِن کی قدرتی طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثر برق کی طرح دوڑ ہی اور کلام کا چرچا بڑھا۔ غزلیں ارباب نشاط کی زبان سے نکل کر کوچہ و بازار میں رنگ اُڑانے لگیں۔ اکبر شاہ بادشاہ تھے اُنھیں تو شعر سے رغبت نہ تھی۔ مرزا ابو ظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملکِ شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اِس لیئے دربار شاہی میں جو کہنہ مشق شاعر تھے مثلاً ثناءاللہ خاں فراق، میر غالب علیخاں سید، عبدالرحمٰن خان احسان، برہان الدین خاں زار، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اور اُنکے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خان عشق، میاں شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم۔ میرزا عظیم بیگ شاگرد سودا، میر قمر الدین منّت اور اُنکے بیٹے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب شاعر وہیں آکر جمع ہوتے اور اپنا اپنا کلام سناتے تھے، میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے مصاحب تھے اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے، شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اِس جلسے میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوت فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا، چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے، رفتہ رفتہ اُنکی قادر الکلامی نے

نیا انداز، نئی طرزیں، نیا جوبن، نئی باتیں بلا کنٹھا ستم یہ ہے غضب چمپہ کلی تس پر		الٰہی چشم بد دور ہوش ابھی اُس نے سنبھالا ہے گلے میں دُھگدگی آفت پڑی سینہ پہ مالا ہے	
	شب قصہ میں اپنے درد کی بات سُن سن کے لگا وہ کہنے ہاں ہاں	میں نے جو سُنائی ناگہانی آگے بھی سُنی تھی یہ کہانی	

ذوق

ذوق - عندلیبؔ شکرستان فصاحت وطوطیٔ چمنستانِ بلاغت ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم دہلوی ولد شیخ محمد رمضان ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴؁ھ کو پیدا ہوئے، اِنکے خاندان کے لوگ اب بھی دہلی میں جراحی کرتے ہیں، اسکے علاوہ کچھ قطعات تاریخِ وفات سے بھی یہ بات ثابت ہے، نیز یہ امر کہ کسی ہمعصر تذکرہ نویس مثل شیفتہ، آزردہ، نساخ - صابر، محسن، منشی کریم الدین، کسی نے ولدیت کا اشارہ تک نہیں کیا جو غالباً عمداً معلوم ہوتا ہے مگر مولوی محمد حسین آزاد اُستاد پرستی کی ترنگ میں شیخ محمد رمضان کو سپاہی زادہ بتاتے ہیں، اُنکا بیان ہے کہ انکی زبانی تقریریں تاریخی معلومات سے لبریز ہوتی تھیں، وہ دلّی میں کابلی دروازے کے قریب رہتے تھے اور نواب لطف علیخاں نے اُنھیں معتبر سمجھ کر اپنے حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے - شیخ ابراہیم ذوق جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ انکے گھر کے پاس رہتے تھے، محلّے کے اکثر لڑکے اُنھیں سے پڑھتے تھے، اِنھیں بھی وہیں بٹھا دیا - حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے، شوق تخلص کرتے تھے - شیخ مرحوم کو اُنکی صحبت میں بہت شعر یاد ہوگئے، نظم کے پڑھنے اور سننے میں دلکو روحانی لذّت ہوتی تھی شیخ مرحوم کا قول تھا کہ میں ہمیشہ اشعار پڑھا کرتا - دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے، اِسی زمانے کا ایک مصرع ہے ؎ مزا انگور کا ہے رنگترے میں (یہ فقرہ آجتک دہلی میں میوہ فروشوں کی زباں پر ہے) ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حسنِ اتفاق تھا کہ ایک حمد میں ایک نعت میں، اِس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود اِس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو دوسرا نعت میں، جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک

مشق کم تھی مگر ذہن رسا اور فکر بجا رکھتے تھے، قدرت اللہ شوق کہتے ہیں مجھ پر اُنکا حق نمک بدرجۂ نہایت ہے۔ الغرض شاہ عالم ثانی کے آخر عہد میں ایک خوش باش، خوش گذران رئیس تھے۔ اور علم و ہنر کے قدر دان۔ یہ اُنکا کلام ہے۔

لگی ہے آخرش جا کر یہ ظالم تیرے قدموں سے
چلا تھا بو نہ کچھ اس خاک دامنگیر پہ تیرا

اگر میری طرح سیماب دل ہارے تو میں جانوں
ٹھہوس نازہ بجا ہے اب اس اکسیر پر تیرا

جب سے ان ماہ وشوں سے یہ مری آنکھ لگی
شیوا پکڑا ہے سدا چشم نے بیداری کا

کچھ ستم سا جو ستم ہو تو میں تقریر کروں
ہا بکیجے بیاں تیری ستم کی صورت

ہائے شب پوچھے تھا وہ مجھ سے کس انداز سے راز
کہہ سکا ایک نہ میں خطرۂ غماز سے راز

پہنچا ہے جب سے گوشۂ دستار پر ترے
ہے کچھ بلند عرش بریں سے دماغ گل

لخت دل اشک سے اب رہتے ہیں پانی میں
گرچہ آتش نہیں آتی ہے نظر پانی میں

عکس ابرو کا تری دیکھ کے مثل شمشیر
موج دریا کی ہوئی زیر و زبر پانی میں

خدا ہی جانے کہ طفلی میں کیا بلا ہوگا
مجھے تو مار گئی یہ ادا جوانی کی

برنگ مہر و شبنم نت مری اوقات کٹتی ہے
جو سر گرداں پھروں دنکو تو روتے رات کٹتی ہے

اہل چمن کو کسکی گلشن میں جستجو ہے
ہر سرو جو کھڑا واں جھانکے ہر ایک سو ہے

ملے کیا کیا جواہر عشق کے ہمکو خزینہ سے
جھڑے ہیں داغ اور گل کھائے سینہ پر نگینے سے

کہاں وہ دن کہاں وہ دل کہاں ہے تیرا وہ عالم
سفر کر آئے ہیں مدت میں لگجا اب تو سینے سے

جواب خط کو کب لکھتا ہے جسنے پڑھتے ہی نامہ
مرا نام ہی تراشا یک قلم دے کے سفینہ سے

نکلتے ہیں ستارے دن کو بھی خورشید کے آگے
ہوئی یہ بات اب روشن ترے منہ کے پسینے سے

دُرِ گوشِ خوباں تو ہے آفتِ جان
پر اُس کانِ خوبی کا بالا بلا ہے

پری، یا حور، یا غلماں، کہ نور حق تعالیٰ ہے
کہ چپ رہنے کی جا ہے اُسکا عالم ہی نرالا ہے

بلا، آفت، غضب، قہر خدا وہ قد بالا ہے
فلک نے بیکسوں کیواسطے یہ فتنہ پالا ہے

کل پرسوں کیسی ہم تو ہیں حاضر ابھی صنم	خنجر نکالئے کہیں صاحب کمر سے آپ
عاشق تو مَیں ہوں یہ تو بچارا ہے ایلچی	بیفائدہ اُلجھتے ہیں کیوں نامہ بر سے آپ
آپ روشن ہیں آپکے غلماں بنینگے دوست	ہاں ہم بشر ہیں کیونکہ ملینگے بشر سے آپ
کیا میرے ذبح کرنے میں خنجر کی جستجو	کر دیجئے فیصلہ مرا ترچھی نظر سے آپ

ذکی

ذکی ۔ منشی اشفاق حسین صاحب قوم کمبوہ ساکن قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ محکمۂ بندوبست میں ملازم اور ابتدائے عمر سے شعر و سخن کے شائق ہیں پچاس برس کے قریب عمر ہے پرانی طرز میں شعر کہتے ہیں، فارسی کا مذاق بھی رکھتے ہیں ترتیب تذکرہ کے وقت جو انکا کلام وصول ہوا اُس کا انتخاب لکھا جاتا ہے ۱۸۹۷ء میں بہ سلسلۂ ملازمت بدایوں میں تھے اور زیادہ حال معلوم نہیں ۔

سُنکر یہ بار بار تمہاری نہیں نہیں	ہاں کا بھی اعتبار اب اے نازنیں نہیں
چھوڑ آتے گر عدم میں تو رہتے تو چین سے	دنیا میں آئے کیوں دلِ مضطر لیئے ہوئے
وحشت کا جوش پھر رہی مجھے کوہ و دشت میں	پھرتا ہے میرے بخت کا چکر لیئے ہوئے
کشتے تمہاری تیغ نظر کے مقتیں ضرور	جاوینگے پیشِ داورِ محشر لیئے ہوئے
ساقی تمھارے پہنچے کہاں سے کہاں ذکیؔ	بیٹھے رہو تم اپنا مقدر لیئے ہوئے

ذلیق

ذلیق ۔ مولوی محمد نصر اللہ خان، مدرسِ مدرسۂ اسلامی عربی حسن پور ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

اجل تو بیٹھی ہے روزِ ازل سے تاکے مجھے	حیات رکھتی ہے لیکن بچا بچا کے مجھے
تمھارے دل کی تمنا بھی ہو گئی پوری	شبِ وصال وہ بولے گلے لگا کے مجھے
اُٹھاؤ ہاتھ مرے دردِ دل سے چارہ گرو!	خدا پہ چھوڑ دو اب واسطے خدا کے مجھے
دلِ حزیں سے مرے سختیاں نہیں اٹھتیں	بتو! معاف کرو واسطے خدا کے مجھے

ذوق

ذوق ۔ الف خان ابنِ دلیر خان معروف بہ خنجر علی فشان پسر بخشی اعظم نواب سعد اللہ خاں آپ اہلِ مروّت، آشنا پرست، صاحبِ حوصلہ، خوش سلیقہ، خوش تلاش، خوش فکر تھے ۔ اگرچہ

عزیز و بعدِ مُردن مجکو نہلانا تو یوں کرنا
پھر گر کوچۂ قاتل سے مل لینگے ذکی ورنہ
مٹانا داغِ حسرت پہلے پھر سارا بدن دھونا
ہماری زندگی سے ہاتھ لے اہلِ وطن دھونا

عاشق کو اک اشارہ میں گردش میں ڈالدیا
سر گرمئی ہجومِ نظارہ تو دیکھ لیں
کُشتے تمہارے دینگے لبِ گور سے جواب
نرگسی آنکھ نے مارا تری ای یار مجھے
تجھکو ہر روز گریباں کہاں سے لادوں
آنکھیں تری نمونۂ لیل و نہار ہیں
مثلِ نقاب رخ پہ نگاہوں کے تار ہیں
اتنا تو پوچھ آکے یہ کس کے مزار ہیں
آپ سا کر لیا بیمار نے بیمار مجھے
اے جنوں اب تو میسر نہیں اک تار مجھے

خدا سے شکوۂ جورِ بتاں کیجے تو کیا کیجے
جفا جو، بے مروت، بیوفا، بے مہر، بے پروا
شکایت گل کی پیشِ باغباں کیجے تو کیا کیجے
ذکی یہ ہے شعارِ گلرخاں کیجے تو کیا کیجے

ذکی - منشی محمد کریم لکھنوی، آپ بہ سلسلۂ ملازمت ریاستِ بھوپال میں سنہ ۱۹۰۰ء میں برسر روزگار تھے اور منشی سراج میر خان ہجر سے اصلاح لیتے تھے۔ ذکی

مجھے ضد ہے کہ وعدہ لیکے اُٹھوں
کیا اُس بُت نے وعدہ بھی تو ہنس کر
وہاں تار اُسنے باندھا ہے نہیں کا
نکالا "ہاں" میں بھی پہلو "نہیں" کا

وابستہ دل ہی یُوں تری زلفِ رسا کے ساتھ
خوش ہیں جہاں میں جام و مئے دلربا کے ساتھ
دیکھے ادائے ناز و کرشمہ تو کھو گیا
بسمل ہوا کوئی تو کوئی لوٹنے لگا
صیاد کی نگاہِ غضب آسماں پہ جب پڑی
تم نے ہمارا حالِ محبت سُنا ذکی
اقبال جیسے سایۂ بالِ ہما کے ساتھ
روزِ جزا کی دیکھیں گے روزِ جزا کے ساتھ
رو بیٹھے دل کو ہم تری محفل میں آکے ساتھ
تیغِ نظر چلی جو کسی کی ادا کے ساتھ
بجلی بھی آسماں سے گری تلملا کے ساتھ
اب کیا وفا کرے کوئی اُس بیوفا کے ساتھ

ذکی - میرزا کبیر الدین گورگانی متخلص بہ ذکی سنہ ۱۲۸۳ھ میں جو دہلی میں مشاعرے ہوتے تھے اُن میں غزل خوانی کیا کرتے تھے شاید اپنے عزیز مرزا ارشد گورگانی سے اس فن میں مستفید تھے ذکی

ہو عکس جلوہ گر جو لبِ لعلِ یار کا	نہریں لہو کی جاری ہوں خنجر کی آب سے
رات میں آئیں نظر تارِ شعاعِ خورشید	زلفِ مشکیں میں جو وہ طرۂ زرتار اُلجھے
وقفہ ہماری خاک پہ اک دم ضرور تھا	کیا آئے، کیا کھڑے ہوئے، کیا ٹھہرے، کیا چلے
ہر رگِ مژگاں میں قطرے آنسوؤں کے ہیں مرے	دیکھ لے رونے میں کیا موتی پروتا ہے کوئی
ناصحا! کیوں منع کرتا ہے تو رونے سے مجھے	آہ ظالم کیا تری آنکھوں سے روتا ہے کوئی
ہر گل کو دلفگار جو دیکھے بہار میں	کیونکر نہ آہِ سرد نسیم و صبا بھرے
یہ کیا سبب کہ تلخ تر اُس لب سے بات ہے	شیریں زباں تو غیرتِ شاخِ نبات ہے
ہے سنگِ سیاہِ کعبۂ حُسن	ابرو پہ جو اُس صنم کی تِل ہے
لی چہرہ پہ آستیں فانوس	پروانہ سے شمع کیا خجل ہے
معشوق چھپائے کیوں نہ مکھڑا	چوری سے نگہ کی منفعل ہے
دل ہم سے جُدا رہا ہمیشہ	گویا وہ ضمیرِ منفصل ہے

ذکی

ذکی حکیم سید عبدالاحد صاحب ولد حکیم میر خادم علیصاحب مرحوم اصل وطن انکا نورنگ آباد ضلع بلند شہر ہے مگر میر خادم علی صاحب مرحوم بوجہ قرابت قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ میں جا رہے تھے اور وہیں انتقال کیا، جناب ذکی اسم بامسمی شخص ہیں ذہانت اور ذکاوت بات بات میں ظاہر ہوتی ہے فنِ طب میں نہایت عمدہ دستگاہ رکھتے ہیں، علم مجلسی سے خوب واقف ہیں اور نہایت خوش تقریر ہیں، عرصۂ دراز سے قصبۂ کاسگنج ضلع ایٹہ میں مطب کرتے ہیں- ابتدائے عمر میں اکثر اور اب بھی کبھی کبھی کسی خاص فرمایش سے شعر و سخن کی طرف توجہ ہو جاتی ہے- ترتیب تذکرہ کے وقت جو اشعار انکے وصول ہوئے وہ درج ذیل ہیں چھپن ستاون سال کی عمر ہے

شب فرقت میں رو رو کر خیالِ گلبدن ہوتا	پڑا ہے ہمکو موجِ اشک سے صحنِ چمن دھونا
کدورت دل کی مٹ جاتی ہے اشکوں کے بہانے سے	مری آنکھوں سے سیکھو دفترِ رنج و محن دھونا
یہ کس خورشید وش کی آمد آمد ہے کہ گلشن میں	ہوا دشوار شبنم کو گلوں کا پیرہن دھونا

بنتی ہیں مٹی کی پریاں نور کی صورت یہاں
لکھنؤ دیکھے تو دیوانہ پرستاں چھوڑ دے

بیقراری سے ہوا خوب کب ٹوٹے پر و بال
ابتو اُمید رہائی سے رہائی ہوگی

زمیں سے لالہ نکلتا ہی داغ کھائے ہوئے
بہارِ عشق کے ہیں یہ بھی گُل کھلائے ہوئے

ذکی مرے دلِ وحشی کو مثلِ طائرِ رنگ
ہوائے طوق لیئے جاتی ہی اُڑائے ہوئے

رات دیوانگی شمع بھی ہم دیکھ چکے
گریۂ و خندۂ جانسوز بھی ہم دیکھ چکے

جی یہی چاہتا ہی پھر بھی کہ دیکھا ہی کریں
لاکھ باری تجھے سر تا بقدم دیکھ چکے

پیری و عہد شباب آہ خرابی میں کٹے
شبِ غم دیکھ چکے صبحِ الم دیکھ چکے

اب تڑپنے کی تمنا ہی تہِ تیغِ نگاہ
خنجرِ غمزۂ دمساز کے دم دیکھ چکے

اب بھی ہو جاتا ہے پیمانِ وفا ہیں ہوکا
جھوٹے سو بار ترے قول و قسم دیکھ چکے

اب ہوس کیا ہی کہ آغوشِ تصور میں دبے
لب بلب سینہ بسینہ اُسے ہم دیکھ چکے

دیکھچکے داغ تو آہ و فغاں بھی سُنئے
دِل بھی دیکھو گے مرا تم کہ جگر دیکھ چکے

جو کوئی دن کو چلے شبکو ٹھہر جاتا ہے
قاصدِ عمرِ رواں آٹھ پہر جاتا ہے

میں تڑپتا ہوں پڑا نیم نگہ کا مشتاق
ای مری جان کے دشمن تو کدھر جاتا ہے

چشم جادو میں تری زہر ہے اور آبحیات
زندگی پاتا ہی کوئی کوئی مرجاتا ہے

ہنس ہنس کے زخمِ دل پہ چھڑکتے تو ہو نمک
پر یہاں تلک مزا ہی کہ باقی مزا رہے

زیبندہ ہی غرورِ بتِ مستِ ناز کو
اِس شرط پر کہ حسن کا عالم سدا رہے

جوہر کی قدر خاک نہو جب ترے حضور
ق
پھر عاشقوں کی بات مری جان کیا رہے

دزدِ حنا کا سرقہ تو اُڑ جائے ہاتھوں ہاتھ
مضمون خونِ دل کا پڑا پیش پا رہے

گاہے غمِ فراق گہے آرزوئے وصل
کیا کیا ہو دل لگی جو کہیں دل لگا رہے

ہے وُہی عہد انتظار وہی
ہم وُہی، تُم وہی، قرار وہی

یہاں تو جز مشتِ خاک کچھ نہ رہا
یار کے دل میں ہے غبار وہی

یہ چمن کی خاک میں ہے اثر نم اشکِ بلبل زار سے
کہ جنوں کی لہر سی اٹھتی ہے رگِ گل میں خونِ ہزار سے

میری آنکھوں میں ہی وہ شوخ طرحدار پری
زلف ہی بالِ پری شعلۂ رخسار پری

نشۂ بادۂ گلرنگ سے دیکھا ہے رنگ
انکھڑیاں شیشہ ہیں برق نگہِ یار پری

دامِ تحریر میں مضمونِ دل آ رہا ہے اسیر
یا خمِ زلفِ سخن میں ہے گرفتار پری

لکھنو جلوہ فروشوں سے پرستاں ہے ذکی
نظر آتا ہے ہر اک شاہدِ بازار پری

شعلہ خو یار کو دیکھا جو ادھر سے برہم
اور بھڑکانے لگے آگ لگانیوالے

ایک نشتر ہی کہ دیتا ہے رگِ جان کو خراش
ایک کانٹا ہے کہ پہلو میں چبھوتا ہے کوئی

ہر ایک دیکھکر اُسے کیوں بے قرار ہے
خورشیدِ حشر کیا کہیں تصویر یار ہے

پیری میں بھی مزا ہی میسر اگر ہو عیش
دل کو سرور ہو تو خزاں بھی بہار ہے

مطلعِ صبحِ قیامت ہی شبیہ زخمِ دل
آفتابِ صبحِ محشر داغ کی تصویر ہے

ای ذکی پوچھو نہ باعث گرمیٔ اشعار کا
سوزِ دل کا حال نوکِ شعلہ سے تحریر ہے

محشر نے آکے قبر میں تڑپا دیا مجھے
کسکی خرامِ ناز کا دھوکا ہوا مجھے

بیٹھکر گورِ غریباں سے جو یار اٹھتا ہے
اُسکے دامن کے پکڑنیکو غبار اٹھتا ہی

پیشوائی کو شتاب آئے قیامت سے کہو
کہ جہاں سے کوئی بے صبر و قرار اٹھتا ہے

نجد میں ناقۂ لیلیٰ جو کبھی گذرا تھا
اب تلک تربتِ مجنوں سے غبار اٹھتا ہے

مستی لبِ گلگوں پر تصویر نظر آئی
یاقوت میں نیلم کی تحریر نظر آئی

پیشِ نظر اُس رُخ کی تنویر نظر آئی
پروازِ تصور کی تصویر نظر آئی

جو دونکی لگاوٹیں ہو دیں بہم تو جفا سے چھٹے نہ ستم سے چھٹے
ہوئے لاکھ طرح کے بگاڑ مگر نہ ہم ان سے چھٹے نہ وہ ہم سے چھٹے

کبھی دیکھیں جو ابروئے چشمِ صنم تو رہینگی نہ خواہشیں اُنکی بہم
دلِ برہمن الفتِ بت سے چھٹے دلِ شیخ ہوائے حرم سے چھٹے

تنگ ہوں میں کشمکش سے تیری ای دستِ جنوں
دامنِ دلدار کا صدقہ گریباں چھوڑ دے

ماہتابی پر جو وہ خورشید رو ہے بے حجاب
اپنے جامہ سے ہوئی جاتی ہے باہر چاندنی

دکھلا رہے ہیں رنگ گلستاں نئے نئے
پتے ہرے ہرے گل و ریحاں نئے نئے

آغازِ عشق میں یہ مزا ہے کہ اے جنوں
دامن نئے نئے ہیں گریباں نئے نئے

آوارگی کی سیر ہے اور آمدِ بہار
سودا ہے تازہ تازہ بیاباں نئے نئے

ہنوئی لطفِ تصور میں یہاں تابِ سخن
ورنہ شکوے تو بہت ای غمِ تنہائی سے تھے

خیالِ زلف میں کب دلکا داغ جلتا ہے
کہیں بھی کالے کے آگے چراغ جلتا ہے

افسردہ اشک و آہ نے ایسا کیا ہے مجھے
دل بستگی کسی سے مسافر کو کیا ضرور
شاید چلی ہے جنبشِ دامانِ یار سے
کہنا پیامبر کہ فراموش ہے کیا
گلدستہ بن کے آنکھوں سے گرتے ہیں لختِ دل
جب یہ سُنا کہ پاؤں میں مہندی لگی ہے وہاں
ہمکو ملا کے خاک میں بھی تم ہوئے نہ صاف
دلِ پھانسنے میں دیکھیے اب کسکی بن پڑے
اُس دم ہوا مقابلہ صبحِ اُمید کا
تاثیر داغ عشق یہ دیکھو کہ بعدِ مرگ
بدلی اُٹھی ہے موجِ ہوائے بہار سے
طرزِ سخن سے رنگ ٹپکتا ہے اے ذکی
اِک ذرا تیغِ نگہ کا جو اشارا ہو جائے
یہ حسن سبز ہے زہر ہلاہل خستہ جانوں کو
دیکھو ذکی کہ اب وہ چُرانے لگے نگاہ

جنگل کا شوق ہے نہ چمن کی ہوا مجھے
جب دل لگا تو رہ گئے جب دل اُٹھا چلے
آتی ہے بوئے ناز نسیمِ بہار سے
وعدہ بھی کچھ کیا تھا کسی بیقرار سے
یہ ہار گوندھے جاتے ہیں اشکوں کے تار سے
یہاں خوں ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے
دل میں وہی غبار ہے اس خاکسار سے
پھولوں کے ہار اُلجھے تو ہیں زلفِ یار سے
آنکھیں سفید ہو گئیں جب انتظار سے
ہر ذرہ آفتاب ہے اپنے غبار سے
بجلی چمک رہی ہے فغانِ ہزار سے
گویا زبان دہوئی ہے خونِ ہزار سے
آپکا نام ہوا اور کام ہمارا ہو جائے
یہ زنگاری ڈوپٹہ اور قہر آسمانی ہے
آنکھوں کو جنکی دیکھ کے بیمار ہم ہوئے

اب سبب کیا ہے کہ کانٹا سا کھٹکتا ہے ذکی
یہ وہی دل ہے کہ رہتا تھا سدا آنکھوں میں

کہا قضا نے کہ سرگرمِ انتظار ہوں میں
پیامِ حشر ہے مجھکو کہ بے قرار ہوں میں

چمن میں سبزۂ پامال گرچہ ہوں لیکن
نظر میں گل کی کھٹکتا یہ ہوں کہ خار ہوں میں

وہ آدمی ہی کیا جو نہو درد آشنا
پتھر سے کم ہے دل میں شرر گر نہاں نہیں

درکار کیا ہے عاشق و معشوق میں تمیز
دو دل جو ایک ہیں تو دوئی درمیاں نہیں

وحدت ہے درمیاں تو پھر اے دل دوئی کہاں
شوقِ وصال ہے تو سمجھ لے کہ تُو نہیں

درپیش ہے ہزار مصیبت اُمید سے
کچھ غم نہیں ہے دِل کو جو کچھ آرزو نہیں

ہم لیکے دِل بغل میں بزمِ صنم میں آئے
شیشہ چھپا کے لائے پریوں کی انجمن میں

کیوں یادِ زلفِ جاناں قیدی ہمیں بنایا
کیوں رشتۂ محبت باندھا ہمیں رسن میں

عرس مجنوں ہے کہ صحرا میں بگولے بن کر
وجد کرتے ہوئے مستوں کے غبار آتے ہیں

دیر سے کچھ خبر خاطرِ ناشاد نہیں
دِل کہاں بھول اُٹھا ہوں مجھے کچھ یاد نہیں

اِس پتہ سے پوچھنا قاصد مکانِ یار کو
چاندنی کہتے ہیں کسکے سایۂ دیوار کو

کچھ سُنو پوچھو تپشِ دل کا ہمارے احوال
ہے وہ عالم کہ قیامت بھی تماشائی ہو

آشنا سب کا ہے تو اور کسیکا بھی نہیں
کوئی کیا تجھپہ فدا اے بتِ ہرجائی ہو

تنگ ہوں ننگ سے اب دل ہی یہ آتی ہے ترنگ
مَیں ہوں اور یار ہو اور عالم رسوائی ہو

قاتل کے ڈر سے بات بھی منہ سے نہ کہہ سکا
ہونٹوں پہ خوں ہوئی دِلِ بسمل کی آرزو

لُطفِ جاں بخش بھی ہے غمزۂ بیداد کیساتھ
مژدہ اے دِل کہ مسیحا بھی ہے جلّاد کے ساتھ

شرما کے، طپش کھا کے، خفا ہو کے ہنس پڑے
پاؤں پہ میں گرا جو بدن پر لگا کے ہاتھ

مُنت مرے، جل مرنے کی پوری ہوئی لیکن
تم شمع چڑھانے کو بھی مدفن پہ نہ آئے

برقِ طپش آہ سے پہنچے نہ کہیں آنچ
کہدو کہ قیامت مرے مدفن پہ نہ آئے

جوہر تھے مجھ میں سب ملکوتی خصال کے
انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

پردے میں آنکھ لڑتی ہے اُس رشکِ حور سے	پر ڈر یہ ہے کہ شرم و حیا کو نہو خبر
وہاں پھولوں کے بستر پہ ہیں کیا چین کی نیند میں	کانٹوں کا یہاں فرش ہے کروٹ کے برابر
منزل گہِ فنا کی خبر کس سے پوچھئے	جا کر وہاں پھرا نہ کوئی کاروان ہنوز
وصلِ محبوب میں ہوجاتا ہے آسان وصال	ناز و غمزے کے جو پانے ہیں سہارے عاشق
کیونکر دلِ بیتاب پہ لگتا ہے نشانہ	ہیں سب قدر انداز ترے تیر کے مشتاق
خوں ہو دلِ بیقرار کبتک	آنسو ہوں گلے کا ہار کبتک
عشق کی آگ سے بھڑکی دلِ بیتاب میں آگ	برقِ سوزاں سے لگی چشمۂ سیماب میں آگ
آب پاشیِ مژۂ تر کی نہ آئی کچھ کام	سوزِ فرقت سے جو بھڑکی دلِ بیتاب میں آگ
واقعی قابلِ سزا ہیں ہم — یعنی دیرینہ آشنا ہیں ہم	اے صنم یہ ستم خدا سے ڈر — عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
قافلے والو اک ذرا ٹھیرو	پھر کے دیکھو شکستہ پا ہیں ہم
عینِ غفلت ہے زیستِ شکلِ حباب	آنکھ کھولی تو بس ہوا ہیں ہم
تڑپتے رہے بلکہ مرتے رہے ہم	مگر دم محبت کا بھرتے رہے ہم
بہت زندگی کے مزے ہمنے لوٹے	بہت بچھڑ اے جان مرتے رہے ہم
شب آئے نہیں قاتل کے جو دیر گذری	تجھے اے اجل یاد کرتے رہے ہم
نہیں تاب کہ دیکھوں جمالِ صنم مجھے خوبیٔ دیدۂ دَر کی قسم	رُخِ حسن کی جلوہ گری کی قسم غمِ عشق پردہ دری کی قسم
تجھے عارضِ رشکِ قمر کی قسم تجھے شعلۂ داغِ جگر کی قسم	تجھے شوخیٔ برقِ نظر کی قسم تجھے گرمیٔ جلوہ گری کی قسم
نکر اتنا ذکیؔ دلِ زار کو خوں کہ یہ ذوقِ سخن ہے مذاقِ زباں	تری طرز سے آتی ہے بوئے جنوں مجھے تیری ہی بیجگری کی قسم
ہر چند گناہ گار ہیں ہم	رحمت کے اُمیدوار ہیں ہم
اے حشر خبر شتاب لینا	بیتاب تہِ مزار ہیں ہم
ہو خاک سے اپنی لالہ پیدا	خونیں جگر بہار ہیں ہم
بو ہے غنچہ میں نہاں یا ترے ہونٹوں پہ ہنسی	قید شیشے میں پری ہے کہ حیا آنکھوں میں

تم کہو قصّہ ہمارا بزمِ حسن و عشق میں
ہنستا ہے وہ کہ ہونٹوں پہ سُرخی ہے پان کی
جوہر کی قدر کھلتی ہے معنی شناس سے
دل میں صبح شب وصل آگ لگا دیتا ہے
ہر سحر طرزِ شفق سے یہ عیاں ہے کہ مدام
آنکھوں میں اُسکی سرمۂ دنبالہ دار ہے
خیالِ یار میں ہے چشمِ تر بند
لالہ رویوں کا جگر غم سے مرے داغ ہوا
عاشق کی بیخودی سے تو بگڑا ہوا ہے کیا
ہوئے ساقی سے خجل واہ رے کمظرفی دل
غش ہے نگاہ شوخیٔ انداز ناز پر
کشتۂ انداز سے آنکھیں چُرانا واہ واہ
سبز پتوں سے شہیدانِ چمن کے زخم پر
پھیلے داغوں سے جگر پر ہیں نشان باقی ہنوز
ہم دیکھتے ہی رہ گئے اور صاف نظر میں
معنی کا لُطف کچھ نہیں صورت پرست کو
جنوں نے غل مچا کر خاک اُڑا کر
چُھپا ظلمت میں آبِ زندگانی
کھلا ہستی کا پردہ جن کے دل پر
نپائے خستہ جاں مجھ سا جو ڈھونڈے
چوری سے بوسہ لیجئے پائے نگاہ کا

گل کہے رُودادِ بلبل شمع پروانے کی بات
آتش لگی ہے خرمنِ برقِ یمن میں آج
فہم سخن ہے نسخۂ علم و ہنر کی شرح
چھوڑ دیتا ہے جو خورشید کی چنگاری چرخ
چشمِ خورشید کو سکھلائے ہے خونخواری چرخ
ہونے لگی نمود غزالِ ختن کی شاخ
پری شیشے کے اندر ہے نظر بند
تازہ گل باغ محبت میں کھلا میرے بعد
اے مستِ ناز اپنی طرف تو خیال کر
بوسۂ لب کی طلب پہلے ہی پیمانے پر
جی لوٹتا ہے غمزۂ عاشق نواز پر
قہر ہے مکھڑا چھپانا جان کر پہچان کر
مرہم زنگار کے پھائے لگاتی ہے بہار
دیکھئے اب کے برس کیا گل کھلاتی ہے بہار
دل لے ہی گیا وہ بتِ عیّار اُڑا کر
بلبل نہو فریفتہ عطرِ گلاب پر
بیاباں رکھ لیا سر پر اُٹھا کر
دھڑی مسّی کی ہونٹوں پر جما کر
وہ بیٹھے زندگی سے ہاتھ اُٹھا کر
فلک خورشید کی مشعل جلا کر
اِس رنگ سے کہ دزدِ حنا کو نہو خبر

روشنی گر لبِ دریا ہو مریجان پسند
ہم قرہ پر کریں اشکوں سے چراغاں پیدا

دیوانہ اُس گلی میں دلِ زار ہو گیا
سایہ پری کا سایۂ دیوار ہو گیا

ہنسی ہنسی میں کیا تمنے زخمِ دل تازہ
نمک چھڑکتے تو ایسا کہاں مزا ہوتا

بیخود جمالِ ساقیٔ سرشار نے کیا
کارِ شرابِ شربتِ دیدار نے کیا

ہوئے بیخود غمِ تنہائی سے
کھینچے کس سے نہیں کیا یاد آیا

بے طرح دل کو عشق کا آزار ہو گیا
کسکی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

لائقِ سزا کے کشتۂ دیدار ہو گیا
آنکھوں سے دیکھنے کا گنہگار ہو گیا

کیا عجب ہی گر وہ پھر زندہ ہوں اے عیسیٰ نفس
لائے تو اپنے شہیدوں کا جو مدفن زیرِ پا

نشہ کی حالت میں جھپکا ڈر کے شوخ نازنیں
لٹ جو اپنی زلف کی سمجھا وہ ناگن زیرِ پا

بوسہ لیتی ہی جو پاپوشِ نگاریں پاؤں کا
رشک سے کہتا ہے دل بنتا کہ دشمن زیرِ پا

یہ ادا قاتل کی قابل دیکھ ہی وقتِ ذبح
ہاتھ ہے بسمل کی آنکھوں پر تو گردن زیرِ پا

غفلت میں کام دل ہمیں بے جستجو ملا
اپنی تلاش تھی کہ نصیبوں سے تو ملا

سب ہمصفیر قید سے چھوٹے بہار میں
اِک میں اسیرِ الفتِ صیاد رہگیا

صیاد نے خبر بھی نہ لی مرغِ دل کی حیف
آخر تڑپ تڑپ کے تہِ دام رہگیا

اک برق سی چمک گئی نگہِ شعلہ فشاں میں
دیکھا جو بھبھوکا بدن اُس رشکِ پری کا

کیا کہا میں نے کہ جھڑکی کا سزاوار ہوا
بات کیا منہ سے نکالی کہ گنہگار ہوا

طرزِ سخن مرقعِ نیرنگ ہو گیا
کاغذ طلسم خانۂ ارژنگ ہو گیا

حسن کی سیر ہے منظور تو رکھیئے ہر آن
آئینہ پیشِ نظر چشمِ تماشائی کا

بوسہ عارض کا لیا ہمنے بلائیں لیکر
کس تکلف سے ترے حسن کا صدقہ اُترا

ہنسی کے لطف اُٹھے جو غضب میں یار آیا
ملی جو بوسہ پہ گالی تو اور پیار آیا

چل بسے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا
جا بجا اُلجھا ہوا کانٹوں میں داماں رہ گیا

مزے جہاں کے اٹھائے یہ خاکساری میں
کہ بندگی میں تماشا کیا خدائی کا

قاصد کے ہوش گم تھے یہ طرفہ ماجرا تھا
کہتا تھا کچھ زبانی اور خط میں کچھ لکھا تھا

اِک بات پر تمہاری سوجی سے ہم تھے قربان
کچھ بات اب نہ پوچھو کیا جانیے وہ کیا تھا

شبِ وصل اپنی گذر گئی تو سحر کو اپنا یہ حال تھا
دل و دیدہ حیرت و غم میں تھے کہ یہ خواب تھا یہ خیال تھا

تا مرگ دردِ عشق نہ ہم سے جدا ہوا
زیر کفن بھی ہاتھ ہے دِل پر رکھا ہوا

بسے ہوئے تھے دلوں میں ہزار ہا نیرنگ
طلسمِ ہستی موہوم اک بہانہ ہوا

تو ہوا گرمِ سخن اور کھل گیا رازِ نہاں
تو ہنسا اور غنچۂ تصویر گویا ہوگیا

کچھ اور ہے باقی ہوسِ کوہکن و قیس
یا دیکھ چکے کوہ و بیاباں کا تماشا

مہِ کنعاں کی زلیخا نے خریداری کی
عشق نے حُسن کو رسوا سر بازار کیا

گو مگو بات ہے کچھ کہہ نہیں سکتا قاصد
کہ نہ انکار کیا اُس نے نہ اقرار کیا

جب سامنے کبھی وہ پریزاد آگیا
دیوانہ پن کبھی کا ہمیں یاد آگیا

شمع گل ہونے لگی یارانِ محفل اُٹھ چلے
ایک میں رونے کو تنہا انجمن میں رہ گیا

آج تو انداز باتوں کا تری کچھ اور ہے
پا گئے ہم بھی کہ ہے غیروں کا سِکھلایا ہوا

اِس آب و گل میں اپنی تو اُلفت کا ہے خمیر
بیگانہ ہو نہ سبزہ بھی اپنے مزار کا

آثارِ صُبح ہے کہ مرا حال دیکھ کر
ٹکڑے جگر ہوا ہے شبِ انتظار کا

ہمارے حال پہ لازم ہے رحم او صیّاد
کہ پر شکستہ ہیں اور شوق ہے رہائی کا

سوچ میں تعبیر کے یوسف کو نیند آنے لگی
ماجرا خوابِ زلیخا کا عجب افسانہ تھا

جلوہ گر آنکھوں میں ہے شوخی نگاہِ یار کی
پتلیوں کا ناچ پریوں کا تماشا ہوگیا

زہر کھایا سبزہ رنگوں کی محبت میں خضر کی
صندلی رنگوں کی غم میں دردِ سر پیدا کیا

دم بدم ہوتی ہے تغیر یہاں صورتِ حال
رنگ ہر حال بدلتی ہے تری یاد نیا

لے ہی چکا وہ جان و دل و طاقت و تواں
کیوں آئے اب یہاں اُسے کیا کام رہ گیا

کھلا کِھلنے ہیں گل کے مدعا رخصت کا گلشن سے
صدائے الفراق آئی جو ٹوٹا زخم کا ٹانکا

سمجھکر ساقیٔ دریا دل ان پاؤں کے چھالوں کو
زباں سوکھی دکھاتا ہی ہر اک کانٹا بیاباں کا

بہار آئی ہی قاصد جی میں رہ رہکر یہ آتا ہی
کہ جائے نامہ بھیجیں یار کو پرزہ گریباں کا

نشہ نے شوق کے جو بد شرابی کا اثر بخشا
ق
کچھ ایسا ہوش بگڑا شب دلِ مشتاق جانا کا

بلائیں شمع کی لیں اس رخِ تاباں کے دہوکے میں
لب ساقی سمجھ کر لے لیا بوسہ نمکداں کا

بگولے کی طرح اٹھتا ہوں ہیں صحرا نوردی کو
کیا ہی بے سرو پائی ہیں کیا پائے سفر پیدا

ذکی جوں شمع اپنی زندگی جلتے ہی کٹتی ہے
کیا ہے سوزِ دل کے واسطے ہمکو مگر پیدا

خون کا دریا جو تھا سینے میں اپنے موجزن
تیر گر نکلا خدنگِ نازِ اُس سفاک کا

نازِ معشوقانہ کو زیبندہ ہی نشانِ حجاب
لن ترانی گو ہے جلوہ شاہدِ بیباک کا

کیا دکھاتا ہی بہار ایکے برس جوشِ جنوں
گل کھلے دیکھئے کیا چاک گریبانی کا

کشمکش گردشِ دوراں کی ہی درپے کیا کیا
سخت مشکل ہے نباہ آہ تن آسانی کا

گر بگولے بھی اٹھے خاک سے تو خاک ہی لطف
زندگی میں ہی مزا بے سر و سامانی کا

حوریں جو آئیں جائے نکیرین قبر میں
کیا کیا مزا اٹھائیں سوال و جواب کا

بسمل تری نگہ کے تڑپتے نہیں کبھی
پانی بھی مانگتے ہیں تو خنجر کی آب کا

اے نامہ بر جو پڑھکے وہ خط ہو رہے خموش
زنہار تو سوال نکرنا جواب کا

کیونکر نہ خون ہو مری حسرت بھری نگاہ
آنکھوں میں کٹ گیا ہی زمانہ شباب کا

بے لطف زندگی کی بہاریں ہیں رنج میں
عیش و طرب کے ساتھ مزا ہے شباب کا

گذری فراقِ یار میں افسوس یہ بہار
دل پر رہیگا داغ شب ماہتاب کا

ہیں کافرانِ عشق حرم میں سیاہ مست
دل میں صنم بغل میں ہی شیشہ شراب کا

وحشت ہی آشکار زلیخا کے حال سے
آنکھیں بیان کرتی ہیں افسانہ خواب کا

دام کے پھندے قفس کی تیلیاں توڑیں تو کیا
کاش رشتہ ٹوٹ جاتا الفتِ صیاد کا

لہ نوٹ گلشن بیخار میں یہ شعر مرزا کے شاگرد کے نام سے درج ہے۔

حیدرآباد دکن چلے گئے وہاں دولت کے فرشتہ نے جنم ہار دیا تھا، اور دن رات چاندی سونے کی گنگا جمنا بہتی تھی، وہاں اِنکے کمال کی بھی قرار واقعی قدردانی ہوئی۔ یہ بھی اپنے فن میں اُستاد مسلم الثبوت تھے، نواب ناصر الدولہ نظام الملک بہادر والی ریاست کی مدح میں وہ وہ عمدہ قصائد کہہ کہکر پیش کئے جن میں خوب خوب صنعتیں تھیں، اِن کو سن کر اہلِ دربار کیا وہاں کے تمام رؤسا ادب کے ساتھ پیش آنے لگے اور نواب صاحب بہادر نے خلعت وانعام سے مالا مال فرمایا، آخر کشش حبِ وطن نے پھر اپنی طرف کھینچا اور مراد آباد آئے۔ چند روز بعد لکھنؤ پہنچکر قطب الدولہ کی وساطت سے واجد علیشاہ کی سرکار میں ملازم ہوئے اور ملک الشعرا کا خطاب پایا، چنانچہ اُنکی مُہر میں ملک الشعرا شیخ مہدی علیخاں ۱۲۶۵ھ کندہ تھا، غدر کے بعد وطن میں خانہ نشین تھے کہ نواب یوسف علیخاں نے اِنکے کمال کا شہرہ سُنکر اپنے دربار میں طلب کیا، چنانچہ یہ رامپور چلے گئے اور جب تک نواب ناظم زندہ رہے وہیں رہے۔ اُنکی وفات کے بعد وہاں سے دل اُکتا گیا اور ۱۲۸۱ھ میں انبالہ پہنچے دو برس کچھ مہینے وہاں قیام کو گذرے تھے کہ پیام اجل آگیا، ماہ ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ میں قضا کی۔ انتخاب یادگار میں اِنکی تاریخ وفات ۱۲۸۱ھ درج ہے مگر غلط ہے، یہ صاحب سخن مورخ بے بدل۔ فاضل بے مثل شیریں سخن، ظریف اور زود فکر تھے، طرز سخن نہایت دلفریب اور پسندیدہ ہے، ایک رسالہ عروض وقوافی میں مسمیٰ بہ یادگیر ۱۲۶۵ھ میں مرتب کیا تھا، کلّیات ذکی عرصہ ہوا منشی نولکشور نے اپنے مطبع سے شائع کیا تھا۔

صرفہ اب پردہ دری میں دلِ ناداں کس کا
دامن یار ہی چھوٹا تو گریباں کس کا

لے اُڑی انجمنِ ناز میں دل کس کی نگاہ
چوریاں کرنے لگے غمزۂ پنہاں کس کا

بال ٹوپر غمزۂ خونریز کو رکھتے ہیں حریف
دیکھئے آج نکلجائے گا ارماں کس کا

ہُوا ہے آفتاب صبح شعلہ داغ پنہاں کا
بنا تارِ شعاعی تار تار اپنے گریباں کا

غبارِ قیس میں جان آگئی ٹھوکر سے لیلیٰ کی
اُڑا جاتا ہے جگنو بنکے ہر ذرہ بیاباں کا

خلف اکبر ولیسر الدولہ دلاور الملک مرزا محمد علیخاں بہادر فیروز جنگ متخلص بہ حیدر متوطن نیشاپور۔ باشندۂ فیض آباد مقیم لکھنؤ پہلے اشرف علی قادر پھر میر اوسط علی رشک، پھر منیر شکوہ آبادی کے شاگرد ہوئے، اِن استادوں کے فیض سخن سے صاحب دیوان ہو گئے یہ اُنکا کلام ہے۔

کرتی شکمِ صاف پہ ہے آبِ رواں کی — یا آپ کا گرمی سے پسینے میں ہے تر پیٹ
بل کھائے بال آگ پہ رکھے اگر کوئی — اُس روئے آتشیں پہ نہ کیوں پیچ کھائے زلف
اعمالِ بد نے مجکو نکالا بہشت سے — دوزخ بھڑک اُٹھا مرے افعالِ زشت سے

اے زاہد وہیں سے ہمارا اسلام ہے — کعبہ کو کون جائے جوارِ کنشت سے
کوچہ میں اُس صنم کے بھی ملجائیگا وُہی — آدم کو جس خدا نے نکالا بہشت سے
توڑونگا میں نہ خاطرِ پیرِ مغاں کبھی — بنوائیو میکدہ مری تربت کی خشت سے
اُٹھا نہ بارِ ضعف کا مجھ ناتواں سے — شرمندہ ایک خس کا نہیں ہیں جہان سے
شکوہ تمہارا سنتے ہیں ہم ہر زبان سے — آواز ایک آتی ہے سارے جہان سے
تیرے شہیدِ ناز کو زندہ نہ کرسکیں — عیسیٰ اُتر کے آئیں اگر آسمان سے

ذکی

ذکی۔ شاعرِ خوش مذاق منشی مہدی علیخاں ذکی خلف شیخ کرامت علی۔ اِنکے بزرگ شیخ زادگان لکھنؤ سے تھے مگر اُنکا مولد و مسکن مراد آباد ہے۔ نواب محمد سعید خاں والی ریاستِ رامپور کے عہد میں برسوں وظیفہ خوار ریاست رہے پھر نواب غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے، وہاں جاکر شیخ امام بخش ناسخ کی شاگردی اختیار کی اور نواب صاحب موصوف کی شان میں قصیدہ کہکر سنایا خلعت و انعام سے مالامال ہوئے، پھر تھوڑے دنوں کے لئے دہلی آئے اُن دنوں نواب مصطفی خاں بہادر متخلص شیفتہ کے ہاں بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی آپ بھی اُس جلسہ میں شریک ہو کر موردِ تحسین و آفرین ہوئے، مگر ان دنوں دِلّی اپنے حال میں مبتلا تھی، یہاں سے بھی دل برداشتہ ہو کر سہارنپور پہنچے لیکن دِل اُچاٹ رہا

شب غم کی بلائیں دور ہو جائیں	کرم فرما جو تو اے ماہرو ہو
کہاں رنگِ حنا ای شوخ اتنا شوخ ہوتا ہے	مرے خونِ تمنا کی ترے ہاتھوں میں لالی ہے
دل کو آنکھ اُسکی جو بیمار بنا دیتی ہے	آکے یادِ لبِ جاں بخش شفا دیتی ہے
اُسکے گیسو کی گھٹا یاد دلا دیتی ہے	اور رونا مرا برسات بڑھا دیتی ہے
طلبِ بوسہ پر اے یار تری ایک نہیں	سارے ارمانوں کو مٹی میں ملا دیتی ہے
لوگ کہتے ہیں جسے برقِ جمالِ معشوق	دل میں عاشق کے یہی آگ لگا دیتی ہے
زندہ زیر چرخ جب تک ہم رہے	موردِ جور و ستم ہر دم رہے
ہوں شہیدِ سُرخی رنگ حنا	دستِ رنگیں سے مرا ماتم رہے
کیوں غش نہ آئے صورتِ موسیٰ ہمیں ذکا	اک رشکِ برقِ طور کا جلوہ نظر میں ہے

ذکائی

ذکائی - محمد ہاشم علی رامپوری - رامپور کے مشاعرہ سنہ ۱۹۰۰ء کی غزل سے وہ شعر نقل ہوتے ہیں

جو پوچھا کہاں کو چلے بن سنور کر	تو بولے بگڑیں کیا کہیں جا رہے ہیں
رقیبوں سے جوبن کو لٹوا رہے ہیں	مجھے دیکھنے تاک کو ترسا رہے ہیں

ذکی

ذکی - نواب محمد جعفر علیخان ذکی مغفور پنجہزاری منصبدار دربار شاہ عالم، شاہ موصوف - اور شجاع الدولہ صوبۂ اودھ کے ہمراہ بہار اور بنگالہ کی مہم سنہ ۱۷۶۱ء میں شریک اور نظامت مرشد آباد کے اُمیدوار تھے، آخرش ناکام سنہ ۱۱۷۸ھ میں مرشد آباد میں راہی ملکِ بقا ہوئے۔ کبھی کبھی فکر سخن بھی کیا کرتے تھے یہ اُنکے نتائج افکار کا خلاصہ ہے۔

سُن کے احوال مرا ناصح مشفق نے ذکی	ہاتھ سے ہاتھ ملے حیف سے سینہ کوٹا
خاکساری پر نہ کر موذی کی ہر گز اعتبار	جونک مٹی میں ملے تو بھی لہو پیتی رہے
عشق میں نسبت نہیں بلبل کو پروانہ کے ساتھ	وصل میں وہ جان دے یہ ہجر میں روتی رہے
چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو	سوزنِ تدبیر گو ساری عمر سیتی رہے

ذکی

ذکی - نواب اسد الدولہ رستم الملک مرزا محمد ذکی خاں بہادر فیل جنگ عرف نواب بہادر

بہانے سے ہمارے خون کے غش تجکو آئیگا	اے قاتل تو کم سن ہے ابھی کیا تو نے دیکھا ہے
زر و مالِ جہاں کی کچھ ہوس باقی نہیں دلکو	فقط دیدار کی اُس شوخ کی دل کو تمنا ہے
نہایت سخت جاں ہوں میں نہایت سخت جاں ہوں میں	نہ ٹوٹے خنجرِ براں کہیں یہ مجکو خطرا ہے
نہیں اُس بت سا کوئی سنگدل ساری خدائی میں	ہوا عاشق تو کیوں اسکا تو کا کچھ تجکو سودا ہے

ذکار

ذکار منشی بخشش محمد باشندہ گورکھپور شروع میں جناب بقا کو کلام دکھایا کرتے تھے، پھر حضرت امیر مینائی کی خدمت میں آکر فیضیاب ہوئے اب فی الجملہ اس فن میں معقول مہارت پیدا کر لی ہے مضمون اور زبان دونوں کی طرف طبیعت کو لگاؤ ہے، اشعار بہم رسیدہ کا انتخاب ملاحظہ فرمایئے :

تعظیم ہمپہ فرض ہے قرآن پاک کی	چومے جو ہمنے آپکے رخسار کیا ہوا
دل لیکے دیکھتا بھی نہیں اب میری طرف	او مطلب آشنا وہ ترا پیار کیا ہوا
گھسوں گا سر درِ پردہ نشیں پر	مٹا دوں گا جو لکھا ہے جبیں پر
نشاں ملتا نہیں لیکن ترا نام	ازل سے نقش ہے دلکے نگیں پر
کہے دیتی ہیں دزدیدہ نگاہیں	گماں ہے دل چرانے کا ہمیں پر
پھر جاتے ہیں روز در تک آکر	ترساتے ہیں جھلکیاں دکھا کر
ہیں تاک میں دختِ رز کی ساقی	لیجائیں گے شیخ جی چرا کر
دکھلا کے وہ زلف مجکو بولے	اِن کالوں سے تو ذرا ڈرا کر
داغوں سے ہے لالہ زار یہ دل	باور نہ ہو تو دیکھ لو تم آکر
بیوفا خلق ہیں گو سارے حسیں ہوتے ہیں	پر تری طرح جفا کار نہیں ہوتے ہیں
شیخ جی اچھا ہے میخانے میں جا یا نہ کرو	بے ادب رند خرابات نشیں ہوتے ہیں
سمجھتا ہی نہیں کوئی یہ مضموں	دہن کے باب میں کیا گفتگو ہو
عدو کے سامنے یوں ظلم مجھ پر	عدو پر لطف میرے روبرو ہو

غم کے ہاتھوں تنگ ہوں یارب جاؤں کہاں
آسماں تو دور ہے اور سخت ہے پتھر زمیں

نہیں رکھیں ہیں کدورت کسی سے اہلِ صفا
چھپاتے عیب ہیں سب کے ہنر کو دیکھتے ہیں

حاکم اس دور کے یہاں نناسہ ہیں دنی اور ظالم
مانگے پیسا جو کوئی داغ درم دیتے ہیں

دلکو لیجاتا ہے وہ آنکھوں میں کچھ رکھتا ہے سحر
دیکھکر حیراں ہوں یارو اس ہنر کو کیا کروں

اضطرابی سے نہیں اتنی خبر مانندِ موج
گر کوئی پوچھے چلے اٹھکر کدہر کو کیا کہوں

یہ معجزۂ عشق ہے لاتی ہیں گل و شمع
ہنگامِ زیارت مرے مدفن پہ ہزاروں

جوابِ خط سے ہیں گذرا خبر تو لو یارو
گلی سے یار کی قاصد ابھی پھر اکہ نہیں

دیکھکر کیجیو ہمچشمی کا دعوی اس سے
کہدو نرگس سے کہ آنکھوں کے لوائے ناخن

مدت میں لگی ہے آنکھ مری کھٹ کھٹ تمکو اے سنگتراش
تعویذ نگھر تربت کا جانبِ پیارے سوتے ہیں

تم اہلِ دل کی غفلت کا احوال نہ پوچھو کچھ ہمسے
بجنے بھی رہیں کلی نوں پہ سدا گھڑیال نقارے سوتے ہیں

یار کی استغنائی تو دیکھو ہم جو گئے ملنے کے لئے
غصہ سے بولا یوں آ کہہ دو گھر کو سدھارے سوتے ہیں

غم جس سے دلکا جائے مہیا وہ شے کرو
موجود یعنی بزم میں مینا و مے کرو

جز شمع کے سر کاٹے پہ زندہ ہو دوبارہ
دیکھا نہ کسی کو کہ کوئی مر کے جیا ہو

رات وہ مطرب پسر گانے لگا جب دیس کو
یاد کر رونے لگے پردیسی اپنے دیس کو

دل نہیں چاہے ہے کرنے کو کسی سے اخلاص
ہر کوئی اپنی غرض کا ہمیں نہ بہ نظر آیا ہمکو

ملے ہے ابروئے خمدار دیکھئے کیا ہو
کہاں کہاں چلے تلوار دیکھئے کیا ہو

ہر طرف خوبرو ہیں جلوہ نما
کب تلک دل کی پاسبانی ہو

کیوں نہو اسپہ اک جہاں عاشق
جبکہ یہ حسن اور جوانی ہو

ذکار

ذکار پنڈت سر کیشن ذکار کشمیری خلفِ پنڈت دیارام ابن عدالتِ دیوانی فرخ آباد ۱۸۶۷ء کے قریب زندہ و سلامت موجود تھے۔ کلام بہم رسیدہ میں سے چند شعر درج ذیل ہیں ۞

ذرا دیکھ اے بتِ سفاک در پر شور و غوغا ہے
ترے کوچہ میں قاتل رقصِ بسمل کا تماشا ہے

ارادہ گر کسی کے دلمیں ہوئے سیرِ جنت کا — تو دیکھے اک نظر آکر جہاں آباد کی گلیاں
جو دھوئے دستِ حنائی وہ اپنے دریا پر — تو آگ لگ اُٹھے یکدست وو ہیں پانی میں
ذکا خیال ترا کیا کسی طرف آئے — لگا رہے ہی ترا جی تو یار جانی میں
دُنیا میں سبکو خاطرِ مہماں عزیز ہے — جاتا ہی دل سے عاشقِ شیدا کے غم کہاں
جامِ مے دے ساقیا یہ ابر و باراں پھر کہاں — ابر و باراں گر ہوا تو بزمِ یاراں پھر کہاں
بے گنہ ہرگز کسی کو قتل اے ظالم نہ کر — آدمی ہوتا ہے پیدا آہ ناداں پھر کہاں
خواب ہوجائیگا ملنا کر ہم آغوشی شتاب — ہو زلیخا دیکھئے یہ ماہِ کنعاں پھر کہاں
ہمنے کیا ہی دیکے دل اپنا ہمنے سوال اک بوسہ کا — اتنے ہیں کیوں آپ خفا کچھ مفت نہیں خیرات ہیں
لختِ دل یوں سرِ مژگاں پہ نظر آتے ہیں — جوں چراغاں ہوں دریا کے کنارے روشن
بیوفائی جو یہاں دیکھی رفیقوں سے ذکا — ہمسے مت پوچھ کہ وہ قابلِ اظہار نہیں
آگیا وہ دور کوئی فکر سے خالی نہیں — ہوگئی عنقا کہیں عالم میں خوشحالی نہیں
جلوہ گر وہ خوبرو ہوتا ہے گر بازار میں — رستے رہتے بند ہیں وو دو پہر بازار میں
بتوں کو جان و دل سے مانتے ہیں — خدا کو اپنے حاضر جانتے ہیں
روتے ہیں یاد کر کے ہم اُن دنوں کو پیارے — ڈالیں پھریں تھے کیسے ہم تم گلے میں باہیں
ڈرتا ہوں ہیں کہیں ترا پہنچا لچک نجائے — گجروں کو مت پہن تو گل اندام ہاتھ میں
کسیکی دیکھی چشمِ مخمور اے ذکا — خود بخود آنے لگیں انگڑائیاں
بہم پیوستہ ہیں وہ ابروئے خمدار یوں اُسکے — لڑیں دو ترک جوں لیکر کہیں تلوار آپس میں
گرہ میں کیا ہے مری ہو منیں فرات کا کاسیتھ — پڑے ہیں ایک دو شیشے شراب کے گھر میں
گذارہ کسکے گھر میں ہو کسی انسان قابل کا — ذکا اب قدردانوں کی ہوئیں برباد سرکار میں
شہر دہلی بھی اک تماشا ہے — آٹھ دن نو طرح کے میلے ہیں
جنبشِ ابرو سے اُسکے مل گئی یکسر زمیں — جس طرح بھونچال سے کرنے لگے تھر تھر زمیں

سیر کرتا ہوں کبھی اسکی تو بیساختہ بس
منہ سے نکلے ہے مرے شاہجہاں کی تعریف

نکلے ہے اشک چشم سے میری ٹپک ٹپک
ساغر سے مے یہ گر گئی آخر چھلک چھلک

چشم میں سرمہ کی تحریر تو ظالم مت کھینچ
ہے قیامت تری اِس خنجر خونخوار کی نوک

آن نکلے ہے ادہر لالہ عذار ایک نہ ایک
سینہ کر جائے ہے داغوں سے فگار ایک نہ ایک

اُس بُتِ شوخ کو دیکھا جو سحر وقت نماز
اہلِ اسلام کی نیت گئی یک بار بدل

کٹی رہتے ہوئے اک عمر باہم
حجاب اُس کا نہیں جاتا ہے تاہم

ہزار افسوس وہ بیگانہ نکلا
جسے سمجھے تھے اپنا آشنا ہم

نہ کیجے اسقدر بیگانگی آپ
کبھی تو تھے تمھارے آشنا ہم

خیال آتا نہیں اتنا بھی ہرگز
کہ آئے کیوں تھے اور کرتے ہیں کیا ہم

مئے گلنار کا پیکر پیالہ
ذکا سب فکر دیتے ہیں بھلا ہم

زنہار مرے قتل سے پیارے نہ ڈرو تم
سر آگے تمھارے ہے جو چاہے سو کرو تم

جگر ٹکڑے ہے کیوں اسکا ہوئی یہ کسلیئے پانی
کھلا ہمپر نہ کچھ حال پریشانِ گل و شبنم

مریضِ عشق کو صحت اگر ہووے تو میں جانوں
کرے لاکھوں دوا لیکن اثر ہووے تو میں جانوں

رخِ تاباں پہ چھوڑو گیسوئے شبرنگ کو اپنے
قیامت تک ٹھہرا ہی پیارے سحر ہووے تو میں جانوں

نہیں جامِ مئے گلنار کو حاجت کچھ اے ساقی
تصوّر میں تری آنکھوں کے ہم مخمور رہتے ہیں

دل و جان سے معتقد ہیں اُسی کے
صنم کو ہم اپنا خدا جانتے ہیں

اِن بتوں سے تو ذکا دل نہ لگا کہتے ہیں
ہم ترے حق میں کہا مان بھلا کہتے ہیں

شہد و شکر سے وہ لبِ شیریں دو چند ہیں
اُنکی نہ بات پوچھ کہ ہونٹھ اپنے بند ہیں

کہتا ہے دیکھ سایہ مژگاں کو طفلِ اشک
خسخانے مجکو یہ لبِ دریا پسند ہیں

نہ آیا یار او رہیں صبح تک گنتا رہا گھڑیاں
لگا دیں چشم دریا بار نے ساون کی سی جھڑیاں

یہ بتانِ سنگدل ایکدم بھی کل پا دیں نہیں
عاشقوں کو حب تلک وے اللہ کلہیا دیں نہیں

کوئی ٹھکانا مقرر نہ کوئی در اپنا
حیرت سے بنگیا ہو تصویر اب سراپا

جہاں ہے یار ہمارا وہیں ہے گھر اپنا
کوئی کچھ کہو ذکا کو چپکا سنا کریگا

خانۂ زندگی خراب گیا
مردِ تہبیدست سے ہو خیرہ گیا
سالنوں کا لگے ہے خوش غصہ
شغلِ مینا و مے مدام رہا

کیا رہا لطف جب شباب گیا
پاؤں گیا ٹوٹ تو پھر سیر کیا
ساتھ ہے ترشی اور سلونے کا
جیتے جی ہمکو یہ ہی کام رہا

انداز عجب طرفہ ادا آن تماشا
نہ ہے طالع جسے یہ دولتِ دیدار ہو حاصل
کیا گیا عہد نوجوانی کا

ہے سر سے قدم تک تو میر یجان تماشا
قدم پر یار جانی کے سر اپنا دہر کے سو جانا
اُٹھ گیا لطف زندگانی کا

اہلِ دنیا کو رہے ہے رات دن دنیا کی یاد
لکھوں تھا خط میں تجھے لیکے دل ربا کاغذ
گہ خیالِ زلف گہ یادِ رخِ گلفام کر
ہوا ہی ابر ہی گلگشت ہے اور سبزہ سبزہ ہی
ذکا قسمت پہ شاکر رہ نصیحت تجکو کرتا ہوں
موئے سفید نکلے بعد از شباب منہ پر

اسقدر فرصت کہاں ہی جو کرے عقبیٰ کی یاد
اُٹھا قلم سے یہ شعلہ کہ جل گیا کاغذ
یوں خیالِ یار میں اے دل سحر کر شام کر
سوالِ جامِ مے ساقی ہمارا آج رد مت کر
کسی کے جاہ و حشمت پر ارے ناداں حسد مت کر
دیتی ہے زندگانی دیکھو جواب منہ پر

اے ہمنشیں تو یار کا ذکر کم نہ کر
شعلۂ شمع کا یہ دود نہیں جلوہ نما
گھر سے ٹک اپنے نکل شوخ ستمگر باہر
ہے لطف میکشی کا اُسی وقت ساقیا

بھولے ہوؤں کو راہ عدم کی خبر نکر
کھولے بیٹھی ہے لٹا اپنی فرنگن سر پر
منتظر بیٹھے ہیں عاشق ترے در پر باہر
بیٹھے ہوں جبکہ یار برابر کے آس پاس

نہیں خوشی کا یہاں اتنو نام سو سو کوس
شہر دہلی نہ کہو ہے یہ عزیز و فردوس

گیا وہ ساقی و مینا و جام سو سو کوس
پوچھتے کیا ہو عمارات و مکانکی تعریف

کر بنائے زندگی پر اپنی اے منعم نظر
فکر کیا کرتا ہے ناداں ہر گھڑی تعمیر کا
غافلو ڈھونڈتے پھرتے ہو جسے عالم میں
غور سے دیکھو وہ ہی دل میں تمہارے بیٹھا
بس نہیں چلتا کہیں زور آوروں سے ای ذکار
یار دل کو لے گیا میں سر پٹک کر رہ گیا

سمجھا میں جسے دوست ہوا وہ ہی مخالف
اخلاص کسی کا بھی مرے کام نہ آیا
آوارہ و بدنام ہوا قیس ہی آخر
لیلیٰ پہ کسی بات کا الزام نہ آیا
بیکسی پر نہ جلا میری کسی دوست کا دل
کوئی تربت پہ دیا بالنے والا نہ گیا
ہاتھوں سے میرے یارو مینا و جام لینا
بیہوش ہوں نشہ میں ٹک مجکو تھام لینا

رکھوں ہوں خصلتِ طاؤسِ آتشبار اے ہمدم
جہاں جاوے قدم اپنا وہیں گلزار ہو پیدا

اب تو اُس بت سے ہم ہوئے ہیں جُدا
دیکھئے کب خدا ملا وے گا
عمر رفتہ نے پھر گذر نہ کیا
گئی ایسی کہ منہ ادھر نہ کیا
ہونا جو کچھ مرض کا تھا انجام ہو چکا
رخصت کرو طبیب کو یاں کام ہو چکا
ہے آپکا قیامت گلشن میں مسکرانا
لیتے ہو جی نکالے ہر ایک کلی کلی کا
کسی کا دل کوئی بیدرد گر ستاویگا
تو عاقبت میں بھی آرام وہ نپاویگا
جو توبہ کی ہے تو مجلس میں میکشو نکی نہ جا
کہ خوامخواہ پیالہ کوئی پلاوے گا
یہ کوہِ عشق تو فرہاد سے بھی اُٹھ نسکا
ذکا کی تاب ہے کیا جو اُسے اُٹھاویگا
آنکھیں کھلی رہی تھیں کسو واسطے ذکا کی
کیا جانے مرتے دم تک تھا انتظار کسکا

حال یوسف کا سُن چکے ہم
بھائیوں سے نہ چاہ کیجیے گا
گل کر دے چراغ کو ذکا اب
گھر میں ترے آفتاب آیا

مانگا جو اُن سے دل تو وہ بولے کہ ای ذکا
لیتا ہے مال پھیر بھی کوئی دیا ہوا
روتا ہوں ای پیارے سو واسطے میں ہر دم
مٹجائے تیرے دل سے تا سب غبار دلکا
مت چھوڑیو تو ہرگز دل کا طواف اپنے
ہے تیرے حق میں غافل یہی مکہ اور مدینا

ہے اُنکے دوست بھی تھے اور ۱۲۸۱؁ھ میں زندہ تھے۔

دِل دار کی خاطر سے دلِ آزار بھی چھوڑا	الفت میں سمن رویوں کی گلزار بھی چھوڑا

ذکار

ذکار، سید اولاد محمد خاں ولد سید غلام امام صادق، حضرت حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے حقیقی بھتیجے تھے۔ ۲۷ رجب ۱۱۵۱؁ھ میں بمقام بلگرام پیدا ہوئے انھوں نے حضرت آزاد کی خدمت میں تربیت و تعلیم پائی اور اُنھیں کی تحریک و طلبی پر حیدرآباد میں منصب عالی پر سرفراز ہو کر امتیاز خاں خطاب پایا اور بڑے اعزاز و آبرو سے بسر کی۔ آخر اُسی عالی منصبی کے ساتھ بمقام اورنگ آباد دکن ۱۲۱۵؁ھ میں انتقال کیا۔ فارسی شاعر تھے۔ اور انکا ذکر اکثر فارسی تذکروں میں موجود ہے مگر حسب رواجِ زمانہ تفنناً کبھی کبھی اُردو بھی کہہ لیتے تھے، یہ اُنکے کلام کا نمونہ ہے۔

ساقی تجھے قسم ہے کہ مے سے بھرے ہوئے	شیشے ہیں انتظار میں کسکے دھرے ہوئے
آوارگی سے باز نہ آوے گا دل مرا	کیا فائدہ ہے اسکو مقید کرے ہوئے
تو ہمسے دوستوں کو نہیں پوچھتا عزیز	معلوم ہوگی قدر ہمارے مرے ہوئے
ہمکو جلو میں دیکھتے ہی شاہِ حسن کے	بولا نقیبِ حسن ادب سے پرے ہوئے
برسا نہ مینہ اور نہ آ لسو نرے سے چلے	جنگل ذکار کہاں سے ابھی سے ہرے ہوئے

ذکار

ذکار، منشی خوب چند دہلوی کایستھ ماتھر ساکن حویلی جگل کشور معروف گھنٹہ والی چاندنی چوک شاگرد رشید شاہ نصیر دہلوی، ایک بہت بڑا تذکرہ معروف بہ عیار الشعراء انھوں نے تالیف کیا تھا جس میں چار پانچ ہزار اُردو گو شعراء کا حال قلمبند کیا تھا۔ استعدادِ علمی معقول تھی۔ ملازمت پیشہ اور صاحب دیوان تھے، مگر وہ سب ذخیرہ اُنکی وفات کے بعد انکی اولاد کی غفلت سے ضائع ہو گیا، اُسکی ایک نقل ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل دہلی کالج کے پاس تھی، ممکن ہے کہ جرمنی میں ہو، انکا دیوان راقمِ تذکرہ کے پاس موجود ہے، قدیم الفاظ مثل اُودی، اُدھیں پھر کر کے، ہوئیگا، جتنے، کیدھر۔ انکے کلام میں پائے جاتے ہیں ۱۸۴۲؁ء میں انتقال کیا۔

قطع کرنا تھا مرے دستِ جنوں کو ناصح	کیوں گریباں مرا تو نے سیا حاصل کیا
دستِ قاتل کو مبارک رہے خونِ عاشق	پاؤں کیوں پڑتی ہے ناحق تو حنا حاصل کیا
عمر بھر خاک ہی چھانا کیا میں اے ذرّہ	اور ان مہوشوں سے تو ہوا حاصل کیا
استخواں میری نہ کھا مجکو ندامت ہوگی	اے ہما گر کبھی ہما سگِ جاناں ہوگا

ذرّہ

ذرّہ منشی ہر پرشاد نقلنویس کلکٹری سلطان پور (ز ۲ سنہ ۱۹۰ء سنہ ۱۸۹۸ء) شاگرد جناب بالکرشن قمر لکھنوی چالیس سال کی عمر اور یہ کلام کا رنگ ہے۔ باوجود مکرر تحریر حالات نہ ملے۔

اُمید و یاس کے جھگڑے وہ حسرتوں کا ہجوم	عجیب لطف رہا جب تک انتظار رہا
رحیم جان کے تجکو خطائیں کیں میں نے	کریم جان کے تجکو گناہ گار رہا +
زمانہ تھا جو موافق شریکِ حال تھے سب	پڑا جو وقت تو کوئی نہ غمگسار رہا
تمھیں کچھ اپنی یہ وعدہ خلافیاں دیکھو	تمھیں کہو کہ تمھارا اب اعتبار رہا
بڑھ گئی حد سے سوا جب سے نقاہت میری	وہ خفا ہیں کہ اُڑائی ہے نزاکت میری
جسقدر غیر نے کی اُن سے شکایت میری	اُنکو ہوتی گئی اُتنی ہی محبت میری
باعثِ ترکِ ملاقات جو پوچھا تو کہا	آپ سے ملکے اُلجھتی ہے طبیعت میری
زاہد تو اب ڈہونڈیں قیامت کیواسطے	ہمتو گناہ کرتے ہیں رحمت کیواسطے
ای شیخ جو وہاں ہے وہی بتکدے میں ہے	کعبے کو جائیں کسکی زیارت کیواسطے
چاہو قیامِ حُسن تو بوسہ عطا کرو	صدقہ ضرور چاہیئے دولت کیواسطے
کُند ہے خنجر بلا سے آپ چلنے دیجئے	کام کچھ تو تشنہ کاموں کا نکلنے دیجئے
شوق سے تیغِ نگاہِ مست چلنے دیجئے	خوب میرے زخم کے انگور پھلنے دیجئے
سر کے نیچے ہو اگر تکیہ تو جلد آتی ہے نیند	اپنے زانو پر ہمارا دم نکلنے دیجئے
کہاں سے کٹتے ہو کسواسطے پشیماں ہو	یہ کیا ہے آج نہیں آنکھ روبرو ہوتی

ذرّہ

ذرّہ منشی اتواری لال باشندہ کلکتہ، حضرت نساخ کے تذکرہ میں ان کا ایک شعر درج

جھگڑے رندوں کے ہیں سب میکدہ آباد ہیں	آرہی ہے کیا ہوائے جانفزا برسات کی

ذخیر

ذخیر - میر قربان علی ساکن فیض آباد اودھ آپکا حال صرف اسقدر معلوم ہوا کہ نغمۂ بہار رسالہ میں جو ۱۸۸۶ء میں شائع ہوتا تھا آپکا کلام اکثر چھپا رہتا تھا -

وہ پاس تھا تو غم دلِ عاشق سے دور تھا	ساقی کے دم سے دورِ شراب سرور تھا
ہے اوسکی طور پہ ناحق گمانِ برق	شمعِ جمالِ یار کا اک وہ بھی نور تھا
کل کیوں سوالِ دید پہ تھیں لنترانیاں	عاشق بھی کیا ترا ارنی گوئے طور تھا
ہوتے ہیں فیضِ تواضع سے سرافراز بشر	چشمِ مردم پہ قدم رکھتے ہیں ابرو ہو کر
دلِ خود رفتہ تو جاناں کی گلی میں پہنچا	رہ گیا دردِ جگر زینتِ پہلو ہو کر
ہجرِ عاشق کو عدم میں یونہیں لیجائیگا	جس طرح لائی ہے ہستی میں محبت تیری

ذرہ

ذرہ - میرزا راجہ رام ناتھ خلف الرشید میرزا راجہ کدار ناتھ - امیر عہدِ عالمگیرِ ثانی و شاہِ عالم ثانی، یہ خود آخر الذکر بادشاہ کے مقرب بااختصاص اور پیشکار و ناظر رہے اور چونکہ بادشاہ کا تخلص آفتاب تھا اِس رعایت سے اپنا ذرہ مقرر کیا، چاوڑی میں راجہ کدار ناتھ کی گلی ابتک اِس خاندان کی یادگار ہے

ترے کوچہ میں روز و شب پڑا پھرتا ہے یہ ذرہ	بجا ہے ایسے دیوانے کے مطلب کو روا کرنا

ذرہ

ذرہ - میر ولایت علی درصل کوئل علیگڈھ کے متوطن تھے مگر بسبب روزگار آگرہ میں زیادہ حصہ عمر کا بسر ہوا، شیریں سخن فصیح البیان شاعر تھے اور اپنے اقران و اماثل میں ممتاز یہ ذکر ۱۲۶۸ھ قبل غدر کا ہے، ڈپٹی عبد العلیم نصر اللہ خاں نے اپنے تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار میں انکا تذکرہ کیا ہے اور انکی خوش خلقی اور مسافر نوازی کی تعریف کی ہے - یہ اِنکا کلام ہے

میں دعا دیتا ہوں تم گالیاں دیتے ہو مجھے	اس بُرا کہنے سے کہیئے تو بھلا حاصل کیا
کرتی پھرتی ہے جو مٹی کو ہماری برباد	تجھے اِس خاک اڑانے سے صبا حاصل کیا
کیا ملے گا مرے سودائی بنانے سے تجھے	پیچ دینے سے مجھے زلفِ دوتا حاصل کیا

جوشِ جنوں میں بھی نہ پھرے ہم برہنہ پا　　یہ آبلے ہی پاؤں کے پاپوش ہوگئے
واعظ پہ بھی تصرفِ پیرِ مغاں ہوا　　رندوں میں آکے آپ قدح نوش ہوگئے
شوخی سے بے نقاب ہی وہ جو بزم میں　　اتنی پڑیں نگاہیں کہ روپوش ہوگئے

ذبیح

ذبیح مولوی سید عبدالحی صاحب باشندہ دربھنگا (بہار) کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا۔ کلام ملاحظہ ہو

زندگی اپنی اسی شغل میں گذرے پیارے　　لب پہ ہو ذکر ترا دل میں تری یاد رہے
کہیں معشوق بھی عاشق کی خبر لیتے ہیں　　اُن کو کیا شاد رہے کوئی کہ ناشاد رہے

کہتا ہے شوقِ قتل میں ہر وار پر ذبیح　　قاتل خدا کے واسطے اِک وار اور بھی

ذبیح

ذبیح جناب خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب ایڈیکانگ نواب ڈھاکہ تلمیذ جناب نسیم ابوالعلائی باشندہ بنگال بعد میں حضرت داغ سے تلمذ اختیار کیا، نوجوان شخص ہیں علمی قابلیت خاصی ہے موزونیٔ طبع کے اقتضا سے گاہ گاہ فکرِ سخن بھی کر لیتے ہیں اپنے آقا کے ہمراہ ہندوستان کے مشہور مقامات کی سیر بھی کی ہے۔ یہ کلام ہے

خدا نے شوق کو کیا رہنما میرا بنایا ہے　　ملا ہے منزلِ اُلفت میں یہ رہبر بہت اچھا
کبھی خالی نہیں ہیں چال سے عیار کی باتیں　　یہ کہتا ہے دمِ عہدِ وفا اکثر بہت اچھا
تم آئے اور ساری بیقراری ہوگئی رخصت　　نہ گھبراؤ کہ ہے حالِ دلِ مضطر بہت اچھا
زمانے بھر میں کوئی غیر کو اچھا نہیں کہتا　　کہو انصاف سے کہتے ہو تم کیونکر بہت اچھا

گلہ کیوں کروں کیا مرا سر پھرا ہے　　گلے پر عنایت سے خنجر پھرا ہے
بہت دیکھے ہیں انقلاباتِ عالم　　فلک عمر بھر میرے سر پر پھرا ہے

ذبیح

ذبیح۔ مولوی محمد اسمٰعیل خان باشندہ بھوپال۔ آجکل کے شعرا میں ہیں۔ طرزِ سخن مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے پینتیس برس کی عمر ہے۔

مانگتا ہوں پی کے مے ہر دم دعا برسات کی　　بھا گئی ہے کچھ ادائے جانفزا برسات کی
ایک جامِ مے کے بدلے رندِ مے آشام سے　　لےگئی دل چھین کر بانکی ادا برسات کی
لطفِ دخترِ رز کی اُلفت میں کچھ آیا ہی اسے　　مانگتا ہے اب تو زاہد بھی دعا برسات کی

مجھکو چُپ کرنے نہیں رسوا یار تو ہو جائیگا
یہ سکوت آخر کو بڑھ کر گفتگو ہو جائیگا

وہ آیا حور پیکر فاتحہ کو
بنا رشکِ جناں مدفن کسیکا

آئینہ نے جو کہا عکس ہوں حیرانوں کا
بول اُٹھی زلف کہ سایہ ہوں پریشانوں کا

میرے زخموں نے اُڑایا ہی ہنسی ہیں سبکو
شور سنتے تھے بہت اُنکے نمک دانوں کا

ہے زیرِ قدم سیل شہیدوں کے لہو کا
عالم قدِ قاتل میں ہے سرو لبِ جو کا

موتی کی صفا زیر ہے دانتوں کی چمک سے
اِس تاب نے پُل باندھ دیا آب گہر پر

قیامت تک نہو گی گل تو اُن کی
جئیں اُمیدِ وعدہ پر کہاں تک

تاثیر سے نالہ کی پلٹ دینگے مقدر
قسمت نئی لکھنے کو اُٹھاتے ہیں قلم ہم

ملجائے کوئی بُت تو اُسے دل میں جگہ دیں
کعبہ کیلئے ڈھونڈتے پھرتے ہیں صنم ہم

مُنہ سے لگا ہوا ترے جامِ شراب ہو
اِک دن تو اتصال مہ و آفتاب ہو

اُڑا دے ہوش بے پیر شیخ کے دو چلو پانی
دکھا منکر کو بھی پیرِ مغاں تاثیر میخانہ

نگہ میں رکھنا رند و محتسب چھپ چھپ کے آتا ہے
اُچکا ہے اُڑا لیجائے گا کفگیر میخانہ

رکوع و سجدہ کرتے دیکھنا متوالے رندوں کو
جو بانگِ قلقل مینا سے ہو تکبیرِ میخانہ

شراب پاک بندوں کو وہاں حوریں پلائینگی
کہیں جنت نہ ہو واعظ تری ہمشیرِ میخانہ

تسکین تجھ سے ہو جو کسی تشنہ کام کی
اے آبِ تیغ یہ بھی ہے اک بات نام کی

خنجر کی ادائیں نہوئیں ختم گلو پر
کچھ دیر تو اے حضرتِ خوں تھم گئے ہوتے

خدا جانے جو خواہش اور کچھ ہوتی تو کیا ہوتا
ذرا سے ایک بوسہ پر تمہارا دم نکلتا ہے

ہمارے وصل کا وعدہ وہ کرتے ہیں تو مجمل سا
سخن منہ سے نکلتا ہے تو اک مبہم نکلتا ہے

ضدِ اُسنے دلا کر مجھے کی رہبرئی عشق
ناصح بھی مرے واسطے گویا خضر آئے

ہجر نے عاشقِ مفلس کو کیا مالا مال
کہ دُرِ اشک کی سینے پہ لڑی رہتی ہے

کہتے ہو تم زخم دل سے مسکرایا کس لیئے
تیر کی اُنگلی سے پوچھو گدگدایا کس لیئے

وہ مجکو بے وفا کہتے ہیں یہ تائید کرتی ہے — الٰہی ہوگئی اُنکی زباں گویا زباں میری
دکھایا داغِ پیشانی جو اُنکو ہنس کے فرمایا — جبینِ فخر کی زینت ہی خاکِ آستاں میری
عیادت کے لیئے یہ کون آتا ہے دمِ آخر — چلی جو بہرِ استقبال جانِ ناتواں میری
تمنا ہے اُسی کی جان دی ہی جسکی فرقت میں — کھڑی ہیں کسلیئے مشتاق حورانِ جناں میری
گذرتا ہی اگر حرفِ طلب اپنے تصور میں — تو ہو جاتی ہی پنہاں شرم سے مُنہ میں زباں میری
یہ کیسی آہِ آتش بار یارب دل سے نکلی ہے — دگرگوں ہوگئی حالت وہاں اُسکی یہاں میری
بجھے جہان کی خو اسکو عادت شکرِ جہاں کی — ترے دِل کی طرح ہی کام میں ہردم زباں میری
مرے سوزِ نہاں کا ماجرا تم شمع سے پوچھو — حقیقت کہہ رہی ہی صاف وہ آتش زباں میری
وہاں وہ شانِ آمرزش یہاں شرمِ تہیدستی — کوئی گوشہ نہیں ملتا چھُپے غیرت جہاں میری
ذبیح اس عہد میں گو اور بھی ہیں مدعی اسکے — مگر حاصل کہاں یہ خوبیِ حُسنِ بیاں میری

ذبیح

ذبیح منشی محمد سمعیل ذبیح باشندہ کیامٹی، سعید صاحب کے حقیقی بھتیجے اور اُنھیں کے شاگرد ہیں پندرہ سولہ برس سے مشقِ سخن کرتے ہیں۔

سنورتی ہے زلفِ پریشاں کسکی — بلا میں کوئی مبتلا ہو رہا ہے
چمن میں جو اٹھکھیلیاں کر رہی ہی — یہ کس گل کا ذکر اے صبا ہو رہا ہے
وہ بُت دیکھ کر مجکو مسجد میں بولا — ذبیح آجکل پارسا ہو رہا ہے

ذبیح

ذبیح حکیم منشی محمد سمعیل خان ذبیح دہلوی ابن مولوی ابراہیم خان سابق برانچ پوسٹ ماسٹر پہاڑ گنج پہلے دہلی میں مطب کیا کرتے تھے، اشعار میں ظریفانہ مضامین اکثر لکھا کرتے ہیں افضل الاخبار میں کئی سال تک برابر ضمیمہ میں انھیں کے مضامین نکلتے رہے اب دو تین برس سے نواب احمد سعید خان صاحب طالب جاگیردار لوہارو کی سرکار میں ملازم ہیں پچپن ساٹھ برس کے قریب عمر اور استعداد علمی بقدرِ ضرورت اچھی ہے ÷

دلِ مایوس میں اپنے ہزار ارماں کا مدفن ہے — گماں ہوتا ہی سینہ میں مجھے گورِ غریباں کا

وغیرہ کی کیفیت نہیں معلوم ہوئی۔ الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ کلام بہت مزے کا اور تعقید سے پاک وصاف اور تلاش مضمون اور الفاظ سے بھی صاحب مذاق سلیم ہونا ثابت ہے ملاحظہ ہو

نہ بیٹھے چین سے اک دم کہیں ہم شادماں ہو کر — پھرایا گردشِ قسمت نے دورِ آسماں ہو کر
کروں عرضِ ہنر کیا جب نہ پایاں قدرداں کوئی — کمال اپنا یونہیں مخفی رہا گنجِ نہاں ہو کر
بزنگِ نخلِ بے برگ و ثمر تھی قدر کب اپنی — رہے جبتک جہاں میں ہم رہے بارِ جہاں ہو کر
تواضع سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو — کجی ہم دور کر دیتے ہیں تیروں سے کماں ہو کر
ملی یہ سربلندی جب مٹایا اپنی ہستی کو — ہوئے مسجودِ عالم اُسکے خاکِ آستاں ہو کر
خزاں کے خوف سے بلبل ہوئی ہو سوکھ کر کانٹا — رہیگی آشیاں میں بھی تو خارِ آشیاں ہو کر

یہ کیسی اپنی غفلت ہی کہ یادِ حق سے غافل ہیں — عیاں ہے صبحِ پیری ہم ابھی ما بین منزل ہیں
دلِ بے مدعا قدرِ امید و بیم کیا جانے — نقوشِ کائنات اپنی نظر میں حرفِ باطل ہیں
رہے ہم سبزۂ بیگانہ بنکر باغِ ہستی میں — حقیقت میں جدا سب سے مگر ظاہر میں شامل ہیں
ہوئی جب سلب طاقت کیا نتیجہ پرفشانی کا — ہماری کوششیں جتنی ہیں سعی مرغِ بسمل ہیں
ذبیح ناتواں جو تھے کبھی آرامِ جاں اپنے — وہی افسوس دشمن کے فروغِ خانۂ دل ہیں

تمھارے ظلم کا ہمکو خیال کچھ بھی نہیں — ملال دل سے ہے تم سے ملال کچھ بھی نہیں
ذبیح عمر سریع الزوال کچھ بھی نہیں — خزان و ہجر و بہار و وصال کچھ بھی نہیں
عبث ہی اُن سے توقع وفائے وعدہ کی — مآلِ کوشش امرِ محال کچھ بھی نہیں
یہ کیسی طرزِ عمل ہے خدا سے شرم نہیں — گناہ حد سے فزوں انفعال کچھ بھی نہیں
یوں ہی گذرتے ہیں غفلت میں دن جوانی کے — ذبیح آپ کو فکرِ مآل کچھ بھی نہیں

رہے پابندِ تسلیم و رضا ہم ایسے بسمل ہیں — گلے پر خنجرِ قاتل زباں پر شکرِ قاتل ہے

نہ ہو کیوں عشق میں ڈوبی ہوئی طرزِ بیاں میری — جوانی گو نہیں لیکن طبیعت ہے جواں میری
عبث اس خاکدانِ تنگ و تیرہ میں پھنسے آکر — کہاں یہ قیدِ تنہائی وہ آزادی کہاں میری

قطعہ

لاغر بھی ہوئے ہم تو تماشے کی غرض سے
کھنچواتے ہیں تصویر پریزاد ہماری

دم سادھے ہوئے اور ذبیح جگر افگار
محنت کہیں ہو جائے نہ برباد ہماری

اپنی ہنسی کو اگر ہم نہ مٹاتے اے جاں
پھر یہ پیدا کہیں مضمون کمر کے ہوتے

نصیب اچھے اگر اے بلبل شوریدہ سر ہوتے
پھر آتی فصل گل اور پھر ہرے داغ جگر ہوتے

دھواں آہوں کا سیدھا چرخ تک پہنچا تو حاصل کیا
کہیں ہے سرو کو دیکھا کسی نے بارور ہوتے

رقیب اپنے دلوں ہی میں آپ ہی کٹ کٹ کے مر جاتے
ادھر ہم سر بکف خنجر بکف جب تم ادھر ہوتے

فرشتوں کوئے جاناں کی ہوا جو تم کو چھو جاتی
ہماری طرح تم بھی خاک اڑاتے دربدر ہوتے

قفس میں مجکو بازو توڑ کر کیوں قید کرنا تھا
ہوس کچھ تو نکالیتا جو ثابت بال و پر ہوتے

کمال ضعف سے اب پاؤں لڑکھڑانے لگے
گرا اگر مدد اے شوق لے سنبھال مجھے

دل رمیدہ وہیں پھر پھرا کے آتا ہے
ہوا ہے نقطۂ پرکار رخ کا خال مجھے

بوسہ بن مانگے رہا جاتا نہیں
گالیاں کھانے کی عادت ہو گئی

جانے آ کر وہ غضب ڈھائینگے کیا
جن کی آمد اک قیامت ہو گئی

ذکر مے کیوں شیخ سنکر پی گئے
کیا کہیں صاحب سلامت ہو گئی

بھول کر یاد وطن آئی نہیں
وادی غربت میں مدت ہو گئی

کی دوا جب سے ترے بیمار کی
اور ابتر اسکی حالت ہو گئی

کسی سے وہ بگڑتے ہیں کسیکو وہ بناتے ہیں
خدا جب حسن دیتا ہے شرارت آ ہی جاتی ہے

ہلال عید کی حسرت تو ہوگی روزہ داروں کو
مجھے میرے گلے سے یار کی تلوار ملنے کی

کیوں شراب سخن اپنی نہ ہو خوشرنگ ذبیح
اسکو نسبت بھی تو ہے داغ کے خمخانے سے

بتوں کی اگر ایسی ہی چڑھ بنی ہے
کسی دن خدائی کا دعویٰ کرینگے

ذبیح

ذبیح منشی باقر حسین صاحب طبیعت دار اور ذکی شخص ہیں کلام سے مشاقی بھی پائی جاتی ہے اور علمی استعداد بھی معقول معلوم ہوتی ہے ہر شعر میں بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تلمذ

موسیٰ کی طرح ہوش ہم اپنے گنوائیں کیوں
ذکرِ حبیب خوش ہے لقائے حبیب سے

کچھ اُنکے رعب حسن سے کچھ میرے خوف سے
نکلی نہ ایک بات زبانِ رقیب سے

بیوجہ مُنہ پھلائے نہیں ہیں چمن میں پھول
بھڑکا دیا صبا نے انھیں عندلیب سے

اک آنکھ سوئے گل بھی تو اک سُوئے آشیاں
ضیا وجب چھُٹا تھا چمن عندلیب سے

مرے سینے کے ویرانے میں کیا جانے دھرا کیا ہے
نہ تیرا غم نکلتا ہے نہ میرا غم نکلتا ہے

ایک وہ خنجر جو چلنے کو کفِ قاتل میں ہے
ایک وہ حسرت نکلنے کو جو میرے دل میں ہے

آج خوش خوش جارہا ہے قیس کیوں ناقہ کے ساتھ
کون تسکین بخش جنبش پردۂ محمل میں ہے

مجھ سے حاصل میری دلکی حسرتوں کا پوچھنا
تم وہی آخر کروگے جو تمھارے دل میں ہے

مرگِ دشمن کی مجھے آنکو مرے مرنے کی فکر
ایک ارماں اُنکے دلمیں ایک میرے دل میں ہے

وسعت آبادِ جہاں میں جن کی گنجایش نہ تھی
جمع اُن سب حسرتوں کا خون میرے دل میں ہے

نہیں سمجھتے ہیں زلف سیہ کے دیوانے
کہ کھیلتی ہے سرِ یار پر قضا اُن کی

مجھے جو دیں وہ عقوبت تو مستحق ہوں میں
جو بخشندیں وہ خطائیں تو ہے عطا اُنکی

شب وصل اُنکے چہرے کی ضیا کچھ اور کہتی ہے
لپٹ کر کالی زلفوں کی بلا کچھ اور کہتی ہے

بٹھائے دیتی ہے جی گرچہ کوتہ دستیٔ قسمت
مگر مجھ سے مری آہِ رسا کچھ اور کہتی ہے

لبِ جاں بخش کے عیسیٰ نفس ہونیکا کیا کہنا
مگر تیغِ تبسّم کی ادا کچھ اور کہتی ہے

کسی کی موت قبل از وقت تو آتی نہیں ہرگز
مگر اُس کی ادا میری قضا کچھ اور کہتی ہے

میں اُنھیں حالِ زار جو سمجھاتا ہوں
ٹالنے کیلئے کہدیتے ہیں ہاں ہاں سمجھے

خاطرِ عزیز دونوں کی ہے تیر یار کو
دم بھر مقام دل میں تو دم بھر جگر میں ہے

میری بھلائیاں تو برائی میں ہوں شمار
دشمن کرے جو عیب وہ داخل ہنر میں ہے

تمھاری دلربائی کے تصدق
نیا دلِ روز میں لاؤں کہاں سے

تُم سے تو بتو مل نہ سکی داد ہماری
اللہ سے بس اب تو ہی فریاد ہماری

خلش نوکِ مژہ رہ گئی دل میں پس کر	نہ تو وہ نکلی نہ ارمان ہمارا نکلا
ضبط نے بھر کے طبیعت کبھی رونے نہ دیا	داغِ غم دامنِ دل سے کبھی دھونے نہ دیا
اللہ اللہ تری بیگانہ مزاجی جس سے	غیر تو غیر ہیں اپنا مجھے ہونے نہ دیا
اے ہوا تیری غرض کیا ہے کہ تونے دم بھر	شمع مرقد کو مرے حال پہ رونے نہ دیا
اے بتو بندہ پروری سیکھو	حوصلہ ہے اگر خدائی کا
ہوئی پھر جو فصلِ بہاری کی آمد	ہرے پھر یہ زخمِ جگر دیکھ لینا
نظروں سے جو اترے ہیں تو سولی پہ چڑھے ہیں	اللہ غنی رتبہ شاہانہ ہمارا
اے فلک زور پہ اپنا جو ستارا ہوتا	پاس میرے بھی کوئی چاند کا ٹکڑا ہوتا
پرتوِ رخ نہ سہی سایۂ کاکل ہی سہی	کوئی تو آکے انیسِ شبِ یلدا ہوتا
وہ مسیحا نہیں آتا ہے تو موت آجاتی	دردِ دل کا تو کسی طرح مداوا ہوتا
میرے مرنے پہ تو مخلوق نہ ہنستی مجھپر	خوب ہوتا سرِ بالیں نہ مسیحا ہوتا
رخصت اے رشک کہ ہم صلح عدو سے کرلیں	دیکھ لیں ہم بھی کہ لڑتی ہیں نگاہیں کیونکر
کوئی شے عالمِ بالا سے پلٹتی ہی نہیں	اے ذبیح آتی ہیں واپس تری آہیں کیونکر
پہلو سے تیرِ یار نکالا تو اُس کے ساتھ	پر لپٹے ہوئے ذبیح کے تھے پارہ ہائے دل
یہ عجب بات ہے ساقی ترے میخواروں میں	مست مستوں میں ہیں ہشیار ہیں ہشیاروں میں
تھی مجھے اپنی دوا کے لئے عیسیٰ کی تلاش	وہ ملے بھی تو ملے آپکے بیماروں میں
مناظر ہیں خدا کی صنعتوں کے	خدا رکھے خدا ساز ان کی آنکھیں
مجھ سے ظاہر میں فلک اور خفا تو دل میں	ایک عدو سر پہ سوار ایک بلا کو دل میں
پھر جان زار بھی نہ تھی عندلیب سے	چھوٹا جو برگِ گل دہنِ عندلیب سے
جلوہ ہے ایک ہم سے نہ پنہاں قریب سے	دیکھا ہے ہمنے دُور سے اُس نے قریب سے
کل میکدہ میں شیخ کی حالت تھی اور ہی	آتے ہیں آج تو یہ نظر کچھ ادیب سے

سے وکالت کا امتحان دیا اور پاس ہوگئے، جب تک اِنکے برادر مذکور فتح گڑھ میں وکالت کرتے رہے یہ اور مقاموں میں رہے اُنکی رحلت کے بعد فتح گڑھ میں وکالت شروع کی اور آجتک وہیں وکالت کرتے ہیں، شعروسخن کا ابتدائے عمر سے شوق ہے، فارسی زبان میں بھی فکرِ سخن کرتے ہیں بلکہ اُردو سے زیادہ اس طرف توجہ ہے، نواب فصیح الملک جہاں اُستاد حضرت داغ دہلوی مرحوم کے جاں نثار شاگردوں میں ہیں، اگرچہ کسی وقت اپنے اُستاد کی زیارت سے مشرف نہیں ہوئے مگر انکی عقیدت اور ارادت کی وہ حالت ہے کہ جو ہر وقت کے حاضر باش کو بھی نہیں ہوسکتی، نہایت زندہ دل اور عجب بے فکر طبیعت پائی ہے، اگرچہ وکالت کا کام وہ ہے جو آدمی کو دوسری طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا مگر جناب ذبیح اسکے ساتھ ساتھ اپنے تمام دلچسپیوں کے مشاغل بھی نہیں چھوڑتے، شکار اور شاعری دونوں کا شوق برابر ہے - بلکہ یہ التزام ہے کہ سال کو تین فصلوں پر منقسم کر کے ایک ایک فصل کے لئے اپنا ایک ایک کام مقرر کر رکھا ہے، یعنی چار مہینے قانونی خدمت چار مہینے شاعری، چار مہینے شکار، غرضکہ عجب رنگ کے آدمی ہیں - زندہ دلی میں فرد ہیں - اکثر شاعری بھی کرتے رہتے ہیں، ۳۰ برس سے مشقِ سخن ہے اور بدرجۂ اوسط سب خوبیاں انکے کلام میں موجود ہیں ٭

ہاں ہٹ کے ذرا اس سے ای گیسوں والے — بھڑ جائے نہ تجھ سے دلِ دیوانہ ہمارا

نگاہیں قیس کی ٹکرا رہی ہیں سرِ قیامت سے — اُٹھا دے اے صبا للہ تو ہی پردہ محمل کا

ادھر شوقِ شہادت سے رگوں میں خون کی طغیانی — اُدھر چل چل کے رُک جانا گلے پر تیغ قاتل کا

ہزاروں بیگنہ دن رات یوہیں قتل ہوتے ہیں — نہ دم رُکتا ہے خنجر کا نہ دل دُکھتا ہے قاتل کا

یار کے نام پہ لازم ہے فدا ہو جانا — اک اسی فرض کا باقی ہے ادا ہو جانا

پھر مجھے موردِ الزام بنانا ناحق — غیر کی بات پہ پھر مجھسے خفا ہو جانا

زلفیں تا شانہ تو جا پہنچی ہیں اب دور ہے کیا — تا کمر بڑھ کے انھیں دامِ بلا ہو جانا

مسجد میں بیٹھکر تو پیتا ہے مَے جو واعظ	تیرا طریق بالکل رندانہ ہو گیا ہے
ہم کوچۂ بتاں میں چکر لگا رہے ہیں	زاہد ہمارا کعبہ بتخانہ ہو گیا ہے
دل میں بتوں کی اُلفت ذکرِ خدا زباں پر	واعظ کی کچھ نہ پوچھو دیوانہ ہو گیا ہے

ذبیح

ذبیح۔ مرزا امان علی مقیم بہادر، بقول نساخ شیعہ عقائد سے توبہ کر کے سُنی ہو گئے تھے اور ۱۸۷۰ء تک حیات تھے ❊

اسقدر تو ہو رجوعِ قلب عاشق سوئے دوست	مُنہ جو دشمن کا نظر آوے تو سمجھے روئے دوست
یہ وہی سر ہے کہ اب ہے اپنے زانو پر سدا	یا اِسی کو تھا میسّر تکیہ زانوئے دوست

ذبیح

ذبیح۔ نواب اسمٰعیل خان ذبیح معروف بہ اچھے میاں، بریلی کے رؤسا میں نواب حافظ الملک رحمت خاں کی اولاد میں تھے، محمد ابراہیم خاں کے بیٹے اور نواب عبدالعزیز خاں عزیز مرحوم کے بھتیجے تھے۔ سترہ اٹھارہ برس ہوئے پچاس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ اُسکے کلام بہم رسیدہ کا خلاصہ ہے جو بڑی دقت سے معرفت شفیقی و مکرمی قاضی محمد خلیل صاحب رئیس بریلی دستیاب ہوا ❊

حافظ آتشِ حب ہے دلِ بیتاب اپنا	آگ اُسپر ہوئی قائم وہ ہے سیماب اپنا
عشق نے ہمسے ازل ہی میں لیا تھا آرام	آنکھ بھی پائی نہ تھی جب سے گیا خواب اپنا
وہ ہوں حُباب کہ قطرہ مَے عدم کا تھا	اُبھار لائی ہے اِس نشہ میں ہوائے شراب
اثر شکستہ دلی کا ہے جسمِ لاغر پر	شکن کی طرح پڑا ہوں ہیں اپنے بستر پر
ملجائے کوئی بُت تو اُسے دل میں جگہ دیں	کعبہ کے لئے ڈھونڈتے پھرتے ہیں صنم ہم
تسکین مجھ سے ہو جو کسی تشنہ کام کی	اے آبِ تیغ یہ بھی ہے اک بات کام کی

ذبیح

ذبیح۔ مولوی سید محمد اسمٰعیل ساکن تحصیل چھبرامئو ضلع فرخ آباد ۱۲۶۲ ہجری سالِ ولادت ہے، نیک نفس خلیق، اور پاک باطن شخص ہیں۔ عربی۔ فارسی کی قابلیت معقول رکھتے ہیں ابتدائے عمر میں معلمی کرتے تھے، معلمی کے بعد اپنے بھائی مولوی محمد عمر مرحوم کی تحریک

ذاکر

ذاکر منشی عنایت خاں ذاکر سنہ ۱۹۰۰ء میں کراچی بندر میں ریلی برادرز کے دفتر میں کلرک تھے، اُس زمانے کی چند غزلیں ہاتھ آئیں اُنکا انتخاب موجود ہے۔

بتوں سے ہے دن رات صحبت ہماری
دکھاتی ہے کیا دیکھیں قسمت ہماری

چلو آج چلکر پئیں شیخ صاحب
کسی دن تو سن لو نصیحت ہماری

ہم اے شیخ کیا حور لیکر کرینگے
ملیگی نہ اُس سے طبیعت ہماری

وطن جاکے باہم ملیں دوستوں سے
کہاں ایسی ذاکر ہے قسمت ہماری

ذائق

ذائق۔ جناب منشی عبدالعزیز لکھنوی عرصہ تک کراچی بندر کی نیوسٹار وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی میں ڈراما نویس رہے، اِس روزگار کے سلسلہ میں تمام ہندوستان کی سیاحت بھی کئی مرتبہ بخوبی ہوگئی اب ۴۰ برس کے قریب عمر ہوگی سنہ ۱۹۰۰ء میں نامی پریس کانپور میں بھی ملازم رہے مفصل حالات کے لیئے بارہا احباب لکھنؤ سے تقاضا کیا، کسی سے جواب باصواب نہ آیا اشعار بہم رسیدہ کا انتخاب یہ ہے۔

نہ کہتا شب وصل ماجا کسی کا
غضب ہوگیا ضد پہ آنا کسی کا

باقی ہے میرے دل میں خدا جانے کیا اُمید
فرقت میں دم لبوں پہ ہے مرتا نہیں ہوں میں

بے دین کردیا بتِ کافر کی چاہ نے
ڈر سے خدا کا نام بھی لیتا نہیں ہوں میں

شب بھر مجھے چھاتی سے لگائے تھا کوئی شوخ
اِس خواب کی تاثیر کا کیا دیکھیں اثر ہو

شوخی تو یہ دیکھے ستم ایجاد کی کوئی
کہتا ہے وہ ہمسے کہ ہمیں باقی تشہ ہو

وفا کیا کرینگے کسی باوفا سے
ستم کرنے والے جفا کرنے والے

شرمندہ ہے قمر ترے گالوں کے سامنے
سنبل کو پیچ و تاب ہے بالوں کے سامنے

شوخی تمام بھول گیا چرخ کج ادا
چکر میں آگیا تری چالوں کے سامنے

ذائق

ذائق شیخ منیر اللہ کانپوری شاگرد حاذق دور موجودہ کے شاعر ہیں اور یہ کلام ہے۔

شیدائے چشم میگوں مستانہ ہوگیا ہے
مجنوں ہیں جو ہیں کہتے دیوانہ ہوگیا ہے

پھر کہہ رہی ہے آبلہ پائی جنوں سے آج
سوکھی زبان ہے سرِ ہر خار دیکھنا

بت سے نفرت ہی مگر بیخود ہیں شوقِ حور میں
شیخ صاحب کی ذرا پرہیزگاری دیکھنا

کٹوا کے سر کو خوش ترا رنجور ہو گیا
اِک دردِ سر تھا روز کا اب دُور ہو گیا

اسقدر چمکے شبِ ہجراں کہ اختر بن گئے
دِل کے داغوں سے اندھیرے میں اُجالا ہو گیا

ہم نہ کہتے تھے نہ دیکھو آئینہ یہ کیا ہوا
کِس لئے ششدر ہوئے کیوں تمکو سکتا ہو گیا

سیل گریہ میں تصور اُنکی مژگاں کا رہا
ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا ہو گیا

بن گئی ہے دم پہ کیا ای حضرتِ ذاکر کہو
تمکو کیوں دشوار اب راتوں کا سونا ہو گیا

پھر مجھے لیجا کے واں رسوا کیا
جو کیا اے دل بہت اچھا کیا

یہ سُنا ہے غیر سے شکوا کیا
شکر ہے کچھ ذکر تو میرا کیا

ملکے روئیں مجھ سے میری حسرتیں
حسرتوں سے ملکے میں رویا کیا

لختِ دل آنکھوں سے نکلے تو کہا
دیکھ آگے آگیا تیرا کہا

کہاں کسی ہیں یہ خود نمائی کہاں کسی ہیں یہ دلربائی
اگرچہ دیکھی بہت خدائی پر ایک تمسا تمہیں کو دیکھا

آئے ہیں بن سنور کر پہلو میں عاشقوں کے
ارماں بڑھا کئے ہیں کچھ اور رات ڈھل کر

زلف عارض پہ کھا رہی ہے بل
چھائی کالی گھٹا ہے گلشن پر

چار تنکوں نے گل کھلائے ہیں
بجلیاں لوٹ ہیں نشیمن پر

دلِ ذاکر تصدق ہو گیا شبہائے ہجراں پر
فغاں پر، آہ پر، فریاد پر، حسرت پر، ارماں پر

قیامت ٹھوکریں کھاتی ہے فتنہ پاؤں پڑتے ہیں
عجب انداز سے آتے ہیں وہ گورِ غریباں پر

نگاہِ لطف کی تیری یہ ادنیٰ کارسازی ہے
کہ میرے کام جو مشکل تھے آساں ہوتے جاتے ہیں

بے حجاب آج کس نے دیکھ لیا
بات کہیے تو شیخ جی دِل کی

کیوں تیغ دو دم آج ترے زیبِ کمر ہے
خوں ریزی عشاق مگر مدِ نظر ہے

محیط آبِ غیرت ہوں غریقِ بحرِ عصیاں ہوں
مری تردامنی سے ہو گئے لب خشک ساحل کے

کہوں میں کیا حال اپنے جی کا نہیں ہے پرساں کوئی کسی کا
خدا ہی اس میری بیکسی کا کہ ایک میں اور غم ہزاروں

مری مصیبت نہ پوچھو کیا ہی بلا کا ہر وقت سامنا ہی
دلِ نبا اُس زلف میں پھنسا ہی کہ جسمیں ہیں پیچ و خم ہزاروں

دِل بیچتے ہیں ایک صنمِ خوش ادا کے ہاتھ
قیمت وہی خوشی سے جو دیدے اُٹھا کے ہاتھ

دکھائے لطف یہ گردش نے مجکو غربت میں
جہاں رہے یہی سمجھے کہ ہم وطن میں رہے

تمام عمر سفر میں بسر ہوئی اپنی
مسافرانہ بھی اِک دن نہ ہم وطن میں رہے

کہتے ہیں وہ دکھلا کے مجھے کاکل و عارض
لو دیکھو کہ ہوتی ہے شب ایسی سحر ایسی

مثل اُس کا نہ دیکھا نہ جواب اس کا سُنا ہے
کس مُنہ سے کہیں ہم دہن ایسا کمر ایسی

عاصی ہوں لاکھ پھر بھی جو تو چاہے اے کریم
جنت کو فخر تیرے گنہگار سے ملے

پہچانو گے نہ کعبہ کا رُخ بھی جناب شیخ
گھر تک جو اِن بتوں کے خدا کی قسم گئے

بیان کیا عجب کا ہو آسکے کہ سایہ تک جس سے دور بھاگے
ملا سکے آنکھ اُس پری سے کسی بشر کی مجال کیا ہے

موت میری شکل سے بیزار ہے
زندگی کی کیا ہو صورت دیکھئے

پھینک دونگا پھاڑ کر فردِ گناہ
واں مری دیوانگی کام آئے گی

تم کہے جاتے ہو میں خاموش ہوں
میں کہوں تو بات کیا رہ جائیگی

ذاکر — شیخ برکت اللہ صاحب دہلوی۔ صاحبِ دیوان ہیں، حالات باوجود کوشش مُہیا نہ ہوسکے نہ دیوان سے کچھ پتہ چلتا ہی طباع اور ذہین شخص معلوم ہوتے ہیں، زبان اور بندش دونوں اچھی ہیں اور اُس میں معرفت کا رنگ اچھی طرح نمایاں ہی، دیوان کا خلاصہ درج ذیل ہی۔

کعبہ میں بتکدہ میں ڈھونڈا ہی خوب تجھکو
آخر کو ہمنے پایا دل میں مقام تیرا

روزِ الست سے اِک سرشار ہم نہیں ہیں
عالم ہے مست پیکر وحدت کا جام تیرا

ہر رنگ میں عیاں ہی ہر شکل میں نہاں ہی
گر تو نہ دیکھے اُسکو تو ہے قصور تیرا

بجلیاں دل پہ گراتا ہی ہزاروں ظالم
محفلِ غیر میں یہ آنکھ لڑانا تیرا

یہ بھی ہی جذبِ محبت کا کرشمہ کوئی
تیغ کھنچتی ہی کھنچا جاتا ہے کچھ دل میرا

ذاکر خوشی کے ساتھ نہ کیوں پی لیا کروں
کرتی ہے دل سے دور غمِ دو جہاں شراب

زاہد وہ پی لو قسم کھائے کو اک ساغر شراب
ورنہ کب جنت میں دینگے ساقیٔ کوثر شراب

ہو کے ساقی نے ترشرو جو دیا جامِ شراب
سمجھے ہم سرکہ بھی ہے داخل اقسامِ شراب

میں نے یوسف جو کہا کہنے لگے پیار سے آپ
کچھ مجھے مول نہیں لائے ہیں بازار سے آپ

تو نے جو بہرِ عیادت کل کا ہے وعدہ کیا
تندرستوں سے بھی اچھے ہیں ترے بیمار آج

دے چکا ساتھ خط کے صبر و قرار
اب مرے پاس کیا رہا قاصد

پھر نہ جائے خدا سے اسے ذاکر
ہو کے اُس بت سے آشنا قاصد

ہوں وہ وحشی کہ نہیں چین مجھے گھر باہر
گھر ستاتا ہے جنوں پڑتے ہیں پتھر باہر

کریں تجویز کیا منسوخ تحریرِ قسمت کی
خدا کے گھر سے آیا ہے یہ جھگڑا فیصلہ ہو کر

چاہے جو اپنی خیر تو جائے نہ شر کے پاس
ہو جس بشر میں شر نہ ہے اُس بشر کے پاس

ہو کے مفلس بھی نہ شاکی ہوئے تقدیر کے ہم
شکر ہے صبر کی دولت تو بچی زر کے عوض

واں پہنچکر سب مرے ہو جاتے ہیں بیکار خط
بھاؤ ہیں ردی کے بکتے ہیں سرِ بازار خط

کیا خاک ہو غمِ دلِ اندوہگیں غلط
لکھا نصیب کا بھی ہوا ہے کہیں غلط

نہیں ان دو بلاؤں سے کہیں چین
جہاں دیکھو زمین و آسمان ایک

رہا ذاکر نہ بعدِ حضرتِ مہر
زمانے میں سخن کا قدرداں ایک

کترا کے نکل جاتے ہو کیوں راہ میں ہم سے
عاشق ہیں تمھارے کوئی رہزن تو نہیں ہم

گانا سُنکے ترا جی سے گزر جاتے ہیں
سینکڑوں ہی تری ہر تان پہ مر جاتے ہیں

اللہ رے بیخودی نہیں اتنا بھی ہمکو ہوش
بیٹھے ہیں کسکے پاس کہاں ہیں خبر نہیں

ٹھیرے یہ پاس آپکے ممکن کبھی نہیں
لیجاتا میرے دلکا کوئی دل لگی نہیں

گھر آپکے بچشم گہربار آئے ہیں۔
ہم نذر دینے موتیوں کا ہار آئے ہیں

کر دوں میں کس کس پہ دلکو مفتوں ہیں جن پہ کم سے کم ہزار دل
خدا ہی کو اپنے کیوں نہ مانوں کہ ہے وہ تنہا صنم ہزار دل

وقت کے مشاہیر میں ہر طرح ممتاز تھے، دیوان نغمۂ بہار نامی اٹھان بیں جزو پر اُس زمانہ میں چھپا تھا، ذاکر، منشی خادم حسین رئیس، صفی امروہوی، ماہ لکھنوی، بزم اکبرآبادی وغیرہ سے ہم صحبت رہتے تھے، فارسی میں بھی ایک مجموعہ مختصر ان سے یادگار ہے۔ طولانی غزلوں میں بھی بمشکل ایک دو شعر معلق اور پیچیدہ ترا کیب سے مُعرّا نکلتے ہیں، مگر ہمنے حتی الوسع صاف عاشقانہ زبان کے اشعار چنے ہیں دیوانِ مطبوعہ کا از سرتاپا انتخاب اپنی پسند کے موافق ضیافت طبع شائقین کے لیئے مہیا کیا جاتا ہی اس میں ہمنے اخلاقی مضامین ارادتاً زیادہ چُنے ہیں ؛

وہ شائق ہوں کہ اپنی جان شیریں دیکے کھاتا ہوں
بہت میٹھا ہی پھل قاتل تری شمشیر بُرّاں کا

سچ پوچھو تو کچھ جھوٹ سے حاصل نہیں ہوتا
سر سبز کبھی دعوئے باطل نہیں ہوتا

کہدو یہ خریداروں سے مول اسکا نہ پوچھیں
جو ڈے نسکے کوئی وہ بیعانہ ہی اُس کا

رہبر راہِ حقیقت ہی غمِ عشق بتاں
وہ مصیبت پڑی سر پر کہ خدا یاد آیا

یَس غم کو، سب مجھے کھائے جاتا ہے غم
وہ میری یَس اُس کی غذا ہو گیا

آجتک کیا نہ ہوا اور نہ ہوگا کیا کیا
دیکھا اور دیکھیں گے دنیا کا تماشا کیا کیا

دل ہی دل میں میری باتوں سے کٹے جاتے ہیں غیر
رکھتی ہے میری زباں قاتل اثر تلوار کا

عطر ہے جس کا پسینہ وہ بدن کیا ہوگا
گالیاں جسکی ہیں شیریں وہ دہن کیا ہوگا

بال بکھرے ہیں تو کیوں اتنے پریشاں ہیں حضور
نہوا زلف میں شانہ تو بلا سے نہ ہوا

غیر سے ہم کنار کیا کہنا؟
مجھ سے ملنے میں عار کیا کہنا؟

نہ چلا دیکئے آسمان سے کبھی
میرے مشتِ غبار کیا کہنا؟

وہ خفا مجھ سے تم اُنہیں ذاکر
کئے جاتے ہو پیار کیا کہنا؟

پہلے کہاں تھا طرز جفا سے تو آشنا
اتنا ہمیں نے او ستم ایجاد کر دیا

آفتابِ رخِ پُر نور کی تابش ہی غضب
دھوپ جلنے لگے پڑ جائے جو سایہ اُنکا

ہم پری کہتے ہیں اُنکو وہ ہمیں دیوانہ
ایک مدت سے یہ جھگڑا ہے ہمارا اُنکا

عشق صادق کا اثر ہے آہِ آتشبار ہیں
آبلے غنچے بنے بلبل تری منقار ہیں
چار آنکھیں اسکی ہوں چاٹے جو مجھ وحشی کا خون
دیدۂ آہو بنے جوہر تری تلوار ہیں
ہوش کیسے دھیان ہی ذاکر کو استغراق ہے
ان دنوں مسکن بنایا ہے تجلی زار ہیں

خاک اڑانے کی تمنا گر ہمیں وحشت میں ہو
پھر زمیں سو کوس اونچی تجھ سے چرخ پیر ہو
عاشقوں کے ہاتھ پہلے کاٹتے ہیں وقتِ قتل
تا قیامت میں نہ کوئی ان کا دامن گیر ہو
ہوں وہ افتادہ جو بعدِ مرگ ہو اٹھنے کا قصد
موجۂ ریگِ رواں کی پاؤں میں زنجیر ہو
بے وسیلہ وصلِ معشوقوں کا ہے مجھکو پسند
پونچھ ڈالوں آنکھ میں گر سرمۂ تسخیر ہو
روشنی ایسی نہ تھی ذاکر تمھاری نظم میں
دھیان میں شاید کسی کا روئے پُر تنویر ہو

مری حیات کا باعث وہی نگار رہے
بجائے روح بدن میں خیالِ یار رہے
دباؤ نعش کو گردِ نگارہ گلرو میں
کہ میرا حسن کے گلزار میں مزار رہے
دکھاؤ آتشِ رخ پر ہلالِ ابرو تم
کہ جس سے نعل در آتش یہ دلفگار رہے
جدا رخ سے زلف اے قمر ہو گئی
تماشا ہے بے شب سحر ہو گئی
شبِ وصل وضو کا تھا کیا اے خدا
ذرا آنکھ جھپکی سحر ہو گئی
یہ تڑپے پسِ مرگ مدفن میں ہم
زمیں ساری زیر و زبر ہو گئی

ذاکر

ذاکر - مولوی محمد ذاکر علی باشندۂ قدیم قصبہ شاہ پور ضلع فتحپور ہسوہ، بہ سبیل روزگار ابتدائے سن شعور سے مختلف اضلاع میں رہے چنانچہ سنہ ۱۸۶۶ء میں کئی سال سے آگرہ کی کمشنری میں سررشتہ دار تھے استعداد علمی معقول تھی، انکے کلام سے پایا جاتا ہے کہ فکر سخن میں مضمون پیدا کرنے کا خیال بہ نسبت ادائے بیان میں سلاست اور صفائی پیدا کرنے کے زیادہ رہتا تھا اس لئے باوجود اسکے کہ بڑے پُر گو کہنے والے تھے کلام میں سادگی۔ روانی اور صفائی کا عنصر کم ہے، میرزا حاتم علی بیگ مہر کے مشورہ سے شعر کہتے تھے جو اُس زمانے میں آگرہ کے شعرا کے سرتاج مانے جاتے تھے، اور فی الواقع ایک مسلم الثبوت استاد اور اپنے

دل پھر گیا حرم سے اب دیر میں بسا ہی پتلیوں تک خون ہو لختِ جگر آنے لگے	دل میں صنم صنم ہے لب پر خدا خدا ہی لعلِ احمر سنگِ موسی میں نظر آنے لگے
جواہر خانہ زنداں کو کیا ہے چشمِ پُر خوں نے	مری زنجیر پر نگ جڑ دیئے ہیں اشکِ گلگوں نے
طوفانِ آتشیں پہ ہی عمرِ رواں مری تو دستِ برہمن سے مارا پڑے گا زاہد	شورِ تنورِ آب زدہ ہے فغاں مری ناقوس لے ستمگر ٹوٹا تو شکیا ہے

ذاکر۔ میر جان مرحوم خلف میر فخر الدین ماہر لکھنوی، اپنے والد کے شاگرد تھے ۱۲۷۰ھ کے قریب انتقال کیا، اشعار سحر آمیز کہتے تھے، اہلِ مشاعرہ اکثر انکا کلام حسن سُنکر لوٹ لوٹ جاتے تھے، یہ چند شعر انکے ہاتھ آئے، ہدیۂ ناظرین کیئے جاتے ہیں +

ہوتا ہے جنکو نزلہ تو ذاکر سُنا ہے یہ	سمجھے ہے ناس لینا وہ اکسیر ناک میں
اُس کو بھی کہیے خلق میں وہ زن مرید ہے دو دانت بڑھ کے آگے کے آئے ہیں یہ نکل ذاکر ہیں اُنکے در پہ بیٹھا کہ رہ گئے	خلوت میں جو پڑے کوئی اپنی دولہن کے پاؤں سمجھو تو شیخ جی کے یہ دو ہیں دہن کے پاؤں ہل سکتے اب ذرا نہیں مجھ خستہ تن کے پاؤں

ذاکر۔ مرزا ذاکر الدین بہادر گورگانی از اولاد میرزا جواں بخت ولیعہد اول شاہ عالمِ ثانی چونکہ وہ خود بنارس جا رہے تھے اس لیئے اِنکی اولاد وہیں محلہ شوالہ میں مقیم رہی۔ شاگرد مرزا قادر بخش گورگانی دہلوی، وقت پسند طبیعت پائی تھی اور اکثر مضامین اِس طرح باندھتے تھے کہ صفائی سے دُور جا پڑتے تھے تاہم مشاق سخنور تھے ۱۲۸۰ھ تک زندہ سلامت موجود تھے اور سرکار سے اپنی خاندانی پنشن پاتے تھے +

کوہکن کا سر سمجھکر روئی وہ تقدیر پر اتنا لاغر ہوں کہ پھنس جاؤں ہیں اُسمیں مثلِ دم وہ ہیں محوِ خود نمائی اور ہم محوِ خیال کھو دیئے ذاکر نے مایوسی و حرماں نے ہوش	جب حباب آئے نظر شیریں کو جوئے شیر پر لپٹے گرفتارِ نگاہ مور مجھ و تنگیر پر دست اندازی ہو کیا تصویر سے تصویر پر گردشِ ساغر کا شک ہی گردشِ تقدیر پر

لندن کے تو سوا ہئیں پل لیا تھا بنا
ذاکر نے بد کے سر کو قلم کر دیں کہا
ہوتی تھی گفتگو ہی شہ اور لاٹ میں
بنوایا شہ نے آہنی پل راج گھاٹ میں

نہ آیا حیف وہ ظالم کہا تھا جسنے آنے کو
کو نچے سے اپنے بجھے ہے جو اٹھانا مجکو
بڑی قسمت ہے اپنی دوس کیا دیجے لگانے کو
بیٹھنے کا بھی بتا دیجے ٹھکانا مجکو

آنکھ اُٹھا کر تو دیکھو میری طرف
یہ میں جانوں ہوں دوگے آخر رنج
بات آگے نہ کر سکا کوئی
مرنے کے بعد آب ندامت میں غرق ہوں
بات کو مجھ سے اب بھلا نہ کرو
باتیں کر دل کو مبتلا نہ کرو
آنکھیں ایسی دکھا گئے سب کو
تر کرتا بار بار پسینا کفن کو ہے

ہے یقیں مجکو یہ دل میں کریں اُسکے تاثیر
قشقا ہے کھینچا جب سے بت پر جانے
انگڑائی لیکے تو جو اُٹھا جی پھڑک گیا
سب کالے بال ہوگئے ڈاڑھی کے شیخ کی
مجھ سے وہ آزردہ یار دیکھئے کب تک رہے
پہنچیں اُس تک جو مری آہ رسا کے جھوکے
اسلام تب سے ترک کیا شیخ و شاب نے
کیا پیاری میرے دل کو تری یہ ادا لگی
ترکیب ایسی یاد ہے اُن کو خضاب کی
دل یہ مرا بیقرار ۔ دیکھئے کب تک رہے

ذاکر ذاکر ۔ مولوی ذاکر علی بنارسی خلف مولوی فضل علی شاگرد مصحفی صاحب دیوان گذرے ہیں مشاق شاعر اور بڑے سخن سنج مانے جاتے تھے نزاکتِ خیال کے ساتھ مضمون آفرینی کا بھی شوق تھا۔

شب جو باتوں میں وہ مہ پیکر بہل کر رہگیا
رنگ سو سو طرح سے گردوں بدل کر رہگیا
لیلی کا جب کہ نجد سے محمل نکل گیا
آرام قیس لاکھوں ہی منزل نکل گیا

لالۂ صد رنگ پھولا کوہ پر تو کیا عجب
کوہکن کا خون کیا کیا رنگ ابھی دکھلائیگا
شب جو نالاں بیکسی سے یہ دلِ صد پارہ تھا
آسماں سے خونفشاں ہر دیدۂ ستارہ تھا
چلتا ہے وہ قیامت اُس شوخِ نوجواں کا
برپا ہے ہر قدم پر اک شور الاماں کا
یہی ہے گر حالِ آہِ سوزاں گرینگے جلکر فلک زمیں پر
یہی ہیں نعرے تو دیکھ لینا کہ حشر ہی حشر تک زمیں پر

ترشرو ہو کے لگا کہنے مغیں اس سے کیا　　جسکو جی چاہا اُسے ہمنے کھلایا میٹھا

کیوں جور و جفا کرتے ہو پوچھا جو کسی نے　　کہتا ہے یہ میرا ہے گنہگار محبت

یوں ہولی کھیلتے دیکھا ہے ہم نے آصف کو　　گلال سیکڑوں من اُڑتا تھا عبیر سمیت
یہ ہوتا ہی نہیں معلوم کیوں یہاں سے رئیس　　نکل گئے ہیں بہت مبلغ خطیبہ سمیت
جو بخشوانے گئے شیخ ماں سے اپنا گناہ　　وہ بولیں بخش دیا میں نے بلکہ شیر سمیت
جو چار دن سے لگے کہنے شعر ہیں گے اب　　وہ طعن کرتے ہیں سودا پہ بلکہ میر سمیت

دم غلامی کا جو کہ بھرتا ہو　　بندگی اپنی سے نہ کر آزاد

عجب ہے ذاکر تماشا دیکھا کہ چند روز نہیں اپنے آگے　　جنھیں نہ آتی تھی بات کرنی وہ کرتے باتیں بنا بنا کر
جو ہیں اُس شوخ نے پھینکا نگہ کا تیر گردوں پر　　وہیں بس ہو گیا مرغِ سحر نخچیر گردوں پر
سُنا اُسکو جو ٹھوکر مار کر مردے جلاتا ہے　　مسیحا ہو گئے جی اپنے ہیں دلگیر گردوں پر
شفق پھولی نہیں ہرگز بہا ہے خون و نو کا　　مہ و خور ہیں چلی ہے آج کیا شمشیر گردوں پر
یہ گل تو کیا ہیں باغ جہاں کے منہ اُس گل دیکھ　　کھاتے ہیں رشک سب گلِ باغِ جناں تلک
نازک مزاج جتنے ہیں وہ سونگھتے نہیں　　چھپے کے کہتے پھولوں کو ہیں دردسر کے پھول
مار کر منہ پہ طمانچوں کو چھڑا دیوے نسیم　　اپنی منقار سے گر گل کو اُٹھاوے بلبل

کیا حسن بیاں کروں میں اُس گل　　بس دیکھ کے اُسکو مر گئے ہم
سمجھا نہ ہمیں وہ اپنا عاشق　　جاں اپنی سے مفت پر گئے ہم

عیاں جو اُسنے کیا وہ عیاں تو سب پر ہے　　نہاں جو اُسنے کیا وہ نہاں نہیں معلوم
موسم گل قید میں گذرا تو اے صیاد ہم　　کیا کرینگے اب قفس سے تیرے ہوا آزاد ہم
خوف کے مارے جو منہ پر نہیں کہتے تجھکو　　جان لو دل میں وہ اپنے بخدا کہتے ہیں
پی کے مے زاہد تو گلیوں میں پڑے ہیں لوٹتے　　شیخ افیوں کے نشے میں بولتے ہیں ناک میں

قطعہ

رکھے الہ امجد علی شاہ کو مدام　　دیتا دعا ہر ایک اُسے راہ باٹ میں

کٹی- اب دیوان کا انتخاب ملاحظہ ہو-

ہمدموں کیا کہوں حالِ دل اپنا تمسے	سمجھے اپنا تھے جسے سو وہ پرایا نکلا
وہ دن تو مجکو سنتے ہی بس کٹ گیا تمام	جس روز ہمکو وہ گل خنداں نظر پڑا
موتی مونگا اُسے ملیحا تا تھا دہلی وہ تھی	سب میں کوڑی کو جسنے کہ نچوڑا کیا گیا
شاہ نصیر الدین حیدر کو خدا قائم رکھے	کون کون ہمنے نہ دیکھا اُس کا نائب ہو گیا
وہ نگاہِ لطف اب اُسکی نظر آتی نہیں	عشق اپنا اُسپہ شاید آشکارا ہو گیا
نام تو باقی رہا دینے سے اُس کا دہر میں	صرف گو حاتم کا سب مال و خزانہ ہو گیا
جب مری جانب وہ نظر کر گیا	سینہ میں سو ٹکڑے جگر کر گیا
منتیں کیں میں نے بہت شوخ کی	پر نہ مرے پاس ٹھہر کر گیا
ہم کہتے ہیں یا قتل کرو یا بوسہ دو لب ملنے کا	اِن دو باتوں میں تم سے اب بھی نہوا وہ بھی نہوا
شیخ جی بھوکے تھے ایسے کہ سئیسوں سے مانگ	تھا جو گھوڑے کا وہ تیا رہیلا کھایا
آیا پڑ سے کو جہاں قاضی کی لونڈی جو مری	جب موئے قاضی تو پھر کوئی نہ دیکھا آیا
غور کر دیکھا تو ہے رُو و ریا کا یہ مقام	کوئی بیکس کا اُٹھانے نہ جنازہ آیا
گھر میں تو ہوا اندھیرا اور ریکھے مسجدوں میں	ہمنے جلائے گھی کے جا کر دیئے تو پھر کیا
احسان کرے لاکھوں رکھے منہ پہ تو ہیں خاک	اِس طرح کا مُو بھر ترا احسان نہ اُٹھے گا
میٹھی نظروں سے وہ اُس کا دیکھنا	ہائے میرے واسطے کیا ستم رہا
جبتک کہ پاس دل رہا اندیشہ ہی رہا	جلانے سے دل کے اب مجھے آرام ہو گیا
ہمارے سینہ کا کیونکر نہ ہووے داغ نیا	نہ تیل بتی ہے جلتا ہے یہ چراغ نیا
دل دیکھ اُسے کس کا تماشا نہیں ستا	ہر چشمِ سیہ کا یہ بادام نہیں پستا
یہ بات جو میں سو نچا دیکھیگا ہر اک لیکر	تصویر بنا اُسکی بہزاد بہت رویا
ق پوچھا اُس شوخ سے میں نے یہ بھلا کسکے لئے	ڈال کر میوہ برابر کا بنایا میٹھا

لیا ہے دِل کسی کا یا چمن سے پھول توڑے ہیں
ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپکے دامن میں کیا کیا ہے

سرِ طور اے کلیم اللہ کیجے ہوش کی باتیں
جسے دیکھے نہ کوئی اُسکے ملنے کی تمنا ہے

نزع میں وہ دیکھنے کو آئے ہیں
دم نکلتا بھی ہے دیکھا چاہیئے

جسکے گھر میں بعد مدت کے وہ آئے
شادمانی اُسکی دیکھا چاہیئے

آکے تڑپا جائیں جس دل کو وہ خود
بیقراری اُسکی دیکھا چاہیئے

لحد میں نیند تھی ایسی کہ کچھ ہوئی نہ خبر
جگا جگا کے تھکا مجکو شورِ محشر بھی

تجھے قریب اُسنے گر جگہ دی نہ کر غرور انجمن میں اُسکی
یہ بچپنا ہے کہ عکس کو بھی وہ آئینہ سے بلا رہا ہے

عیاں ہیں سامان سرور و غم کے ہیں ظلمت و نور گرد میرے
کوئی حسیں سر کے بال کھولے چراغِ مرقد جلا رہا ہے

کچھ ایسے کانپتے ہیں ہاتھ گردن پر ستمگر کے
رگوں سے خط الگ پڑتے ہیں وقتِ ذبح خنجر کے

مجھے کیا دخل دل کو جس طرح چاہو کرو برباد
مگر اتنا سمجھ لو رہنے والے ہو اِسی گھر کے

نکلتے ہیں یہ جتنے اُتنی ہوتی جاتی ہے تسکیں
ہیں آنسو کیا شبِ فرقت میں ارماں قلبِ مضطر کے

وہی احباب جن سے زیست میں کیا کیا اُمیدیں تھیں
چلے جاتے ہیں اپنے پاؤں میری قبر پر دھر کے

اثر یہ جذبۂ اُلفت کا بعد مرگ بھی تھا
وہیں وہ بیٹھ گئے قبر تھی جہاں میری

ذاکر

ذاکر۔ ہزار کوشش و تلاش کے باوصف اِس پُرگو شاعر کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ ضخیم دیوان کے معائنہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ دہلی سے آصف الدولہ کے وقت میں لکھنؤ گئے، اور اُنکی شاہانہ داد و دہش سے فیض اُٹھایا۔ امجد علیشاہ کے وقت تک زندہ تھے حضرت ناسخ سے معاصرانہ مراسم تھے۔ پُرگو از حد تھے اور بیس۲۰ جزو کے قلمی دیوان میں فحش و غیر مہذب کلام کے جا بجا نمونے ملتے ہیں، ایک خصوصیت اور ہے کہ غیر مانوس ردیف اور قافیوں میں خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اِس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید شاہ نصیر کے شاگرد یا ہم مشق رہے ہوں، اِنکے قادر الکلام اور مشاق ہونے میں شبہ نہیں۔ متروک الفاظ اکثر پائے جاتے ہیں۔ آخر عمر بہت غربت اور بے سروسامانی سے

ردیف ذال

ذاخر

ذاخر ۔ جناب سیّد فرزند حسین صاحب لکھنوی عرف اچّھن صاحب لکھنؤ کے مشہور خاندان مجتہدان کے ممبر ہیں، آپ کو اپنے ماموں نواب سیّد اصغر حسین خان صاحب فاخر سے ابتدائے مشقِ سخن سے تلمّذ رہا ہے، مولانا مہدی حسن صاحب باہر آپکے رشتہ میں نانا تھے، مشقِ سخن خاصی ہے اور علمی استعداد بھی بُری نہیں، قاضی خلیل کے مشاعرے میں بریلی میں ملاقات ہوئی تھی اب غالباً پنیتالیس برس کا سِن ہوگا، کلام اور حالات بھیجنے کا اقرار کیا تھا مگر باوجود تقاضوں کے ایفا کی نوبت نہ آئی کچھ اشعار جو رسالوں سے چُنے گئے درجِ ذیل ہیں:-

آنے دے مجھے مری شوریدہ سری کا عالم
کوئی مشکل نہیں شہروں کا بیاباں ہونا

آجتک یاد ہے زینت میں وہ غصّہ کی اَدا
آئینہ توڑ کے پھروں وہ پشیماں ہونا

اُسے فریاد سے اپنی نہ تم بدنام کرجانا
نہ کاٹے کٹ سکے طولِ شبِ فرقت تو مرجانا

اُتر کر قبر میں منھ سے کفن تم کیوں ہٹاتے ہو
لڑکپن ہے ہماری دیکھکر صورت نہ ڈر جانا

لاش ہوتی دوشِ قاتل پر تو تھا مرنیکا لُطف
لیکے بسمل کو لحد تک اضطراب آیا تو کیا

رہا کچھ تیغ پر کچھ آستیں پر
نہ گرنے پایا میرا خوں زمیں پر

سیہ بختوں کی جس جا تربتیں تھیں
نہ بجلی بھی گری اُتنی زمیں پر

لحد پہ مہوشوں کا پا کے مجمع
ستارے ٹوٹے پڑتے ہیں زمیں پر

بیخودیٔ قیس کہتی تھی کہ کیوں چُھپتی ہے تو
شکل تیری خود اُسے لیلیٰ نظر آتی نہیں

تم پریشاں عاشقوں کی بھیڑ سے ہوتے ہو کیوں
ہوں اگر لاکھوں پتنگے شمع گھبراتی نہیں

کھنچ آیا خونِ دل آنکھوں میں اشکونکی روانی سے
نکالی سوزِ داغِ دل نے آخر آگ پانی سے

یقینِ مرگ قاتل کو نہیں ہے سخت جانی سے
گلے پر تیغ بعدِ ذبح بھی ہے بدگمانی سے

ہزاروں حسرتوں کا بسملوں کی خوں ہوا قاتل
تڑپنے بھی نہ پایا کوئی خنجر کی روانی سے

یہ خونِ قلب سے مہندی بھرے ہاتھونکا نقشا ہے
جو مٹھی بند ہو دل ہے جو کھُلجائے تو دریا ہے

ردیف ڈال

ڈاکٹر

ڈاکٹر۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ صاحب ملازم ریاستِ رامپور سنہ ۱۸۹۹ء - حضرت امیر مینائی کے خرمنِ فیض سے بہرہ ور تھے جدتِ خیال کے ساتھ زود گوئی اور خوش کلامی کے جوہر بھی انکے کلام میں پائے جاتے ہیں، زبان بھی بُری نہیں، طبیعت بھی شوخ پائی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں

نیم جاں چھوڑ کے مقتل میں نہ جا اے قاتل	تیرے کشتے تو ابھی سانس ذرا لیتے ہیں
یادِ مژگاں کی جو ہے بادیہ پیمائی ہیں	خوب کانٹوں کے مزے آبلہ پا لیتے ہیں
وائے تقدیر کہ ہم پھرتے ہیں مارے مارے	غیر گھر بیٹھے محبت کا مزا لیتے ہیں
ڈاکٹر ہمکو نہیں اور کوئی بیماری	دردِ الفت کی جو ہے کوئی دوا لیتے ہیں

اُدھر پھانسی گلے میں کاکلِ پیچاں نے ڈالی ہے	اُدھر ٹٹی لگائے آڑ میں کُرتی کی جالی ہے
حیا کا ہائے یہ کہنا کہ خواب ناز سے اُٹھئے	نہیں تو اب یہاں بوسوں کی چوری ہونیوالی ہے
اے اجل تجھ سے بھی سخت اور مصیبت آئی	تو نہ آئی ترے بدلے شبِ فرقت آئی
تو نے اے چرخ کبھی چین سے رہنے نہ دیا	کٹ گیا دن تو بلائے شبِ فرقت آئی
بھولی صورت پہ یہ غصہ یہ ستم یہ شوخی	ڈھل کے کیا حُسن کے سانچے میں قیامت آئی
داورِ حشر سے فریاد بھی ہم کرنے نہ پائے	لب ہوئے بند زباں پر نہ شکایت آئی
ہو گئے فرطِ قلق سے مرے دل کے ٹکڑے	یاد وائے زخمِ جگر جب تری صورت آئی
جو تصور میں بھی آئے تو قیامت آئی	وائے قسمت کہ اُسی پر ہے طبیعت آئی
ڈاکٹر سے نہوا دردِ محبت کا علاج	چلدیا چھوڑ کے جس دم تپِ فرقت آئی

اِک نظر میں خاک کر ڈالا ہمیں — کہیے صاحب تھا یہ کیسا دیکھنا
میری رسوائی کے ہو کے درپئے تم — ہو نہ جانا خود بھی رسوا دیکھنا

کیا کہیے شب جو حالِ دلِ بیقرار تھا — اب آئے اب وہ آئے یہی انتظار تھا
تیرِ نظر سے ہیں، مری آہِ رسا سے وہ — دونوں نہ بچ سکے کہ برابر کا وار تھا
خارِ الم کی دل میں خلش رات ہی سے تھی — دیکھا جو صبح کو تو جگر بھی فگار تھا
اہلِ غرض سے دور جو صحرا میں جا بسا — دیوانہ سچ تو یہ ہے بڑا ہوشیار تھا

آپ بھی کچھ دل بیتاب سے کہتے جائیں
یہ سمجھتا ہی نہیں ہے مرے سمجھانے سے

اس سے بڑھکر مجھے اب اور خوشی کیا ہوگی
یار نے عہد کیا غیر کے گھر جانے سے

گھر بنے آپکا بازار ہمیں کیا مطلب
ہمکو کیا کام ہے آئے کوئی جائے کوئی

دیوانہ

دیوانہ ۔ قسیم الدین احمد دیوانہ سنہ ۱۹۰۰ء میں عدالتِ کلکٹری گیا میں امین محکمۂ مال تھے مولٰنا کوثر خیر آبادی سے تلمذ تھا۔

ہوا ہے عشق میں وارفتہ ایسا
دلِ ناداں نہیں سنتا کسی کی

ہوئی برگشتہ ایسی میری قسمت
پھری ہے آنکھ مجھ سے اس پری کی

گزرتی ہے جو دل کیا بیان ہو
نہیں امید اپنی زندگی کی

دیوانہ

دیوانہ ۔ جناب حکیم سید باقر علی صاحب جیپوری۔ آپ حکیم سید منور علی صاحب متوطنِ جیپور کے صاحبزادے ہیں اور عرصۂ تیس سال سے گویا سنہ ۱۸۸۸ء سے فکر شعر کرتے ہیں پہلے باقر تخلص کرتے تھے پھر دیوانہ تخلص اختیار کیا چند شعر نتائج افکار سے درج ذیل ہیں

فصلِ گل میں مرا کیوں چاک گریباں ہوتا
گر مرے ہاتھ میں اس شوخ کا داماں ہوتا

کرتے فرقت کا گلہ ہم نہ ستم کا شکوہ
غیر سے بھی جو یہ شیوہ ترا جاناں ہوتا

تمکو معلوم صنم حال ہمارا ہو جائے
دل تمہارا جو کسی پہ کہیں شیدا ہو جائے

ناز و انداز پہ اس شوخ ستمگر کی دلا
زندگانی جسے دشوار ہو شیدا ہو جائے

دیکھ کر حسن خداداد کو اُن کے باقر
آدمی کیا جو فرشتہ ہو تو شیدا ہو جائے

دیوانہ

دیوانہ ۔ سید محمد فاروق صاحب گورکھپوری، دورِ موجودہ کے خوش فکر اور طباع کہنے والوں میں ہیں، نیچرل نظمیں اکثر رسالوں میں نکلتی رہتی ہیں۔

کثرتِ مشقِ تماشا دیکھنا
اٹھ گیا آنکھوں سے پردہ دیکھنا

سب مزے دنیا کے ہیں نظروں میں خاک
لذتِ ترکِ تمنا دیکھنا

ہو کے محوِ دیدِ حسنِ گلرخان
ہو گیا میں بھی تماشا دیکھنا

دیوانہ

دیوانہ میر طالب علی صاحب دیوانہ مقیم بنارس شاگرد رشید سید عبداللہ وحشی بنارسی ۱۸۷۲ء میں زندہ تھے اور بریلی کے چند مشاعروں میں تشریف لاکر داد سخنوری دی تھی۔ کلام بامزا ہے اور آپکی چلبلی طبیعت کا آئینہ ہے یہ چند شعر ملے درج کیے گئے ؎

بندہ بے داموں بکا ہے آپکی سرکار میں
شوق سے بیچو کھڑا کر کے مجھے بازار میں

مجھکو حیرت ہے لڑائی کیلئے چھوڑا ہی کیا
گالیاں دیتے ہیں وہ دشمن کو ہردم پیار میں

ہوگیا ناز اُن کو اپنے حُسن پر حد سے سوا
جو نہ کہنا تھا کہا سب ہمنے اُنسے پیار میں

میں بتاؤں تمکو اب کے مجھ سے گر تقصیر ہو
تم کو بھی لذت ملے ایسی مجھے تعزیر ہو

یہ مزا ہے یار کے لعل نمک آلود میں
لاکھ بوسے لیجیے بھی نیت نہ اپنی سیر ہو

اپنے مرنے کا کیا دعویٰ تو بولے ہنسکے وہ
بولتے ہو مر کے تم دنیا میں زندہ پیر ہو

وہ ہی دیوانے کو پہنا دو کہ وہ شاگرد ہے
حضرتِ وحشی کی جو اُتری ہوئی زنجیر ہو

کیا ہی دفن مجھے شاہراہ میں اُسنے
کہ ٹھوکروں میں ہمیشہ مرا مزار رہے

نہ دشمنوں کےلیئے دوستوں سے رنج کرو
کرو وہ بات کہ دشمن بھی دوستدار رہے

لڑی اشک کی حب گہر ہو گئی
تو زردی مرے رُخ کی زر ہو گئی

جو محنت پہ میری نظر ہو گئی
محبت تجھے فتنہ گر ہو گئی ؎

دیوانہ

دیوانہ منشی بنس گوپال باشندۂ شاہجہان پور ۱۸۹۳ء سے شعر کہتے ہیں اور جناب شاد دہلوی سے مشورہ کرتے ہیں زیادہ حال باوجود دریافت نہ مل سکا۔

اگر شان دیکھے مرے بُت کی زاہد
پڑھے اُس کا کلمہ مسلمان ہوکر

بتوں کی محبت نے کافر بنایا
چلے دَیر کو ہم مسلمان ہوکر

جنازہ اُٹھائیں گی پریاں ہمارا
مرینگے مقدّر رسلیمان ہوکر

مزا تو یہ ہے میرے دل میں رہو تم
مری آرزو میرے ارمان ہوکر

زندگی کی تھی شب ہجر نہ کوئی اُمید
آگئی جان میں جان آپکے آجانے سے

امتیاز تھے ذات کے کھتری اور بڑے جامہ زیب نفیس مزاج، وجیہ و شکیل جوان تھے۔ فارسی شعر خوب کہتے تھے اور مرزا فاخر مکین سے ہنگام قیام لکھنؤ میں ہزارہا روپیہ کا سلوک کر کے کامل ۱۲ برس اِس فن میں مشق کی تھی اور مرتبہ اُستادی حاصل کیا تھا۔ مشاعرے بھی بڑے کروفر سے کیا کرتے تھے بنارس اور لکھنؤ میں بہت رہے اور اپنے وقت میں مستند شاعر مانے جاتے تھے۔ چار دیوان فارسی اور ایک دیوان اُردو میں اِن سے یادگار ہیں۔ میر حیدر علی حیران اور جعفر علی حسرت اُستادِ جرأت اِنکے قابل فخر شاگرد تھے سنہ ۱۲۰۴ھ میں پیکر وجود کو آتشِ فنا کے سپرد کیا۔ فارسی کلام دس ہزار اشعار سے کم نہ ہوگا*

دِل سدا تڑپے ہے میرا مرغ بسمل کی طرح	یا کہ سیکھی مرغ بسمل نے مرے دل کی طرح
جان پر آبنی ہمدم مری خاموشی سے	بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر
بزم میں رات بہت سادہ و پُرفن تھے ولے	گرمیٔ بزم کہاں اُس بتِ عیار بغیر
دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا	ہو چکی اسکو شفا شربتِ دیدار بغیر
دل ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نجائے	رستم کا کب جگر ہے کہ زہرہ پگھل نجائے
وے یار کہاں کہ یار باشی کیجئے	وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجئے
اِک گوشہ میں بیٹھکر دیوانہ تنہا	اب ناخنِ غم سے دِل خراشی کیجئے

دیوانہ **دیوانہ** مرزا محمد علی جان باشندۂ بنارس سنہ ۱۸۴۰ء کے قریب روشن الدولہ کولبرک رزیڈنٹ کے وقت میں دہلی میں اُنکے پاس رہے پھر علیگڈھ میں تحصیلدار ہو گئے تھے اِس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا۔

اُس کا آخر ادھر کلام ہوا	اپنا قصہ اُدھر تمام ہوا
آیا نہ بعد مرنے کے بھی وہ مزار پر	خاک اُسکے پیچھے آپکو ہمنے کیا عبث
میری سرگشتگی کو دیوانے	پہنچے کب آسمان کی گردش
جلتے جلتے ایک دن دیوانہ بس اُٹھ جائینگے	جوں چراغِ صبحدم ہم سینۂ سوزاں سمیت

تھے مگر کلام اُنکے مرتبہ کو نہ پہنچا۔ عرصہ ہوا انتقال کیا۔ یہ چند شعر درج کیے گئے۔

عاشقوں کیواسطے حالِ پریشاں چاہیئے
آتے ہی فصلِ جنوں ٹکڑے گریباں چاہیئے

کل جو کی تھیں شرطیں اُنکا کیجیے ایفا ضرور
آج ہمکو بوسۂ لعلِ درخشاں چاہیئے

چارہ گر تد بیر درماں عاشقوں کے درد کی
ہمکو پہلوے صنم آغوشِ جاناں چاہیئے

گر نہیں چادر تو دولہ مہ سے مانگو چاندنی
کچھ تو بہرِ پوششِ گورِ غریباں چاہیئے

دولہ

دولہ جناب منشی علی احمد صاحب بدایونی بیس بائیس برس سے مشق سخن کرتے ہیں اور رسالوں میں اپنا کلام شائع کراتے رہتے ہیں، باوجود کوشش و دریافت نہ تلمذ کی کیفیت معلوم ہوئی اور نہ کچھ حال ملا اشعار ملاحظہ ہوں

جذبۂ دل اسے کہتے ہیں کہ مجنوں کیلئے
لیلیٰ پردہ نشیں نے بھی بیابان دیکھا

ایک ہی تیغ سے عالم کو کیا تو نے حلال
اُف رے کافر کوئی ہندو نہ مسلمان دیکھا

خیر گذری نہ ہوا شوق اُسے زینت سے
سرمۂ چشم صنم خلق کا قاتل ہوتا

کون ہمدم ہے یہاں کس پہ بھروسا کیجیے
دل تو دل جان بھی ہے اُنکے طرفدار نہیں

ٹھیریے ٹھیریے مژگاں کو نہ کیجے سیدھا
دلِ نہ چھد جائے ہمارا کہیں سوفار نہیں

کبتک یہ سہے درد و غم و رنج کے صدمے
اب صبر کی طاقت دلِ بسمل میں نہیں ہے

کس طرح ہجر میں بہلے گی طبیعت میری
کچھ تو کر دیجیے تسکیں دمِ رخصت میری

قبر پر پھول چڑھاتا ہے وہ گل لالہ کے
بارِ احساں سے دبی جاتی ہے تربت میری

آپ پچھتائیں نہیں سورۂ یٰسین پڑھیں
آپکے سر کی قسم وہ نہیں حالت میری

عید کے دن وہ رقیبوں سے بغلگیر ہوئے
ہاتھ پھیلائے ہوئے رہ گئی حسرت میری

دیوانہ

دیوانہ ۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ ہمشیرہ زادہ حقیقی راجہ مہا نرائن بہادر دیوان و مدار المہام نواب شجاع الدولہ صوبہ اودھ، یہ خود شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے اور عنفوان شباب میں کہ ابتدائی عہد شاہ عالمِ ثانی کا تھا اپنے عمِ نامدار کے پاس گئے اور مدۃ العمر وہیں امیرانہ شان و شوکت سے بسر کی اپنے ہمعصر رؤسا میں داد و دہش اور سیر چشمی اور قدردانی اہل علم و فن کی بدولت صاحب

جسکو غرض ہو جائے وہ طوبیٰ کی چھاؤں ہیں
بیٹھا ہوں میں تو سایۂ دیوارِ یار میں

تلووں لگی وہ آگ کہ سر سے نکل گئی
مہندی ملی جو غیر نے وہاں پائے یار میں

کاش وہ آرامِ جاں آئے تو جائے غم کہیں
اُسکی آنے کی اگر ٹھیرے تو ٹھیرے دم کہیں

ہیہات اُسکے ہاتھ میں غیروں کا ہاتھ ہو
آنکھوں سے ہم کو پاؤں نہ ملنا نصیب ہو

ق

اِس انکسار پر ترے سہتا ہوں کیا ستم
پھر بھی یہ ہے دعا مری ایسا نصیب ہو

مَیں منتوں سے تجکو منایا کروں مُجھے
تیری اُٹھانی رنجش بے جا نصیب ہو

حاجت نہیں ہے اور سے ملنے کی پھر تجھے
دوؔلہ سا جبکہ چاہنے والا نصیب ہو

قطعہ

چاہت کو جو میری پا گیا ہے
ہر بات پہ اب وہ روٹھتا ہے

لو جو رہی دِل کو بھا گیا ہے
معلوم نہیں کہ کیا بلا ہے

اُسکے آنے کی نہ ٹھیری سو طرح غم کھا چکے
جان بھی جائے کہیں قصہ مٹے جھگڑا چکے

مجکو طعنہ اور مہرویوں سے ملنے کا دیا
ہیں بھی کچھ اب عرض کرلوں آپ تو فرما چکے

جب نہ اک بوسہ ہی دو تم اور نہ اک دشنام دو
دِل بھتیں کیونکر ملے اور اُسکی قیمت کیا چکے

خدا نے کر دیا ہے موم تمکو حق میں غیروں کے
دِلِ نازک تمھارا پر مری جانب سے پتھر ہے

یہ تو ہیں کیونکر کہوں تم ہو رہو میرا جی
فخر ہے میرا اگر تم کر رکھو اپنا مجھے

کیوں ذرا سی بات پر تم نے کیا رسوا مجھے
کہدیا ہوتا بلا کر کان میں تنہا مجھے

آشنا ظاہر میں اور باطن میں بیگانہ صفت
تم نے وہ پردہ جلا کر خاک کر ڈالا مجھے

آنکھ پھر جاتے ہی اُسکے ہو گیا بیہوش میں
گردشِ چشمِ بُتاں ہے ساغرِ صہبا مجھے

دِل کو مجھ سے توڑ کر اپنا اُسے بند اکیا
آہ ایسے آشنا کو یوں چھڑایا آپ نے

دمِ قتل اپنی گردن کب بُتِ بے پیر پھرتی ہے
زہے قسمت گلے پر جو تری شمشیر پھرتی ہے

دولہ

دولہ ۔ مرزا علی نقی تخلص دولہ شاگرد مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی ۔ لکھنو کے رہنے والے اور حضرت نسیم کے شاگردوں میں بڑے خوش فکر تھے ۔ حضرت تسلیم و اشرف کے ہم مشق

مضامین کثرت سے ہیں اور اُن سے اُنکے دلی سوز و گداز کی جھلک آشکارا ہے جو کچھ قلب پر گذرتی تھی بیشتر وہی نظم کر دیتے تھے، تلمّذ کا حال معلوم نہیں مگر کلام بامزا اور پُر لطف ہے چھ جزو کے دیوان کا خلاصہ درجِ ذیل ہے۔

عبث ہو ساتھ پھرنا غیر کے اُس شاہِ خوباں کا
گدا کا ہرزہ گردی ہی ہنر، اور عیب سلطان کا

مساوی ہو نگاہِ لطفِ شہ اپنی رعیت پر
برابر ہیں زناباں کے ہو ہر ذرہ بیاباں کا

قمر کی طرح کب منّت کشِ خورشید انجم ہیں
نہیں لیتے ہیں عالی طبع ہرگز بار احساں کا

رہیگا علم کی دولت سے جو محروم دنیا میں
نہیں انسان وہ ہمرتبہ کہیئے اُسکو حیواں کا

نہ کیوں وہ شاہِ خوباں تمکنت کو کار فرمائے
سُبک وضعی سے اُٹھ جاتا ہی اکثر رعب شاہاں کا

مرے سر کے تلے سے نزع میں زانو نہ تو سرکا
ہے تکیہ زندگی کا جان یہ تکیہ مرے سر کا

کہاں مخلوق کو ہو فائدہ شاہِ خود آرا سے
رگرہے کب حلق میں پیاسوں کے قطرہ آبِ گوہر کا

قطعہ

جوں خار دل میں تھی مژۂ یار کی خلش
فرقت میں اُسکی سانس بھی لینا عذاب تھا

خالی ہاتھ آیا ہوں منزل میں الٰہی کیا کروں
لُٹ گیا رستہ میں سب پر ساتھ جو اسباب تھا

قتل کرنا عاشقوں کا اک قدیمی رسم ہے
چھوڑ جانا بیمجاں یہ آپ کا ایجاد تھا

رہی جہانگیر اسلیئے نام اُنکا ساری خلق میں
گھر عروسِ دہر کا دُولہ سے جو آباد تھا

تم خفا مجھ سے ہوئے اچھا ہوا بہتر ہوا
میں بھی تو ہرجائی پن سے آپکے بیزار تھا

تیری خاطر پاؤں اُن لوگوں کے اب پڑتے ہیں ہم
جن پہ ٹھوکر مارنے سے ہمکو ننگ و عار تھا

چوڑیوں میں بھی پسندِ دل جہانگیری ہی تھی
جن دنوں دولہ سے اُس پردہ نشیں کو پیار تھا

قطعہ

مت کہہ وہ اپنے گھر تھا وہ غیروں کے گھر نہ تھا
کیا اِس سے فائدہ مجھے اے ہمنشیں ہوا

میرا وصال اُسکے تصوّر میں ہو گیا
مجھ تک نہ آیا میری بلا سے کہیں ہوا

کب جدا ہے مجھ سے دلبر کب میں دلبر سے جدا
ہو نہ گوہر آب سے اور آب گوہر سے جدا

روح تن سے جان بدن سے ہوش ہے سر سے جدا
کیا کشاکش میں پھنسا ہوں جب سے دلبر ہے جدا

شریک ہوکر داد غزلخوانی دیتے تھے، اُس زمانے کے ایک مجموعہ میں چند غزلیں نظر سے گزریں اور کچھ شعر منتخب ہو کر درج کیے گئے، کلام میں زبان کا لُطف موجود ہے تلاش الفاظ و مضامین بھی بُری نہیں ہے ٭

ذکر کس کا نہ تری بزم میں اکثر آیا زلف کا بل تگیا لاکھ مِتن ہنے کئے	پر نہ ندکور ہمارا کبھی دلبر آیا کوئی افسوں نہ کبھی کام نہ منتر آیا
رزق پہنچاتا ہے ہر روز وہ رازق ہمکو دل ہیں عشاق کے کرتے ہیں ٹھکانا اپنا ابر ہو، دریا ہو، خلوت ہو، بُت بے پیر ہو غش پہ غش کھاتے ہیں تمکو دیکھکر جن و ملک ہادی معجز بیاں کے فیضِ صحبت کے سبب	گرچہ ہم لاکھ گنہ شام و سحر کرتے ہیں گھر میں اللہ کے بُت دیکھ لو گھر کرتے ہیں تب کہیں حاصل مرادِ عاشق دلگیر ہو تم پری کی شکل ہو یا حور کی تصویر ہو کیا عجب دولہ ترے اشعار میں تاثیر ہو
محبت بتوں کی خدا کی قسم چلے آئے وہ گھر مرے بن بُلائے خفا ہمسے دولہ وہ کیوں ہو گیا	رگِ جان کو نیشتر ہو گئی مری آہ کیا کارگر ہو گئی یہ تکرار کس بات پر ہو گئی

دولہ - نواب جہانگیر محمد خاں صاحب بہادر مغفور معروف بہ نظیر الدولہ - نواب سکندر بیگم صاحبہ والیہ بھوپال سے پہلے انکے بھائی کی نسبت ہوئی مگر نوبت نکاح کی نہ آئی اور آخر قدسیہ بیگم صاحبہ نے اِن سے نکاح کر دیا۔ بعد بلوغ انھوں نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے لیئے بہت دست و پا مارے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر نتیجہ انجام کو اچھا نہ ہوا اور عزیزوں اور اہلکاروں کی سازشوں سے آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ صرف ایک لڑکی نواب شاہجہان بیگم پیدا ہوئی تھیں اُسکے بعد سکندر بیگم صاحبہ سے اَن بن رہی انجام کار چھبیس سال کی عمر میں جام فنا نوش کر کے سفر آخرت اختیار کیا، اِنکے کلام میں جو انکی صاحبزادی نے سنہ ۱۲۸۸ھ میں اپنے دیوان کے ہمراہ چھپوا کر مشتہر کر دیا ہے عاشقانہ اور معاملہ بندی کے

ناصح سُنی ہیں میں نے جہاں کی حکایتیں
جاتا ہے کون کوچۂ جاناں کو چھوڑ کر

منعم عبث ہی دولتِ دنیا پہ یہ غرور
جاتا ہی ایک دن سر و ساماں کو چھوڑ کر

کون کہتا ہی کہ جلتا ہے دلِ عاشق زار
خاک ہو جاتا ہے سب جسم پہ جلتا ہی نہیں

لاکھ چاہا کہ کہوں اب نہ ملوں گا تجھ سے
لڑکھڑاتی ہے زبان منہ سے نکلتا ہی نہیں

چھپ گیا جب سے وہ شکل اپنی دکھا کر ای دوست
کسی صورت سے دلِ زار بہلتا ہی نہیں

دلوں میں یاد تھی دونوں طرف مرے اُنکے
میں اُنکے گھر میں رہا اور وہ میرے گھر میں رہے

جہاں ہے وہ دلِ مائل وہیں ہے
سخن ہے جس جگہ سائل وہیں ہے

نہ پوچھو حال ہم عاشق تنوں کا +
جہاں دلبر ہے اپنا دل وہیں ہے

جہاں پر آپ تنہا بیٹھ جائیں
وہیں ہی جمگھٹا محفل وہیں ہے

سفر ہم ناتوانوں کا نہ پوچھو
جہاں تھک کر گرے منزل وہیں ہے

دوست منشی دوست محمد خان پٹھان - موزونی طبع کی امداد سے شعر کہہ لیتے ہیں ورنہ کچھ خاص بات انکے کلام میں نہیں پائی جاتی - ایک دیوان بھی شائع کر چکے ہیں، یہ دیوان کا انتخاب ہی - دوست

پوچھتے کیا ہو شبِ فرقت کا حال
دل ہمارا رات بھر تڑپا کیا

جو تیری جدائی کا غم دیکھتے ہیں
وہی جلد راہِ عدم دیکھتے ہیں

سچ کہو! رہنے دو بہانے کو
کس نے روکا ہی آنے جانے کو

جو کیا ہم نے عشق میں تیرے
نکرے اب خدا کرے کوئی

بھلا یاد کیونکر بھلائی تمھاری
سمائی ہیں دل میں ادائیں تمھاری

زباں سے ہی کہتے ہیں مرتے ہیں تجپر
نہیں مرتے ای دوست مرجانیوالے

دولھا - نواب محمد حسن علیخاں صاحب دولہ بریلوی شاگرد نواب ہادی حسن خاں صاحب ہادی از خاندان حافظ الملک بہادر ۱۸۷۰ء میں جو بریلی میں مشاعرے ہوتے تھے اُن میں - دُولھا

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گہونا
موری کہتی وتن مان کھیلی برج میں موری
دُکھڑا اسناؤں کا سے وے چندر لکھ کہت سے
پیاری کون جانے بوجھا سکرے نگر موں لشن ون
شوخی نیٹ کرت ہی چھکنی ہاتھ مل کر
تالی بجی ہی کیا کیا کلھ شیخ جی کے پیچھے
دو پیازہ از دل و جان قرباں چرا نباشم
آلبسے ہیں جو دو پیازہ چلے متھرا سوں
شاہِ ایراں ہے یہ چار دہم گو بالغرض
کیونکہ اسکو ہے ہر اک رات ترقی اور اُسے
پیالہ پیم وِسکا چاکھہ بیٹھے
نہ دو پیازہ کی دلداری کرتے ہے

ایسا لگے ہے مجکو جیوں کھانڈ کا کھلو نا
پنیم کے پیچھے ساری بیسر ہنم بھگونا
ایسو مہا کیٹ باسوں مری لگاؤں کیوں نا
ہم روم و شام و روس ہم خیر و پلونا
تیں تاک شیخ کیتی ایسی طرح ملونا
رم و ربفعل میں بھاگا لے اوڑھنا بچھونا
جوبن سے مدہ کا ماتا وہ سانولا سلونا
تا بہ پر لو نہ نکالیں گے قدم ہندیا سوں
شاہِ اکبر کو ہلالِ شب اول سمجھو
دن بدن روز نئے طور تنزل سمجھو
ملت ہیں تن بدن پر راکھہ دیکھیو
مگر صد گو نہ ہا خواری کرتے ہے

دو پیازہ اب نکس ہنڈیا میں آ کے
ہا کھی کے ہاتھ پھنس گئے جالے میں جا کے

دوست شیخ غلام محمد عظیم آباد پٹنہ کے متوطن اور نظامت مُرشد آباد میں اوائل اُنیسویں صدی میں ملازم تھے اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔

کافر ہے جسکے دل میں تری آرزو نہو
کس کام کی زبان اگر گفتگو نہ ہو

صنم جو دیکھ مجکو تو کہے ہے دُور آنکھوں سے
کُچھ اپنا بس نہیں ظالم ہیں ہوں مجبور آنکھوں سے

دوست۔ سید خواجہ ولد سید حیات حیدر آباد دکن کے رہنے والے نہایت نیک طینت آدمی ہیں شیخ فدا حسین صاحب مہر سے تلمذ ہے دیوان گلزار دوست چھپ گیا ہے بقولِ دیگر مشہور لکھنوی کے شاگرد ہیں اور تعلقہ دار جاگیرات دکن ہیں پچاس باون برس کا سن اور یہ کلام کا انتخاب ہے ❖

فضل میں بہرۂ وافی و نصیبۂ کافی رکھتے تھے، ترکی زبان میں کامل عبور تھا چونکہ مسخرا اور مذاق نے آپ کی طبیعت پر غلبہ کر رکھا تھا اس سبب سے فضائلِ علمی نے شہرت نپائی۔ محمد جلال الدین اکبر شاہ بادشاہ عرش آشیانی کے جلیس خاص تھے، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کا یہ حال تھا کہ بات بات میں پھلجھڑی کی طرح مُنہ سے پھول جھڑتے تھے، خلوت و جلوت میں ایسی گل افشانیاں کرتے تھے کہ تمام حاضرین دربار مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ جاتے تھے، اِنکے لطائف و ظرائف آجتک زبان زد خلائق ہیں، مشہور زمانہ راجہ بیربل سے ہمیشہ انکی چشمک رہا کرتی تھی اور آپس میں اکثر چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ اِن دونوں کی نوک جھوک کے بیسیوں لطیفے اب بھی لوگوں کی زبان پر ہیں، مّلا صاحب موصوف عرصۂ دراز تک متھرا میں مقیم رہے اور وہی اُنکا اصلی وطن بھی تھا وہاں کے پنڈتوں سے اکثر گرمیٔ صحبت رہا کرتی تھی اور اسی وجہ سے زبانِ ہندی میں بھی آپنے طبع آزمائی کی ہے اکثر فقیروں کو انکے دوہے یاد ہیں۔ فارسی زبان میں بیشتر فکر سخن کرتے تھے اور اس فن میں علامۂ دہر ابوالفضل سے صلاح لیتے تھے۔ اُن واقعات کے برخلاف ایک قدیم تذکرہ میں مفصلۂ ذیل حال نظر سے گذرا جسکی صحت میں ہمیں کسی قدر تامل ہے کیونکہ اکبر شاہ اور آصفجاہ مرحوم کے عہد میں تخمیناً دوسو برس کا تفاوت ہے۔ "کچھ دنوں بعد آصف جاہ نواب نظام الملک کے دامن دولت سے وابستہ رہکر آخر عمر میں قصبہ ہنڈیا ہروہ جو نواح قصبۂ جیبیا پنر ضلع بھوپال میں واقع ہے وارد ہوئے لوگوں سے پوچھا کہ اس بستی کا کیا نام ہے۔ کسی نے کہا "ہنڈیا" فرمایا کہ دوپیازہ ہنڈیا میں آکر اب باہر کہاں جائے آخر ایسے بیٹھے کہ مرکر ہی اُٹھے اور اسی خاک کے پیوند ہوئے آپ کا مزار اسی مقام پر ہے۔ ایک کتاب مسمی بہ اتراک عالمگیری لغت ترکی زبان میں ان سے یادگار زمانہ ہے، اِنکے ایک سو ایک لطائف بزبان فارسی بھی شائع ہو چکے ہیں اور "مّلا نامہ" ایک چھوٹا سا رسالہ جس سے عجیب مذاق حاصل ہوتا ہے مّلا نامہ کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ زبان اُردو میں یہ چند شعر انکی موزونی طبع کا نتیجہ ہیں

دماغ

دماغ منشی گنگا لال صاحب خلف منشی کنھیا لال۔ میران پور نندرہ ضلع گیا کے رہنے والے ذی علم، خوش وضع اور نہایت متین و خلیق آدمی تھے۔ اردو و فارسی کے علاوہ آپ کو بھاشا و سنسکرت میں بھی دستگاہ حاصل تھی فن شاعری میں حضرت عرش خلف میر تقی میر کے شاگرد تھے ۱۲۶۸ھ میں بعمر ۷۰ سال اس جہان فانی سے رحلت کی۔ ایک دیوان غیر مطبوعہ موسومہ گلشن بیخار آپکی یادگار ہے مگر عنقا صفت ہے۔ بہزار کوشش یہ چند شعر دستیاب ہوئے جو ہدیہ ناظرین کیئے جاتے ہیں ؀

تیری زلفوں سے اماں ہے کسے یار آج کی رات ۔۔۔ انھیں دو کالوں نے رکھا ہمیں مار آج کی رات
صاف ہو وصل میں عاشق سے کدورت کیسی ۔۔۔ میری جاں دُور کرو دل سے غبار آج کی رات
درد دل سے جو کراہا تو وہ ہنس کر بولے ۔۔۔ جاں بلب کون ہے آوارہ دیار آج کی رات
وہ شب ماہ میں آئے ہیں جو افشاں چنکر ۔۔۔ چاندنی دوہری دکھاتی ہے بہار آج کی رات

گلشنِ حسن پر بہار نہیں ۔۔۔ کنگھی چوٹی نہیں سنگار نہیں
قتل کو بس ہے خنجر ابرو ۔۔۔ حاجتِ تیغ آبدار نہیں
باغ عالم میں گل کھلاتے کچھ ۔۔۔ اے جنوں موسم بہار نہیں

ایک ہی شکل کو دو کرکے دکھا دیتے ہیں ۔۔۔ جوہر آئینہ قاتل تری تلوار میں ہے

دماغ

دماغ۔ مولوی مرزا سجاد علی لکھنوی۔ دور موجودہ کے خوش فکر ہیں چند غزلوں کا ماحصل درج ذیل ہے۔

کیا تری معجز نما اے یار آنکھیں ہو گئیں ۔۔۔ جو کوئی آیا پئے دیدار آنکھیں ہو گئیں
محو ہیں اتنا خیالِ دیدِ جاناں میں ہوا ۔۔۔ دست و پا بھی ہیں ہوئے بیکار آنکھیں ہو گئیں
باغ میں وہ گل نہاں جب میری آنکھوں سے ہوا ۔۔۔ مجکو آپ اپنی نظر میں خار آنکھیں ہو گئیں
اتفاقاً دید کا انکی جو موقعہ بھی ملا ۔۔۔ شومئی تقدیر سے دیوار آنکھیں ہو گئیں

دوپیازہ

دوپیازہ۔ ملا عبدالمومن دہلوی معروف بہ ملا دوپیازہ خلفِ ملا ولی محمد۔ ہر گونہ علم و

آپ کا دربار کعبہ بن نجائے تو سہی
کچھ دنوں گھسنے تو دیجے اپنی پیشانی مجھے

آج سے وہ لطفِ راہ و رسم ظاہر بھی گیا
رازِ دل کہکر ہوئی کیسی پشیمانی مجھے

عقل کا کہنا سمجھ ہی میں نہیں آتا دلیر
کیا خدا جانے یہ سمجھاتی ہے دیوانی مجھے

مدعی کی تبکو قسمت کھلگئی ۔ کچھ نہ کھیے سب حقیقت کھل گئی
امتحانِ عشق بھی کیا سخت تھا ۔ آدمی کی آدمیت کھل گئی

فریاد حشر میں ہے یہ اک دردخواہ کی
پرسش یہاں تو ہو مرے حالِ تباہ کی

رکھا نہ عشق تو نے کسی دین کا مجھے
دُنیا تباہ کی مری عقبیٰ تباہ کی

افسوس دل کا حال کوئی پوچھتا نہیں
یہ کہرہے ہیں سب تری صورت بدل گئی

جو ہم نے کہدیا تھا وُہی عشق میں ہوا
آخر ہماری جان ہی لیکر اجل گئی

عزت اُسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے
سب کچھ بشر میں ہے جو محبت بشر میں ہے

دلیر مرزا تصدق حسین خلفِ مرزا واجد حسین فنِ شعر میں حضرت امیر مرحوم کے صاحبزادے جناب حکیم مغفور سے مستفید ہیں کم و بیش ۳۰ برس سے مشقِ سخن کرتے ہیں ۵۰ سال سے عمر متجاوز ہے ٭

مدت کے بعد دیکھنے آیا ہے وہ قمر
اے موت آج ہی تجھے آنا ضرور تھا

بجلی تڑپ تڑپ کے تھمی پر نہ یہ تھما
کس درجہ بیقرار دلِ ناصبور تھا

کہتا ہے درد مجھسے نہ بیتاب آپ ہوں
گھر سے وہ چل چکے ہیں کہیں ہونگے راہ میں

رحمت نے اُسکو بڑھکے گلے سے لگا لیا
دیکھا مجھے جو حلقۂ شرم و گناہ میں

خوشی ہے قتل کی اپنے فقط اسواسطے دلکو
کہ خونریزی کا ارماں تو رہا باقی نہ قاتل کو

وہ قاتل فاتحہ پڑھنے کو آیا ہے جو تربت پر
یہ بیجرم و گنہ مقتول ہونے کی خوشی ہے

دلیر منشی علی شبیر ساکنِ بمبئی رسالۂ معیار میں کچھ کلام نظر سے گزرا اُسکا انتخاب ضبطِ تحریر میں آیا

گھٹا کے آتے ہی محفل میں آیا جامِ شراب
اِک آفتاب گیا اور اِک آفتاب آیا

طلسمِ حسن جو دیکھا اُچٹ گئی مری نیند
لگی جو آنکھ تو عمر بھر نہ خواب آیا

دلیر میں نے تو خط اُنکو سینکڑوں بھیجے
مگر نہ نامے کا میرے کوئی جواب آیا

جو تیر آ رہا ہے وہ پار جا رہا ہے
وہ کھیل جانتے ہیں الفت کے مشغلوں کو

اب دل میں کیا دھرا ہے اب دل میں کیا دھرا ہے
اِک بدنصیب اپنی ہستی مٹا رہا ہے

کیا بتاؤں کیا نگاہِ یار ہو کر رہ گئی
میری دل کی مالک و مختار ہو کر رہ گئی

اِس نقاہت کا برا ہو منہ سے کہتا ہی وہ شوخ
ایک ہی فریاد اے بیمار ہو کر رہ گئی

ظلمتِ شامِ جدائی کب ہٹائے سے ہٹے
سامنے آنکھوں کے اِک دیوار ہو کر رہ گئی

غیر کی گردن میں جب بانہیں کسی کی پڑ گئیں
میری مایوسی گلے کا ہار ہو کر رہ گئی

کیا وہاں بھی جا کے پہنچی میری آہِ شعلہ ریز
کیوں ستارے گر رہے ہیں عرش سے ٹوٹے ہوئے

بخشدے تجھے اپنے عاشق کا قصور
بندہ پرور کیا کرے انسان ہے

زنداں میں فتنہ گرنے کی یہ تو دستگیری
جب پانوں میرے باندھے تب ہاتھ کھول ڈالے

گل پیرہن ہزاروں بنتے زیادہ نازک
نظروں میں آزمائے آنکھوں میں تول ڈالے

خونِ جگر سے اپنے لکھا تھا حال دل کا
واں خط شوق اُسنے پانی میں گھول ڈالے

چودھویں سال میں پہنچے تو کہا اِترا کر
جیسے ہم آج ہیں ایسا ہی مہ کامل ہے

مجھ سے کہتے ہیں کہ تو حشر میں یہ کہدیجو
میرا دعوی ہے کسی پر نہ کوئی قاتل ہے

نثر کے شکوے ہیں اک انشائے غم
نظم کی فریاد اک دیوان ہے

اِس قسم کھانیکے صدقے جائیے
آنکھ نیچی ہاتھ میں قرآن ہے

یہ فصاحت اور یہ آمد دلبیر
داغ کے فیضِ کرم کی شان ہے

کبھی راہ پر وہ نہیں آنیوالے
سلامت رہیں آنکو بہکانے والے

مری روح پر ہے قیامت کا صدمہ
تجھے کھیل ہے قبر ٹھکرانے والے

تفصیل وار ذکرِ ملاقات کیجیے
کس سے ملے کہاں ملے یہ بات کیا ہوئی

یہ گلگشتیں یہ سیریں ہی تو سارے گل کھلاتی ہیں
ستمگر تو جو رسوا ہے انھیں باتوں سے رسوا ہے

بے رخی میٹھی نظر کے ساتھ ہے
عیب کیا اچھے ہنر کے ساتھ ہے

کیا ضرورت تھی جو یہ زحمت گوارا کی گئی
کیوں مجھے ناپید ہونیکے لیئے پیدا کیا

عشق میں ضبط مدعا نہوا
آدمی ہیں بہت کیا نہوا
وہ بہت پوچھتے رہے لیکن
ہمسے اظہار مدعا نہو

تمھیں یہ ضد ہے تو دنیا کو چھوڑ دینگے ہم
یہی جہان ہے کیا دوسرا جہان نہیں

ملیگی کیوں نہ ہمیں قبر میں ستم سے نجات
کہ اس زمین کے نیچے تو آسمان نہیں

یہ سودا تو دیکھو وہاں جا رہے ہیں
جہاں سیکڑوں ٹھوکریں کھا رہے ہیں

یہ کہکر مجھے اُنکے درباں نے روکا
کریں کیا ہم اس بات کا کھا رہے ہیں

کہیں تم، کہیں ہم، یہ اندھیر کیا ہے
مُرادوں کے دن اور یوں جا رہے ہیں

اثر دے الٰہی ہماری دعا ہیں
ترے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں

چڑھیں طور پر ہم کو اِسکی ضرورت
یہیں سب کرشمہ نظر آرہے ہیں

مستحق ہم بھی ہیں اِس لطف کے دشمن ہی نہیں
اِس طرف بھی تو ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھو

روکنا دیدۂ خونبار کو اے حضرتِ دل
داغ آجائے نہ دامانِ وفا پر دیکھو

کراہے کیوں نہ وہ جو آتشِ فرقت سے جلتا ہو
مجھے پروا نہیں اسکی سُنے جو کوئی سنتا ہو

جنازے کو ہمارے دیکھ کر تم سوچتے کیا ہو
جلا دو اپنے کشتہ کو اگر رشکِ مسیحا ہو

ستمگر حشر ہے یہ آخری دن جسکو کہتے ہیں
قیامت ہے جو وعدہ آج بھی تیرا نہ پُورا ہو

بسر ہوتی ہے کیونکر زندگی ایام فرقت میں
یہ اُس سے پوچھنے کی بات ہے جو نیتہ مرتا ہو

بہت تو نے ڈرا رکھا تھا مقتل اور خنجر سے
یہیں ہوا اور ابھی ہو فتنہ گر جو کچھ کہ ہونا ہو

خدا نا ترس ہیں کافر حسین تو جرم کیا اس کا
خدا کو جب نجانیں یہ تو پھر خوفِ خدا کیا ہو

مانگو دعا کہ حشر میں اللہ بخشدے
میرا قصور ہو کہ تمھارا قصور ہو

سُن کے تبخانہ کو ہم شہرتِ اصنام چلے
کتنے دن دیکھئے اب مذہبِ اسلام چلے

دم نکلجائے تو ہو ہجر کی مشکل آسان
موت کام آئے اگر آج تو کچھ کام چلے

آج وہ میری عیادت کو جو آئے تو کہا
تم تو کل کہتے تھے ہم صبح چلے شام چلے

تک پنشن پاتے رہے۔ اِن کا سالِ ولادت ۱۸۷۰ء مطابق ۱۲۸۸ھ ہے۔ فارسی اُردو میں خاص دستگاہ ہے۔ مڈل تک انگریزی بھی پڑھی تھی۔ خلیق، نیک خصلت شخص ہیں، طبیعت نہایت شوخ اور چلبلی پائی ہے ابتدائے شعور سے شعر و سخن کا ذوق ہے، شعر اچھا کہتے ہیں۔ فنِ موسیقی سے بھی ایک گونہ لگاؤ ہے، پہلے جناب مضطر کے شاگرد ہوئے بعد میں فصیح الملک مرزا داغ سے بہ سلسلۂ خط و کتابت تلمذ اختیار کیا اور اس امر کی خاص کوشش کی کہ اُستاد کے رنگ میں کہیں۔ آجکل زمینداری کے انتظام کا مشغلہ ہے۔ کثرت مشق سے اب روز مرہ میں بے تکلفی کلام میں روانی زبان میں صفائی اچھی پیدا ہو گئی، اکثر مشاعروں میں اپنی خوش گوئی کی داد پاتے ہیں سندیلہ، رامپور، علیگڈھ کے مشاعروں میں شریک ہوئے راقم سے بریلی میں قاضی محمد خلیل کے مشاعرے میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا، شوخی مضمون اور طرز بیان قابلِ تعریف ہے اور جا بجا حضرت داغ کے فیضان کی جھلک ان کے کلام سے آشکار ہے

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں
بیٹھے بٹھائے آج مجھے ہوگیا ہے کیا

صورت نمائے حسن ہے آشفتگی مری
جو مجکو دیکھتا ہے تجھے دیکھتا ہے کیا

اندیشۂ فراق سے کرتا ہے ترکِ عشق
ہمت کو اے دلیر تری ہوگیا ہے کیا

مجمع اہلِ شکایت سے تمھیں کیا مطلب
کوئی دل سے کوئی تقدیر سے نالاں ہوگا

تم تو بے پردہ سامنے آؤ
صبر مجھ سے ہوا ہوا نہ ہوا

ہائے قسمت اسیرِ اُلفت کی
قید ہی میں رہا۔ رہا نہ ہوا

رشک یہ ہے کہ عدو نے لبِ لعلیں کو ترے
کر دیا چوس کے برگِ گلِ سوسن کیسا

ترکش میں ہیں جو تیر وہ قاتل کے پاس ہیں
جو کھو گیا کہیں وہ مرے دِل میں رہ گیا

ہیں سب خیال و خواب کی باتیں اے ہمنشیں
آنکھوں میں رہ گیا نہ کوئی دل میں رہ گیا

یہ سن لو اور جاؤ ہے اگر مدِ نظر جانا
تمھیں آتا ہے گھر جانا ہمیں آتا ہے مر جانا

نہ اپنے دِل کو دل جانا نہ اپنے دم کو دم سمجھے
تمھیں کو عمر بھر سمجھے تمھیں کو عمر بھر جانا

کوئی دم کوئی ساعت یاد سے تیری نہیں خالی
ہمیں کیا بے خبر اپنا سا تو نے بے خبر جانا

دلیر خستہ جاں کی خودکشی کو سُن کے فرمایا
خدا مرحوم کو بخشے اِسے کہتے ہیں مر جانا

گرہ اب کھولیے زلفوں کی لا دل لگی ہوئی
بھلا تیرے سوا اے دلربا کس پر گماں ہوگا

کوئی حسرت اگر برسوں میں نکلی بھی تو کیا نکلی	ہزاروں حوصلے وہ ہیں جو دلکے دلمیں رہتے ہیں
دردِ دل کا مزا وہ کیا جانیں	جن کا دل عمر بھر دُکھا ہی نہیں
پھیر دیتے نہیں وہ کیوں دل کو	جب یہ کہتے ہیں کام کا ہی نہیں
رُخِ زیبا نہیں زلفِ رسا ہیں	یہ ہے اک صبح دو اسکی ہیں شامیں
یہ ایک نشہ محبت کا ہے وہ چارہ گرو	کہ جس کا سارے جہاں میں اُتار کچھ بھی نہیں
وہ لپٹے نشۂ مے میں عدو سے	یہ بیہوشی میں ہشیاری تو دیکھو
اِن روزوں خانداں کو کوئی پوچھتا نہیں	عزت ہے آدمی کی بس اب سیم و زر کے ساتھ
دخترِ رز کا کئی دن سے نہیں ملتا سراغ	آج سنتے ہیں کہ قاضی کے وہ گھر بیٹھ گئی
سچ تو یہ ہے کہ بُری شے ہے تہیدستی بھی	رہن مے کے لیئے زاہد کی ردا آتی ہے
تڑپ جاؤگے میرا دردِ دل تم	جو سن لوگے کبھی میری زبان سے
مے کو کیونکر نہ وہ بُرا جانے	واعظ اسکے مزے کو کیا جانے
چھوڑے اُلفت وہ کیا حسینوں کی	کوسنے کو بھی جو دعا جانے
ہماری جبیں کے لیئے کعبہ زاہد	کسی شوخ کا آستان ہو رہا ہے
بیہوش ہے اک بیخبری آٹھ پہر ہے	کچھ عاشقِ جانباز کی بھی اپنے خبر ہے
اگلا سا وہ حیف اپنا زمانہ نہ رہا	دولت نہ رہی وہ کارخانہ نہ رہا
کھو بیٹھے اُسے ایک مکاں تھا جو دلیر	رہنے کا بھی افسوس ٹھکانا نہ رہا

دلیر

دلیر منشی سید امیر حسن مارہروی آپکے دادا میر داور علی دآور مرحوم اُناؤ کے قدیم باشندے اور ایام غدر میں سرکار انگلشیہ میں تحصیلدار تھے بصلۂ خیر خواہی سرکار سے موضع سلیم پور انعام میں ملا ہوا تھا بعد ازاں اور کچھ دیہات نواح ایٹہ میں خرید فرما کر اور مارہرہ کو پسند کر کے یہاں مستقل سکونت اختیار کی اُس میں جناب دلیر کے والد سید الطاف حسین بھی حصہ دار ہیں اور مکانات درگاہ کے قرب میں بنائے۔ تحصیلداری سے ترقی پا کر غدر کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور سنہ ۱۸۹۶

درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ۔

دے ساقیا شراب ہوا چاند عید کا
محتاج میکدہ تھا فقط اس کلید تھا

کیا سو رہا ہی چین سے مرقد میں بعد مرگ
زانوئے حور تکیہ ہی تیرے شہید کا

سرِ بالیں ہے وہ رشکِ مسیحا
کر گئی اب یہاں آ کر قضا کیا

کیونکر نہ ہو زبان کا دعوی مجھے دلیر
شاگرد ہوں منیر کا سیّد جلال کا

کمبل بھی اوڑھنے کو انھیں اب نہیں نصیب
دیتے تھے جو فقیر کو رومال شال کا

زہد و تقوی کی عبث لیتے ہو زاہد ہم سے
پیتے دیکھا ہے تمھیں ہی اسی برسات کی بات

تیر مژگاں پڑا کیئے دل پر
خوب کی تم نے چاند ماری رات

ہے مطلب ہی جب نہیں تم کو
کیوں کیا کرتے ہو ہماری بات

ہے جلوہ نیا کوئی تو چلمن کے اُدھر آج
جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج

تم اُٹھ کے کہاں جاتے ہو پہلو سے ہمارے
بیٹھو ابھی دنیا سے ہے اپنا بھی سفر آج

زاہد کو آب کوثر و حور و جنان پسند
ہمکو بتان ہند و مئے ارغوان پسند

ہوئی فصل جنوں میں جوشِ وحشت کی فزونی
کہ زنجیروں کی بیلیں چڑھ گئیں دیوارِ زندان پر

مے پی لو رہن رکھ کر رند و عبائے واعظ
سوچی ہی آج ہمنے کیسی سزائے واعظ

کم معاش ہیں جو رکھتے ہو بہت خرچ دلیر
بات کرتے نہیں کچھ اپنے گھر لینے کے خلاف

اُنکی زلفوں میں جو ہوتا ہی میرے دل پر بگاڑ
فیصلا کو بیچ میں دونوں کے آجاتی ہی مانگ

خوب جینے کا مزا پاتے ہیں ہم
خون دل پیتے ہیں غم کھاتے ہیں ہم

ہے یہ کیسا غمکدہ اے بزم آرائے جہاں
کتنے اِس محفل میں ہیں اور شادماں کوئی نہیں

جو کعبہ میں شیخ حرم دیکھتے ہیں
وہی بتکدہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں

بہت زہد و تقوے میں نازاں ہیں زاہد
گنہ گار تیرا کرم دیکھتے ہیں

سنیں کیونکر دلیر کی فریاد
کانوں کو بالی پتے بھرتے ہیں

خاندان کو شاہی مدفن قطب صاحب میں دفن ہونے کی اجازت سرکار شاہی سے عنایت کی گئی۔ چنانچہ جب نواب علی بہادر نے کالنجر میں انتقال کیا تو لاش قطب صاحب میں سپرد زمین ہونے کو دہلی بھیجی گئی، علی بہادر کے انتقال کے بعد نواب امراؤ بہادر کے دادا شمشیر بہادر پونہ سے کالنجر آئے اور سرکار انگلشیہ سے ۱۸۱۲ء میں معاہدہ کیا جسکی رو سے خطاب نواب باندہ اور چار لاکھ روپیہ سالانہ کا علاقہ یا پنشن زیر حمایت سرکار ہمیشہ کیلئے مسلم ہو گیا اس زمانے میں بعض وجوہ سے پیشوا نے اِن کا علاقہ ضبط کر رکھا تھا، جب غدر ۱۸۵۷ء ہوا تو اس زمانہ میں نواب امراؤ بہادر کے والد نواب علی بہادر ثانی رئیس باندا تھے، شروع بغاوت میں انھوں نے ۳۰، ۴۰ حکام انگریزی کی جانیں بچائیں، لیکن آخر کار فوج باغی نے انھیں اپنی امداد دینے پر مجبور کیا، بعد خاتمۂ فساد سرکار انگریزی نے علاقہ اور پنشن سابقہ ضبط کر کے تین ہزار روپیہ ماہوار پنشن مقرر کی اور اندور بھیجدیا، جبسے یہ خاندان وہاں مقیم ہے حضرت دلیر کی پیدایش ۱۲۷۳ھ میں بمقام باندا ہوئی تھی۔ اور تعلیم راجکمار کالج اندور میں پائی آپ اور آپکے برادر کلاں نواب ذوالفقار بہادر ثانی پنشن بقدر گزارہ پاتے ہیں اور جیسی فراغبالی و آسودگی اِس قدیم خاندان کی رفعت برقرار رکھنے کو لازم ہے وہ حاصل نہیں۔ فنِ سخن میں آپ کو حضرت جلال لکھنوی سے فیض پہنچا ہے چنانچہ ۱۳۳۹ھ میں دیوان بھی شائع کر چکے ہیں، سیدھا سادہ کلام ہے مضمون آفرینی اور نزاکتِ خیال کی طرف توجہ کم ہے پُر گوئی البتہ ہے اور اساتذۂ سلف و حال کے کلام پر خوب ہاتھ صاف کیا ہے جس کا باعث غالباً یہی ہے کہ انکا کلام نظر سے نہیں گذرا ہنگامِ ترتیب تذکرہ مع حالات دیوان ارسال کیا طرز ناسخ کے مقلد ہیں کنگھی۔ چوٹی۔ محرم کے مضامین پر اکثر نظم کرتے ہیں سرورق پر یہ شعر درج ہے۔

سخن بہتر سے بہتر اس کا ہمسر ہو نہیں سکتا	یہ دعوے سے میں کہتا ہوں کہ بہتر ہو نہیں سکتا

اِس دعوے کی صداقت کی بابت ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے۔ ہم تو چند منتخب شعر

اور نواب ذو الفقار بہادر والی ریاستِ باندہ کے پوتے ہیں جو خود مرہٹوں کے فرمانروا باجے راؤ اول پیشوائے پونا کے خلف اصغر شمشیر بہادر کے پوتے اور جانشین تھے، اسکے خاندانی مطبوعہ حالات سے پایا جاتا ہے کہ ۱۷۲۵ء میں راجہ چھتر سال رئیس پنّا نے پیشوا باجے راؤ سے غضنفر جنگ محمد خان بنگش صوبہ دار الہ آباد کے مقابلہ کے لیئے امداد طلب کی چنانچہ باجے راؤ خود فوج لیکر اُسکی حمایت کے لیئے بندیل کھنڈ آئے اور بنگش کو شکستِ فاش دیکر راجہ کے ملک کو اُسکے چنگل سے آزاد کرایا - اسی معرکہ میں رئیس پنّا کے اہلِ خاندان جن میں اُنکی لڑکی بھی تھی لشکر اسلامی کی ہزیمت کے بعد آزاد ہو کر راجہ کے پاس واپس آئی - مگر رئیس مذکور نے اس خیال سے کہ یہ لڑکی کچھ روز مسلمانوں کے لشکر میں رہ چکی ہے اُسے اپنی دختر تسلیم کرنے میں پس و پیش کیا - ناچار باجے راؤ جو اُسکے حسن و جمال کو دیکھ کر دل باختہ ہو گیا تھا اُسے اپنے ہمراہ پونہ لیگیا اور داخلِ حرم کر لیا، وہاں اُسکے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، یہ بچہ مشکل سے پانچ برس کا ہوا تھا کہ باجے راؤ کا انتقال ہو گیا، چونکہ اُسکے جوان ہونے پر سرداران ریاست نے اُسے ہندو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا بالاجی باجے راؤ پیشوا نے اُسے باندا کا علاقہ مدد معاش کے طور پر دیکر مذہب اسلام اختیار کرنے کی اجازت دیدی - باوجود اس ترک مذہب کے یہ خاندان قیام سلطنتِ مرہٹہ تک برابر اپنے آپ کو مرہٹہ طاقت کا جزو سمجھتا رہا اور باجگذار مطیع رہا - نواب شمشیر بہادر بانی خاندانِ باندا اس طرح باجے راؤ پیشوا کے خلفِ چہارم اور بالاجی باجے راؤ پیشوا کے برادر اصغر تھے ۱۷۶۱ء کی پانی پت کی لڑائی میں وہ زخمی ہوئے اور بموقع واپسی افواج مرہٹہ جانب دکن بھرتپور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے، اُنکے لڑکے علی بہادر نے بامداد مادھوجی سیندھیہ بندیل کھنڈ کے اکثر اضلاع فتح کیئے اور نمک حرام غلام قادر کو جس نے واجب التعظیم شہنشاہ دہلی شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال لی تھیں گرفتار کر کے دہلی بھیجا اور اس کار نمایاں کے صلے میں ماہی مراتب و دیگر مدارج حاصل کیئے، ایک یہ خاص رعایت بھی اُن سے کی گئی کہ اُن کے

غیر پر لوٹ ہیں اب چھوڑ کے چاہت میری — کچھ جو کہتا ہوں تو کہتے ہیں طبیعت میری
تھی جوانی تو انھیں ناز تھا کیا کیا کل تک — غیر کی سنتے تھے منت نہ سماجت میری
آج گردوں کی طرف دیکھ کے وہ کہتے ہیں — ہائے کیا ہوگئی وہ چاند سی صورت میری

دلیر

دلیر۔ نواب علی محمد خاں صاحب لکھنوی۔ آپ کو حضرت عشق لکھنوی سے تلمذ رہا ہے۔ انجمن محمدی کے پریسیڈنٹ تھے ارمغان سنہ ۹۶ء سے کلام منتخب ہو کر نقل ہوا۔ بار بار لکھنو سے حالات دریافت کیے مگر کسی صاحب نے توجہ نکی صرف محشر صاحب کی زبانی اتنا معلوم ہوا کہ دس برس ہوئے انتقال کر گئے اور کلام ملنا اب ناممکن ہے۔ چند شعر حاضر ہیں۔

روح عاشق قفس جسم سے آزاد نہ ہو — ملک الموت اگر شکل پریزاد نہ ہو
دل کا جلنا کیا الفت میں گوارا کس نے — اپنا گھر پھونک کے دیکھا ہی تماشا کس نے
نور سے اس رخ تاباں کے ہوئیں آنکھیں بند — بے نقاب آئے بھی وہ تو نہیں دیکھا کس نے
لب جاں بخش پہ تہمت ہی سہی مان لیا — یہ بتاؤ تو کیا پھر مجھے اچھا کس نے
لاکھ جانیں ہوں تو اک نقش قدم پر صدقے — دل کے مٹنے کا کیا آپ سے شکوا کس نے

دلیر

دلیر۔ نواب دلیر جنگ بہادر رئیس مدراس۔ شاید نواب کرناٹک کے خاندان کے رکن ہیں باوصف اہل زبان نہ ہونے کے اردو و فارسی کی طرف بھی توجہ رہی۔ یہ چند شعر نتائج افکار سے ملے درج کئے گئے*

دیکھنا انکو ہے ممنوع صنم خانوں کا — کچھ خفا ہو گیا اللہ مسلمانوں کا
دیکھئے عاشق و معشوق کی کیفیت کو — شمع کیا جلتی ہے جی جلتا ہے پروانوں کا
ایک گردش سے کیا مست تری آنکھوں نے — کام میخانہ میں ہے ایسے ہی پیمانوں کا
خفا کیوں ہو نکل آئے جو آنسو — یہ لڑکے ہیں نکل جاتے ہیں گھر سے
حسیں سب اے دلیر اٹھے چلے جاتے ہیں دنیا سے — عدم آباد میں شاید کوئی دلچسپ بستی ہے

دلیر

دلیر۔ نواب امراؤ بہادر ملقب بہ شمشیر بہادر ثانی۔ آپ نواب علی بہادر ثانی کے خلف دوم

کہتے ہیں تلاش اسکو دلگیر		خود کھو گئے ایسی جستجو کی	

دلگیر

دلگیر۔ سید اظہر حسین عرف مُنا میاں مارہرہ کے باشندے اپنے بھائی جناب دلیر کے مشورہ سے شعر کہتے ہیں سنہ ۹۸ء سے مشق سخن کرتے ہیں اِنکے خاندانی حالات بہ تحت ترجمہ جناب دلگیر درج ہیں دوبارہ اُنکا اعادہ فضول ہے۔ خاصے شوخ طبع موزوں فکر ہیں زبان بھی شستہ و صاف ہے

رہا دلگیر یوں بھولا ہوا دنیا و دیں برسوں	کہ رگڑی اُس بتِ سفاک کے در پر جبیں برسوں
وہاں بھی جلکے روحِ قیس کو نالوں سے پھونکایا	رلائی خوب دشتِ نجد کی بھی سرزمیں برسوں
نہ چھوٹے گا ہمارے خون کا دھبہ قیامت تک	بتِ سفاک دھوئے لاکھ اپنی آستیں برسوں
اِس طرز سے وہ چلتے ہیں وقتِ خرام ناز	گویا کہ اُنکے پاؤں کے نیچے زمیں نہیں
انداز گفتگو کا کچھ اُلجھا ہوا سا ہے	فقرہ پیامبر کا کوئی دلنشیں نہیں
عدو سے اُنکے لڑنے پر بجا ہے میرا یہ کہنا	دکھائی آپنے تو آج جنگ زرگری اچھی
حنا مالیدہ ہاتھوں نے سجھائی قتل عاشق کی	کسیکے خون ہونے کے لئے مہندی رچی اچھی
بُرا ہے نام ہی اُلفت کا پوچھا ہے تو کہتا ہوں	نہ الفت حور کی اچھی نہ اُلفت آپکی اچھی

دلگیر

دلگیر۔ منشی عبدالوہاب خان صاحب آپکو حضرت امیر مینائی سے تلمذ رہا ہے سنہ ۱۸۹۸ء کے حدیقۂ ہادی سے کلام منتخب ہوا، امیر اللغات کے دفتر میں بھی کچھ دنوں مددگار رہے زیادہ حال باوجود مکرر دریافت معلوم نہوا کلام منتخب ملاحظہ ہو؛

نہ دیتے تھے تم گالیاں اوّل اوّل	نہ تھی ہاتھ بھر کی زباں اوّل اوّل
کوئی پھول مجکو بھی گلشن کا صدقہ	میں آیا ہوں اے باغباں اوّل اوّل
ہمیں کچھ فائدہ اس سے جو چہرہ سے نقاب اُٹھے	مزا اُسوقت ہے جب پردۂ شرم و حجاب اُٹھے
جھپک جائیں فلک پہ چاند سورج گر پڑے بجلی	تمھارے روئے تاباں سے مرے جان گر نقاب اُٹھے
بوسوں کے بدلے مجکو وہ دیتے ہیں گالیاں	اچھی دوا ہے یہ دلِ بیمار کے لیئے
دلگیر کہتے تھے کہ لگاؤ کہیں نہ دل	رونا پڑا نہ تمکو دلِ زار کے لیئے

سروں پر میکشوں کی ابر کا سایہ تھا دنیا میں   عجب کیا اُسکی رحمت گھیرے اُنکے مزاروں کو
نہ تھا ہمدرد کوئی دشتِ وحشت میں سوا انکے   ہماری آبلہ پائی پہ آیا رحم خاروں کو
شکستہ قبر اک میری بھی ہے گنجِ شہیداں میں   جو آنکلو ادھر تم فاتحہ دینے مزاروں کو
کلیجا کھا گئے رنج و غم و اندوہ سب مل کے   ہجومِ غم ہوا اتنا کہ حصے بٹ گئے دل کے
ستم توڑا غضب ڈھایا نگاہِ ناز نے مل کے   پڑی اُوپر مگر اندر سے ٹکڑے کر دیئے دل کے
نہ مرتے مجکو بنتی ہے نہ جیتے مجکو بنتی ہے   نہ دل ہی میرے قابو میں نہ میں قابو میں ہوں دل کے

دمِ نزع حسرت بڑی رہ گئی   نظر جانبِ در لڑی رہ گئی
نہ ڈھونڈا دلِ غیر میں آپ کو   یہ اک چال ہمسے بڑی رہگئی
دمِ نزع اے جان آئے نہ تم   مری جان تم میں پڑی رہ گئی
اُٹھائے ہوئے ہیں ہم اک کوہِ غم   مصیبت جو سر پر پڑی رہ گئی
ہوئے مرحلے زندگی کے تمام   بس اب ایک منزل کڑی رہگئی
گئی مرتے مرتے نہ مژگاں کی یاد   یہ برچھی جگر میں گڑی رہ گئی
وہ آئے دمِ نزع بالیں پہ جب   اجل بھی کھڑی کی کھڑی رہگئی
ہوئے آپ رخصت مگر مجکو یاد   قیامت کی وہ اک گھڑی رہ گئی
کیا ذبح تم نے نہ دلگیر کو   یہ اک حسرت اُسکو بڑی رہگئی

باتوں میں ہے سحر فتنہ جو کی   دل لے لیا جس سے گفتگو کی
کٹ کٹ کے دعائیں دے رہی ہیں   خنجر کو رگیں مرے گلو کی
ہو قصۂ قیس یا کہ فرہاد   اک شرح ہے لفظِ آرزو کی
دل لیکے کسی کا پوچھنا ہائے   کس دل سے ہماری آرزو کی
میں چشمِ عدو میں ڈالتا ہوں   چھانی ہوئی خاک کو بکو کی
لاکھوں کا نوالہ کر رہی ہے   ہے گور بھی کس بلا کی بھوکی

خانۂ دل کیوں نہو زاہد حسینوں کا مکاں / گھر بتوں کا مدتوں اللہ کے گھر میں رہا

چین کچھ ایسا دیا کنجِ لحد نے بعدِ مرگ / قبر میں جا کر بھی میں آغوشِ مادر میں رہا

جستجوئے یار نے مجکو پھرایا دربدر / میں نہ مسجد میں نہ کعبہ میں نہ مندر میں رہا

آتشِ عشقِ بتاں سے کوئی کیوں کر بچ رہے / یہ وہ شعلہ ہے شرر بنکر جو پتھر میں رہا

چشمِ حیرت بن کے تکتا یہ رہا ہر ایک شکل / حشر تک محوِ آئینہ۔ یادِ سکندر میں رہا

مرنیوالوں کے لیے خنجرِ بُرّاں کسکا / راستہ دیکھتی ہے ہمتِ مرداں کسکا

پہلوئے غیر میں وہ چین سے سونیوالے / چاک ہے مثلِ سحر - دیکھیے گریباں کسکا

دل سا پروردہ آغوش ہو جب اُنکی طرف / پھر بھلا اور بھروسا کرے انسان کسکا

دہنِ زخم کی نیت نہیں بھرنے والی / چاہیئے کانِ نمک، اجکو نمکداں کسکا

عہد یہ ہے کہ کبھی خود نہ پئیں گے زاہد / کوئی گلرنگ دے پیمانہ تو پیماں کسکا

لدا ہوا ہوں داغوں کے پھولوں سے لالہ زار ہوں میں / خزاں کی بھی ہے جھلک جسمیں وہ بہار ہوں میں

مری جگہ ہے ہر اک دل میں خاکسار ہوں میں / گیا گھر آنکھ میں دشمن کی وہ غبار ہوں میں

غضب کا شوخ ہے دیکھو تمہارا تیزِ نگاہ / یہ تاک ہے کہ کسی کے جگر کے پار ہوں میں

اسی طرح سے نکل جائے حسرتِ پابوس / سرِ مزار ہو تم اور تہِ مزار ہوں میں

اُگا ہوں خاک سے میں بعدِ مرگ گل بن کر / جو دسترس ہو تو تیرے گلے کا ہار ہوں میں

جو ہوں تو کچھ نہیں، ہونا مرا نہونا ہے / کسی کے وعدۂ فردا کا اعتبار ہوں میں

سرِ محشر تری تیغِ ادا کا کیوں نہ بسمل ہوں / ترا ہنس ہنس کے یہ کہنا کہ ہاں میں اسکا قاتل ہوں

مری اِس بیخودی پر کیوں نہ آکر ہوش صدقے ہوں / نہیں غفلت میں پہچانا وہ بیخود ہوں وہ غافل ہوں

مری تقدیر میں دلگیر رہنا ہی مقدر ہے / نہ نکلی آجتک حسرت میں وہ حسرت بھرا دل ہوں

نہ پوچھا ہائے اُس ظالم نے اپنے دل فگاروں کو / رکھا اُمید ہی اُمید میں اُمیدواروں کو

ہمیشہ تیری فرقت میں تڑپتے ہی کٹی گذری / نہ پوچھا موت نے بھی ہائے تیرے غم کے ماروں کو

ترے آنے کی خبر جب کبھی ملجاتی ہے
موت منہ دیکھ کے رہجاتی ہے بیماروں کا

انھیں دونوں سے الٰہی رہے زنداں آباد
غل ہو زنجیر کا نالہ ہو گرفتاروں کا

قصر جنت پہ بھی دیوانوں نے لاتیں ماریں
آگیا یاد جو سایہ تری دیواروں کا ✣

وہ میرا گھر سمجھ کر خانۂ دشمن سے پھر آئے
مرا مطلب نکل آیا بھلا ہو بدگمانی کا

کئے سیراب زخم اے تیرِ قاتل آب پیکاں سے
طریقہ تونے مہمانی میں برتا میزبانی کا

جنابِ خضر سے کہدو عبث جینے پہ مرتے ہو
نہو کھٹکا اجل کا تو مزہ کیا زندگانی کا

مئے کہنہ کہاں ہے حضرتِ زاہد وہ آپہنچے
نئے مہمان کو دے ساقی کوئی ساغر پرانی کا

گلے پر میرے خنجر رکھ کے پھر کچھ فکر کرتے ہیں
نتیجہ دیکھئے ہوتا ہے کیا تجویز ثانی کا

چلا ہے نجد کی جانب جو کھنچکر ناقہ لیلیٰ
غبارِ قیس کو عہدہ ملا ہے پاسبانی کا

غزل میری نہ تھی دلگیر کچھ توصیف کے قابل
مگر مشکور ہوں اہلِ سخن کی قدردانی کا

ہر طرف جاتی ہیں نظریں تری ترچھی ہوکر
کبھی سیکھے ہی نہیں تیر نے سیدھا جانا

بند ہوتا ہی نہیں ملکِ عدم کا رستہ
رات دن رہتا ہے جاری یہی آنا جانا

کیا قیامت ہیں ادائیں انکی
دیکھکر مجکو کن انکھیوں سے وہ شرما جانا

بتکدے دوڑ کے پہنچے کبھی کعبہ کو گئے
آج تک ہمنے ترے گھر کا نہ رستہ جانا

دم آخر ہے ٹھہر جاؤ میری بالیں پر
ابھی آئے ہو، ابھی جاؤ گے، جانا جانا

وہ سمجھتے نہیں کچھ بھی یہ سمجھ ہے انکی
کہ مجھے غیر کیا غیر کو اپنا جانا

پہنچے دلگیر وہاں جسکے حسینوں کا ہجوم
عرصۂ حشر کو بھی کیا کوئی میلا جانا

ہیں لحد میں بھی جو یادِ روئے انور میں رہا
کیا چمک کر نامِ لوحِ سنگِ مرمر میں رہا

جیتے جی تھا چرخ دشمن بعد مردن ہے زمیں
جب بھی میں گردش میں تھا اور اب بھی چکر میں رہا

مجھ سے رخصت ہو کے پیری میں مرا عہدِ شباب
نکہتِ حسنِ شاعری شعروں کے تیور میں رہا

چین سے آکر جو بیٹھا پھر نہ نکلا حشر تک
تیر انکا بن کے ارمان قلبِ مضطر میں رہا

واقف ہیں، نثر طرازی اور شعر گوئی کا مذاق بچپن سے رفیق رہا۔ چنانچہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر سے برابر مختلف رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھتے رہے کچھ عرصہ آگرہ اخبار اور مفید عام کی ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیئے فن شعر میں باوجود نغز گوئی اور شیریں گفتاری حیرت ہی کہ آپنے کسی سے باضابطہ طور پر اصلاح نہیں لی پڑھنے کا انداز دلکش اور موثر ہے سنہ ۱۹۰۹ء میں دہلی کے کئی مشاعروں میں تشریف لائے اور اپنے دلپذیر کلام سے شائقین کی سامعہ نوازی کی اُس زمانے سے مؤلف تذکرہ سے مراسم اتحاد قائم ہوئے جو بفضلہ قائم ہیں۔

دور موجودہ کے انشاپردازوں کے زمرہ میں ہماری رائے میں شاہ دلگیر کا پایہ صفِ دوم کے صدرنشینوں میں سمجھنا چاہیئے۔ آپکا تخیل ایک عجیب جدت و لطافت کا پہلو لیئے ہوئے ہے۔ آمد۔ اور اس میں جا بجا انسانی جذبات اور مناظرِ قدرت کے دلفریب نمونے ایسی سلیس و شستہ زبان میں ملتے ہیں کہ خواہ مخواہ انسان تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب شروع سنہ ۱۹۱۳ء سے شاہ صاحب نے ایک رسالہ نظم و نثر موسومہ "نقاد" آگرہ سے شائع کرنا شروع کیا ہے جسکی گو ابھی پوری دو برس کی بھی عمر نہیں ہوئی تاہم وہ موجودہ رسالوں میں نہایت وقیع اور ممتاز سمجھا جاتا ہے اور اُمید ہی کہ اگر شاہ صاحب کی توجہ استقلال کے ساتھ اسکی ترتیب و تہذیب کی طرف منعطف رہی تو یہ رسالہ ادب اردو کی خدمت کا ایک قابل قدر ذریعہ ثابت ہوگا۔ آپکے اشعار میں نزاکت و جدت خیال۔ تلاش مضمون، مناسب الفاظ۔ شستگی روزمرہ و طرز ادائے بیان الغرض جملہ خوبیاں موجود ہیں۔ پڑھیئے اور لطف اُٹھایئے

کیوں نہ دھوکا ہو دہکتے ہوے انگاروں کا	شعلۂ طور ہے جلوہ ترے رخساروں کا
سایۂ دامنِ رحمت میں ہیں عاصی زاہد	دیکھ کیا حشر میں رتبہ ہے گنہگاروں کا
جل اُٹھا آتشِ دل سے مری ہر سنگِ مزار	ڈھیر ہے بعد فنا قبر پہ انگاروں کا
ہار پھولوں کے لیئے پھرتی ہیں حورانِ جناں	آج فردوس میں میلہ ہے گنہگاروں کا

خانی نوازش سے تلمذ تھا، پھر شیخ ناسخ کی خدمت میں آئے۔ مراثی کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔ میر خلیق اور فصیح انکے ہمعصر تھے، نواب سعادت علی خان اور غازی الدین حیدر کے زمانے سے مرثیہ گویوں کے سرتاج سمجھے جاتے تھے جب میر انیس نے مرثیہ کہنا شروع کیا ہے تو انکا عالم ضعیفی تھا

معطر اسکے نہانے سے بسکہ آب ہوا ۔۔۔ حباب بحر ہر ایک شیشۂ گلاب ہوا

کسکو دکھاؤں میں یہ بھلا ماجرائے چشم ۔۔۔ ناسور بن گئے ہیں عزیزو بجائے چشم
باتیں تری سنا کریں اور دیکھیں تیری شکل ۔۔۔ دار وئے گوش یہ ہے تو وہ مدعائے چشم
آئے طرب ترا جو وہ خوش چشم باغ میں ۔۔۔ نرگس کے دستے کیجیو تو بھی فدائے چشم

دلگیر

دلگیر۔ ناثر بے نظیر سخنور خوش تقریر شاہ سید نظام الدین دلگیر اکبر آبادی۔ آپکے والد سید عبد القادر شاہ صاحب قیصر اکبر آباد کے شرفاء روساء میں سے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت سید عبد القادر شاہ بغدادی تک پہنچتا ہے جو بغداد سے عَلَمِ خلافت سید عبد القادر جیلانی لیکر ہندوستان میں آئے۔ یہ عَلَم دو سیر سونے کا ہے اور شاہ دلگیر اب بھی گیارہویں کو اسے اپنی درگاہ میں استادہ کرتے ہیں، شاہ دلگیر کے پردادا سید منور علی شاہ جو صاحبِ علم کے پوتے تھے آخر اٹھارھویں صدی میں جب آگرہ میں مرہٹوں کی عملداری تھی صاحبِ کرامات مشہور ہوئے۔ نقل ہے کہ مہاراجہ سیندھیا کی ایک لڑکی جو عرصہ سے سخت بیمار تھی شاہ صاحب کی دعا سے بالکل تندرست ہو گئی اسکے صلہ میں مہاراجہ سیندھیا نے بطور شکریہ کئی گانو شاہ صاحب کو بطور معافی عطا کیئے۔ حضرت دلگیر کے والد اور دادا لاٹ صاحب کے درباری بھی رہے۔ شاہ دلگیر کی ولادت ۲۳ فروری ۱۸۸۳ء مطابق ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۰۰ھ کو آگرہ میں میوا کڑے کے محلہ میں ہوئی ابھی چودہ برس کی عمر نہ ہونے پائی تھی کہ خاندانی تنازعوں کے باعث باضابطہ تعلیم کا سلسلہ مسدود ہو گیا۔ تاہم ذاتی شوق مطالعہ کی بدولت فارسی اردو کا مذاق اعلیٰ درجے کا ہے اور انگریزی میں بھی فی الجملہ مہارت حاصل کر لی ہے، عربی سے بقدر ضرورت

رہا ہے کب کوئی دنیا میں دم بھر شادماں ہو کر	ملا ہے کب کسیکو چین دم بھر شادماں ہو کر
حقیقی عشق کی عشقِ مجازی پہلی منزل ہے	چلو سوئے خدا اے زاہد و کوئے بتاں ہو کر
یہی دلریش حسرت ہے یہی دل کی تمنا ہے	کہ گذرے عمر باقی خادمِ ہندوستاں ہو کر

دلسوز

دلسوز۔خیراتی خان دلسوز، قوم کے افغان باشندۂ علیگڈھ شاہ ضمیر مرحوم کے شاگرد اور نواب ظفریاب خان خلف بیگم شمرو کی رفاقت میں تھے ۱۸۲۵ء کے قریب جیپور میں انتقال کیا، شراب بہت پیتے تھے، مزاج میں شوخی و ظرافت بدرجۂ انتہا تھی پرانے تذکروں سے کلام منتخب ہو کر درج ہوا۔

ارادہ پائے بوسی کا تھا اے بیداد گر اپنا	گرا قدموں ہی پر تیرے کٹا جسوقت سر اپنا
جگر فراق کے صدموں سے لالہ زار رہا	یہاں خزاں میں سدا موسمِ بہار رہا
وہ تو کہتے ہیں راز دل اپنا	مت کسی اپنے یار سے کہنا
اور یہاں دل کی بیقراری سے	روز دو تین چار سے کہنا
رات تم اِس طرف جو آن پھرے	دن مرے کچھ تو مہربان پھرے
سب سہیں گے ہم اگر لاکھ برائی ہو گی	پر کہیں آنکھ لڑائی، تو لڑائی ہو گی

ق

دلشاد

دلشاد۔خلیفہ عبدالرحمٰن دلشاد باشندۂ خورجہ، منشی فائق ساکن ہاپڑ سے صلاح لیتے ہیں دس بارہ برس کی مشق بھی ہے۔

نوبت ترے بیمار کی پہنچی ہے یہانتک	جو دیکھنے آتا ہے تو دیکھا نہیں جاتا
لے جلد خبر آکے مری عیسیٰ دوراں	بیمارِ محبت سے اب اُٹھا نہیں جاتا

دلگیر

دلگیر۔منشی چھنولال کالیستھ سکسینہ باشندۂ لکھنؤ۔ایام جوانی میں طرب تخلص کرتے تھے اور غزل میں بھی یہی تخلص لاتے رہے، اوائلِ شباب میں بڑے رندانہ منش اور رنگین مزاج تھے چنانچہ اُسی لاُابالی عالم میں مذہب آبائی کو ترک کر کے مسلمان ہو گئے اور غزل گوئی کی بجائے مرثیہ کہنا شروع کیا، اور چونکہ صاحب استعداد تھے اِس میں اچھا نام پایا شروع میں مرزا

اصلاح لی ہے اٹھارہ بیس برس کی مشق سخن ہے۔ کلام میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں پائی جاتی۔ استعداد علمی بھی رسمی معلوم ہوتی ہے۔

کروں میں انکو رسوا دعویٰ خون کرکے محشر میں / دلاور میرے دل سے یہ گوارا ہو نہیں سکتا
بنو گی سرد یہ گرمیٔ الفت خاک ڈالے سے / رہیگی سوزش دل مضطرب زیر زمیں برسوں
نکلتے ہمنے دیکھے ہیں بہت ارمان غیروں کے / ہماری حسرتیں خوں ہو کے بھی دلمیں رہیں برسوں
خیال ہمسری ہے تو کرے کسب ضیا پہلے / مہ نو عارض انور سے تیرے مہ جبیں برسوں
قدرداں دل کا خریدار دلاور ہو اگر / مفت اس جنس گرانمایہ کو ہم دیتے ہیں
اگر اس فتنہ گر کی دل کو الفت ہونیوالی ہے / تو الفت کیا ہے اک خاصی مصیبت ہونیوالی ہے
عدو کو بھیجنے والے ہیں وہ رسم عیادت میں / ہمارے مارنے کی اب یہ حکمت ہونیوالی ہے
ذرا ہشیار ہو کر آئینہ پیش نظر رکھنا / مقابل دیکھ کر خود تم کو حیرت ہونیوالی ہے
لئے جاتا ہے اسکا شوق ہی خود اسکو مقتل میں / تمہارے ہاتھ سے جسکی شہادت ہونیوالی ہے
ہنوز آغاز الفت تھا کہ دلکو ہاتھ سے کھویا / خدا جانے ابھی کیا اور حالت ہونیوالی ہے

دلاور

دلاور۔ نواب دلاور حسین خان لکھنوی شاگرد منظہر آغا مظہر مرحوم

ثنائے رخ میں وہ رنگیں ہے داستاں میری / ملی نہ بلبل شیراز کو زباں میری
یہ تیغ حسن کا ہے زخم بے خرد جراح / جسے کہ داغ ہے سمجھا وہی ہے جاں میری
نکل بھی جائیے دے مجھکو کہو تجھے بھی قرار / تڑپ تڑپ کے یہ کہتی ہے دل سے جاں میری

دلخوش

دلخوش۔ لالہ بہادر سنگھ کھتری، راجہ خوشحال رائے دہلوی امیر عہد اکبر شاہ ثانی کے پوتے اور غدر کے بعد سنہ [illegible]ء تک حیات تھے۔ انکے دادا کا کٹرہ ابتک مشہور ہے ۔

ہوں ترے ہجر میں جوں دیدۂ نرگس حیراں / چشم پوشی نہ کر آ اپنے گنہگار سے مل

دلریش

دلریش۔ منشی اجل بہاری لال صاحب مختار عدالت علیگڈھ آپ کو علیگڈھ کے نامور شاعر منشی بنواری لال صاحب شعلہ سے تلمذ ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں ۔

عطر آگیں آپکی پوشاک سے گلزار ہیں
نکہتِ گل ہوش میں وہ وہ پھر آتی نہیں

چشمِ بد دور آپ کی حاضر جوابی کی ہے دھوم
کونسی پھبتی ہے وہ ایسی کہ چھا جاتی نہیں

سُرخ غصہ سے ہی چہرہ کہہ رہے ہیں جوش سے
چومنے تلووں کو میرے کیوں حنا آتی نہیں

ہوش میں کیا خاک آئیں آپکے آشفتہ دل
اب صبا بھی بوئے زلفِ عنبریں لاتی نہیں

دل

دل۔ منشی محمد حسین قصبہ بسواں ضلع سیتا پور کے باشندے اور جگر کے شاگرد ہیں گلچیں سنہ ۹۹ء سے کلام منتخب ہوا۔

کوئی کیونکر سنبھالے اِس دلِ بیتاب کو جسمیں
کھٹک ہو، درد ہو، ایذا ہو، بیتابی ہو حسرت ہو

ہماری خاک شاید تیرے دامن تک پہنچ جائے
پسِ مردن تمنا ہے ترے کوچہ میں تربت ہو

چھڑکدے میرے زخموں پر نمک ہنس ہنس کے او قاتل
وہ راحت ہے مجھے جو تیری ہاتھوں سے اذیت ہو

وہ پہلو میں ہیں پھر بھی دل ہے بیچین
نہ ہوں پہلو میں تو کیونکر بسر ہو

کسی کے غمزہ و ناز و ادا پر
تصدق جان ہو صدقے جگر ہو

دلاور

دلاور۔ منشی سید دلاور علی ولد سید قاسم علی شاگرد حضرت داغ۔ ترتیب تذکرہ انتخاب یادگار امیر مینائی کے ہنگام میں ریاستِ رامپور میں ملازم تھے اور بڑے ذکی الطبع اور فہیم کہنے والے تھے سنہ ۱۲۳۸ھ سال ولادت ہے، مذاق سخن سلیم تھا سنہ ۱۲۹۰ھ میں ۳۵ سال کی عمر تھی۔ باوجود کوشش کے حالات معلوم نہ ہو سکے نہ کلام ہی ملا۔

کی جو شکایت تو یہ پایا جواب
آتے ہی کیوں ہو جو سناتے ہیں ہم

قبر پر فاتحہ کے حیلے سے
گالیاں کچھ سنانے آتے ہیں

عبث بیتاب ہو کر بیقرار ہوتے ہیں کہا ایدل
جگایا کیا اُسے تونے اٹھایا شورِ محشر کو

تم دور رہو اور یہ بے چین ہو جائے
اپنا سا سمجھتے ہو مری جاں مرے دل کو

منہ لگائیں غیر کو اتنا دماغ انکو کہاں
چھیڑ تھی یہ بھی فقط میرے جلانے کیلئے

دلاور

دلاور۔ محمد دلاور حسین خاں باشندہ موضع اٹنگا چاند پور۔ جناب تشنہ بلند شہری سے

تا سائباں کا کام دے بیگم کے شاہی تاج پر
دو چار باقی پیڑ ہیں، یا ٹھیکیوں کے ڈھیر ہیں
یا چر رہی ہیں بکریاں، یا بوم کا ہے آشیاں
شاہی شکوہ و عز و شاں، اڑ جاتے ہیں شبنم صفت

باقی نہیں رہتا نشاں

دنیا نے گو چھوڑا مگر خدمت میں ہے پنچر ابھی
دیتی ہے پہرا رات بھر، تربت پہ اسکی چاندنی
وہ بیگم زہرہ جبیں، مرقد سے باہر آن کر
اور لیکے مشعل ماہ کی، جاتی ہے جانب شاہ کی
حالت نہ پوچھو راہ کی، آنسو نکلتے جاتے ہیں
اور پھول کھلتے جاتے ہیں، جب بچھڑے ملتے جاتے ہیں

ہوتا غضب کا ہے سماں

اور جب اندھیری رات ہو، تربت ہی سب کو بھاتی ہے
شبنم کہیں آ جاتی ہے، موتی کا سہرا لاتی ہے
دیتا ہے جگنو ٹمٹما، گورِ غریباں پر دیا
شاخیں بڑھا کر ہاتھ کو، پڑھتی ہیں گویا فاتحا
پتے سِتک رہجاتے ہیں، آتی ہے جب ٹھنڈی ہوا
حیرت کا بھی دھڑکے ہے دل، ہاں دیکھ کر ایسا سماں
عبرت نگاہی چاہئے، انجام ہے یہ بیگماں
گو اس میں ہو شاہِ جہاں یا بادشاہِ این و آں

ہوتا ہے تربت میں نہاں

صریرِ کلک سے کیوں کر ادا ہو داستاں میری
یہ نے لائے کہاں سے دردِ دل میرا زباں میری
میں آوازِ جرس ہوں ہر گھڑی فریاد کرتا ہوں
جگا دے کارواں کو خواب سے شاید فغاں میری
تغافلہائے ساقی کا گلہ کیجے تو کس منہ سے
گرا دی ایک لغزش سے شرابِ ارغواں میری
میں حسنِ معنیِ صرفِ انا الحق کی نزاکت ہوں
نہیں سمجھا نہیں سمجھا حقیقت کو جہاں میری
سبق لیتا ہوں استادِ ازل سے میں فصاحت کا
نوائے طائرِ سدرہ ہے یا طرزِ بیاں میری
میں حیرت بھی ہوں آئینہ بھی ہوں محوِ تماشا بھی
شرر بھی، سوزِ دل بھی طور بھی برقِ تجلی بھی

دل

دل ۔ شیخ ممتاز علی ابن شیخ شجاعت علی ضلع بارہ بنکی کچھ دن آپکو حضرت اسیر سے تلمذ رہا ہے پھر منشی فضل رسول خان واسطی اور جناب قدر بلگرامی سے مشورہ کرتے رہے تعلقہ داری معقول ہے میرانہ بسر کرتے ہیں سنہ ۱۹۰۰ء ۵۶ برس کی عمر تھی

الاماں اسکی ڈھٹائی کچھ کہی جاتی نہیں
چاہنے والوں سے بھی وہ آنکھ شرماتی نہیں

اے کارواں وہ وقتِ طلوعِ سحر ہوا
طیار آفتاب اُٹھائے سپر ہوا
پرچم بلند صبح کا باکروفر ہوا
کیا شہسوار تیز عناں ہمسفر ہوا
ہمراہِ آفتاب درخشاں بڑھے چلو!

ہمت ہو جنکے پاس کریں صبر کس طرح
ہو طبع آتشیں پہ روا جبر کس طرح
اِس رہگذر میں کھود لیں وہ قبر کس طرح
اُٹھیں نہ ابخرے تو بنے ابر کس طرح
جوں دودِ آب اُٹھ کے مرجاں بڑھے چلو!

چرخ و نجوم و مشتری و زہرہ و قمر
اپنی زمیں سمجھتے تھے ساکن جسے بشر
سب اپنی اپنی راہ میں بڑھتے ہیں سال بھر
کہتے ہیں وہ بھی چلتی ہے اپنے محیط پر
تم بھی بشکلِ گیتی دوراں بڑھے چلو!

نورجہاں کے مرقد پر جو راوی کے کنارے کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے دو حرف عبرت کہے ہیں

ہاں ای لبِ راوی بتا۔ کچھ رفتگاں کا ماجرا
کل تجھ پہ جن کا راج تھا۔ انجام اُنکا کیا ہوا؟
ہے اب کہاں نورجہاں حورجہاں عصمت کی جان
وہ بلبل شیریں زباں۔ وہ قمری ہندوستاں
تیرے کنارے ہی پڑا ٹوٹا سا جس کا آشیاں
عبرت نشاں، عبرت نشاں،

شوکت تھی جسکی پاسباں۔ چاکر سے تھے جاہ و حشم
تھی بحر و بر کی سب سپہ۔ حاضر لیئے تیغ دودم
خیل و خدم ناز و نعم، رخت و خیم طبل و علم
افسوس رکھے رہ گئے، خود چلدیئے سوئے عدم
عالم میں ہے کسکو بقا؟ نامِ بقا کسنے لیا
قصرِ فنا ہے آسماں

آئی کہاں سے موت تو، ایوانِ شاہی میں بھلا
کیا پاسباں حاضر نہ تھے، جو روکتے تیرا گذر
ہاں پر تری پرواز کا، آیا نہیں اُن کو نظر
یوں کھینچ کر لیجاتی ہے، انساں سے اسکی روح کو
اُڑ جاتی ہے جیسے مگس، گل سے عسل کو کھینچ کر
یا ہنس ہو جیسے ہوا ڈنٹھل سے ریشہ کھینچ کر
رہتا ہے باقی بر زمیں۔ افسردہ گل بے رنگ بیں
بے جان جسمِ ناتواں
تضحیک چرخِ پر جفا، دیکھو عیاں ہے برملا
ہے جس جگہ وہ مہ لقا، جالا ہی مکڑی نے بنا

نوکِ خامہ شوق سے منقارِ بُلبل بن گئی	ہے صریرِ خامہ گرمِ لذتِ گفتار آج
نرگسِ مخمور کا ساغر بنانا چاہیئے	تاکہ محفل ہووے مستِ شربتِ دیدار آج
دیدۂ احباب روشن ہیں ستاروں کی طرح	ہوگئی ہے چشمِ اعدا کی مگر بیمار آج
کیا عجب فرصت کے باعث گرمِ رقص نا ہو	لولیٔ گردونگی صورت چرخِ کجرفتار آج
گو نہاں آنکھوں سے وہ دو تین سالوں تک رہے	مل گیا آخر کو خط دیدہ آخر کار آج

حمدِ باری

وہ خالق سزاوارِ تحمید ہے	صریرِ قلم جسکی تحمید ہے
قلم سے ہوئے جسکے سب آشکار	جہاں کے نگارش کدہ کی بہار
اُسی سے عیاں نقش سارے ہوئے	جو چھڑکا قلم تو ستارے ہوئے
یہ سورج دیا جو خدائی کا ہے	یہ دھبا سا اک روشنائی کا ہے
یہ جاذب کا کاغذ ہے یا آسماں	یہ مشقِ شکستہ ہے یا کہکشاں
یہ قوسِ قزح جو نمودار ہے	یہ آدھا سا اک خطِ پرکار ہے
نہ کیوں اُسکے کاموں میں ہو عقل دنگ	ہیں اک خط کے اندر بھرے ہفت رنگ
درخشاں نہیں چرخ پر ماہتاب	کھلی سورۂ نور کی ہے کتاب
شعاعیں ہیں مسطر لگائے ہوئے	طلا کار جدول بنائے ہوئے
کریں تاکہ قدرت کو اُسکی رقم	ہیں پتے ورق اور شاخیں قلم
نظر کیجئے سطحِ تالاب پر	لکھی نظم ہے صفحۂ آب پر
جو جاری کوئی باغ میں نہر ہے	نوا اک شعر گویا ہر اک لہر ہے
سُنو شورِ قمری فصاحت ہے یہ	قدِ سرو دیکھو بلاغت ہے یہ
جو نور اُسنے چشمِ بشر میں دیا	بُتِ خاک کو چرخ پیما کیا
عجب اُسکی ہر شے بنائی ہوئی	ہے تل میں خدائی سمائی ہوئی
ترے مُنہ میں باقی ہے جبتک زباں	کر اے دل تو تحمید خلاق جاں

جو فدا اوروں پہ ہو کیونکر نہ قدر اُسکی کریں ٭ چاہئے بلبل کو پہناویں گلوں کا ہار آج ٭

سنبھل اے دل نہ وصلِ یار کی شادی سے مر جانا	بُرا ہوتا ہے ہر اک بات کا حد سے گذر جانا
تری فرقت کا رنج و غم اُٹھایا تا دمِ آخر	نشاطِ وصل کیا شے ہے نہ ہنسے عمر بھر جانا
جس کے سبب یگانہ و بیگانہ چھٹ گیا۔	افسوس پھر بھی مجھ سے وہ جانانہ چھُٹ گیا
رہتا ہے وحشی ترا اُس وادیٔ پر ہول میں	رُوحِ مجنوں کانپتی ہے جو بیاباں دیکھ کر
اُن پہ بھی جنگل کی تصویریں نظر آنے لگیں	یہ بڑھی وحشت درو دیوارِ زنداں دیکھ کر
ہونگے محوِ شادی و غم وہ ہماری لاش پر	ہنستے جائینگے کف افسوس ملتے جائینگے

دِل

دل۔ جناب مرزا بہادر محمد جعفر علی خاں خلف اکبر نواب مرزا محمد عباس علی خاں بہادر جگر مرحوم سابق ڈپٹی کمشنر و رئیس اعظم و جاگیردار لکھنؤ آبائی ریاست کے علاوہ فن سخن بھی میراث ملا ہے، تین پینتس ۳۵ برس کی عمر اور ذکی و طباع نوجوان ہیں بہنگام ترتیب تذکرہ حالات اور کلام منگائے مگر جواب آنیکے باوصف مطلب برآری نہیں ہوئی

تیر نگاہِ ناز ہوئے دونوں کارگر	اِک دل میں چُبھ گیا ہی مرے اِک جگر میں ہی
صبح شبِ وصال ہے یا صبحِ حشر ہے	ای دل کچھ آج اور ہی رنگ اس سحر میں ہی

دل

دل۔ خواجہ دل محمد ایم اے ابن خواجہ نظام الدین مولد و مسکن لاہور تاریخ ولادت ۹ فروری ۱۸۷۸ء علوم عربیہ اور تعلیم رائج الوقت حاصل کر کے ایک کامیاب طالبعلمانہ زندگی کے بعد ۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے امتحان ایم اے مضمون ریاضیات میں پاس کیا اور اُس وقت سے اسلامیہ کالج لاہور میں سینیر پروفیسر ریاضیات کی خدمات انجام دیرہے ہیں آپ کی طبیعت کو ادب اور فلسفہ کی طرف شروع ہی سے ایک لگاؤ ہے، اور شعر و اشعار کی طرف میلان لڑکپن کے زمانے سے ہی، غزل بہت کم لکھتے ہیں، نیچرل مضامین اور قومی یا ملکی نظمیں زیادہ تر لکھی ہیں، شعر و اشعار کے متعلق کسی خاص استاد سے تلمذ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ زور طبیعت سے خود ہی جو آیا لکھا ہے۔ نمونۃً تھوڑا سا کلام ہدیۂ ناظرین کرام ہے

لذتِ دیدار سے مجلس ہی سب سرشار آج	عکس مے سے کم نہیں ہی عکس روئے یار آج

عجب ہے یہ ہمارا چلبلا دِل　　جسے دیکھا اُسی کا ہو گیا دل

مست و مدہوش و دیوانہ تمھارے پیارے　　پھرتے ہیں دشت میں کہتے ہوئے پیارے پیارے
قتل کیوں کرتا ہے بیجرم و خطا تو ہمکو　　ہم تو پہلے ہی سے ہیں عشق کے مارے پیارے

دل　**دل**۔ بابو سید احمد دل جعفری ساکن لاہور، کمالِ دہلی سے کلام نقل ہوا منشی وجاہت حسین وجاہت کے شاگرد ہیں ؛

عمر گذری ہے آہ و زاری میں　　اُسکے دِل پر اثر ذرا نہ ہوا
چاہنے والے تیرے ہیں لاکھوں　　سچ یہ ہے دِل سا دوسرا نہ ہوا

تعریف کیا کروں تری چشم سیاہ کی　　بے چین کر دیا اُسے جسپر نگاہ کی

دل　**دل** منشی محمد علی حسین خان دل، نوجوان، خوشنخو، استعدادِ علم معقول، نوشت و خواند میں مایقری محاورت رکھتے ہیں، حضرت ظہیر کے شاگرد رشید، صاحبزادہ احمد سعید خان عاشق کے شاگرد ہیں۔ یہ چند شعر اُنکے طبعزاد ہیں۔

دشمن سے ملو شوق سے اچھا کوئی دن اور　　تم دیکھو ذرا اس کا تماشا کوئی دن اور
بیماری اُلفت سے میں ناحق ہوا اچھا　　آتا تو عیادت کو مسیحا کوئی دن اور
روکا ہے دِل زار کو یہ دیکے تسلی　　کم بخت ذرا ٹھہر خدا را کوئی دن اور
وہ غیر تھا چھوڑا اُسے اچھا کیا لیکن　　اِس دل پہ تو رکھنا تھا اجارہ کوئی دن اور

دل　**دل** منشی سید علی حیدر کنتوری۔ لکھنؤ میں بھی اکثر رہنے کا اتفاق ہوتا ہے نوجوان شخص ہیں آجکل کے موزوں طبع خوش فکر کہنے والوں میں ہیں اور معیار کی کمیٹی کی ہم طرح غزلیں کہتے ہیں جو کلام بروقت نظر ثانی ہاتھ لگا اُس کا انتخاب تحریر میں آیا ؛

سب کہتے ہیں گو کعبہ کو یہ خانۂ حق ہے　　اللہ پہ اے دل کوئی منزل نہیں رکھتا
حشر کے ہونے سے منظور ہے دیدار ترا　　کسکو منظور ہے انصاف کا خواہاں ہونا
جوش وحشت کی خبر دیتا ہے دیوانوں کو　　آپ سے آپ مرا چاک گریباں ہونا

کہتے ہیں چھپایا ہے مرا ناوکِ مژگاں
دل دیکھ کے وہ زخمِ جگر دیکھ رہے ہیں

دیکھو فریبِ زخمیٔ تیغِ نگاہ کا
قاتل سے کہہ رہا ہے کہ میں نیم جاں نہیں

مجھسے کہاں چھپائیں گے دشمن کی چاہ کو
جو بات اُنکے دلمیں ہے میری نظر میں ہے

کیا دیکھیں جامِ مے کیطرف ہم سے بادہ نوش
ساقی کی چشمِ مست ہماری نظر میں ہے

تنفر تجھکو کیا ہے مے سے زاہد
ہمیں بھی ایسی ہی نفرت کبھی تھی

ملا کے آنکھ جو اُس بت سے گفتگو کرتے
جنابِ خضر مسیحا کی جستجو کرتے

خرامِ ناز کا انداز یوں دکھانا تھا
کہ دل کے داغ بھی مٹنے کی آرزو کرتے

اُسے قلق ہے مرا حالِ غیر سن سُن کر
یہ وقت تھا کہ کوئی فکرِ چارہ جو کرتے

نہیں علاج کے قابل مریضِ دردِ فراق
یہ سچ سہی مگر اپنی سی چارہ جو کرتے

بڑے ہیں نیک بڑے پاکباز حضرتِ دل
وہ جا رہے ہیں حسینوں سے گفتگو کرتے

خون کی ہر بوند میں جوش آجکل اک دل کا ہے
اِس بھروسہ پر ارادہ کوچۂ قاتل کا ہے

پاس رہکر بے تکلف ساتھ رہکر یہ حجاب
میرے اُنکے فاصلہ گویا کئی منزل کا ہے

حسرتِ وصل اب کہاں باقی ہے بس یہ آرزو
کاش وہ کہدیں کہ تو مختار اپنے دل کا ہے

پیچھے پیچھے آرہی ہے ہائے ظالم کی صدا
آگے آگے اک جنازہ حسرتِ بسمل کا ہے

حضرتِ دل اک نیا سر ہر قدم پر چاہیئے
تشنۂ خوں ذرہ ذرہ کوچۂ قاتل کا ہے

دل

دل۔ سید احمد اللہ حیدرآبادی مسکن۔ مولانا بیدل سہارنپوری کے شاگرد ہیں ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے اور اُس زمانہ میں نومشق تھے۔ یہ کلام کا انتخاب ہے۔

وہ سر نہیں جس میں کہ ہو سودا کسی کا
وہ دل نہیں جو دل نہ ہو دیوانہ کسی کا

جب دمِ قتل کہا جلوہ دکھادو تو کہا
وعدۂ قتل تھا کچھ وعدۂ دیدار نہ تھا

خنجر چلا کے حلق پہ کہتے ہیں ناز سے
دیکھا نتیجہ تم نے حسینوں کی چاہ کا

مقتل میں رنگ لائی آخر میری خموشی
ہر قطرہ خونِ دل کا اک شرح مدعا تھا

محمل نشیں کے دلمیں چبھتے تھے خارِ صحرا
پیش نگاہ جبتک قیس برہنہ پا تھا

رنگ لایا ہے یہ ضبطِ الفتِ گیسوئے دوست
آخر اپنے پیرہن سے پھوٹ نکلی بوئے دوست

رہنما کی کیا ضرورت عشق کامل چاہیئے
دل جہاں تڑپے سمجھ لینا یہی ہے کوئے دوست

بیخودی میں کچھ نہیں معلوم کس عالم میں ہوں
ڈھونڈتی پھرتی ہی مجھکو نکہتِ گیسوئے دوست

طالع بیدار کیا کہنا خوشی ہے اور ہم
صبح کو اُٹھکر ہمیشہ دیکھتے ہیں روئے دوست

خیر کرنا آج یارب کیوں ہے دلکو اضطراب
گو وہی ہم ہیں وہی گھر ہے وُہی پہلوئے دوست

تھک کے جب بیٹھے تو یہ کہکر تلاشِ دوست میں
اے دلِ حسرت زدہ وہ سامنے ہے کوئے دوست

یوں مٹے گا رنج فرقت کاٹ لیں ہم خود گلا
حضرتِ دل کون ہو منت کشِ بازوئے دوست

تن بر سرِ زمیں ہے دماغ آسمان پر
یعنی سرِ نیاز ہے اُس آستان پر

اقرار وصل اور پھر اُنکی زبان پر
سو جان سے نثار ہیں اپنے بیان پر

اقرار وصل کر کے مکرنے سے فائدہ
ہاں ہاں وہی کہو جو ابھی تھا زبان پر

ساقی کی چشم مست نے بیہوش کر دیا
بینا خباب شیخ چلے آسمان پر

وعدہ خلاف، عہد شکن کون وہ کہ ہم
اچھا یہ فیصلہ ہے اُنھیں کی زبان پر

کمسن ہیں کیا ہو اُنکو میری حسرتوں کا پاس
انکارِ وصل کھیل رہا ہے زبان پر

ساقی نہیں کو تشنہ لبی کا گلہ رہا
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں تیری زبان پر

اُس بت کے بام تک جو پہنچتے تو لطف تھا
نالے مرے گئے تو کہاں آسمان پر

اے دل یہ آپ ہی کا جگر ہے کہ عشق میں
صدمے ہزار جھیل لیئے ایک جان پر

اُنکی آرایش سے رنگِ بیخودی پائینگے ہم
آئینہ دیکھیں گے وہ تصویر بن جائینگے ہم

اُنکا زانو زیرِ سر، پھر چارہ سازی کا خیال
ہوش میں آ چارہ گر اب ہوش میں آئینگے ہم

مجکو یہ غم سر نہیں تو عشق کا سودا نہیں
اُنکو یہ افسوس اب کسکی قسم کھائینگے ہم

بظاہر نہیں تو کہیں حضرت امیر کے تصرف کا نشان اِنکے کلام میں نظر نہیں آتا- غالباً ذاتی مطالعہ دواوین اساتذہ، فطری ذکاوت اور قابلیت اِنکے مذاقِ شاعری کے ممدو معاون ہوئے، ہر شعر پُر لطف اور بامزا سنجیدگی اور متانت سے معمور رہے۔

ہم اور سنگِ در ہے کسی دلنواز کا　　اللہ رے عروج جبینِ نیاز کا
کیا کیا کیے سلوک پتنگوں سے شمع نے　　ایک ڈھیر تھا سحر کو شہیدانِ ناز کا
جس حال میں پڑا ہوں یونہیں کاش چھوڑ دے　　مجھ پر بڑا کرم ہو میرے چارہ ساز کا
عاشق کی آہ برقِ تجلی سے کم نہیں　　پردہ کہیں اُلٹ نہ دے اخفار راز کا
جب دل میں دردِ عشق اُٹھا ہم اچھل پڑے　　سمجھے کہ یہ کرم ہے کسی دلنواز کا
پہنچے تڑپ کے حضرتِ دِل کوئے یار تک　　دردِ جگر نے کام کیا چارہ ساز کا

بیٹھا ہے یہاں دل کو دو عالم سے اُٹھا کے　　اب در سے ترے عاشقِ مضطر نہ اُٹھے گا

زور پر ہے ترا اُبھرا ہوا جوبن کیسا　　دب گیا اُٹھتی جوانی سے لڑکپن کیسا
پردۂ چشم میں چھپی ہوئی بیٹھی ہے حیا　　کھیلتا ہی تری شوخی سے لڑکپن کیسا
اپنی قسمت ہی جو برگشتہ تو ای حضرتِ دل　　دوست بھی ہمکو بُرا کہتے ہیں دشمن کیسا

کیا کہوں کس آرزو کا خون ہو کر رہ گیا　　دل کی دل ہی میں رہی جب کھچکے خنجر رہگیا
نارسائی کا سبب کیا ہی؟ یہی شوقِ طلب　　بڑھ گئے ہم اسقدر آگے کہ رہبر رہگیا
منزلِ مقصود پر پہنچا وہی آشفتہ حال　　آستانِ یار پر جو کھا کے ٹھوکر رہگیا
دِل بھی مِٹ جاتا تمنائیں اگر مٹنے کو تھیں　　رہنے والا کون ہے کسکے لئے گھر رہگیا
جی ڈوب گیا جب یہ حقیقت ہوئی ظاہر　　جس بحر میں کشتی ہے وہ ساحل نہیں رکھتا
کہوں کیا حال ای ہمدم شبِ غم کی مصیبت کا　　یہ عالم تھا کہ اب نکلا، نہ نکلا پھر بھی دم میرا
مگر جمعیتِ خاطر ہے آرایش سے وابستہ　　کھُلے جب انکے گیسو کھُل گیا سارا بھرم میرا
شامِ شبِ جُدائی جو تھا قلق فزا تھا　　تسکین دینے والا اِک دردِ لا دوا تھا

ای ہمتِ مردانہ قدم میں نہو لغزش
مجروح ہوا، خستہ ہُوا، پِس گیا، آخر

ای ابروے خمدار پھر اک تیغِ نگاہ اُور
دِل اس سے زیادہ تھا سزاوار سزا اُور

مسیحا کلمہ گو جسکے ہیں وہ گفتار کیسی ہے
قیامت جسکی وارفتہ ہی، وہ رفتار کیسی ہے

شہیدِ غمزہ و ناز و ادا واقف نہ تھا پہلے
کہ خنجر کیا ہے، کیسا تیر ہے، تلوار کیسی ہے

پریشاں زلف وا بندِ قبا مخمور ہیں آنکھیں
کہاں سے آئے ہو، لغزش دمِ رفتار کیسی ہے

بھروسے تیری رحمت کے، سہارے تیری بخشش کے
میرے جرم گنہ کی دھوم اے غفار کیسی ہے

تمہاری نرگسِ بیمار تو عینِ شفا ٹھیری
مسیحائی کا دعوی اور خود بیمار کیسی ہے

سنبھل جاؤ کہیں اے حضرتِ دل راہ پر آؤ
یہ رسوائی سرِ ہر کوچہ و بازار کیسی ہے

تڑپتے ہوئے چھوڑ کر غمزدوں کو
کس آرام سے ہو گئے سونے والے

غم و، حسرت و، رنج، یاس و، تمنّا
مری لاش پر رو گئے رونے والے

قرار و توانائی، تاب و، طاقت
جُدا ہم سے سب ہو گئے ہونیوالے

دل سے وصلِ جاناں کی آرزو نہیں جاتی
خاک ہو گئے لیکن جستجو نہیں جاتی

دل

دل ۔ حکیم ضمیر حسن خان شاہجہانپوری۔ قوم کے پٹھان اور شاہ قاسم سلیمان کی اولاد میں ہیں، اگرچہ امیر مینائی کے شاگرد ہیں مگر خود اُساتذہ دہلی کے طرز تغزّل کے پیرو ہیں جس میں درد و اثر طرزِ بیان کی نفاست کے ساتھ شاعری کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ عربی فارسی کی استعداد معقول ہے، آجکل طبابت کا شغلہ رہتا ہے اور کچھ زمینداری بھی ہے، دِلی جذبات کے اظہار کو شاعری کا حسن سمجھتے ہیں ناول "دردِ دل" "دلسوز" آپکی تصنیف سے ہیں نظرِ ثانی کے وقت بھی کچھ کلام موصول ہوا وہ بھی سابقہ انتخاب میں شامل کر کے درجِ تذکرہ کیا گیا۔ کلام کے ملاحظہ سے صاف مترشح ہی کہ فی الواقع اِنکا دعوی سچا ہے۔ شاعری کا سچا مذاق اِنکے ہر ایک شعر سے ظاہر ہے، اور کلام میں دلاویزی کے ساتھ بندش کی چستی، الفاظ کی برجستگی، خیالات کی نفاست اور بلندی قابلِ ستایش ہی،

متفرق کلام دستیاب ہوا اُس کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

پردہ اُٹھاکے تو نے ادھر کو گذر کیا	عالَم کے دِل میں تیری محبت نے گھر کیا
نالہ و، شور و، فغاں، بیطاقتی ہمراہ ہیں	ہمتو کوچے سے ترے نکلے بڑے سامان لئے
اور روٹھ کے ہمسے جایئو لالے	مت رُوٹھ ہمیں گلے لگالے
دِل چاہتا ہے بولیئے ہرگز نہ یار سے	پر بس نہیں چلے ہے دِلِ بیقرار سے

دل ۔زور آور خاں باشندۂ علی گڈھ، تذکرہ مرسلہ قاضی محمد خلیل سے ایک شعر قابلِ انتخاب نظر آیا۔ درج ذیل ہے، حال باوجود تلاش دستیاب نہوا۔ دل

ساقی نے جو پلایا مجھے میں نے پی لیا	واعظ ۔ ب مجھے خبر ہے حرام و حلال کی

دل ۔عالیجناب والاخطاب اشرف الحکما رنواب لقمان الدولہ فلاطون جنگ محمد حیدر جان دِل طبیب خاص و مقرب باختصاص اعلیحضرت نظام الملک آصفجاہ والی دکن حضرت فصیح الملک بہادر داغ دہلوی کے تلمیذ رشید ہیں، انگریزی کا علم بھی اچھا ہے ڈاکٹری وجراحی سے اچھی طرح ماہر ہیں، خاص حیدر آباد کے باشندے ہیں، عمر ۵۰ برس کے قریب اور سٹاف سرجن ہیں، انکے والد حکیم محمد شرف صاحب حیدر آباد کے نامی طبیبوں میں تھے، مثنوی کا وعظ بہت اچھا بیان کرتے ہیں، صوفی مشرب ہیں، شعر وسخن کا بھی شوق ہے اور اس میں نواب فصیح الملک داغ مرحوم سے فیض پایا ہے۔ دل

مثلِ نقشِ پا۔ برباد کیوں نشاں ہوتا	ہم نہ خاک میں ملتے، تو جو مہرباں ہوتا
افسانۂ گل قصۂ بلبل نہ سُنا اُور	اٹھکھیلیاں کچھ اپنی دکھا بادِ صبا اور
ای شعلۂ سوزانِ دروں جی نہ جلا اُور	ای رنج و غم و دردِ نہاں بس نہ ستا اور
اے گردنِ تسلیم و رضا سر کو جھکا اُور	اے تیغِ ستمگار پھر ایک وار لگا اور
اُس شوخ کی مہندی کا ہوا رنگ دوبالا	خونِ دلِ عشاق جو ہاتھوں میں ملا اُور
ای خضر نہ ہادی ہو مرے راہ لو اپنی	اِس منزلِ عشاق کا ہے راہ نما اور

ہو بھلا تیرا شبِ فرقت اپنی غم ہے تو	جز ترے دم کے ہمارا مہرباں کوئی نہیں
ناتواں پاکر مجھے سب قافلہ راہی ہوا	ساتھ دے بیکس کا ایسا کارواں کوئی نہیں
حشر میں ہوگا مزا جب میں کہونگا اُن سے	کھینچے اب کچھ یہ ستم دیدہ بھی فریاد کرے
دل میں آنکھوں میں تجھے جلوہ نما دیکھا ہی	پھر بھی یہ شوق ہی کہتا ہوں کہاں دیکھا ہی
نہ کلیسا پہ ہی موقوف نہ کچھ کعبہ پر	ہر جگہ ہمنے تجھے جانِ جہاں دیکھا ہی

دقیق

دقیق - جناب میر واجد حسین صاحب وکیل ہائی کورٹ سرکار عالی نظامِ دکن شاید حضرت داغ سے اصلاح لیا کرتے تھے ۱۹۰۰ء کے مطبوعہ رسالوں سے کلام کا انتخاب حاضر ہی

حسرت ہی یہی زانوئے دِلدار پہ نکلے	لِلّٰہ ٹھہر جا کہیں اے جانِ حزیں اَور
بگڑے ہی سدا رہتے ہیں سفاک کے تیور	دل لیجکا رہتا ہی مگر در پئے کیں اَور
آلودہ خوں ہو نہ کہیں آپکا دامن	جلدی سے لگا دیجئے اک ہاتھ کہیں اَور
گھبرائی ہوئی باتوں سے ہوتا ہی ظاہر	جاتے تھے کہیں اور چلے آئے کہیں اَور
یہ ظرف ہمارا ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے	ورنہ تری باتوں سے تو ہی دلکو یقیں اَور

دل

دل - شیخ محمد عابد متوطنِ عظیم آباد، اپنے زمانہ کے بے مثل اور بے نظیر عالم تھے، شیخ محمد روشن جوشش تخلص آپکے بڑے بھائی مشہور شاعر تھے، صاحب سراپا سخن کا قول ہے کہ آپ جسونت رائے ناگر کی اولاد میں تھے، غرضکہ آپ سنجیدہ اطوار، حمیدہ خصال اور طریقۂ یکرنگی میں بے مثل سمجھے جاتے تھے، یہ آپکے اشعار ہیں +

تیری زلفوں سے بہت دِن ہی تقصیر ہوئی	نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہگاری دل
نالے ہی سدا بھر بھر دن عمر کے بھرتے ہیں	ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
جُوں آئینہ بہ ستم رسیدہ	رہتا ہے مدام آب دیدہ
تمہارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی	بزنگِ نقشِ قدم ہمنے بھی زمیں پکڑی

دل

دل - منشی بینی پرشاد دل کالیستھہ متوطنِ عظیم آباد پٹنہ - مدت ہوئی کہ انتقال کیا - کچھ

ایسا ہی ہوتا ہے جب دل کہیں آ جاتا ہے

در پردہ ستم ہم پہ وہ کر جاتے ہیں کیسے	گر کیجے گلہ صاف مکر جاتے ہیں کیسے
جب ہم سے موافق نہ ہو تقدیر ہماری	کیا عقدہ کشائی کرے تدبیر ہماری

دریا **دریا**۔ پنڈت رتن ناتھ دریا خلف پنڈت امر ناتھ شعلہ جو سبحان علی خان کمبوہ کے دیوان تھے۔ باشندہ لکھنؤ اور شاگرد میر اوسط علی رشک ہیں، زبان فارسی اور دری ژنار کی تحصیل عالمانہ درجے کی تھی اور بڑے زبردست ادیب اور محقق زبان تھے دس بارہ برس ہوئے پیرانہ سالی میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا، یہ چند شعر نتائج افکار کے ہاتھ آئے تبرکاً درج تذکرہ کئے گئے۔

ہے گوشِ گل کی یا کہ چراغِ قمر کی لو	اللہ جانے دلکو لگی تھی کدھر کی لو
دریا دلوں سے ڈرتے ہیں روشن ضمیر بھی	تھرائے کیوں نہ پانی میں شمع قمر کی لو
دردانِ زخم پانی چراتے ہیں کیوں عبث	کم ہوویگی نہ آتشِ داغِ جگر کی لو
حرص کہتے ہیں کسے خواہش دنیا کیا ہے	بے اجازت نہ مرے گھر میں ہوا بھی آئے

دریا **دریا**۔ منشی سید محمد عباس ہیڈ کلرک کچہری کورٹ آف وارڈز متھرا، آجکل کے شعرا میں ہیں باوجود مکرر تحریروں کے حالات بہم نہ پہنچے ناچار کچھ اشعار درج کرنے پر اکتفا کیا گیا۔

کعبہ و دیر میں سنتے تھے مکان ہے اُسکا	پائی اِن سب سے مگر منزلِ جانانہ جُدا
دیکھئے کھینچتا ہے کون مجھے اے دریا	درِ مسجد ہے جُدا اور درِ میخانہ جُدا
میں تو اس طرزِ اس انداز کا دیوانہ ہوں	زلف بکھری ہے الگ چال ہے مستانہ جُدا
اللہ اللہ یہ ہے اعجاز خیالِ روی دوست	آپ اپنے پیرہن سے آ رہی ہے بوئی دوست
ای خوشا قسمت نکلنے کو ہے اب ارمانِ قتل	حلق پر خنجر ہے سینہ ہے تہِ زانوئی دوست
بن گئے تصویرِ حیرت چشمِ حیراں دیکھ کر	خود پریشاں ہوگئے مجکو پریشاں دیکھکر
تو جفائیں اور کرلے کچھ دنوں پر میرے بعد	ظلم سہنے کو ترے ای آسمان کوئی نہیں

۳۵، ۳۶ سال کی عمر اور یہ کلام کا نمونہ ہے ✤

ہزاروں میں کوئی بہتر کوئی لاکھوں میں اچھا ہے	مری آنکھوں میں لیکن تو خدائی بھر میں اچھا ہے
جہاں میں گو ہر اک بُت کو مسیحائی کا دعویٰ ہے	کرے مردے کو جو زندہ اُسی کا نام عیسیٰ ہے
مجھی سے ہی لگاوٹ بھی مجھی سے ہے تنفر بھی	مری نظروں میں رہتے ہیں مری آنکھوں سے پردا ہے
کسیکو ایک کی ہو گی ہمیں دونوں سے ہے اُلفت	خدا کی یاد ہے دل میں بتوں کا سر میں سودا ہے
طبیعت کو جو خوش آئے وہی بہتر سے ہی بہتر	جو آنکھوں میں سما جائے وہی اچھے سے اچھا ہے

درویش — میر شاہ علی دہلوی آپ کو میر نظام الدین فخر شعرا سے تلمذ تھا، شاہ اللہ دیا کی اولاد میں تھے آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کر لی تھی۔ شاہ عالم ثانی کے آخر عہد میں بعالم ضعیفی انتقال کیا ✤

درویش کو مجنوں بھی لکھا کرتا تھا عرضی	اِس مملکت عشق میں اُستاد سمجھ کر
ایک شب بیٹھے تھے جس گھر میں کبھی یار سے مل	روز روتے ہیں وہاں کے در و دیوار سے مل

درویش — درویش علی نام ولد خدا بخش سہارنپور، مہدی علی خاں صاحب زکی کے تلامذہ میں ایک آزاد، شوریدہ سر، موزوں طبع شخص تھے، اور دنیوی کار و بار سے حد درجہ نفور، ریاست رامپور سے بصلۂ خدمتِ آبائی کچھ وظیفہ مقرر تھا اسی پر قناعت کر کے بیٹھک مکان مذکورہ کا دروازہ بند کر کے تنہائی میں بسر اوقات کرتے تھے اور میل جول سے حتی الوسع گریز کرتے تھے ۴۰ برس کے قریب گزرے چالیس سال کی عمر میں انتقال کیا، چند شعر بروقت ترتیب تذکرہ سہارنپور سے ایک مہربان نے بھیجے درج ذیل کیئے جاتے ہیں جن سے انکی خوش مذاقی کا کافی ثبوت ملتا ہے

پڑا جو سایۂ گیسو جھجک کے ساقی نے		یہ کہکے رکھدیا ساغر کہ ہے شراب میں سانپ
ہو کے قرباں میں کہا یار سے اے کافر کیش	بند	ہے یہ انصاف کہ ہیں لب پہ ہوں ہجر کے نیش
طاقت آہ بھی رکھتا نہیں اب یہ دل ریش		ہنس دیا سُنکے ستمگر نے کہا اے درویش

سنہ ۱۱۷۶ھ میں مرشدآباد میں انتقال کیا، میرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ میں انکا ذکر کیا ہے، اشعار کا انتخاب ہے، ایک ساقی نامہ اور دیوان انسے یادگار ہے۔

پڑی اُسکی خوبی کی ازبسکہ دھوم — لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم
ارے ساقی اے جانِ فصلِ بہار — یہی تھا ہمارا و تیرا قرار
ہمارے بسر نے کی یہ فصل تھی — فراموش کرنے کی یہ فصل تھی
فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار — نہ لاویگا مجھ سا کوئی روبکار
نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف — شگوفے کو آیا ہے مستی سے کف
چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک — کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک
ادا سے لہکنے کی تجھکو قسم — نشہ سے بہکنے کی تجھکو قسم
تجھے ناز مستی کی اپنے قسم — تجھے خود پرستی کی اپنی قسم
ارے بیوفا بے مروّت صنم — میں دیتا ہوں تجھکو ستم پر قسم
تجھے دخترِ رز کی حرمت کی سوں — تجھے مغبچوں کی شرافت کی سوں
تُجھے وعدہ کر بھول جانیکی سوں — تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں
جو تونے کیا ہے کو مجھ پر حرام — تو اتنا تو کر ظالموں کے امام
کہ تو سرکشی سے نہ کر پائمال — مرے خون کو اپنے اُو پر حلال
یقیں جانیو گر نہ ہو ایک آن — تری مہربانی کا مجھکو گمان
تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات — نکل جائے جی نااُمیدی کے ساتھ

دردی — **دردی** : مفتی محفوظ علی باشندۂ بدایوں، جناب کشفی سے تلمذ تھا ایک شعر تذکرۂ قلمی مرسلۂ شفیقی قاضی محمد خلیل سے اخذ کرکے درج کیا جاتا ہے۔

جب ہوگی تو ہوگی زندگانی — اب تو ہمیں موت بھی نہیں ہے

درس — **درس** : منشی مُنی لال باشندۂ شاہجہانپور، منشی احسان علی احسان مرحوم شاعر نامور شاہجہانپوری کے تلامذہ میں سے تھے، بریلی کے مشاعرہ میں میں نے انھیں دیکھا تھا

یہ کیا درد تجھپر مصیبت پڑی ہے	کہ دن رات نالہ ہے اور آہ ہے
نہ ملئے یار سے تو دلکو کب آرام ہوتا ہے	وگر ملئے تو مشکل ہے کہ وہ بدنام ہوتا ہے
فرصتِ زندگی بہت کم ہے	مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے
روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے	اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیئے	پردے تعینات کے جو تھے اُٹھا دیئے
کوئی بھی دوا اپنے تئیں راس نہیں ہے	جز وصل سو ملنے کی ہمیں آس نہیں ہے
آتشِ عشق جی جلاتی ہے	یہ بلا جان ہی پہ آتی ہے
اِن دنوں کچھ عجب ہے میرا حال	دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے
سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف	جسکے ہاتھ آئے جام سو جم ہے
درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم	وہی رونا ہے نت وہی غم ہے

درد

درد ۔ مسٹر عزیز الدین احمد صاحب بی ۔ اے ۔ رسالۂ معیار میں اپنا کلام شائع کراتے ہیں اِس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوا شعر ملاحظہ ہوں :۔

اُن سے مِل بیٹھنے کی دیر تھی جب مِل بیٹھے	ساری بگڑی ہوئی باتوں کو بنا کر اُٹھے
وہ جبیں سائی سے پایا جو مقدر میں نہ تھا	لوحِ قسمت کو ہم اُس در سے مٹا کر اُٹھے
دیکھو اے درد کہیں تم سے احبا نہ کہیں	ایسے آئے تھے کہ ہنستوں کو رُلا کر اُٹھے

درد مند

درد مند ۔ فقیہ صاحب نام، وطن آپکا دکن تھا، لیکن تربیت شاہجہاں آباد میں پائی تھی اور میرزا جانجاناں مظہر کی خدمت میں آکر آدابِ فقر کی ماہیت حاصل کی اور مرید بھی ہوئے، چند مدت عظیم آباد میں رہ کر نواب غلام حسین خان اور نواب اعظم خاں کے صاحبزادے کی رفاقت میں گذر اوقات کی، بعد ازیں پھر دلی گئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کرکے مرشد آباد تشریف لیگئے ۔ مرشد آباد آپ کا تشریف لیجانا نواب نوازش محمد خان شہامت جنگ نواب الہ وردی خان مہابت جنگ کے بھتیجے کی طلب کے باعث ہوا

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ

دل بھی تیرا ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

لے خبر تیغ یار کہتی ہے
باقی اس نیم جان میں کچھ ہے

مرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے
زباں تب تلک ہے تری گفتگو ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

ہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے
جس لیئے آئے تھے سو ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
چل سکے بس جب تلک ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے
یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے

درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے
جو سانس بھی نہ لے سکے وہ آہ کیا کرے

جی کی جی میں ہی رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اُس سے ملاقات نہ ہونے پائی

ہم نہ کہتے تھے ہو جو مت عاشق
پائی دل اپنی کچھ سزا تو نے

ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا کہیں کیا جی کو رو بیٹھے
بس اب اک ساتھ ہم دونوں جہاں سے ہاتھ دھو بیٹھے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
اپنا ہی دل ہے یہ کہ جہاں تو سما سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلاوے اگر تو بھلا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقش قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے

دشوار ہوتی ظالم تجکو بھی نیند آنی
لیکن سُنی نہ تو نے ٹک بھی مری کہانی

گرچہ بیزار تو ہے پر اُسے کچھ پیار بھی ہے
ساتھ انکار کے پردے میں کچھ اقرار بھی ہے

دل بھلا ایسے کو لے درد نہ کیونکر دیتے
ایک تو یار ہے اور تسپہ طرحدار بھی ہے

مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کیے
جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھکر کہیں

مژگانِ تر ہوں، یا رگِ جانِ بُریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کھینچے ہے دُور آپ کو میری فروتنی
اُفتادہ ہوں پہ سایۂ قدِّ کشیدہ ہوں

مرے دلکے شیشہ کو بیوفا تونے ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیا
مرے پاس تھا وہی ایک تھا یہ دکانِ شیشہ گراں نہیں

بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ
سب اہلِ قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں

عشوہ و ناز و کرشمہ ہیں سبھی جان بخش لیک
درد مرتا ہے کوئی اُسکی دوا کرتا نہیں

داد کو تو پہونچنا معلوم ہے
کوئی یاں فریاد سنتا ہی نہیں

ہر دم بتوں کی صورت رکھتا ہے دل نظر میں
ہوتی ہے بت پرستی ابتو خدا کے گھر میں

دل تو سمجھائے سمجھتا ہی نہیں
کہیئے سودا ہے تو سودا بھی نہیں

کہیں ہوئے ہیں سوال و جواب آنکھوں میں
یہ بے سبب نہیں ہمسے حجاب آنکھوں میں

نہیں شکوہ مجھے کچھ بیوفائی کا تری ہرگز
گِلہ تب ہو اگر تونے کسی سے بھی نباہی ہو

اپنے بندہ پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
یہ نہ آجائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو

اے درد یاں نہ دل کو کسی سے پھنسائیو
لگ چلیو سب سے یوں تو پہ دل مت لگائیو

مانع نہیں ہم وہ بتِ خودکام کہیں ہو
پر اس دلِ بیتاب کو آرام کہیں ہو

ہر چند تجھے صبر نہیں درد ولیکن
اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

تیری خوں آشامیاں مشہور ہیں اے تیغِ یار
ایک قطرہ چھوڑے تو پیوے ہمارا ہی لہو

اے درد بہت تونے ستایا ہمکو
بیدرد بہت تونے ستایا ہمکو

جاتی ہے مری جان تو راضی رہنا
لے درد بہت تونے ستایا ہمکو

جو جفا جو ہیں اُنہیں سنگدلی لازم ہے
کام تلوار کو رہتا ہے سدا سان کے ساتھ

نظر جب دل پہ کی دیکھا تو مسجودِ خلائق ہے
کوئی کعبہ سمجھتا ہے کوئی سمجھے ہے بتخانہ

کیا کہوں دل کا کسی سے قصۂ آوارگی
کوئی بھی بے ربط ہوتی ہے کہانی اسقدر

جان کو کیونہ دے لب تک نزع میں کب تک رہو
دشمنی مجھ سے نہ کر اے ناتوانی اسقدر

ہنس قبر پہ میری کھل کھلا کر
یہ پھول چڑھا کبھی تو آکر

خارِ مژہ پڑے ہیں مرے خاک میں ملے
اے دشت اپنے کیجیو داماں کی احتیاط

دل کے تئیں گرہ سے کبھی کھولتی نہیں
ہے زلف کو بھی اپنے پریشاں کی احتیاط

داغوں کی اپنے کیوں نہ کرے دردؔ پرورش
ہر باغباں کرے ہے گلستاں کی احتیاط

کیجے نہ قتل اہلِ وفا جتنے ہیں یہ سب
بارے کہیں ٹھکانے لگے جستجوئے تیغ

صیاد! اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو
ہے کس کو زندگی کی توقع بہار تک

لازم ہے گوشۂ شکنِ زلف میں تری
ظالم کوئی پڑا رہے مجھ سا شکستہ دل

ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا
ادھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی ادھر شبنم

اپنے ملنے سے منع مت کر
اس میں بے اختیار ہیں ہم

رباعی

اے دردؔ یہ دردجی کا کھونا معلوم
جوں لالہ جگر داغ سے دھونا معلوم
گلزارِ جہاں ہزار پھولے لیکن
میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

اس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں
پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

موت! کیا آکے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

دردؔ یاں دو ہی پیمانوں پہ قناعت کیجے
خانۂ چشم ہے یہ خانۂ خمار نہیں

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سرتا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

گذرا تھا بعدِ مدت وہ سامنے سے ہو کر ۔۔۔ اے کوہتی نالہ یہ وقت تھا گئی تھا؟

اُسنے ھفندا ابھی میرے نالے کو ۔۔۔ نہ سُنا ہوگا گر سُنا ہوگا
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم ۔۔۔ کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
قتل سے میرے وہ جو باز رہا ۔۔۔ کسی بدخواہ نے کہا ہوگا
دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں ۔۔۔ کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
دِل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا ۔۔۔ آنسوؤں میں کہیں بہا ہوگا

کسی سے کیا بیاں کیجے اس اپنے حال ابتر کا ۔۔۔ دِل اُسکے ہاتھ دے بیٹھے جسے جانا نہ پہچانا

بے طرح کچھ اُلجھ گیا تھا دِل ۔۔۔ بیوفائی نے تیری سُلجھایا
ہم تو کہتے تھے مُنہ نہ چڑھ اُسکے ۔۔۔ دردؔ کچھ عشق میں مزہ پایا

مَیں اپنا دردِ دل جا کر کہا جس پاس عالم ہیں ۔۔۔ بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا
گذروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں واں کے لوگ ۔۔۔ ہے کوئی دِن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

جان پہ کھیلا ہوں مَیں میرا جگر دیکھنا ۔۔۔ جی رہے یا نہ رہے مجکو اُدھر دیکھنا
گرچہ وہ خورشید رو ہے مرے سامنے ۔۔۔ تو بھی میسر نہیں بھر کے نظر دیکھنا
سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک ۔۔۔ اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا
ذکرِ وفا کیجئے اُس سے جو واقف نہ ہو ۔۔۔ کہتے یہ کس سے ہو تم ٹک اُدھر دیکھنا
نالۂ دل کا اثر دیکھ لیا دردؔ بس ۔۔۔ جی میں نہ رہ جائے یہ آہ بھی کر دیکھنا

رباعی

تبخانہ برہمن کا مکرر دیکھا ۔۔۔ کعبہ کو بھی شیخ کے مَیں اکثر دیکھا
دِل لگنے کی صورت نہ کہیں دیکھی ہائے ۔۔۔ جو کچھ دیکھا سو خاک پتھر دیکھا

سیرِ باغ و بوستاں تو ہے میسر ہر گھڑی ۔۔۔ آرہیے گاہے فقیروں کے بھی ویرانے کے بیچ
جو مزے ہیں مر گئے ہیں سو ہمسے پوچھا چاہئے ۔۔۔ کوئی جانے آہ کیا لذت ہے مر جانیکے بیچ

اسقدر تھا یا کرم یا ظلم رانی اسقدر ۔۔۔ مہربانی اسقدر نا مہربانی اسقدر

کتنے بندوں کو جان سے مارا — کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما — اِس طرف کو کبھو گذر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا — پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں تری حُسن کے شعلہ کے حضور — شمع کے مُنہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے — وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
ذکر میرا تو وہ کرتا تھا صریحاً لیکن — مَیں نے پُوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا
محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں — دِل نہ تھا کوئی کہ شیشہ کی طرح چُور نہ تھا

کیا جفا کے سوا ابھی کچھ اَور — اے ستمگار خوش نہیں آتا
درد ہمکو یہ رات دن تیرا — نالۂ زار خوش نہیں آتا
یک بیک نام لے اُٹھا میرا — جی میں کیا اُسکے آگیا ہوگا

تو اپنے دل سے غیر کی اُلفت نہ کھو سکا — مَیں چاہوں اَور کو تو یہ مجھ سے نہو سکا
جُوں شمع روتے روتے ہی گذری تمام عمر — تو بھی تو درد داغِ دِل اپنا نہ کھو سکا

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں — نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشتِ دِل میں ہو — درد منزل ایک تھی ٹک راہ کا ہی پھیر تھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
دِل کسی چشمِ مست کا سرشار ہو گیا — کِسکی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اُسکو بھی — جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

تم اوّل ہی آکر جو مجھ سے ملے تھے — نگاہوں میں جادو سا کچھ کر دیا تھا

تو ہی نہ اگر ملا کرے گا — عاشق پھر جی کے کیا کریگا

ہمنے چاہا بھی پر اُسکو جی سے آیا نہ گیا — وہاں سے جوں نقشِ قدم دِل تو اُٹھایا نہ گیا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہمنے کیا کیا نہ دیکھا

حجابِ رُخِ یار بھی آپ ہم ہیں
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

کیا مجھکو داغوں نے سروِ چراغاں
کبھو تُو نے آکر تماشا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جسکو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

سینہ و دِل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس! جی گھبرا گیا

تجھ سے ہمنے کچھ نہ دیکھا جز جفا
پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

پی گئی کِتنوں کا لوہو تیری یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا

کھُل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آ گیا

ہیں تو کچھ ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

فلک پر کون کہتا ہے گذر آہِ سحر کرنا
جہاں جی چاہے وہاں جا پر کسی دل میں اثر کرنا

مثلِ نگیں جو ہم سے ہوا کام رہگیا
ہم روسیاہ جاتے رہے نام رہگیا

یارب یہ دل ہے یا کوئی مہمان سرائے ہے
غم رہگیا کبھو۔ کبھو آرام رہگیا

ہم کب کے چل بسے تھے پر اے مژدۂ وصال
کچھ آج ہوتے ہوتے سرانجام رہگیا

مدت سے وہ تپاک تو موقوف ہو گئے
اب گاہ گاہ بوسہ بہ پیغام رہگیا

ساقی مری طرف بھی ٹک اُنکی نگاہ کر
لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہگیا

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تُو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تُو نے آنکھ بھر دیکھا

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا
تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا

میں جاتا ہوں دلکو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھکو دلاتا رہے گا

قدر و منزلت ہے انکی اور تصانیف ہیں۔ اِن کے والد خواجہ ناصر عندلیب بھی شاعر تھے۔ چنانچہ اُنکا بھی ایک مختصر دیوان اور رسالہ "نالۂ عندلیب" موجود ہے، اسی طرح درد کے چھوٹے بھائی سید محمد میر اثر جن کا ذکر خیر پہلے جلد میں آچکا ہے صاحب دیوان و مثنوی "خواب و خیال" تھے۔ خواجہ صاحب کی غزل عموماً سات یا نو شعر کی ہوتی تھی، مگر مضامین سب چھنے پھٹکے ہوئے، گویا تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے تھے، البتہ جیسا انکے ہمعصر شعرا میر تقی میر۔ سودا اور درد کے شاگرد رشید قائم کے ہاں بعض الفاظ۔ جاگہ نت، ٹک، اتنئیں، جیدھر، جواب متروک ہیں مستعمل ہوئے ہیں اِنکے کلام میں بھی وہ پائے جاتے ہیں، اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں، ہر عہد اور زمانہ کی زبان جداگانہ ہوتی آتی ہے۔ صفائی زبان، و سوز و گداز، و خوش اسلوبی محاورہ او مضمون آفرینی پر شیدا تھے، ۲۴ صفر سنہ ۱۱۹۹ ہجری یوم جمعہ کو انتقال کیا۔ کسی مرید نے تاریخ کہی "حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب"

مقدور کسے ہے ترے وصفوں کے رقم کا	حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
بستے ہیں ترے کوچہ میں سب شیخ و برہمن	آبادی تجھسے ہی تو گھر دیر و حرم کا
ہے خوف اگر جی میں تو ہی تیرے غضب کا	اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا
کبھی خوش بھی کیا ہے دِل کسی رندِ شرابی کا	بھڑ اٹھے مُنہ سے مُنہ ساقی ہمارا اور گلابی کا
اکسیر پر تہوس اتنا نہ ناز کرنا	ہے کیمیا سے بہتر دل کا گداز کرنا
ای آنسوؤ نہ آوے کچھ دلکی بات لب پر	لڑکے ہو تم کہیں مت افشار راز کرنا
ہم جانتے نہیں ہیں ای درد کیا ہے کعبہ	جیدھر ملے وہ ابرو اُدھر نماز کرنا
مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا	ہم سبھی مہمان تھے تو آپ ہی صاحبخانہ تھا
ہو گیا مہمان سرائے کثرتِ موہوم آہ	وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوتخانہ تھا
وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا
نجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا	برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

تھے۔ قدیم متانت اور تہذیب کی ایک مجسم تصویر تھے، یہ صبر و قناعت ہی کا کرشمہ تھا، کہ سودا میر، مصحفی، جرأت، انشا۔ حسرت، سوز، جیسے مشاہیر سلطنت کی تباہی اور رات دن کی غارتگری سے تنگ آکر تلاش روزگار میں دہلی کو خیرباد کہکے بلاد شرقیہ کو روانہ ہوئے۔ مگر انکے پائے استقلال نے جنبش نہ کی اور اپنی خانقاہ میں اسی طرح بیٹھے رہے دُنیاوی عزوجاہ کی طرف بھی التفات نہ کیا، اِس کا نتیجہ یہ تھا کہ تادمِ اخیر مرجع صغیر و کبیر رہے دربار شاہی سے کچھ تھوڑی سی جاگیر بزرگوں کی مقرر تھی اُسکی آمدنی اور نذر و نیاز سے بخوبی بسر اوقات ہوجاتی تھی، موسیقی میں چونکہ اچھی مہارت رکھتے تھے اِس لیئے بڑے بڑے گویئے اور کلاونت اپنی چیزیں بنظر صلاح و استفادہ سُنایا کرتے تھے، محرم میں مرثیہ اور سوزخوانی کی محفل ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب ہر مہینے کی ۲۔ اور ۲۴ تاریخ کو مشائخوں کی محفل کیا کرتے تھے، اور اُس میں اکثر اُمراء و بزرگ اپنا فخر سمجھ کر آتے تھے، حتیٰ کہ خود بادشاہ حضرت شاہ عالم ثانی کئی دفعہ تشریف فرما ہوئے، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت بلا اِطلاع چلے آیئے، اور چونکہ پاؤں میں درد تھا ضبط نہ کرسکے اور ذرا پاؤں پھیلا دیا، اب خواجہ صاحب کی نازک مزاجی دیکھیے کہ وہ اِس بےادبی کی متحمل نہ ہوسکی اور اُسی وقت بولے کہ "یہ امر فقیر کی داب محفل کے خلاف ہے" بادشاہ نے عذر کیا اور معافی چاہی، جسپر میر درد نے فرمایا کہ "اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چھوٹی بحروں میں جو شعر کہتے تھے لاجواب اور بےمثل ہوتا تھا، میر تقی میر کے رنگ میں رنگ ملا دیتے تھے بلکہ تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے انکا کلام زیادہ مؤثر اور دلاویز ہوتا تھا، تصنیف اور تالیف کا شوق بچپن سے رفیق تھا، چنانچہ اُردو دیوان کے علاوہ ایک مختصر فارسی دیوان بھی ہے، ان دونوں کے علاوہ رسالۂ اسرار الصلوٰۃ، واردات درد اُسکی شرح میں علم الکتاب ایک بڑا نسخہ تحریر کیا، جس میں ۱۱۱ متفرق رسالے ہیں۔ نالۂ درد، آہِ سرد، دردِ دل، سوزِ دل، شمع محفل، حرمتِ غنا، وغیرہ جن کی شائقین تصوف کی نگاہوں میں بڑی

دشتِ غربت میں جلائے خار و خس نے برگ و بر	منعموں کے واسطے ہے رونقِ کاشانہ شمع
بے گنہ کے سر قلم کرنے پہ ہے کتنا دلیر	ہو اگر حاکم تو لے گلگیر سے جرمانہ شمع
سر برہنہ مو پریشاں چشم گریاں سینہ چاک	رکھتی ہے سامانِ رنج و ماتمِ پروانہ شمع
معرکہ میں عشق کے کی سر سے طے راہ عدم	آفریں ثابت قدم تھی کس طرح مردانہ شمع
ناصحا دیکھ نہ غصہ سے سوئے طفل پلک	تیری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں مجھے پیارے ہیں
نہ ہے اس طرح سنگ آسیا ای چرخ گردش میں	نہ ہے یوں ساغر بادہ سدا اے چرخ گردش میں
یہ یوں تسبیح دست پارسا اے چرخ گردش میں	رہیگا نجمِ اختر تا کجا اے چرخ گردش میں

خاکساری کمال کی ہے دلیل	ہیں جو ناقص غرور کرتے ہیں
وعدہ روز ازل کچھ یاد ہے	غافلو آئے کیوں کیا کر چلے

طواف تھا جو کبھی دل کے گرد ہم پھرتے	جہاد تھا جو کبھی خونِ آرزو کرتے

درد۔ ملک الشعرا خواجہ میر درد دہلوی خلف الصدق خواجہ میر ناصر عندلیب آپکا مادری سلسلہ خواجہ بہاءالدین نقشبند سے ملتا ہے۔ انکا خاندان قدیم الایام سے دہلی میں پیری مریدی کے باعث نہایت با رسوخ اور صاحب اثر سمجھا جاتا تھا، علوم رسمی سے بخوبی ماہر تھے مشہور مفتی دولت سے مثنوی مولانا روم کے سبق لیئے تھے، آپ نواب ظفر خان بہادر امیر عہد جہانگیر بادشاہ کی اولاد امجاد اور خاندان چشتیہ میں سجادہ نشین تھے۔ شاہ گلشن کے خلیفہ اور علم تصوف و باطنی میں وحید العصر اور یگانہ وقت سمجھے جاتے تھے، کلام انکا نہایت پاکیزہ، فصیح اور درد انگیز ہے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دیوان انکے موجود ہیں، میر تقی میر اور سودا کے ہمعصر تھے، خدائے سخن میر تقی میر نے ان کو آدھا شاعر مانا ہے، اسی طرح مرزا رفیع السودا بھی انکے کمال کے مقر تھے جس کا اظہار کئی مقطعوں میں کیا ہے۔ ع

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ	اے بے ادب تو درد سے بس دو بدو نہ ہو

الغرض میر درد ایوان شاعری کے ایک بڑے جلیل القدر رکن ہیں۔ ہزار ہا آدمی انکے مرید

ناحق ہمیں سمجھتے ہیں اغیار آشنا
ہوتے نہیں کسی کے طرحدار آشنا

قاتل سے ہے اشارۂ ابروئے ماہِ نو
دو دن تو ہو نیام سے تلوار آشنا

کب ہے برادرانِ حقیقی کا اعتماد
بے فائدہ بدلتے ہیں دستار آشنا

پوچھوں میں لطفِ بوسہ دُرِ گوش یار سے
کانوں سے ہو اگر لبِ گفتار آشنا

ہے جائے گریہ حال جہانِ خراب کا
ہو چشم مہر و ماہ پہ دامن سحاب کا

تکیہ پہ لطفِ عارضِ رنگیں کو دیکھنا
گویا روش پہ پھول پڑا ہی گلاب کا

کبتک پیوں میں ظلمتِ شب کے لہو کے گھونٹ
چھلکائے شیر صبح قدح آفتاب کا

کیا آئینہ میں عارضِ رنگیں کی ہے بہار
پانی میں پھول تیر رہا ہے گلاب کا

ہم حُلۂ بہشت پہن کے چلے گئے
ڈھونڈا کیا کفن میں فرشتہ عذاب کا

رتبۂ اعلیٰ نہ پائے لاکھ گرادنی بڑھے
قدِ آدم آئینہ کس دن سکندر ہو گیا

زخمیٔ تیغِ ادا شب بھر تڑپ کر مر گئے
چاندنی کا کھیت دو پھولوں کا زیور ہو گیا

زندگی بھر جز ندامت اور کیا حاصل ہوا
مجھسے فعلِ نیک یارب تیرے قابل کیا ہوا

غالب ہوئی جو نکہتِ گل پر شمیم زلف
غنچوں نے چٹکیوں میں صبا کو اڑا دیا

وبال اس سر کے کٹنے کا نہ بالا بالا جائے گا
دُھواں اسکو نہ اے قاتل سمجھنا شمع روشن کا

سکتے ہیں وہ آئینہ دکھا کر مجھے بولے
پتھر پڑیں اسے شخص تری بیخبری پر

صدمے سے بچاتی ہی طبیعت کی لطافت
پانی پہ کرے کاٹ نہ شمشیر ہوا پر

جو پھول پھینک کے مارا رقیب نے اسکو
لگا ہی رشک کا کاری خدنگ سینہ پر

کس طرح چشمِ شوق کو آئے نظر کمر
تارِ نظر سے اسکی ہے باریک تر کمر

معدوم کوئی چیز نہیں پر دہانِ یار
غائب کوئی جہاں سے نہیں ہی مگر کمر

آیا گر اسکے راہ میں گر خط شوق کو
میرا ہے ہاتھ اور تری نامہ بر کمر

آتا ہے انکو اپنی نزاکت کا جب خیال
پاتے نہیں ہیں آپ وہ دو دو پہر کمر

نیک پر ہے فوق بد کو بحرِ عالم میں تو کیا
حسن نظر آتا ہے مجکو ایک - گو ہر دوسرا

کیوں پئے روزی کس و ناکس سے کرتا ہے رجوع
بند کر سکتا نہیں رزقِ مقدر دوسرا

دسترس میرا جو ہو پتھر سے توڑوں آئینہ
دیکھنے پائے نہ تیرا روئے انور دوسرا

ذبح کیا کرتے ہو چھوڑو باندھ کر پر بام پر
ایک کو دیکھے تو آ بیٹھے کبوتر دوسرا

اے درخشاں جسکے مضموں سے ہے روشن اک جہاں
شاہ اختر سا نہیں دیکھا سخنور دوسرا

دریائے محبت کا نہ پوچھو حد و پایاں
جی ڈوب گیا جب مجھے ساحل نظر آیا

نازک ہے فنِ شعر نہایت ہی درخشاں
کہنے سے سمجھنا مجھے مشکل نظر آیا-

کوئی میرے لیئے ہے بیخور و خواب
ہمیں اتنا خیال آیا تو ہوتا

کیا شرف ذات کا گر فیض کا جوہر نہوا
آبِ گوہر سے لبِ خشک کبھی تر نہوا

بخیہ در کار نہیں چشم مروت کے لیئے
آشنا باز کی وحشت سے کبوتر نہوا

بیشتر حالِ جہاں ہمنے پریشاں دیکھا
گھر ہوا در نہوا، زور ہوا، زر نہوا

بزنگ بوئے گل پہنچے سبکروحی سے اس جا ہم
دکھائے برچھیاں سبزہ جہاں دیوار گلشن کا

ہمیشہ رنج میں رکھتی ہے اپنی ہمت عالی
ہمیں ہے دوست کا احسان، گویا ظلم دشمن کا

جامِ ہتی ہیں صورتِ دستِ سوال بھی
گردن کو اپنی شیشۂ مے نے جھکا دیا

آئی قریب گوشۂ ابرو جو زلفِ یار
اتری ہوئی کمان پہ چلا چڑھا دیا

کل وہ جو مجھ کو دیکھ کے بیگانہ بن گیا
میں بھی تو ہوشیار ہوں دیوانہ بن گیا

غفلت پہ اپنی کیوں نہ ہوں خونِ دل ادام
جامِ شرابِ عمر کا پیمانہ بن گیا

رونق فزا ہوا جو درخشاں وہ بت کبھی
آئینہ خانہ رشکِ صنم خانہ بن گیا

جب نگاہِ مست اسکی غیر پر پڑنے لگی
ہو گیا ثابت بہکنا نرگس مخمور کا

چارہ سازی خلق کی کرتا ہوں گو درماندہ ہوں
بے مرمت بیشتر رہتا ہے گھر مزدور کا

کہنے کیواسطے ہیں بہت یار آشنا
لاکھوں میں یاں نکلتے ہیں دو چار آشنا

کی غفلت سے برباد ہوگیا، مولوی علی حیدر رسا نے بڑی کوشش سے کچھ اجزا اشعار ردیف الف کے بٹیا برج میں فراہم کیئے اور مضامین کی صورت میں رسالہ ادیب میں شائع کرائے جس سے ہماری معلومات اور دستیاب شدہ کلام میں معتد بہ اضافہ ہوا جسکے لئے ہم مولنا مذکور کے ممنون ہیں، اُس کا انتخاب درج ذیل ہے، اِنکے تلامذہ میں رئیس الدولہ افسر خوشنویسان شاہی اچھا کہنے والوں میں تھے، روزمرہ بہت صاف لکھتے تھے اور نازک خیالی بھی انکے کلام سے آشکار ہے۔ آپکے اکثر اشعار میں اخلاقی مضامین صفائی سے نظم پائے جاتے ہیں، جو ناسخ کی طرز کے مقلد کے لیئے کچھ آسان بات نہیں، خود بادشاہ اور جملہ شعرائے لکھنؤ اُسی خشک اور بے تاثیر رنگ کے اسیر تھے، الغرض تغزل کا دلفریب رنگ اِن کے کلام میں موجود ہے، مضمون کی بندش ایسی چست ہوتی تھی کہ ردیف بول اُٹھتی ہے۔

اب کلام ملاحظہ ہو :-

آثارِ صبحِ حشر ہیں شاید کہ اے اجل مرنا بھی اہلِ ہوش کا ہے غافلوں کو پند ہم اُس سے نقد بوسے کے اُمیدوار تھے	میرا چراغ عمر جو تو نے بجھا دیا ہم سو رہے تو یاروں کو اپنے جگا دیا قیمت میں دل کی یار نے خنجر لگا دیا
کہا یہ سارباں سے نجد کے وادی میں لیلیٰ نے ہوگی فکر معنی آشنا محتاجِ غواصی	کہ پہچانا نہیں جاتا ہوا کیا حال مجنوں کا گہر افشاں ہے خود دامن مرے دریائے مضموں کا
ظلم کرتا ہے کتابی چہرا خود پرستی ہے پرستش بت کی	خطِ کوفی میں ہے قرآں میرا کم نہیں کفر سے ایماں میرا
آدمیت کو فقط جوہر انساں جانا ہمکو یہ فیض ہوا عشقِ رخِ گیسو سے شر سے نفرت ہے ہمیں خیر سے رغبت ہے مدام	جس میں اخلاق نہ پائے اُسے حیواں جانا گبر نے گبر مسلماں نے مسلماں جانا کفر سمجھا اسے ہمنے اُسے ایماں جانا
حال ابنائے زماں ہے مثلِ سنگِ آسیا	ایک ہے آرام سے کھاتا ہے چکر دوسرا

کہنے میں ہے تاثیرِ خدا داد ہمیشہ　　بھولے سے بتا دوں تو رہے یاد ہمیشہ
شکرِ خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں　　ہر مرثیہ میں موجدِ طرزِ جدید ہوں
آمدِ شہِ عادل کی ہے انصاف کی رہبر　　خرمن سے شرر بھاگتے ہیں شیشہ سے پتھر
بلبل سے قفس، گل سے خزاں، شمع سے صرصر　　شبنم سے جو سورج تو کتاں سے مہِ انور
نیکی سے بدن نام سے اب ننگ جدا ہے　　توبہ سے شکست آئینہ سے زنگ جدا ہے

ہر جسم سے یہ دبدبۂ شہ کا بیاں ہے　　آرام کہاں، ہوش کہاں، جاں کہاں ہے
تن کہتا ہے سب قافلہ دوزخ کو رواں ہے　　دوزخ کی ندا ہے نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے
اب عقل کہاں ہوش کہاں فوجِ لعیں ہیں　　سب گرد ہوئے راہِ سمندِ شہِ دیں میں

اِک دم میں یہ طے کرتا ہے دُنیا کی حدیں سب　　کیسی وہ حدیں آپ سے باہر ہے یہ مرکب
خالی ہیں رکابوں کی طرح چلنے میں قالب　　نقرہ ہے، نہ سبزہ ہے، نہ ابلق ہے نہ اشہب
نام اِس کا تصور میں گذرتا نہیں کوئی　　شوخی کے سبب رنگ ٹھہرتا نہیں کوئی

درخشاں ماہتاب الدولہ کوکب الملک سید علیخاں بہادر درخشاں ستارہ جنگ منجم شاہی ولد میر مغل لکھنوی شاگرد تدبر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی اور اُنکے باختصاص مقربوں میں شامل تھے۔ مشہور سبع سیارہ کے ایک رکن تھے۔ ستاروں کی مزاج شناسی کے ساتھ ساتھ فنِ سخن کو بھی خوب نباہتے تھے۔ انکی سخن سنجی پہ استاد کو بھی ناز تھا۔ جب فتح الدولہ برق نے اپنے ایک خوش فکر شاگرد مرزا محمد رضا، طور کو دربارِ شاہی میں پیش کیا، تو منشی اسیر نے انکی نذر بھی دلوادی۔ خود درخشاں نے مولوی حیدر علی طباطبائی سے جنھوں نے اُنکا مختصر حال رسالۂ ادیب میں شائع کیا ہے فرمایا تھا کہ میری اور آفتاب الدولہ قلق کی باریابی ساتھ ساتھ ہوئی تھی اور خطاب بھی ساتھ ہی ملے تھے، انتزاعِ سلطنت کے بعد برق اور درخشان بادشاہ کے ہمرکاب کلکتہ گئے اور قلق و اسیر لکھنو رہ گئے درخشاں کا انتقال بھی مٹیابرج ہی میں ہوا، بڑے پُرگو اور زود فکر سخنور تھے، دیوان تیار تھا مگر حواثین

خبر حیف کیا جہاں سے سلیمان لے گئے شاہانِ دہر کونسا سامان لے گئے	بند	یوسف بھی زیرِ خاک سب ارمان لیگئے سب کچھ وہ لے گئے کہ جو ایمان لیگئے
کن قافلوں کو خاک نہ اس راہ نے کیا		کن یوسفوں کو غرق نہ اِس چاہ نے کیا
یہ سُن کے مطمئن ہوئے وہ غازی وغنی تو کان کی مڑی، نہ پھری مُنہ پہ مُردنی	بند	منکہ ڈھلا، نہ اشک بہا، وقت جانکنی پتھرانا کیسا آنکھ میں دُونی تھی روشنی
مرتے ہوئے غضب کی دلیری دکھاتے تھے		رگ رگ سے دم نکلتا تھا اور مُسکراتے تھے
مجرئی ہے سوگوارِ ماہِ حیدر چاندنی تا کمالِ چاردہ[۱۴] معصوم روشن سب پہ ہو شمر نے چاہا کہ حضرت سے جُدا عباس ہوں مال و زر کا کیا بھروسہ چاہئے فکرِ مآل ثابت شر و آفت سے شرافت نہیں ہوتی		اشک شبنم ہیں بُکا کرتی ہے شب بھر چاندنی چودھویں[۱۴] شب کو رہا کرتی ہے شب بھر چاندنی یہ نہ سمجھا۔ چاند سے چھوٹے گی کیونکر چاندنی فی المثل ہے چار دن کی اے تونگر چاندنی کامل کی یہ پہچان ہے نخوت نہیں ہوتی
پیش اُمرا طالبِ زر جھکتے ہیں سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح		سجدے سے سوا مجرے کو سر جھکتے ہیں ہے مال سوا جدھر، اُدھر جھکتے ہیں
دریا پہ تو ظاہر ہیں علمدار گئے تھا بیچ میں دریائے شہادت حائل خبر حیف کیا جہاں سے سلیمان لیگئے شاہانِ دہر کونسا سامان لیگئے	بند	باطن میں وہ کوثر کے طلبگار گئے دو ہاتھ میں اس پار سے اُس پار گئے یوسف بھی زیرِ خاک سب ارمان لیگئے سب کچھ وہ لیگئے کہ جو ایمان لیگئے
کن قافلوں کو خاک نہ اس راہ نے کیا ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی دز دانِ مضامیں پہ نہ کر منع کی تاکید		کن یوسفوں کو غرق نہ اِس چاہ نے کیا ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی تو مجتہدِ نظم ہے، فرض اُن پہ ہے تقلید
مضموں نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ		کہتا ہے سخن حضرتِ اُستاد ہمیشہ

کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی دبیر		سمجھے جو برا آپ کو اچھا وہ ہے
گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے		بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا		جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے
بو گل نے رنگ لالہ نے سرعت ہوا نے دی		یہ ہے یہ کیا ہے اپنی نیابت قضا نے دی
دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے		غفلت میں طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو ہے اگر سرکشی کا غرہ		ہمکو بھی غرور خاکساری کا ہے
یاں شور وہاں غل ادھر آئی ادھر آئی		وہ چمکی، وہ تڑپی، وہ چھپی وہ نظر آئی
وہ تیر گئی خود میں وہ سر میں در آئی		گردن سے بڑھی سینہ لیا تا کمر آئی
سن اسکا گھٹا تھا جو دلیرانہ بڑھا تھا		منہ کی وہی کھاتا تھا جو منہ اسکے چڑھا تھا
چمکی جو خود سر پہ تو سر سے نکل گئی		شانے پہ جو پڑی تو جگر سے نکل گئی
سینے میں دم لیا تو کمر سے نکل گئی		حیراں تھا خود بدن کہ کدھر سے نکل گئی
اونچی ہوئی تو فرق عدو کو فرو کیا		گر کر اٹھی تو راکب و مرکب کو دو کیا
جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے	رباعی	اس دور میں جور آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنو جنت تھا		آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے
عباس کے غم سے چشم سرور نم تھی		حالت شہ بیکس کی عجب اس دم تھی
اشک آنکھوں میں اور زباں پہ عباس کا نام		رخ زرد، کمر پہ ہاتھ۔ گردن خم تھی
اے ابر تری گہر فشانی کیا ہے؟		آ، دیکھ کہ یہ دُرِّ معانی کیا ہے
یاں گل ہے چراغ انوری کا بالکل		اے شمع تری چرب زبانی کیا ہے
اے جل شانہ، وہ غفور الرحیم ہے	بند	ہم سب ہیں دردمند وہ کامل حکیم ہے
رحمان و مستعان و رؤف و رحیم ہے		اسکے سوا بھلا کوئی ایسا کریم ہے
ایمان بھی دے، مراد بھی دے عز و جاہ بھی		روزی بھی بخشے۔ خلد بھی بخشے گناہ بھی

دعا بھی مال و دولت کی نہ مانگوں
ہمیشہ یہ دعا ہے اور میں ہوں
تمنا دولت و حشمت کی بے جا
دبیر آخر فنا ہے اور میں ہوں

بند

ہے عکس گیسو و رخ اکبر کہاں کہاں
سنبل کہاں کہاں ہے گل تر کہاں کہاں
گلزار میں، جناں میں، ختن میں، تتار میں
پھیلی ہے نکہت گل حیدر کہاں کہاں
فرق عدو میں سینہ میں جوشن میں زین میں
در آئی ذوالفقار دو پیکر کہاں کہاں
بستی میں جنگلوں میں، ترائی میں کوہ میں
شہ کو لیے پھرا ہے مقدر کہاں کہاں
اس کشت روزگار میں تخم بقا نہیں
اس بوستاں کے پھولوں میں بوئے وفا نہیں
اس بزم کے چراغوں میں نور ولا نہیں
اس بحر کے صدف میں در مدعا نہیں
گھر کونسا بسا کہ جو ویراں نہ ہو گیا
گل کونسا ہنسا کہ پریشاں نہ ہو گیا

اگر وہ غیرت شمشاد جائے سیر گلشن کو
گلوئے سرو میں پہنا دے قمری طوق گردن کو
چمن کی بے ثباتی پر جو اس کا دھیان جاتا ہے
تو کیا روتی ہے شبنم منہ پہ رکھکے گل کے دامن کو
رواں کرتا تھا خنجر گاہ گاہے روک لیتا تھا
عجب ناز و ادا سے اسنے کاٹا میری گردن کو
میں کشتہ ہوں کسی گل کے مسی آلودہ دنداں کا
چڑھانا باغباں تربت پہ میری برگ سوسن کو
دلا ان تنگ چشموں سے نہ چشم رحم تو رکھیو
کسی کے حال پر روتا نہ دیکھا چشم سوزن کو
سواد نامہ اعمال کیا یہ اشک دھوئیں گے
نہ شبنم نے کیا تبدیل رنگ برگ سوسن کو
دبیر آئیگا کب وہ بھول کر گور غریباں پر
جو اکثر روندتا تھا ناز سے پھولوں کے خرمن کو

آتے تھے جوڑ توڑ غضب تیغ تیز کو
سر سے گری جدا کیا پائے گریز کو
اپنے سے گرم دیکھ کے اس شعلہ ریز کو
برق و شرر نے نذر کیا جست و خیز کو

گھر اپنا اجاڑ کر بسایا تجھکو
ڈھانپا جو کفن سے منہ دکھایا تجھکو
اے قبر کہاں کہاں نکی تیری تلاش
جب خاک میں ملگئے تو پایا تجھکو

ادنی سے جو سر جھکائے اعلی وہ ہے
جو خلق سے بہرہ ور ہے دریا وہ ہے

اِس نہرِ خوں میں سر جو دبیر اُنکے گرتے تھے
مثلِ حباب چاروں طرف بہتے پھرتے تھے

بند

بیٹھ کر خاک پہ غلطاں ہوئے وہ دونو یتیم
لپٹا یوں بھائی سے بھائی کہ ہلا عرش عظیم
تیغ چمکانے لگا بچوں کے سر پر وہ لئیم
اُٹھ کے تعظیم سے کی دونوں نے جھک کر تسلیم
خوف سے بند تھے مُنہ بات نکی جاتی تھی
استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی تھی

غزل کمیاب میرزا دبیر منقول از مجموعہ مرسلہ

دفن کرنا مجھکو کوئے یار میں
قبر بلبل کی بنے گلزار میں
اپنے یوسف کا عزیزو ہوں غلام
چاہے مجھکو بیچ دے بازار میں
سر مرا لٹکا کے قاتل نے کہا
پھل لگا ہے آج نخلِ دار میں
گرمیٔ خوں کی مری تاثیر دیکھ
پڑ گئے چھالے تری تلوار میں
سر کے کٹنے کا مجھے کچھ غم نہیں
خم نہ پڑ جائے تری تلوار میں
قبر میں روزن مری رکھنا ضرور
مر گیا ہوں انتظارِ یار میں
میرا مرنا اُنکے گھر شادی ہوئی
خون کے چھاپے لگے دیوار میں
بعد مردن میرے لاشے کو دبیر
دفن کرنا کوچۂ دلدار میں

رباعی

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں
مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل
تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

رر

ناداں کہوں دلکو کہ خردمند کہوں
یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو مُنہ دکھانا ہے دبیر
بندوں کو میں کس مُنہ سے خداوند کہوں

خیالِ کربلا ہے، اور میں ہوں
بہشتِ جاں فزا ہے، اور میں ہوں
چُنوں موتی بیابانِ نجف کے
یہ دُرِّ مدعا ہے، اور میں ہوں
مثالِ دانہ پستا ہوں شب و روز
فلک کی آسیا ہے، اور میں ہوں
صفِ دشمن سے حر نکلا یہ کہکر
بس اب راہِ وفا ہے، اور میں ہوں

زندان میں نبض ہتھکڑی نے دیکھی		جز داغ کسی نے ہاتھ دل پر نہ رکھا
کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دُنیا سے دبیر	رباعی	باقی سامانِ عیش فانی نکلا اتنا بھی نہ اِس کنوئیں میں پانی نکلا

نیرنگیٔ دُنیا و عبرت

دُنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا برسوں رہا جن کے سر پہ چترِ زریں		کس کس کا نہ یاں ہم نے زمانہ دیکھا تربت پہ نہ اُنکی شامیانہ دیکھا
مرکر بھی نہ چین زیرِ افلاک مِلا اے خانہ خراب قبر تیری خاطر	رباعی	اک تارِ کفن نہ گرد سے پاک مِلا کھویا بھی جو نقدِ جاں تو کیا خاک مِلا
کس عہد میں تبدیل نہیں دَور ہوا اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر	رباعی	گہہ عدل گہے ظلم گہے جور ہوا کیا غم جو زمین اور فلک اَور ہوا
نمرود کو خدائی کے دعوے سے کیا مِلا		بندہ جُدا ہوا جو خودی سے خدا مِلا
مصرع کے عوض آپ سے طوبیٰ نہیں لیتا اب تُو پوچھیے کیا مانگتا ہے کیا نہیں لیتا	بند	لو جنّتِ اعلیٰ بھی یہ ادنیٰ نہیں لیتا ہَیں نام زباں سے کسی شئے کا نہیں لیتا
جز نقدِ رضا کچھ بھی مجھے منظور نہیں ہے		خادم ترا، مدّاح ہے مزدور نہیں ہے
پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل	رباعی	قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا
سمجھے ہیں نامرادیٔ دنیا کو یہ مُراد ہر عضو میں ہے دل کی طرح سے خدا کی یاد	بند	غم انکے دل میں شاد ہے دل انکا غم میں شاد قرآن پڑھنا ختم ہے اِن پہ دمِ جہاد
بازوئے جنگ مثلِ ترازو تُلے ہوئے		خود رحل زین پہ، گود میں قرآن کھلے ہوئے
تن لوٹتا تھا یاں تو تڑپتا تھا سَر اُدھر اک بیحواس اس طرف اک بے خبر اُدھر	بند	زخمی پدر ادھر تھا تو بیجاں پسر اُدھر دریا لہو کا بہتا تھا اِن میں ادھر اُدھر

اور لکھنؤ کے باہر کہاں ہیں؟ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے دو برس بعد نواب امام باندی بیگم صاحبہ کی طلب پر پٹنہ عظیم آباد تشریف لیگئے۔ اور پھر ہر سال وہاں جاتے رہے وہاں جو پہلی مجلس میں مرثیہ پڑھا اُس سے قبل مندرجۂ ذیل رُباعی بھی پڑھی جس سے اُنکے دلی خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ ؎

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے	اِس دَور میں جورِ آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنؤ جنت تھا	آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

بالآخر ۳ محرم ۱۲۹۲ھ کو لکھنؤ میں مرزا صاحب نے انتقال فرمایا، اور اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے، آپکے صاحبزادے حضرت اَوج بڑے باکمال مرثیہ گو ہیں، اُنکی خدمت میں راقم کو بمقامِ لکھنؤ دو بار نیاز حاصل ہوا تھا۔ ہنگامِ مُلاقات حضرت نے بکمال توجہ جناب دبیر کے حالات بھی سُنائے تھے۔ مندرجۂ بالا حالات کے لیئے راقم منشی افضل حسین ثابت کا مشکور رہے جنھوں نے ایک پُورا رسالہ موسوم "خمخانۂ جاوید کا اک جام ہر یہ بھی" مرزا دبیر کے حالات میں بھیجکر خمخانۂ جاوید سے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا۔

ہم طالعِ ہما مراد ہم رسا ہُوا		طاؤسِ کلکِ مدح اُڑا اور ہُما ہوا
مطلع ہمارا مطلعِ مہرِ سما ہُوا		اور دوحۂ کلام سراسر ہَرا ہوا
مصرع ہوا کہ سرو وہ دار السلام کا		عطرِ گلِ ارم ہوا حاصِل کلام کا
دِل کو پئے جمع زرِ پریشاں نکیا	[illegible]	سر کو گشتۂ بہرِ سامان نکیا
ہم تو ہیں ترے شکر گزار ای گردوں		احسان کیا جو ہمپہ احساں نکیا
بلبل بیزمانہ ایک گل کا نہ ہوا	[illegible]	محکوم ائمہ و رسل کا نہ ہوا
بندوں کو عبث خیالِ یکتائی ہی		اللہ پر اتفاق کل کا نہ ہوا

امام زین العابدین کی عکسی قید خانہ کا فوٹو

عابد نے سوائے خاک بستر نہ رکھا	تپ میں سر بالینِ شفا سر نہ رکھا

میر عباس "عشرہ کاملہ" میں انیس اور دبیر کی نسبت لکھتے ہیں "دونوں صاحبوں کا مذاق جدا جدا ہے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیجا سکتی میر صاحب کا کلام فصیح و شیریں ہے اور مرزا صاحب کا دقیق اور نمکین ہے ؎ ہر پھول کی خوشبو ہے جدا رنگ جدا ہے"

اسی طرح شمس العلماء مولوی سید حامد حسین نے ایک مجمع میں مرزا صاحب کی مندرجۂ ذیل ٹیپ

طے ہر قدم پر ایک مہینے کی راہ تھی ۔۔۔ رویت ہلالِ نعل کی اُس پر گواہ تھی

سنکر فرمایا کہ کسی عرب و عجم نے بھی آجتک یہ مضمون اِس خوبی سے نہیں باندھا، اسی طرح تدبیر الدولہ اسیر لکھنوی اور منشی امیر مینائی دونوں کا بیان تھا کہ ہم انیس اور دبیر دونوں کو استاد مانتے ہیں اور ایک کو دوسرے پر علانیہ ترجیح نہیں دے سکتے۔ قدردانی کمال کے متعلق یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ سنہ ۱۲۹۱ھ میں مرزا دبیر نابینا ہو گئے تھے، حضرت واجد علیشاہ طاب ثراہ کلکتہ ٹمیا برج میں تشریف فرما تھے کہ ایک جرمن کا ماہر آنکھیں بنانے والا ڈاکٹر ان کا ملازم ہوا، بادشاہ کے اشارے سے ایک رفیق نے مرزا صاحب کو لکھا کہ بادشاہ کی خواہش ہے کہ اگر آپ یہاں آئیں تو آپکی آنکھیں بنوادی جائیں۔ چنانچہ مرزا صاحب کلکتہ گئے اور نواب مؤنس الدولہ مصاحب شاہ جمجاہ کی کوٹھی پر مہمان ہوئے اور آنکھیں بنوائیں اور عرضداشت متضمن اطلاع شاہ جمجاہ کو بھیجی، اُس کی پیشانی پر شاہ ممدوح نے یہ شعر لکھا۔

گر بر سر و چشمِ من بیائی ۔۔۔ بر قلب نہم کہ کیمیائی

۲۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۱ھ کو پھر سلطانخانۂ مبارک اور سبطین آباد کے امام باڑہ میں مرزا دبیر سے ملاقات ہوئی اور سلطانعالم نے مرزا دبیر کی تعریف اپنے مرثیہ میں فرمائی جس میں سے ایک ٹیپ مشہور ہے۔

بچپن سے اسکے دامِ سخن میں اسیر ہوں ۔۔۔ ہیں کمسنی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں

جبتک سلطنتِ اودھ قائم رہی باہر کے اُمرا باصرار مرزا صاحب کو بلاتے رہے مگر مرزا صاحب نے وطن کی مفارقت گوارا نکی، اور یہی جواب کہلا بھیجا کہ ہماری زبان کے سمجھنے والے دہلی

تصدق جناب استاد کا ہے، بعد مجلس میر ضمیر صاحب نے مرزا صاحب کو اٹھکر گلے سے لگا لیا، اور وہیں سے اپنے گھر لے گئے، اگلی پچھلی باتیں دوہرائی گئیں، میر عابد علی بشیر کی خطا ثابت ہوئی - میر ضمیر صاحب نے فرمایا کہ اب یہ شخص اس لائق نہیں کہ ہمارے یہاں آئے مرزا صاحب نے دست بستہ عرض کیا کہ انکی خطا بھی میری خطا کے ساتھ معاف فرمایئے میر ضمیر صاحب نے سکوت فرمایا اور نادم ہوئے - اور اسکے بعد میر ضمیر صاحب کی گھر کی مجلس میں ہمیشہ مرزا صاحب پڑھتے رہے یہانتک کہ میر ضمیر صاحب کی سوم کی مجلس میں بھی مرزا صاحب نے مرثیہ پڑھا - میر عابد علی بشیر مرحوم بھی اپنا کلام مرزا دبیر مرحوم کو دکھلانے لگے اور مرزا صاحب کے خیر خواہ شاگرد ہوگئے تھے - مرزا صاحب کے مقابلہ پر جن شاعروں نے علم شہرت بلند کرنا چاہا اُن میں صرف میر انیس کو فروغ حاصل ہوا مرزا صاحب کی خوش فکری کا زمانہ سترہ برس کے سن سے ۱۲۳۵ھ میں شروع ہوا - اس کے کامل ۲۳ برس بعد یعنی ۱۲۵۸ھ میں جب مرزا دبیر کی چالیس برس کی عمر تھی میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ آئے، حضرت امجد علیشاہ کا زمانہ تھا، یہ میر خلیق کے فرزند رشید تھے جو عناصر اربع مرثیہ گوئی کے ایک عنصر لطیف تھے، اُس وقت رزمیہ مرثیہ گو صرف مرزا ضمیر - میر فصیح، اور میرزا دبیر تھے، اپنے والد کی تحریک پر انھوں نے رزمیہ مرثیہ گوئی شروع کی، اور اسکے ساتھ ہی منبر پر تانا بھی شروع کیا - واقعات انیس میں درج ہے کہ میر انیس خود اس امر کے معترف تھے کہ انکے لکھنؤ آنے کے وقت میرزا دبیر کا لکھنؤ میں اچھا شہرہ تھا، میر انیس مرحوم میرزا دبیر کے ہم سن بھی تھے، اور لکھنؤ میں آتے ہی اُن کے فروغ کا بڑا باعث یہ ہوا کہ اکثر شرفا نواب زادے جو اُنکے والد کے شاگرد تھے اُنکے طرفدار تھے، لکھنؤ والوں کو بالمقابل کاملوں کی تعریف کرنے میں مزا بھی آتا تھا، اس لیئے دو فریق "اُنیسیئے" اور "دبیریئے" مشہور ہوگئے اور انکے روبرو بقیہ مرثیہ گو ماند ہوگئے *

مرزا صاحب کے اکثر ہمعصر علمار اور کملار نے اُنکی تعریف کی ہے، مثلاً شمس العلما مفتی

حصہ میر ضمیر۔ مشہور رہے کہ میر عابد علی بشیر شاگرد ضمیر نے عین مجلس میں میر ضمیر کو مرزا دبیر کی طرف سے بھڑکا دیا، مرزا صاحب نے چند رباعیاں پڑھکر وہی نیا مرثیہ شروع کیا، اہل مجلس نے تعریفوں کے پھول نثار کیے۔ جہاں تک استاد کا حکم تھا وہیں تک پڑھکر منبر سے اُترے میر ضمیر صاحب منبر پر تشریف لیگئے اور یہ فرماکر کہ یہ مرثیہ انھیں کا ہے میرا نہیں کسی پرانے مرثیہ کے چند بند اور نثر کے کچھ فقرے پڑھے اور منبر سے اُتر آئے، بعد مجلس دو خلعت دونوں صاحبوں کیواسطے آئے، میر ضمیر صاحب نے اپنی خلعت پر ٹھوکر مار کر فرمایا کہ اُٹھالے جاؤ، اور اُٹھ کھڑے ہوئے، مرزا صاحب نے بھی یہ فرماکر کہ جو اُستاد کے فائدہ پر اپنے فائدہ کو مقدم رکھتے ہیں اُسکو ملعون جانتا ہوں، خلعت پھیر دیا۔

اب زمانے نے دوسرا پلٹا کھایا، میر ضمیر صاحب کے اکثر شاگرد نظم و نثر میں مرزا صاحب پر حملے کرتے تھے اُنھیں میں سے کسی صاحب کا یہ مصرع آج تک مشہور رہے ۵ ہمنام دبیر فلکِ پیر مٹا دوں" ہر مہینے کی گیارہویں کو مرزا صاحب اپنا نیا مرثیہ کہکر پڑھتے تھے چنانچہ اُسی زمانے کا اُنکے ایک سلام کا شعر ہے۔

نیا مرثیہ نظم ہوتا ہے ہر ماہ		دبیر اسکو سمجھو مہینا ہمارا	

مرزا صاحب کا کوئی شاگرد میر ضمیر صاحب کے کسی شاگرد کی بد زبانی مرزا صاحب سے بیان کرتا تھا تو وہ اُسکو جواب دیتے تھے کہ تم سخت بات کا ہمیشہ نرم اور ملائم جواب دو اور اصل واقعہ سمجھا دو۔ حیاتِ مستعار باقی ہے تو یہ سب شورشیں اور سوزشیں مٹ جائینگی چند سال یہی عالم رہا، اور اس درمیان میں مرزا صاحب کی شہرت کمال بڑھتی گئی یہانتک کہ وزیر شاہ اودھ نواب علی نقی خان مرحوم کی مجلس میں مرزا صاحب نے مرثیہ پڑھا سامعین مجلس میں تمام شاہزادے اور اکثر حکام اور معززین موجود تھے جن میں سے میر ضمیر صاحب بھی ایک سامع تھے، اثنائے مجلس میں جب حضور عالم (وزیر ممدوح) نے باآواز بلند تعریف فرمائی، تو مرزا صاحب نے میر ضمیر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ سب

اِنکے مکان پر حاضر ہوتے تھے، ادھر محلات میں کئی بیگمیں اور شہزادیاں اُنکی شاگرد ہوگئیں جن میں سے ایک نواب ملکۂ زمانیہ زوجۂ نواب نصیر الدین حیدر شاہِ اودھ اور دوسری سلطان عالیہ دختر نواب ملکۂ زمانیہ اودھ تھیں، یہ دونوں شاہزادیاں مرزا صاحب کو ابّا جان کہتی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ محلاتِ شاہی کی زبان قابل سند ہے اور در حقیقت ہے مگر مرزا صاحب کی زبان کا کمال یہ ہے کہ محلاتِ شاہی میں جب کسی لفظ یا محاورہ روزمرہ کے متعلق بحث ہوتی تھی تو کلام مرزا صاحب سے سند لی جاتی تھی یا اُسکے فیصلہ کا حصر مرزا صاحب پر رکھا جاتا تھا، اِس شہرت سے جسقدر مرزا صاحب کو فائدہ پہنچا اُتنا ہی حاسدوں کا حسد بڑھتا گیا، یہاں تک کہ میر ضمیر کے بعض شاگردوں نے چاہا کہ اُستاد اور شاگرد میں ناچاقی ہوجائے، اِس اجمال کی تفصیل میر محمد رضا صاحب ظہیر لکھنوی دارشد تلامذہ مرزا دبیر مرحوم کی زبانی جو اُن تمام مجالس وغیرہ میں شریک تھے اور جنھوں نے تنقید آبحیات مرزا دبیر کے واقعات میں ۱۳۰۳ھ میں لکھی ہے) یہ بیان کرتے ہیں کہ مہاراج میوہ رام افتخار الدولہ (لکھنؤ کے ایک نومسلم فیاض رئیس) نے ۱۹ ماہ شعبان کو میر ضمیر اور مرزا دبیر سے اصرار کیا کہ اب کے اکیسویں ماہِ رمضان کی مجلس میں آپ دونوں صاحب نیا مرثیہ کہہ کر پڑھیں، دونوں صاحبوں نے وعدہ کر لیا کہ بشرطِ فرصت نیا مرثیہ کہیں گے، مرزا صاحب نے کہ اُنکی مشق اُس زمانہ میں مثل شباب کے زوروں پر تھی۔ رات بھر میں ایک نیا مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے "ذرہ ہے آفتاب درِ بوتراب کا"، ۲۰ کو علی الصباح میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا، حضور نے کچھ فکر فرمائی۔ فرمایا کہ مجھکو اتنی فرصت کہاں؟ ایک پہلے کا کہا ہوا مرثیہ ہے، اُس میں چند بند نئے کہکر لگا لئے ہیں اور مطلع بدل لیا ہے وہی پڑھ دونگا، مرزا صاحب نے اپنا مرثیہ پیش کیا۔ دیکھکر بہت خوش ہوئے، مرزا صاحب نے عرض کی یہ سب حضور ہی کا فیض ہے اسے آپ پڑھیں۔ میں کچھ عذر کر دوں گا اصرار کے بعد میر ضمیر نے منظور کر لیا، اور یہ قرار پایا کہ فضائل کا حصہ مرزا دبیر پڑھیں اور مصائب کا

ہی مرزا دبیر کا شہرہ ہو گیا، اور اب میر ضمیر صاحب نے یہ شیوہ اختیار فرمایا کہ جو کوئی اُن کا شاگرد کوئی تصنیف اصلاح کے لئے انکو دیتا وہ اول مرزا صاحب کو دیدیتے اور فرماتے کہ بھئی سلامت علی اول تم اسکو دیکھ کر عیوب سے پاک کر دو۔ جو کوئی عیب انکی نظر سے رہجاتا اُسکو میر ضمیر مرحوم خود نکال دیتے تھے، مرزا صاحب کے علم اور نیک نفسی اور خلق و انکسار اور مہمان نوازی نے انکو اور بھی چمکایا اور ایسی شہرت ہوئی کہ اب دبیر کا نام لوگ چار مشہور مرثیہ گویوں، ضمیر، خلیق، فصیح، دلگیر، کے ساتھ لینے لگے، چنانچہ اس بات کی شاہد عادل مرزا رجب علی بیگ سرور مغفور کے فسانہ عجائب کی مندرجہ ذیل عبارت ہے۔ یہ کتاب عہد غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر شاہان اودھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اُس زمانہ تک کے تمام مشہور مرثیہ گو اس مختصر عبارت میں آگئے یہ سرور کا کمال قابل داد ہے۔

وہ عبارت یہ ہے

"مرثیہ گو بے نظیر، میاں دلگیر، صاف باطن نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مرد مسکین، مکروہات زمانہ سے کبھی فسردہ نہ دیکھا، اللہ کے کرم سے ناظم خوب، دبیر مرغوب، سکندر طالع بصورت گدا، بار احسان اہل دول کا نہ اُٹھایا، عرصہ قلیل میں مرثیہ و سلام کا دیوان کثیر فرمایا"

مرزا صاحب کی شہرت کا چرچا سن کر نواب غازی الدین حیدر (اول شاہان اودھ) نے انکو یکایک بلوا کر اپنے عزاخانہ خاص میں سُنا۔ مرزا صاحب نے رباعیوں کے بعد اور مرثیہ سے پہلے یہ مطلع فی البدیہہ کہکر پڑھا۔

واجب ہی حمد و شکر جناب اِلٰہ میں مجھ سا گدا، اور انجمن بادشاہ میں	فضل خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اسوقت راہ میں

ذرّے پہ چشم مہر ہے مہر منیر کو
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو

تھوڑے دنوں میں مرزا صاحب کا اسقدر شہرہ ہو گیا کہ بڑے بڑے رئیس اور شہزادے

پھر مرزا غلام حسین مرحوم دہلی میں تشریف لیگئے، اور دہلی میں سات آٹھ برس تک متوطن رہے
انکا مکان بلّی ماروں کے محلّہ میں تھا۔ وہیں مرزا دبیر مرحوم کی دو بڑی بہنیں اور اُنکے
بڑے بھائی مرزا غلام محمد، نظیر مرحوم پیدا ہوئے اور ۱۱ جمادی الاولی ۱۲۱۸ھ کو دہلی ہی
میں وہ آفتاب بُرجِ کمال طلوع ہوا جسکو آج تمام ملک "مرزا دبیر" مرحوم کہتا ہے، مرزا دبیر
مرحوم کی ذات پر دہلی کو بھی اُسی طرح فخر حاصل ہے جس طرح لکھنؤ کو، مرزا دبیر پانچ
سات برس کے تھے کہ انکے والد مرحوم پھر لکھنؤ مع اہل و عیال کے آئے اور اپنے انہیں
نخاس والے مکانات میں رہے، اور یہ مستغنی المزاج بزرگ مدۃ العمر خانہ نشین ہی رہے،
یہ بھی قابل ذکر امر ہے کہ مرزا دبیر صاحب کو میر انشاء اللہ خان مرحوم کی نواسی بیاہی ہوئی
تھیں، مرزا دبیر مرحوم کی ابتدائے مرثیہ گوئی ع سالے کہ نکوست از بہارش پیدا، ۱۲ برس
کی عمر ہی کہ مرزا صاحب ابھی درس و تدریس میں مشغول تھے، انکو شعر گوئی کا شوق ہوا۔ مگر اکثر
مناقب بزرگانِ دین کہتے تھے انکے والد ماجد میر مظفر حسن ضمیرؔ (مرحوم)، کی خدمت میں اِن
(مرزا صاحب) کو لیکر پہنچے۔ کلام کی فرمایش پر یہ قطعہ مرزا دبیر نے پڑھا۔ ؎

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے	کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر	کسیکا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

یہ قطعہ سُن کر تمام حاضرین اور خود میر ضمیر پھڑک گئے، اور میر ضمیر مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ
صاحبزادہ تم آیا کرو میں تم کو ضرور بتاؤں گا۔ میر ضمیر ہی نے دبیر تخلص مقرر کیا۔ اور مرزا
دبیر مغفور کو ایک قدرتی نیچرل شاعر پاکر دل لگا کر خوب بتایا، ادہر مرزا صاحب کا سلسلۂ
درس برابر جاری تھا، یہ بات تمام لکھنؤ میں مشہور ہے کہ مرزا صاحب نے باقاعدہ تحصیل
علم فرمائی تھی اور عالم و فاضل جید تھے۔ ادھر علم کی قوت اُدھر طبیعت کی تیزی۔ اِن
سب پر طرّہ لکھنؤ کے باکمالوں کی صحبتیں، رات دِن کے علمی مباحثے۔ اِن سب باتوں
نے مِل جُلکر مرزا دبیر کو چند برسوں میں ایک شاعر کامل بنا دیا۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں

ملتے ہیں ہم کسی سے تو ملتے ہیں اے دبیر نہ مدفن کا نشاں باقی نہ خاک استخواں تک ہے	اُلفت ہے، دوستی ہے، محبت ہے، چاہ ہے مٹایا ای فلک تو نے یہاں تک ہی یہاں تک ہے
خاکساروں سے ہے حذر ہے خاکساری سے گریز ہیں ہمہ تن وقفِ تسلیم و رضا ہوں عشق میں آپ اپنے ظلم سے رسوائے عالم تم ہوئے اے دبیر اب ہند میں یکتا ہیں مولنا ظہیر	جستجو اس پر ہوس ہے نسخۂ اکسیر کی مِلک ہی سر تیغ کی، جاگیر ہے دِل تیر کی کیا کیا کھیل تم نے جو میری نعش کی تشہیر کی دھوم تھی اگلے زمانے میں جناب میر کی

دبیر

دبیر- امام کعبۂ بلاغت ناظمِ عطارد تحریر حضرت مرزا سلامت علی دبیر مرحوم

خمخانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی

اِن باکمال مرثیہ گو کے جد اعلیٰ ملّا ہاشم شیرازی نثار تھے جو ملّا علی شیرازی کے بڑے بھائی تھے، ملّا ہاشم کے بیٹے مرزا رفیع متخلص بہ رفیعؔ۔ اُنکے فرزند مرزا غلام محمد مرحوم اُن کے بیٹے مرزا غلام حسین مغفور تھے، مرزا غلام حسین مغفور کے خلف الصدق مرزا سلامت علی دبیر مرحوم تھے، شمس الضحیٰ مطبوعۂ میر عابد علی صاحب میں وہ فرمان بھی ہیں جو شاہانِ دہلی نے مرزا صاحب کے بزرگوں کو لکھے تھے، اور جن فرمانوں سے ظاہر ہے کہ مرزا غلام محمد اور مرزا رفیع و ملا ہاشم شاہانِ دہلی کے میر منشی سلطنت ہندوستان تھے اور میرزا غلام حسین صاحب کے حقیقی نانا میرزا عنایت اللہ خاں ابن مرزا ابوظفر خاں ناظم صوبۂ کشمیر کے تھے اور میرزا غلام حسین صاحب کے ماموں مرزا شہامت علی خاں شاہزادگانِ دہلی کے اتالیق اور خطِ نستعلیق لکھوانے پر مامور تھے۔

مرزا دبیر مرحوم کے والدِ ماجد (مرزا غلام حسین مرحوم) نے دہلی کے چند مرتبہ تاخت و تاراج ہو جانے کے بعد دہلی سے لکھنؤ میں آکر سکونت اختیار فرمائی اور اثاث البیت بیچ بیچکر شادی بھی لکھنؤ میں کی۔ مکانات بھی یہیں بنوائے جو اب تک محلّہ نخاس میں موجود ہیں اور آج وہ محلہ کوچۂ دبیر کہلاتا ہے، بعد شادی کے دہلی میں کسی قدر اطمینان ہو جانے پر

جس دل پہ مری جان ترا نام ہے کندہ
بہتر نہیں اُس دل کے نگینے سے نگیں اور

واہ کیا کہنا ہے اِس گفتار اور رفتار کا
جی اُٹھے مردے ہزاروں شوخیٔ رفتار سے
حرص دنیا سچ تو یہ ہے سبکو کرتی ہے خراب

قابل تحسیں ہے نغمہ لائق انعام رقص
قُم باذنی سے بھی بڑھکر کر گیا ہی کام رقص
سیم و زر کیواسطے کرتے ہیں سیم اندام رقص

دیکھے ہیں جس کسی نے ترے پیرہن کے پھول
نازک بدن ہیں اتنے کہ اللہ کی پناہ
جنت کے سبز باغ دکھاؤ نہ واعظو!
یا تنگ اُڑا ہے رنگ چمن تیرے خوف سے
کیوں بات بات میں نہ کھلیں غنچہائے دِل
کس کی بہار کس کا چمن اپنے وقت پر
فیضِ بہارِ باغ کلامِ ظہیر سے
اُسکی صورت دلمیں ہے اور دل ہے مٹھی میں مری
دستِ مشاطہ میں رہنی ہے تری زلفِ دراز
نان جو بھی ہے ہتھیدستی میں نعمت اے دبیر
حالِ دلِ پُر درد نہ محتاجِ بیاں ہے
ہر چند کہ تو خلق کی نظروں سے نہاں ہے
تو کیا نہیں پہلو میں نہیں دلِ بھی ہمارا
رکھتے تھے جو نخوت سے قدم عرش بریں پر
یہ لیجے نقدِ دل حاضر ہے اور موجود جاں تک ہے
آنا ہے تو خدا کے لیئے جلد آ کہیں
خط تیرہ بختیوں کے وہی جانتا ہے خوب

تنگ چمن ہیں اُسکی نظر میں چمن کے پھول
دشوار ہوگیا اُنھیں اُٹھنا پہن کے پھول
وعدے ہیں آپکے شجرِ مکر و فن کے پھول
بن بن گئے ہیں لالہ و گل بھی سمن کے پھول
گویا کہ منہ سے جھڑتے ہیں اس گلبدن کے پھول
ہر شے نظر کے سامنے آتی ہے بنکے پھول
کھلتے ہیں لے دبیر نہال سخن سے پھول
میں لیئے بیٹھا ہوں تصویرِ خیالی ہاتھ میں
ہتھکڑی پڑتی نہیں اس لاؤبالی ہاتھ میں
ایک پیسہ اشرفی ہو جائے خالی ہاتھ میں
سب عرض مطالب مری صورت سے عیاں ہے
پر نور کا جلوہ ترا ہر شے میں عیاں ہے
ہے جائے تعجب نہ مکیں ہے نہ مکاں ہے
اب اِنکا زمیں پر نہ کہیں نام و نشاں ہے
گراں اِس بوسۂ لب کا یہاں دیکھیں کہانتک ہے
آنکھیں لگی ہوئی ہیں یہاں فرش راہ سے
پالا پڑا ہے جیسے تری زلفِ سیاہ سے

اُچٹ جاتا ہے خنجر چلتے چلتے دستِ قاتل سے
نِکل آئی ہیں پتھر کی لکیریں سرنوشت اپنی

داغ کھائے، رنج پائے، غم اُٹھائے، عندلیب
دُور ہو کم بخت، بختِ نارسائے عندلیب

کون سنتا ہے چمن میں نالہائے عندلیب
اُڑ گیا بادِ خزاں میں طایرِ رنگ چمن

ہمصفیرانِ چمن کو قیدیوں کی کیا خبر
ایک تو ہے بیوفا تجھ میں نہیں بوئے وفا

یہ غزل اپنی پسند خاطرِ عشاق ہے
کسقدر ہے دلکش و جانکش مقامِ کوئے دوست

کِس طرح رضواں سے ہو نا اہتمامِ کوئے دوست
اے فلک کیا پُوچھتا ہے تو مقامِ کوئے دوست

اللہ اللہ ازدحامِ خاص و عامِ کوئے دوست
اہتمامِ خلد پر ہے ناز رضواں کو اگر

سب طرف سے دیدۂ باطن کو جب یکسو کیا
کردیا محشر بپا اُسکے خرامِ ناز نے

ہو مبارک زاہدوں کو نزہتِ گلگشتِ خلد
تعزیر کے قابل ہیں ابھی اہل زمیں اور

لِلّٰہ ذرا صبر کرلے جانِ حزیں اور
رہتے نہ ترے سایۂ میں اے چرخ برین ہم

تم آئینہ خانے میں ذرا جاکے تو دیکھو

بنایا سخت جانی نے تہ شمشیر پتھر کا
الٰہی دے مجھے اب ناخنِ تدبیر پتھر کا

دِل لگا کر گل سے کیا پھل پھُول پائے عندلیب
گوشِ گُل تک بھی نہ پہنچائی صدائے عندلیب

ہے عبث نقار خانے میں صدائے عندلیب
رہگیا تکتا ہوا اثیرِ دعائے عندلیب

کون پہنچائے چمن تک نالہائے عندلیب
دیکھ تُو ہر گل ہے پابند رضائے عندلیب

ہے دبیر اس میں سراسر ماجرائے عندلیب
چلدیئے دنیا سے ہم سنتے ہی نامِ کوئے دوست

خلد سے بڑھکر ہے عز و احترام کوئے دوست
سطحۂ عرشِ بریں ہے زیرِ بامِ کوئے دوست

ہو نہ ہو ہنگامۂ محشر ہے نامِ کوئے دوست
دیکھ جائیے آکے حسنِ انتظامِ کوئے دوست

پھر جدھر دیکھا نظر آیا مقامِ کوئے دوست
نفسی نفسی کہہ اُٹھا ہر خاص و عامِ کوئے دوست

جھانکتے ہیں اسطرف کب خوش خرامِ کوئے دوست
پامال ہم انھیں شوق سے کر چرخ بریں اور

باقی ہے ابھی ایک دمِ بازپسیں اور
اے کاش جو ہوتی کہیں دو ہاتھ زمیں اور

ہاں پھر بھی یہ کہنا کہ ہمارا سا نہیں اور

سربرآوردہ رہا اسکول میں تو جس طرح	کرکٹ و فٹ بال میں بھی ویسے ہی ممتاز تھا
اب نہ تو ہے اور نہ کالج میں ترا کوئی نشاں	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

دبنگ

دبنگ - حافظ سراج احمد پھکڑ باشندہ مُراد آباد یہ ایک شعر اُن کا قابل اندراج ہاتھ آیا

شیخ جی کا بھی انتقال ہوا	کوئی دنیا میں مسخرا نہ رہا

دبیر

دبیر - منشی محمد ابراہیم خلف منشی ذوالفقار علی، نکوڑ تحصیل رڑکی ضلع سہارنپور وطن ہے حضرت ظہیر دہلوی سے تلمذ ہے، بارہ تیرہ برس کا عرصہ ہوا حضرت ظہیر جب راقم کی استدعا پر کامل تیس ۳۰ سال بعد دہلی اپنے وطن دس بارہ روز کے لیئے تشریف لائے اون ایام میں انکا کلام بھی حضرت ظہیر نے تذکرہ کے لیئے عنایت فرمایا تھا اور ارشاد کیا تھا کہ اگرچہ میری شاگردی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا، تاہم یہ نوجوان ذہین اور طباع اور ہوشیار معلوم ہوتا ہے، اسکے بعد کچھ کلام براہِ راست اور کچھ حضرت ظہیر نے وقتاً فوقتاً ارسال فرمایا جس کا خلاصہ درج ہے انکی عمر اب بیالیس سال کے قریب ہوگی، شعر کا سلیقہ اچھا ہے، اور مذاق شستہ اور سلیم پایا ہے، بندش چست اور تراکیب موزوں اور خوش اسلوب ہوتی ہیں، روزمرہ کی صفائی کے ساتھ نازک خیالی کا لطف بھی موجود ہے، سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں زورِ طبیعت سے اچھے اچھے مزیدار مضمون نکالتے ہیں،

بنے واماندگی سے کیوں دُعا کا تیر پتھر کا	مگر رکھتا ہے دل وہ کافرِ بے پیر پتھر کا
گرانباریٔ غم کا جب بیاں کرتا ہوں حسرت سے	بنا دیتی ہے سامع کو مری تقریر پتھر کا
کیا ہے قتل مقتل میں ہزاروں بیگناہوں کو	کلیجا رکھتی ہے ظالم تری شمشیر پتھر کا
صدائے شور وغل زنداں سے اب ہرگز نہ آئیگی	ترا دیوانہ ہو بیٹھا مع زنجیر پتھر کا
خدا یا بت پرست ایسا ہوں اپنی جان تک دیدوں	ذرا مانگے تو منہ سے چہرۂ تصویر پتھر کا
نہ صرف آنکھیں ہی پتھرائی ہیں اے بت دیکھکر تجکو	سراپا ہو گیا ہوں صورتِ تصویر پتھر کا
اثر صحبت کا ہوتا ہے بلاشک اے بت کافر	بنا دے کیا عجب مجھکو تری تاثیر پتھر کا

جسکی کل مسند نشینی کی سنی تھی خوش خبر
لُطف جینے کا اُٹھایا تھا نہ یوسف نے ابھی
جسقدر ارمان دل میں تھے وہ دل میں رہ گئے
رحم آیا اے فلک تجکو نہ اُس کے حال پر
کسکو دُنیا سے اُٹھایا اے خدا نا ترس موت
کونسے تاریک بادل میں چھپا ہے چاند وہ
اے گلِ مشکیں نفس کیوں آگئی تجھ پر خزاں
تیرے مرنیکا زمانہ تھا نہ یوسف خاں ابھی
باغِ عالم میں نہ دیکھی تھی ابھی تیری بہار
داستاں تیری کیئے دیتی ہے دلکو پاش پاش
وہ تنِ نازک ترا زخموں سے ہو کر چُور چُور
جان دی ہوگی نہیں معلوم کس تکلیف سے
تیرے قاتل نے نکی بچپن پہ بھی تیرے نظر
چھوڑ کر کالج چلا تھا جبکہ تو سوئے وطن
وہ دمِ رخصت ترا رو رو کے جانا یاد ہے
کہہ رہی تھیں حسرت آلودہ نگاہیں تیری صاف
اپنے واپس آنے کا آنا نہ تھا تجھ کو یقین
کچھ دلاسوں کا نہ ہوتا تھا ترے دل پر اثر
اب یہ ثابت ہوگیا تیرا ہی کہنا تھا درست
غیر ممکن ہے کہ تجھکو بھول جائیں جلد ہم
جس طرح کھیلوں میں تھا حاصل تجھے رطولی

وائے قسمت آج ہم لکھتے ہیں اُس کا مرثیا
اُس کا مرنا ہر طرح بیوقت و بے ہنگام تھا
زیست کا افسوس ہے کچھ بھی نہ حظ حاصل ہوا
تو نے کس موتی کو خاک و خون میں غلطاں کیا
دل بھر آتا ہے یہ کس سے جہاں خالی ہوا
دفعتہً آنکھوں کے آگے کیوں اندھیرا چھا گیا
اے خزاں اُس پھول کو پامال کیوں تو نے کیا
کھائی ہوتی کوئی دن تو اور دنیا کی ہوا
ہائے کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ تو مرجھا گیا
مُنہ کو آتا ہے کلیجا واقعہ سُن کر تیرا
بے کفن بے گور خاک و خون میں ہوگا پڑا
کیا اذیت ہوگی جب سینے میں دم ہوگا رکا
جسنے تیرا خون بہایا کون وہ بیدرد تھا
ہے ہمارے سامنے ابتک سماں اُس روز کا
دل سے جانیکا نہیں اُس دن کا وہ جانا ترا
ہو رہا ہے تو ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا
سب تجھے سمجھا رہے تھے اور تو مایوس تھا
بند ہوتا تھا نہ ہرگز آنسوؤں کا سلسلا
تھا غلط جو کوئی کہتا تھا کہ پھر تو آئے گا
مدتوں ہوتا رہے گا ذکر کالج میں ترا
ایسی ہی علمی ترقی کا بھی تجھکو شوق تھا

مرثیہ سردار یوسف خان بلوچستانی طالب علم علیگڈھ کالج ۱۸۹۶ء

خشک اور ویران صحرا میں بلوچستان کے / اِک کھِلا تھا پھول نازک اور نہایت خوشنما
باغبانِ دہر نے دیکھا نہ ہوگا کوئی پھول / اُس سے بہتر پُر فضا اور دلفریب اُس سے سوا
گلشنِ عالم میں لاکھوں گل کھِلے ہونگے مگر / کم ہوا ہوگا کوئی اُس سے زیادہ دلربا
لیکن اُسکے واسطے موزوں نہ تھی وہ سرزمین / وہ گلِ تر ایسے ریگستاں کے قابل نہ تھا
نامناسب تھی وہانکی خاک اُسکے واسطے / تھا مضر پانی وہاں کا اور مخالف تھی ہوا
کرکے اُسپر غور آخر ایک ذی تدبیر نے / وہاں کے خار وخس سے اُس گل کو علحدہ کرلیا
سرزمینِ ہند میں اک باغ دیکھا پر بہار / مختلف اقسام کے پھولوں سے جو معمور تھا
بوئے جنسیت وہاں کی آب وگل میں دیکھکر / اُس گلِ نوخیز کو اُس باغ میں لاکر رکھا
اُس چمن میں کھل رہے تھے پھول صدہا رنگ کے / جنکی بوئے خوش سے تھا سارا جہاں مہکا ہوا
مہرباں تھا باغباں اور بار آور تھی زمین / موسم گل جوش پر تھا راس تھی آب وہوا
چونکہ واں سامان ایسے روح پرور تھے بہم / رات دن ہوتی گئی اُس گل کی شادابی سوا
حسن وخوبی میں ترقی دمبدم ہونے لگی / تازگی بڑھتی گئی ہوتی گئی زائد جلا
حیف چرخ کینہ ور نے ظلم پر باندھی کمر / کردیا گلشن سے اُسکو وقت سے پہلے جدا
رنگ وبوئے اُسکے دکھلائے نہ تھے جوہر ابھی / ہونے پایا تھا نہ کامل طور سے نشو ونما
لیگئی قسمت اُسے پھر کھینچکر سوئے وطن / جو کسی پہلو سے اُسکے واسطے موزوں نہ تھا
پھر وہی موجِ بلا انگیز تھی چاروں طرف / پھر اُسی طوفانِ آفت خیز کا تھا سامنا
لیکن اِس گل کو کہاں اُن سختیونکی تاب تھی / ایک ہی جھونکے میں آخر کار وہ مرجھا گیا
جس چمن میں [illegible] وہ گلِ رعنا رہا تھا چند روز / آج تک اُسکی جدائی کا ہے واں ماتم بپا
گل گریباں چاک ہیں اُسکے غم فرقت میں سب / ڈھونڈتی پھرتی ہے ہرسو اُسکی نکہت کو صبا
ہے یہ مجمل ہی بیاں کافی سمجھنے کے لیے / اِسکے کہنے کی ضرورت کیا کہ وہ گل کون تھا

"میں شتر خانے کا منشی ہوں" یہ کہتے تھے وہ | کہہ گئے گھبرا کے یوں "ہوں منشی خانے کا شتر"

زمزم

ایک دن کچھ آدمی بیٹھے ہوئے | کر رہے تھے گفتگو باہم دگر
اُن میں تھا اِک شخص ایسا بھی کہ جو | کر چکا تھا غیر ملکوں کا سفر
ہوتے ہیں چالاک جیسے لوگ سب | وہ مگر اوروں سے تھا چالاک تر
جھوٹ کہتا تھا مگر سچ کی طرح | اُسکی باتیں تھیں نہایت پُراثر
ہو رہا تھا تذکرہ ہر قسم کا | کر رہے تھے بحث ہر مضمون پر
باتوں باتوں میں کہا سیاح نے | میں عرب میں بھی رہا ہوں سال بھر
سُنکے یہ بات اور تو سب چپ رہے | سب نے اُسکا قول سچ سمجھا، مگر
ایک کے دل میں یہ شک پیدا ہوا | کیا تعجب جھوٹ کہتا ہو اگر
اِس سے کچھ حالات واں کے پوچھیے | سوچ کر یہ اُس نے قصہ مختصر
اُن سے پوچھا آپکا ہوتا تھا واں | خدمتِ زمزم میں بھی گاہے گذر
سُن کے اُسکے منہ سے یہ سیاح نے | سمجھا زمزم نام ہے کوئی بشر
بولے جی ہاں اُنکی خدمت میں تو میں | روز حاضر ہوتا تھا وقتِ سحر
آج دنیا میں نہیں اُنکا جواب | ہے تقدس ختم اُنکی ذات پر
اب تو بوڑھے ہوتے جاتے ہیں بہت | کیوں نہوں ہیں بھی تو ستر سے اُدھر
سن کے یہ سب نے لگایا قہقہہ | اور کہا تم کو نہیں یہ بھی خبر
اِک کنوئیں کا نام ہے زمزم وہاں | آپ یہ سمجھے کہ ہے کوئی بشر
جب نہ بن آئی کوئی معقول بات | تب کہا سیاح نے یوں جھینپ کر
اُس زمانے میں تو تھے وہ آدمی | ہو گئے ہونگے کنوئیں اب کیا خبر

خود مجکو تجربہ ہے بس اتنا بیاں کروں — خالق بچائے ایسے شریروں کے وار سے

بند مخمسہ

طاقت تو رنج اٹھانے کی ہم میں رہی ہے کب — تاب و توان و ضبط گئے دل کے ساتھ سب
غم جھیلنے کا آپ ہی کچھ پڑ گیا ہے ڈھب — اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

دیگر

تیرے نزدیک ہیں سب ایک سے کعبہ ہو کہ دیر — تجھکو اپنوں سے کوئی انس نہ بیگانوں سے بیر
تیری محفل میں بھی رہتی ہی عجب طرح کی سیر — یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر
تو تو اچھا ہے مگر تیرے بُرے ہیں برتاؤ

دیگر

ہو کے باہم عہد و پیماں رہ گئے — پُورے ہوتے ہوتے ارماں رہ گئے
مُنہ سے کہتے کہتے وہ "ہاں" رہ گئے — وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

مسدس

غور کر دل میں ستمگر یہ جفائیں کب تک — ظلم کی حد بھی کوئی ظلم اُٹھائیں کب تک
شکوۂ جور و ستم لب پہ نہ لائیں کب تک — دل میں جو آگ لگی ہے وہ دبائیں کبتک
شرح ایں آتش جاں سوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم ایں برق نہفتن تا کے

بند مخمسہ

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انسان — پہلے یہ دیکھے وہ اُس کام کے ہے بھی شایاں
سُنکے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داؤد کے یہاں — اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپکی اور آپکے گھر کی صُورت

گھبراہٹ

کیا بُری شے ہے یہ گھبراہٹ بھی جس میں آدمی — آپ کچھ کہتا ہے مُنہ سے کچھ نکلتا ہے مگر
ایک منشی سے شتر خانے پہ جو مامور تھا — پُوچھا اک انگریز نے نوکر ہو تم کس کام پر
بات تو کچھ بھی نہ تھی، لیکن نہیں معلوم کیوں — ہو گئے اُسوقت وہ سُنکر پریشاں اسقدر

نقد دل دیکے جو اندوہ والم مول لیا
شوق دیدار نے فرقت میں سزا دی اچھی
آج ہو گی مرے نالوں کی فلک سے مٹھ بھیڑ
خود میں حیران ہوں یہ کیا مجھے سودا اٹھا
سیکڑوں بار میں بے چینی سے بیٹھا اٹھا
اب کوئی دم میں سنو گے کہ یہ پردا اٹھا

زندگی تلخ ہے اب ضبط کئے سے حاصل | صبر کرتے تھے رہے صبر کے جبتک قابل
ہو گیا کثرتِ اندوہ سے جینا مشکل | حال بیحال کئے دیتی ہے بیتابیِ دل

اب خموشی سے زیادہ خفقان ہوتا ہے | آخر افسانۂ غم آج بیان ہوتا ہے

اس عشق کے طفیل لڑائی رہی سدا | تقدیر سے، رقیب سے، ناصح سے، یار سے
انصاف کی یہ بات ہیں پھر کیا گلہ کروں | جب ڈالدے وہ ہاتھ گلے میں پیار سے
کیوں ہو نہ زلفِ یار کو تارِ کمر سے ربط | دستور ہے کہ ملتے ہیں سب رشتہ دار سے
رہزن ادہر اوا ہے اُدہر زلف پر شکن | یارب بچائیو مجھے اس لوٹ مار سے
قربان عشق کے کہ ہم آزاد ہو گئے | قید حیا سے، شرم سے، ذلت سے، عار سے

قطعہ
جانا وہ اُنکا صبح شبِ وصل ہائے ہائے | نیچی نظر کئے ہوئے اور شرمسار سے
کچھ کچھ وہ پیچ زلف سیہ کے کھلے ہوئے | وہ لال لال آنکھوں میں ڈورے خمار سے
فرطِ حیا سے گردنِ نازک میں خم ذرا | جوشِ غضب وہ سینے پہ کچھ کچھ ابھار سے
کب تھا وفورِ خواب سے کچھ تن بدن کا ہوش | بیخود سے، بیحواس سے، بے اختیار سے

برہم ہوئی وہ بزمِ شبِ وصل ہو چکی | بیٹھے ہیں پھر فراق میں ہم سوگوار سے
میری طرف سے آپکے دل میں ہے کیوں غبار | تقصیر ایسی کیا ہوئی اس خاکسار سے
ناصح کی گفتگو سے مرا ناک میں ہے دم | آتے ہیں دیکھئے شترِ بے مہار سے
یہ جھوٹ اور ہمسے بس اب رہنے دیجئے | ہم بھی تو رات جھانک رہے تھے دراڑ سے

قطعہ
سُن کر پیامبر سے مرا نام یوں کہا | وہ ہی نہ دبلے پتلے نحیف و نزار سے
معلوم ہے مجھے بڑے استاد ہیں جناب | یوں دیکھنے میں سیدھے سے پرہیزگار سے

طبع کے لیے لکھیں، بعد سندیابی کالج ہی میں معلم مقرر ہوئے، پھر صاحب پرنسپل کی سفارش سے نائب تحصیلدار مقرر ہوگئے اور تحصیل اترولی و آگرہ و کاسگنج و مین پوری میں قائم مقام نائب تحصیلدار رہے، اور بالآخر فتح آباد ضلع آگرہ میں جاکر مستقل عہدہ پایا، وہاں انھوں نے دو برس تک نہایت قابلیت سے کام انجام دیا۔ اِنکے حُسنِ اخلاق، دیانت اور حفظ مراتب سے سب حاب اِن سے رضامند رہتے تھے، شعر سے شوق تھا۔ اکثر مشاعروں میں شریک ہوا کیے، اور طرحی غزلیں پڑھیں۔ قدیم اور جدید دونوں شاہراہوں کے سالک تھے۔ اشعار سے خصوصاً مرثیہ سر ڈاریوسف خاں سے انکی غیر معمولی لیاقت اور معاملہ بندی اور مضمون پسند فکر کا رنگ مترشح ہے، حق یہ ہے کہ یہ مرثیہ اپنے رنگ میں فرد ہے۔ مثنوی "شکوۂ یار" نامی اور "ایک سچے کی دوستی کا امتحان" اِنکی تصنیف ہیں اور یہ دونوں تصانیف اِنکی چھپ کر شایع ہوئیں۔ مولنا حالی کے اکثر اشعار کو تضمین کیا ہے، بلا کے ذکی و ذہین تھے۔ اِنکے کلام سے اِنکی شوخی، اور طبیعت داری، ذکاوت ٹپکتی ہے، تھوڑی سی مشق میں بہت اچھا ملکہ پیدا کرلیا تھا، اگر زندگی وفا کرتی تو کیا عجب کہ اس فن میں بھی نام و نمود حاصل کرتے بڑی تلاش سے کچھ کلام ملا اس کا انتخاب درج ذیل ہے ؎

جب پئے سیرِ چمن وہ گلِ رعنا اُٹھا		پائے بوسی کے لئے خواب سے سبزہ اُٹھا
بزم میں غیر کے اُٹھ جانے کی تشویش فضول		اُس کا اب ذکر ہی کیا جو کوئی اُٹھا اُٹھا
جب دمِ نزع مجھے پاؤں رگڑتے دیکھا	ق	ہاتھ ملتا ہوا بالیں سے مسیحا اُٹھا
مَیں نے جب وادیٔ غربت میں رکھا اپنا قدم		خار پا بوسی کی خاطر بہ تمنا اُٹھا
پئے تسلیم درختوں نے جھکائیں شاخیں		میری تعظیم کو جنگل میں بگولا اُٹھا
آندھیاں آئیں ہوا خواہی کا دم بھرنے کو		خیر مقدم کا ہر اک سمت سے غوغا اُٹھا
پیشکش خاک لئے اکسیر کی زرد ذرّوں نے		کچھ نہ کچھ لیکے ہر اک ساکنِ صحرا اُٹھا
طرب و عیش کا سامان کیا تھا بھاری		کیا کہیں ابر ہی تقدیر سے ہلکا اُٹھا

کلیجا کچھ ہوا ٹھنڈا اُسوقت میرے قاتل کا ڈبو دیگا زمانے بھر کو وہ طوفان آئے گا	لہو ہیں دیکھے جب ڈوبے ہوئے تیر ستم نکلے جو دو آنسو بھی تیرے ای غریق بحر غم نکلے

داؤد

داؤد۔ ندیم الدولہ خلیفۃ الملک حافظ محمد داؤد خاں بہادر داؤد مستقیم جنگ دہلوی معروف بہ حافظ داؤد" بہادر شاہ ثانی نے انکے والد حافظ محمد خلیل سے قرآن شریف پڑھا تھا۔ خود حافظ صاحب نہایت عالی حوصلہ سخی اور باہمت رئیس تھے۔ درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی میں ایک وسیع باؤلی سنہ ۱۲۶۳ھ میں بنوائی جس میں قریب پچیس تیس ہزار روپیہ کے لاگت آئی ہوگی، بازار چاوڑی میں ایک وسیع مکان معروف بہ "حافظ داؤد کا کمرہ" ابتک اُنکی یاد دلاتا ہے۔ اب بیگم صاحبہ وجانہ کی ملکیت ہے، یہ خود ابتدائے تخت نشینی ابوظفر سے غدر تک داروغگی نذر ونیاز اور علاقہ خانساماتی شاہی سے مشرف رہے۔ دو چار غزلیں حافظ قطب الدین مشیر اپنے عزیز کے مشورہ سے کہیں تھیں سنہ ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا۔ طبیعت موزوں تھی مگر شعر کم کہتے تھے یہ چند شعر اُنکے نتائج افکار سے درج ہیں +

نگہ سے، ناز سے غمزے سے اور اداسے بھڑکے	بزورِ عشق نہ ہم کوسنی بلا سے بھڑکے
گو بظاہر نہ مُنہ دکھاؤ گے	کیا کبھی خواب میں نہ آؤ گے
مر چکا داؤد کب کا اُسکے غم میں ہمنشین	دم چرانے کا ابھی تک اُس صنم کو دھیان ہے

داؤد

داؤد۔ مولوی محمد داؤد ابن مولوی علی محمد صاحب وکیل عباسی متوطن امروہہ بتاریخ ۲۷ رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۰ ہجری بمقام امروہہ پیدا ہوئے اور بتاریخ ۱۷ جون سنہ ۱۹۰۱ء بمقام فتح آباد انتقال کیا اور اُسی قصبہ میں احاطۂ عیدگاہ میں مدفون ہوئے۔ ابتدائے عمر میں عربی فارسی کی تحصیل کی۔ بارہ سال کی عمر میں محمڈن کالج علیگڈھ میں داخل ہوئے طبیعت کو درد ومحبت وزندہ دلی کے عناصر کا بڑا حصہ ملا تھا۔ بارہ سال وہاں تعلیم پاکر ۲۴ برس کی عمر میں سندِ بی اے حاصل کی۔ ایام طالب علمی ہی میں شعر وسخن کا چسکا لگ گیا، اور طبیعت کی شوخی اُس رنگ کو اور بھی اُڑا لے گئی۔ اکثر نظمیں دوست احباب کی تفریح

سکھاتی ہی تمنائے شہادت میرے قاتل کو
جفا سے قتل تم کرنا وفا پوچھے مگر جانا

تا قیامت رہے یہ داغِ محبت دل میں
گھر کی زینت ہے جُدا روشنیٔ خانہ جُدا

اُسکو کیوں بیہوش کرتی ہو ہوائے کوئے دوست
بس گئی جسکے مشامِ جان و دل میں بوئے دوست

جس جگہ ہے قبر مجھ سے عاشقِ ناشاد کی
آسمان کی جان ہو اُتنی زمینِ کوئے دوست

آسمان کی ہر شکایت میں گلہ ہے یار کا
سمتِ دشمن آنکھ ہو روئے سخن ہو سوئے دوست

کچھ تجھی پر نہیں موقوف سبھی دیتے ہیں رنج
درد بھی مجھکو ستاتا ہے تری خو ہو کر

اے گھٹا جلدی برس کس کا تجھے ہی انتظار
شور ہو پھر میکشوں کا خانۂ خمار میں

دل لیئے در پر کھڑے ہیں دیر سے عاشق حضور
پیشکش ہو جائے انکی نذر بھی سرکار میں

خوش نصیب اسمیں ہو معلوم نہیں کون اے دل
جسکو وہ شاد کریں یا جسے ناشاد کریں

دیکھکر بد حال میں مجنوں کو، لیلیٰ نے کہا
کونسی اِس مرے دیوانے میں ہشیاری نہیں

جل چکا پروانہ جب اے شمع پھر روئی تو کیا
قابلِ تسکین عاشق تیری غمخواری نہیں

پھول سی شکلوں سے پھولونکا سبد قبریں نہیں
موت سا گلچین گلزارِ جہاں کوئی نہیں

حکایت دردِ دل کی دردِ دل ہے
اے ظالم میں در گزرا بیاں سے

ابتدائے شب ابھی تو ہے فراقِ یار کی
رات یہ جتنی بڑھے گی داغ جلتے جائینگے

کیا کیا ہمنے یہاں آئے تھے ہم کسواسطے
جائینگے دنیا سے جبدم ہاتھ ملتے جائینگے

جو شبِ وصل ان آنکھوں سے نسماں دیکھا ہو
تمنے موسیٰ وہ سرِ طور کہاں دیکھا ہے

دل کو دنیا سے اُٹھائے ہوسے میں بیٹھا ہوں
نہیں معلوم وہ کس وقت مجھے یاد کرے

ضبط میں اُسکے بھی تاثیر کوئی ہے کہ نہیں
جو زمانے کے ستم سہکے نہ فریاد کرے

ہے اُسی کے لیے مخصوص زمانے کی خوشی
دل کو جو دیکھ کے آئینۂ غم شاد کرے

کھینچتا ہوں میں درِ کعبہ و بتخانہ پر
کوئی بُت راہِ خدا میں مجھے آزاد کرے

ہزاروں حال بدلے سیکڑوں پہلوے غم نکلے
مریضانِ محبت کے بڑی مشکل سے دم نکلے

کلام درج ذیل ہے۔

یہ دل محفوظ تھا سینے میں میرے کس حفاظت سے	چُرا لیا تیری آنکھوں نے اِسے کیسی شرارت سے
جو یاد آتے ہیں صدمہ ہجر کے دل کانپ جاتا ہے	شبِ غم ہم نے رو رو کر سحر کی ہی کس آفت سے
قدم اُٹھنے نہیں دیتی گناہوں کی گرانباری	نظر اونچی نہیں ہوتی ہی اے دانش ندامت سے
ساقی سے کہو دور میں ساغر آئے	ہاں دخترِ رز خوب نکھر کر آئے
لائی ہے انھیں بھی مے انگور کی تاک	واعظ بھی یہاں آنکھ بچا کر آئے

دانش

دانش حکیم میرزا فدا احمد صاحب خلف حکیم مرزا غلام عباس آپکی ولادت ۱۲۷۰ھ میں بمقام لکھنو ہوئی آپکے والد نے آپکو صغر سنی کیحالت میں یعنی صرف نو برس کی عمر میں چھوڑ کر قضا کی اُنکے سوم کے روز جناب مرزا بہادر ناظم صاحب نے انکو تعلیم و تربیت کیلئے مرزا محمد جعفر کے سپرد کیا اُنکے داماد حکیم میر علی ضامن شوق خلف رشک مرحوم کے فیض صحبت سے انھیں شاعری کا چسکا پڑ گیا اور شروع میں اُنھیں سے اصلاح کا سلسلہ رہا، اِس عرصہ میں دیگر علماء سے استعداد علمی کی تکمیل کی۔ اور پھر کامل تیس سال تک طلباء کو درس دیتے رہے، تاریخ گوئی کی بھی مشق ہے جب خاصہ ملکہ ہو گیا تو جلال مرحوم سے اصلاح لینے لگے بیس پچیس شاگرد بھی ہیں۔ تلاش الفاظ اور بندش کا سلیقہ قابل داد ہے۔ اور مضمون پیدا کرنے کا خیال رکھتے ہیں اب مشق سخن کو ۳۰ برس کا زمانہ ہو گیا کمیٹی رسالہ معیار کے ممبر اور صاحب استعداد کہنے والوں میں ہیں۔

بجز اُس قاتل بیرحم کے دیکھے کا کیا کوئی	تڑپنا قلبِ مضطر کا پھڑکنا مرغِ بسمل کا
ہماری آہِ عالم سوز پر وہ خوب ہنستے ہیں	ابھی بھولا نہیں جبکا ہمیں بجلی سے ڈجانا
سمجھا تی ہجر یار میں کس کسکو چشم تر	دل بیقرار تھا تو جگر نا صبور تھا
پابندِ حکمِ ضبط تھے بگڑے نہ ناشکِ درد	آنکھوں کی کچھ خطا تھی نہ دلکا قصور تھا
جگر سے قدر داں کے بعد لطفِ شاعری کیسا	غزل لکھنے کو اے دانش نہیں اُٹھتا قلم میرا
بجز اُس قاتل بیرحم کے دیکھے گا کیا کوئی	تڑپنا قلبِ مضطر کا پھڑکنا مرغِ بسمل کا

خنجر یار کے گلے مِل کے گور سائی نہیں وہاں اپنی	ہم نکالیں گے حوصلے دل کے رُوح پھرتی ہے گردِ محفل کے
جوبن کا اشارہ ہے ڈوپٹہ سے کسی کے	کس طرح چھپاؤ گے اگر ہم اُبھر آئے

دانش

دانش - قاضی محمد بشیر الدین خلف اصغر قاضی محمد رمضان علی، وطنِ قدیم سکندرآباد ضلع بلند شہر ہے - آجکل اجمیر میں جاگیر حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کامدار ہیں - نوجوان شریف اور تیز طبع ہیں، قاضی نجم الدین برق شاگرد رشید مومن خان انکے حقیقی تایا تھے - قاضی صاحب کا ہنوز عنفوان شباب ہے اور فن سخن کی ابتدا ہے - آختر سہارنپوری سے تلمذ اختیار کیا ہے - کلام ملاحظہ ہو -

وہ دل چُرا کے نظر بھی چُرائے بیٹھے ہیں تماشا ہو ترے در پر ترے جانباز یوں آہیں وہاں پہلے ہی وہ اپنے نگہباں آپ بن بیٹھے نہ خود آؤ نہ تم تصویر ہی اپنی یہاں بھیجو اللہ رے درازی اُس زلف دلربا کی کچھ لب ہی جانتے ہیں کچھ دل ہی جانتا ہے اب دل پہ آبنی ہے اب جاں پہ آبنی ہے	پرائے مال کو کیسے چھپائے بیٹھے ہیں کسی کے ہاتھ میں دل ہو کسی کے ہاتھ میں سر ہو بھلا پھر ہم غریبوں کی رسائی ہو تو کیونکر ہو تمہارے دیکھنے والوں کو پھر تسکین کیونکر ہو بڑھ بڑھ کے آج باتیں کرتی ہے آسماں سے بوسوں کی لذتوں کو پوچھو مری زباں سے اِس آپکے ستم سے اِس جور آسماں سے

دانش

دانش - حافظ محمد بشارۃ الحق صاحب دانش، مولوی نور الحسن نازش کے بیٹے اور حکیم سید اولاد علی صاحب کاہش مرحوم کے پوتے تھے - آپکے بزرگوں کا وطن جونپور ہے - صاحب گنج میں ایک مسجد کے امام تھے اور اُسی مسجد میں اپنے اہتمام سے ایک مدرسہ تعلیم دینیات کا قائم کر رکھا تھا جس میں خود درس دیتے تھے - چند مذہبی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں - فن شاعری میں سید شاہ محمد اکبر صاحب ابو العلائی داناپوری سے استفادہ کرتے تھے - عین عنفوانِ شباب میں سنہ ۱۳۲۹ ہجری میں وفات پائی مختصر

دانا

دانا منشی روشن لال خلف منشی رائے کالیستھ باشندہ لکھنو نواب عاشور علی خان بہادر کے شاگردوں میں تھے اور سنہ ۱۲۷۴ھ میں حیات تھے۔ چند شعر ملے درج کئے گئے۔

آتی نہیں جو زلفِ گرہ گیر ہاتھ میں
سودائیو! لپیٹ لو زنجیر ہاتھ میں

دیکھے بغیر چین مجھے ایکدم نہیں
رہتی ہے رات دن تری تصویر ہاتھ میں

آہن کو مس کہ جس جو کیا بن گیا طلا
ایسی ہے میرے یار کی تاثیر ہاتھ میں

دانش

دانش منشی تصدق حسین دانش خلف مولوی لُطف علی متوطنِ نواح جونپور میر مونس کے شاگرد اور سررشتہ دار ججی اعظم گڈھ ہیں، سن شریف قریب ۵۰ برس کے ہے یہ اُنکے اشعار ہیں۔

صفتِ حور کہاں تک میں سنوں واعظ سے
ذکر کرتا ہے صُراحی کا نہ پیمانوں کا

اے شہِ حُسن ہُوا عصر کا قاروں میں بھی
دِل سے نکلا نہ خزانہ مرے ارمانوں کا

وہ میری ملاقات کو آئے مرے گھر آج
مدّت میں دعاؤں نے دکھایا ہے اثر آج

درپیش ہے بتخانہ و کعبہ کا دوراہہ
اب وحشتِ دل دیکھئے لیجائے کدھر آج

اُداسی چھارہی ہے شمع بالیں کو ترستی ہے
مزارِ کشتۂ اُلفت پہ اک حسرت برستی ہے

تم اتبک واعظو! پتھر کے بوسے جا کے لیتے ہو
مقرر خانۂ کعبہ سے پیدا بُت پرستی ہے

غرض کیا خضر سے رہبر جنوں ہے دشتِ غربت میں
کُھلیں ہیں صاف یہ راہیں بلندی ہے نہ پستی ہے

آکر مریضِ عشق کا لاشہ اُٹھائیے
مردے کو اپنے آپ مسیحا اُٹھائیے

دانش

دانش حکیم احمد حسین خان دانش لکھنوی شاگرد احسان شاہجہاں پُوری۔ کلام معمولی درجہ کا ہے۔ انتخابِ کلام یہ ہے۔ باوجود کوشش حالات نہیں ملے۔

کہوں میں اُس سے دل کا مدّعا کیا؟
جو جھلّا کر کہے تُو نے کہا کیا؟

رہی محمل نشیں بیجا سے لیلےٰ
رہ گیا پردہ قیس کے دِل کا

تیر چھوڑا مرے سینے کی طرف آخر کا
لو پسند آہی گیا اُنکو نشانہ دل کا

الم میں، درد میں، آہ و بکا میں
پڑا ہے ایک دل کس کس بلا میں

ادا ادا سے تری کھچ رہی ہیں تلواریں		نگہ نگہ سے چھری پر چھری نکلتی ہے
سمجھ تو لیجئے۔ کہنے تو دیجئے مطلب		بیاں سے پہلے ہی مجھ پر چھری نکلتی ہے
یہ دل کی آگ ہے یا دل کے نور کا ہے ظہور		نفس نفس میں مرے روشنی نکلتی ہے
صنمکدہ میں بھی ہے حسن اک خدائی کا		کہ جو نکلتی ہے صورت پری نکلتی ہے
غمِ فراق میں ہو داغ اسقدر بیتاب		ذرا سے رنج میں جان آپکی نکلتی ہے
بزم سے میکے اُٹھانے کے لیئے		پوچھتے ہیں آپ کو کچھ کام ہے
جو چھید ڈالے دل کو تمھاری نگاہ ہے		جو پیس ڈالے دل کو تمھارا خرام ہے
مجرم بتوں کا بھی ہوں خدا کا بھی چور ہوں		دونوں میں عذر ہے ایک گنہ گار کے لیئے
ہمت کا ہارنا نہ مصیبت میں چاہیئے		تھوڑا سا حوصلہ بھی طبیعت میں چاہیئے
آجائے راہِ راست پہ کافر ترا مزاج		اک بندۂ خدا تری خدمت میں چاہیئے
حاتم کا دل ہو۔ دولت قاروں ہو۔ عمر خضر		اے داغ یہ کسی کی محبت میں چاہیئے
دل دو طرح کا تیری محبت میں چاہیئے		راحت میں ایک ایک مصیبت میں چاہیئے
کچھ لاگ کچھ لگاؤ طبیعت میں چاہیئے		دونوں طرح کا رنگ محبت میں چاہیئے
اپنا بھی کام نکلے وہ ناراض بھی نہ ہوں		ایسے مزے کی بات شکایت میں چاہیئے
نقشے ہیں یہ اب دیدۂ دیدار طلب کے		رہ جاتی ہے پلکوں میں نگہ ضعف سے دب کے
مسجد میں تو گنتی کے مسلمان ہی دیکھے		میخانے میں جلوے نظر آئے ہیں سب کے
کیا سخت گھڑی تھی کہ مری آنکھ لڑی تھی		یہ درد یہ آزار یہ آلام ہیں جب کے
لطفِ ایذا طلبی کیا کہیئے		درد آرام ہوا جاتا ہے
دلِ بیمار میں چٹکی لے لو		ابھی آرام ہوا جاتا ہے
اب تم سے کہوں جو کچھ ہی دلمیں میرے	قطعہ	سب تم سے کہوں جو کچھ ہی دلمیں میرے
پہلے یہ کہو کہ میں نہ مانوں گا بُرا		جب تم سے کہوں جو کچھ ہی دلمیں میرے

داغ سے عید کے دن بھی نہ ملے وہ آکر
یہ گیا وقت پھر آئیگا بھلا کون سے دن

رنج پر رنج دئے جاتے ہیں
اپنی کرنی وہ کیئے جاتے ہیں

طور بے طور ہوئے جاتے ہیں
وہ تو کچھ اور ہوئے جاتے ہیں

یہ عنایت پہ عنایت ہے ستم
لطف بھی جور ہوئے جاتے ہیں

گھڑیوں بڑھتا ہے حسینوں کا جمال
اور سے اور ہوئے جاتے ہیں

کرے گا بیوفائی مجھ سے تو سامان ایسے ہیں
تری جان سے مجھکو وہم میری جان ایسے ہیں

مرے دِل میں برچھی چبھو کر کہا
خبردار تو نے اگر آہ کی

یہ جرمِ وفا پر مجھے ارشاد ہوا ہے
بخشے جو سب تجھے بخشنے والے کی خطا ہے

اب داغ کے احوال سے مطلب تمھیں کیا ہے
اچھا ہے تو اچھا ہے بُرا ہے تو بُرا ہے

دنیا میں جانتا ہوں کہ جنت ملی مجھے
راحت اگر ذرا سی مُصیبت میں مِل گئی

اِس کو ملجائے اگر چاہت کی داد
چاہنے والے کو پھر کیا چاہیے

بہت تکلیف پائی ہی بہت صدمے اُٹھائے ہیں
طبیعت اب کہیں بے اختیار آئے تو کیا آئے

خاک اُس سے عشق نے چھنوائی تھی
دشت میں مجنوں کی مٹی لائی تھی

ہے یہی افسردہ دِل کو لُطفِ باغ
ہم نے چن لی جو کلی مرجھائی تھی

فاتحہ کو بھی لحد پہ نہیں آتا ہے کوئی
جیتے جی سب سے مُلاقات ہوا کرتی ہی

ہیں ادائیں سی ادائیں اُس سراپا ناز کی
اِک نیا انداز پیدا ہوگا جتنا دیکھئے

مجھ کو راہِ عشق میں سوجھا نہ اپنا نیک و بد
رہنما کہتا رہا رستہ ہے ٹیڑھا دیکھئے

یہ بات بات میں کیا نازکی نکلتی ہے
دبی دبی ترے لب سے ہنسی نکلتی ہے

ٹھہر ٹھہر کے جلا دِل کو ایک بار نہ پھونک
کہ اِسمیں بوئے محبت ابھی نکلتی ہے

بجائے شکوہ بھی دیتا ہوں میں دُعا اُس کو
مری زباں سے کروں کیا وہی نکلتی ہے

ہزار بار جو مانگا کرو تو کیا حاصِل
دعا وہی ہے جو دِل سے کبھی نکلتی ہے

کہتے ہیں وہ جلائیں گے ہم تجھکو حشر تک
وہ کم سنی ہیں کھیل بھی کھیلیں گے تو بھی

اپنی بھی شامت آگئی توبہ کے ساتھ ہی
اللہ دے تو فقر کی دولت ہے سلطنت

بچھڑے ہوئے معشوق ملیں سبکو الٰہی
اِک چیز ہے اِس عالمِ ہستی میں بشر بھی

ملے زاھد پیر کو حور تو یہ
ترا ثانی کہاں پیدا فقط کہنے کی باتیں ہیں

بلا سے گر کوئی اسبات کا دل میں بُرا مانے
سوال اُن کا یہ ہے دنیا میں کر لو فیصلہ ہمسے

بڑھے تکرار کیوں پہلے ہی اس کا فیصلہ کر لو
زور و زر سے بھی کہیں داغ حسیں ملتے ہیں

جب کہا میں نے کہ لو مرتا ہوں میں
محفل میں کس نے آپ کو دلمیں چھپا لیا

ہاں ہاں ٹھہر ٹھہر کے اُٹھا رُخ سے تو نقاب
نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو

مجھکو مزا ہے چھیڑ کا دِل مانتا نہیں

اُٹھے ہیں آج صبح کو منہ کس کا دیکھکر
جو پارسا ہیں خوف اُنھیں اس قدر کہاں

دیکھئے اُن سے ملاتا ہے خدا کون سے دن
اے نجومی تجھے دعویٰ ہے تو یہ حکم لگا

دشمن کی قبر تیرے برابر بنائیں گے
مٹی کی تیغ و ناوک و خنجر بنائیں گے

عہدِ شباب کے جو کہیں آشنا ملے
جتنے فقیر مجکو ملے بادشا ملے

تنہا کوئی جنت میں نہ جائے میرے آگے
دنیا کا طلبگار بھی دنیا سے حذر بھی

وہاں ہوں گے رعنا جوان کیسے کیسے
اگر سارا زمانہ مان لیگا ہم نہ مانیں گے

مگر معشوق ہو وعدہ کا سچا ہم نہ مانیں گے
اُٹھاؤ گے اگر عقبیٰ میں جھگڑا ہم نہ مانیں گے

یہ کہنا مان لینگے ہم یہ کہنا ہم نہ مانیں گے
اپنے نزدیک تو ہے سب سے اطاعت اچھی

بوسے لبسم اللہ اچھی بات ہے
اِتنوں میں چور کون ہے پہچان چاہیئے

بدطبیعتوں میں بہت جوش ہو گئے
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

گالی سُنے بغیر ستمگر کہے بغیر

توڑا ہے آئینہ کو وہ بیزار سب سے ہیں
ڈرتے گناہگار خدا کے غضب سے ہیں

کون سی رات ہو مقبول دعا کون سے دن
کون سے وقت ملینگے وہ بتا کون سے دن

نواب مرزا خاں داغ

ہزاروں رنگ عاشقی کے جو انکو بتے تو وہ اُن کو جانے
تمھیں کو ہم بیوفا کہیں گے تمھیں سے ہم التجا کرینگے

عداوت انکو ہی آج جس سے اُسی پہ کل مہربانیاں ہیں
جو دشمنی کر سکیں نہ پوری وہ دوستی ہمسے کیا کرینگے

عکس بھی آئینہ میں چار گھڑی بعد آیا
بڑھ گئی حد سے سوا انکی نزاکت کیسی

جو معشوق کی پرسش ہی نہیں دنیا میں
اپنے بندہ سے خدا کو ہے محبت کیسی

لے ہی تو لینگے گنہگاروں کے ہوتے زاہد
یہ تو دوزخ کے بھی قابل نہیں جنت کیسی

چھیڑ ہر وقت کی اچھی نہیں یہ یاد رہے
کبھی کیسی ہے کبھی اپنی طبیعت کیسی

کہتے ہیں وہ ہماری اطاعت کریگا کیا
جس بندۂ خدا سے نہ طاعت ادا ہوئی

حوصلہ چاہیے اِنساں کو پائے جو عروج
پست ہمت کو بلندی بھی جو ہی پستی ہی

داغ دشمن سے بھی جھک کر ملیئے
کچھ عجب چیز ملنساری ہے

جو پوچھا کبھی شغلِ تنہائی اُن سے
کہا گنتے ہیں ہم خطائیں تمھاری

نگہ نکلی نہ دل کی چور زلفِ عنبریں نکلی
اِدھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

اُٹھی دستِ دعا کیا ضعف نے ایسا گھلایا ہے
جسے میں ہاتھ سمجھا تھا وہ خالی آستیں نکلی

چین سے آپ رہیں کچھ مری پروا نہ کریں
کیا شب ہجر بلا ہے کہ مجھے کھائے گی

دِل نہیں مال تو اس کا تمھیں لالچ کیسا
تم نہیں چور تو دُزدیدہ نگاہی کیسی

اِس سے بڑھ کر تو گنہگار نہ دیکھا نہ سُنا
جب کیا عشق تو ناکردہ گناہی کیسی

بنایا اِن حسینوں کو تباہی کے لیئے ورنہ
ترقی سی ترقی عالمِ اسباب کو ہوتی

میں بُرا ہوں تو بُرا جان کے ملئے مجھسے
عیب کو عیب سمجھئے تو کہاں رہتا ہے

لامکاں تک کی خبر حضرتِ واعظ نے کہی
یہ تو فرمائیں کہ اللہ کہاں رہتا ہے

انہیں قدموں نے تمھارے انہیں قدموں کی قسم
خاک میں اِتنے ملائے ہیں کہ جی جانتا ہے

داغِ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اِس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

ایک مہمان نے آتے ہی یہ گھر لوٹ لیا
وہ جو دِل میں ہے تو باقی نہیں ارماں کوئی

گر مرض ہو دوا کرے کوئی
مرنے والے کا کیا کرے کوئی

جب پڑا ہی وقت کوئی ہو گئے ہیں سب الگ
دوست بھی اپنا نہیں بیگانہ تو بیگانہ ہی

بُرائی بچا ہی بُروں سے نباہے
اگر ہے تو دنیا میں مشکل یہی ہے

تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے
ہاتھ لا اوستاد کیوں کیسی کہی

کس طرح کہوں قیس تیرے دلکو لگی ہے
نالوں سے کبھی آگ بھی محمل کو لگی ہے

کس نے یوں پیار کیا کس نے وفا ایسی کی
کیوں کریں قتل کسیکو وہ ہمارے ہوتے

تارے گن گن کے گذاری شب دیجور فراق
کیا مصیبت تھی جو گنتی کے ستارے ہوتے

زلفیں بکھری ہوئیں تمنے جو سنواریں تو کیا
کام بگڑے ہوئے عاشق کے سنوارے ہوتے

ہر دم اُسیکی دُھن ہے اوسیکا خیال ہی
چھوٹے چھٹائے ربط پہ ابتک یہ حال ہے

دل لے ہی چکے ناز سے شوخی سے ہنسی سے
اب اُنکی بلا آنکھ ملاتی ہے کسی سے

کہتا ہے کہ مرجاؤ تو کچھ ہم کو یقین ہو
بیدرد کی اس شرطِ وفا کو کوئی دیکھے

کرتا ہے امام آج بہت سہو کے سجدہ
پوشیدہ جماعت میں وہ کافر تو نہیں ہے

نظر کعبہ میں اس بُت پر پڑی ہے
کہاں جاکر مری قسمت لڑی ہے

ناوک لگا جگر پہ تو دلپر سناں لگی
کاری لگی نظر تری کافر جہاں لگی

تو اگر سُن لے تو کیا جانے کرے کیسا غرور
دیکھکر سمجھا ہے جو تیرا تماشائی تجھے

جلوہ سب ہے پر وہ تو ہوتا ہے فقط ہوش ربا
وہ قیامت ہے جو چلمن کی جھلک ہوتی ہے

جسنے سونگھی ہی وہ خوشبو کوئی اُس سے پوچھے
باسی ہاروںکے جو پھولوں میں مہک ہوتی ہے

پی کر نہ توبہ کی ہو تو واعظ زباں جلے
یہ اعتراض کیوں ہے کہ مے خوار کیوں ہوئے

وہ دلپہ چھُری پھیر گئے نازو ادا سے
اب کوئی مرے کوئی جئے اُنکی بلا سے

ہم تیرے سوا اور ہوں کس چیز کے طالب
کیا چھوڑ دیا مانگنے والوں نے خدا سے

ہر بندۂ خدا پر کب تک ستم رہے گا
زنیر سے دلمیں کافر کب تک ٹھنی رہیگی

وہ لے کر کیا کریں عشاق کا دل
کسی میں داغ ہے کانٹا کسی میں
دم نہیں دل نہیں دماغ نہیں
کوئی دیکھے تو اب وہ داغ نہیں

دم شماری دل مہجور بری ہوتی ہے
جان کی خیر اسی میں ہے کہ تو گن ہی نہیں
یہ تو نہیں کہ تمنا جہاں میں حسیں نہیں
اس دلکو کیا کروں یہ بہلتا کہیں نہیں
کیا ہے بوسہ کا وعدہ مگر ہو وہ احسان
کوئی یہ جانے کہ دونوں جہان دیتے ہیں
وہ رنج بندے کو اپنے خدا نہیں دیتا
جو مجکو ایک مرے مہربان دیتے ہیں
واعظ بڑا مزا ہو اگر یوں عذاب ہو
دوزخ میں پاؤں ہاتھ میں جام شراب ہو
یارب شمار جرم سے بس منفعل نکر
تنخواہ تو نہیں ہے کہ جس کا حساب ہو
در پردہ تم جلاؤ جلاؤں نہیں چہ خوش
میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو
زاہد کو بڑا ناز ہے میکش کو بڑا عجز
اللہ کو مقبول مگر دیکھئے کیا ہو
یارب بنا دے تو اسی صورت کا اور کچھ
اس آسماں سے تنگ ہیں یہ آسماں نہو
واعظ بجا ہے کہئے جو ویرانہ کو بہشت
جنت اسیکا نام ہے آدم جہاں نہو
آج مجھ سے حضرت ناصح یہ چلکر کہہ گئے
آسماں سے اب فرشتے آئینگے تعلیم کو
اپنے دل کا حال ہے دم بھر میں کچھ دم بھر میں کچھ
آگ لگ جائے الٰہی اس امید و بیم کو
آنکھیں یہ جستجو ہے مرنے والا کوئی پیدا ہو
مگر بہتر سے بہتر ہو مگر اچھے سے اچھا ہو
تری زلفیں بھی ہیں صیاد آنکھیں بھی شکاری ہیں
تماشا دیکھنے کا ہی جو میرے دل پہ جھگڑا ہو
کیوں کرتے ہو دنیا کی ہر اک بات سے توبہ
منظور تو ہے میری ملاقات سے توبہ
دنیا میں کوئی بات ہی اچھی نہیں زاہد
اس بات سے توبہ کبھی اُس بات سے توبہ
اہل دول نہ دیکھیں مجھے چشم کم سے داغ
دولت لگی پڑی ہی میرے دم قدم کیساتھ
ظاہر میں اختلاط کی باتیں ہوا کریں
دل میں اگر نہیں ہے محبت نہیں سہی

غم جگہ دل میں پا ہی جاتا ہے
آدمی کو یہ کھا ہی جاتا ہے

کرچکے سب اپنی اپنی حکمتیں
معرکہ ہے آج حسن و عشق کا
حیدرآباد اور لشکر یاد ہے
ہماری طرف اب وہ کم دیکھتے ہیں
غنیمت ہے چشمِ تغافل بھی اُن کی

دم نکلتا ہو تو ہمدم کیا کریں
دیکھئے وہ کیا کریں ہم کیا کریں
اب کے دلّی میں محرم کیا کریں
وہ نظریں نہیں جن کو ہم دیکھتے ہیں
بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں

بُرا انجان حسینوں کو مان اے واعظ
وفا کرو کہ جفا اختیار ہے تم کو
زمیں پہ رشکِ مہ و مہر ہیں حسیں لاکھوں
زمانہ کیا ستائے گا فلک آزار کیا دے گا
کہاں کی داد خواہی حشر میں جب کہا اُس نے
جتنی باتیں کام کی تھیں کر گئے سب اہلِ عشق
التجائیں جسقدر تھیں سب اس بتِ کافر سے کیں
ہوش ہی جاتے رہیں تو آدمی کیا کر سکے
دل سے وہ کافر صنم نکلے تو سب کچھ ہو قبول

خدا گواہ یہ بندے خدا کے پیارے ہیں
بُرے ہیں یا ہیں بھلے جیسے ہیں تمھارے ہیں
فلک پہ وہ ہی تو چمکے ہوئے ستارے ہیں
مصیبت اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی کہ بیدل ہوں
تراجی چاہتا ہے میں گنہ گاروں میں داخل ہوں
ہو گرفتارِ محبت میں کروں تو کیا کروں
اب خدا سے عرضِ حاجت میں کروں تو کیا کروں
دیکھ لوں جب اچھی صورت میں کروں تو کیا کروں
جا کے مسجد میں عبادت میں کروں تو کیا کروں

تسلّی مرے دل کو کیا دے رہے ہیں
عجب خوبیاں خوبرویوں میں دیکھیں
جدھر سے وہ گذرے قیامت بپا تھی
خط میں لکھے ہوئے رنجش کے کلام آتے ہیں
تابِ نظارہ کہاں دیکھے جو ان کے جلوے
نہ کسی شخص کی عزت نہ کسی کی توقیر

مرے دل میں وہ چٹکیاں لے رہے ہیں
بُرائی میں بھی سب سے اچھے رہے ہیں
کہ نقشِ قدم تک تڑپتے رہے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں
بجلیاں کوندتی ہیں جب لبِ بام آتے ہیں
عاشق آتے ہیں تمھارے کہ غلام آتے ہیں

بتوں سے اب معافی چاہتا ہوں
خدا سے کچھ کہا تھا بے خودی میں

دیکھ کر فیاض کو کہتی ہے کیا طبع بخیل
موت تھی قارون کی ہوتا اگر حاتم کے پاس

دل ہے مرا ہر ایک رفیق کہن کے پاس
جتنا وطن سے دور ہوں اُتنا وطن کے پاس

کامل ہو عشقِ پاک تو پرویز سا رقیب
شیریں کو لائے شوق سے خود کوہکن کے پاس

اے بیکسی رہیگی نہ بے پردہ اپنی لاش
میت خود اُڑ کے جائیگی گور و کفن کے پاس

غربت سے ہم پھریں تو کہیں پھر پلٹ نہ جائیں
احباب کچھ نشان بنادیں وطن کے پاس

محبت میں تکرار کا ہے مزہ
گلے ہوں جو باہم دگر دیر تک

صبر کرائے دلِ مضطر وہ نہیں ملنے کے
کل سے آج اُنکی ہوئی ہوگی یونہی آج سے کل

آپ جن کو ہدفِ تیرِ نظر کرتے ہیں
رات دن ہائے جگر ہائے جگر کرتے ہیں

تھک گئے نامۂ اعمال کو لکھتے لکھتے
کیا فرشتوں کا بُرا حال بشر کرتے ہیں

ہو چکا قطع تعلق تو جفائیں کیوں ہوں
جن کو مطلب نہیں رہتا وہ ستاتے بھی نہیں

خوب خوش باش گذر اہل صفا کرتے ہیں
نہ خفا ہوتے ہیں ایسے نہ خفا کرتے ہیں

اڑائی خاک تیری جستجو میں ہر کہیں برسوں
پھری لے آسماں بنکر مرے سر پر زمیں برسوں

نہیں تھا تو بھی تھا وہ بیوفا آغوشِ دشمن میں
کہ میری بدگمانی نے اُسے رکھا وہیں برسوں

آپ کا حال جو غیروں نے کہا ہی مجھ سے
ہیں مرے کان گنہ گار کہوں یا نہ کہوں

ہوش جب آیا تو یہ جانا تو قیامت آگئی
زندگی میری جبھی تک ہے کہ میں غفلت میں ہوں

دیکھیں تو کیسے فتنے ہیں نیچی نگاہ میں
آئینہ رکھدے کاش کوئی اُنکی راہ میں

اُمیدوار رحمت باری ہوں اس قدر
ہوتا ہوں میں شریک برائے گناہ میں

محشر میں کس طرف سے یہ آنے لگی صدا
آنا ہو آئے جسکو ہماری پناہ میں

نظر آتا ہوں نہ اُس بزم سے اٹھ سکتا ہوں
ناتوانی سے بڑے کام لئے جاتے ہیں

مول جنت کا ہوا نقدِ عبادت زاہد
ہے کہیں مال کہیں دام لئے جاتے ہیں

اپنے بسمل کا سر ہے زانو پر
کس محبت سے جان لیتے ہیں

بزم میں دیکھا ہے کس حسرت سے میں نے سوئے دوست
مجکو دشمن سے گلے مل کر جو آئی بوئے دوست

آپ اپنے کو تو چشم شوق پہلے دیکھ لے
کیا ہنسی ہی کھیل ہی یوں دیکھ لیا روئے دوست

اے وعدہ فراموش رہی تجکو جفا یاد
یہ بھول بھی کیا بھول ہی یہ یاد بھی کیا یاد

اُستاد نے اچھا سبق عشق پڑھایا
جب اس کو بھلاتا ہوں یہ ہوتا ہی سوا یاد

حسرت آتی ہے دلِ ناکام پر
اس کو دے ڈالوں خدا کے نام پر

آئے کوئی تو بیٹھ بھی جائے ذرا سی دیر
مشتاق دید لطف اُٹھائے ذرا سی دیر

ہوتی ہیں اتنی بات کی برسوں شکایتیں
کوئی اگر کسی کو ستائے ذرا سی دیر

سب خاک ہی میں مجکو ملانے کو آئے تھے
ٹھیرے رہے نہ اپنے پرائے ذرا سی دیر

تم نے تمام عمر جلایا ہے داغ کو
کیا لطف ہو جو وہ بھی جلائے ذرا سی دیر

دِلّی سے چلو داغ کرو سیر دکن کی
گوہر کی ہوئی قدر سمندر سے نکل کر

تمکو تو آرزو کی خلش بھی نہیں ہوئی
کیا جانو کیا گذرتی ہے اُمیدوار پر

جانچ لو ہاتھ میں پہلے دلِ شیدا لیکر
نہیں پھرنے کا مری جان یہ سودا لیکر

ناز ہوتا ہے اُنھیں مال پرایا لیکر
دُون کی لیتے ہیں میرا دلِ شیدا لیکر

دِل کا سودا جو کرے تم سے وہ سودائی ہو
دام دیتے ہی نہیں مال پرایا لیکر

رکھدیا ہاتھ میرے مونہ پہ بُتِ کافر نے
صبح اُٹھنے نہ دیا نام خدا کا لیکر

اپنی آنکھوں سے تو وہ بھی نہیں دیکھی چوری
کیوں گنہگار رہوں میں نام کسی کا لیکر

مرے لوں ورنہ کیے ہیں تھوڑے تھوڑے ظلم سہ سہ کر
ستم کیجیے تو تھم تھم کر جفا کیجیے تو رہ رہ کر

حضرتِ زاہد ہماری چھیڑ کی عادت نہیں
گدگدی ہوتی ہے دِل میں پارسا کو دیکھکر

ہم مٹے جس پہ تیری بیساختہ وہ بات تھی
تو بھی عاشق ہو ہی جاتا اُس ادا کو دیکھکر

یہ حوروں پہ مرتا ہے سب دیکھے بھالے
نہیں کوئی عاشق مسلماں سے بڑھکر

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہان کی سیر
دل خوش نہو تو کس کا تماشا کہاں کی سیر

پیغامبر کی بات پہ آپس میں رنج کیا
میری زباں کی ہے نہ تمہاری زباں کی ہے

سُنکر میرا افسانۂ غم اُس نے یہ کہا
ہو جائے جھوٹ سچ یہی خوبی بیاں کی ہے

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

غم اُٹھانے کے واسطے دم ہے
زندگی ہے اگر تو کیا غم ہے

اچھی صورت پہ غضب ٹوٹ کے آنا دِل کا
یاد آتا ہے ہمیں ہائے زمانہ دِل کا

اِن حسینوں کا لڑکپن ہی رہے یا اللہ
ہوش آتا ہی تو آتا ہے ستانا دِل کا

حسینوں کی وفا کیسی جفا کیا
جو دل آیا تو پھر اچھا بُرا کیا؟

تو ہی اپنے ہاتھ سے جب دلرُبا جاتا رہا
دل کی بھی پروا نہیں جاتا رہا جاتا رہا

داغ ہر ایک زباں پر ہو فسانہ تیرا
وُہ دن آتے ہیں وہ آتا ہے زمانہ تیرا

دُعا مانگ لو تم بھی اپنی زباں سے
کہ پورا ہو جو مدعا ہے کسی کا

قبضہ کرتا ہے ہر ایک حور شمائل اپنا
آج ہم وقف کیئے دیتے ہیں لو دل اپنا

او بری دِل سے بپا گریہ وزاری رکھنا
آخری وقت ذرا شرم ہماری رکھنا

آئیں تھم تھم کے مرے دِل کو جراحت کے مزے
تیغ بے آب ذرا کُند کٹاری رکھنا

عاشقی سے ملے گا اَے زاہد
بندگی سے خدا نہیں مِلتا

نہ بدلے آدمی جنّت سے بھی بیت الحزن اپنا
کہ اپنا گھر ہے اپنا اور ہے اپنا وطن اپنا

اسپر بھی تو نہیں ہے غم عشق میں کمی
کھاتا ہے ایک جہاں تمھارا دیا ہوا

بیخود رہے وصال میں بیہوش ہجر میں
کیا جانے ہم سے کب وہ ملا کب جُدا ہوا

کِس کِس طرح سے ہمکو جلاتے ہیں رات دِن
وہ جانتے ہیں داغ ہے ہم پر مٹا ہوا

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا
کنکھیوں سے مجکو مگر دیکھ لینا

جسدن وہ مرے قتل کے ساما نہیں ہوگا
وہ دن بھی کبھی گردشِ دوراں میں ہوگا

بزمِ دشمن میں نہ کھِلنا گُلِ تر کی صورت
جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

غش آیا ہاتھ کانپے تیغ کے ٹکڑے ہوئے آخر
کہو تو سخت جانوں کا کروگے امتحاں پھر بھی

سچ ہے کہ یونہی ڈوب گئیں اپنی وفائیں
ہم تم پہ کسی طرح کا دعوی نہیں رکھتے

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گذار دے

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمھارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی دہن غنچہ کا حیرت میری

دوست خوش ہونے لگے دوست کے مر جانیسے
غم کا یہ کال پڑا ہے مرے غم کھانیسے

روح کسی مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اُڑی جاتی ہے ساقی تیرے پیمانے سے

قابلِ رحم ہے اُس شخص کی رسوائی بھی
پردے پردے ہی میں کمبخت جو رسوا ہو جائے

سنتے ہیں خوشی بھی ہے زمانہ میں کوئی چیز
ہم ڈھونڈھتے پھرتے ہیں کدھر ہے وہ کہاں ہے

دل ہمیں نے دیا تھا جسے دلدار سمجھ کر
کیوں تم وہی معشوق ہو یا مجکو گماں ہے

یہ میرے واسطے تاکید ہے دربانوں کو
کہ اسے میں بھی بلاؤں تو نہ آنے پائے

حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے
سیر تو جب ہے کہ جنت میں نہ جانے پائے

رہرہ کے وہ پچتائیں کہ کیوں اسکو ستایا
تھم تھم کے میری آہ میں یارب اثر آئے

نہیں ہوتی کسیکو بھی گوارا اپنی ناکامی
جسے تو بخش دیتا ہے جہنم اس سے جلتا ہے

شگفتگی کسی کی اثر کچھ تو کر گئی
بن بنکے زلف رخ پہ تمھارے بکھر گئی

کیا کہیئے کس طرح سے جوانی گذر گئی
بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی

زاہد شراب ناب کی تاثیر کچھ نہ پوچھ
اکسیر ہے جو حلق کے نیچے اُتر گئی

کچھ زہر نہ تھی شراب انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

بوسہ مانگا تو کہا اُسنے بدل کر چتون
آپکو یہ بھی خبر ہے میری عادت کیا ہے

تڑپنے سے دلِ بیتاب کوئی غم نکلتا ہے
ٹھہر جا صبر کر مضطر نہ ہو کیوں دم نکلتا ہے

جو کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں مرجاؤ
جو غش آتا ہے مجھپر تو ہزاروں دم بھی ہوتے ہیں

کوئی اب تجھ سے آرزو ہی نہیں
اب جو دیکھا تجھے وہ تو ہی نہیں

رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہونگے
صاف کہدیجئے ملنا ہمیں منظور نہیں

خدا شاہد خدا شاہد ہے کیوں کہتے ہو وعدوں پر
خدا کو کیا غرض میرے تمہارے درمیاں کیوں ہو

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتاؤ مجھکو
دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھکو

دیکھئے سبز سر حشر میرے پاس اگر
کہتے ہیں کون ہوں میں جانتے ہو تم مجھکو

میں بھی حیران ہوں اے داغ کہ یہ بات ہو کیا
وعدہ وہ کرتے ہیں آتا ہے تبسّم مجھکو

گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنّت کو کیا کرے کوئی

مریض عشق کی کیا پوچھتے ہو پوچھو
کہ زندہ کوئی بھی تیماردار باقی ہے

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

دمِ تقریر نالے حلق میں چھریاں چبھوتے ہیں
زباں تک ٹکڑے ہو ہو کر مرا افسانہ آتا ہے

وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی قصہ ہے اُلفت کا
تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے

ہر دلمیں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

یار کا پاس نزاکت دلِ ناشاد رہے
نالہ تھمتا ہوا رکتی ہوئی فریاد رہے

رنج وہ رنج ہے جسمیں نہ بتوں کو بھولیں
عیش وہ عیش ہے جس میں نہ خدا یاد رہے

یوں تو برسوں نہ پلاؤں نہ پیوں اے زاہد
توبہ کرتے ہی بدل جاتی ہے نیت میری

تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد
کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

کیجئے اے قسمتِ برگشتہ تلاشِ دشمن
دوست کو ڈھونڈتے ہیں ہم تو عدو ملتا ہے

حق ہے اسباب میں ناصح کا طرفدار ہوں میں
دل کی کہتا ہے جو اس دلکو برا کہتا ہے

تھم تھم کے وار کر کہ مرا ورد مٹ نہ جائے
جب ہیں نہیں تو لذت زخم جگر کہاں

کیا کہا پھر تو کہو دل کی خبر کچھ بھی نہیں
کیوں یہ کیا ہے خم گیسو ہیں اگر کچھ بھی نہیں

اٹھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

کیسا جواب حضرت دل دیکھئے ذرا
پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

ہر چند داغ ایک ہی عیار ہے مگر
دشمن بھی تو چھٹے ہوئے سارے جہان کے ہیں

لطف مے تجھسے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

اڑ گئی یوں وفا زمانہ سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

دل لگی دل لگی نہیں ناصح
تیرے دل کو ابھی لگی ہی نہیں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

چلا ہے کعبہ کو تو خاک چھاننے زاہد
فقط خدا ہی خدا ہے حرم میں خاک نہیں

ملے مجھ سے تو فرمایا تمھیں کو داغ کہتے ہیں
تمھیں ہو ماہ کامل ہیں تمھیں سنتے ہو لالے ہیں

بنے ہوئے ہیں وہ محفل میں صورت تصویر
ہر ایک کو یہ گماں ہے ادھر کو دیکھتے ہیں

اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھسے چھیڑ چھاڑ
ہیں پائے شوق و دست تمنا بریدہ ہوں

اجل کا نام لیں تقدیر کو روئیں مجھے کوسیں
مرے قاتل کا چرچا کیوں ہو میرے سوگواروں میں

مرا ہی دل نہ ہو میں ہی نہوں لے مرگ مایوسی
خدا جانے یہ کسکی فاتحہ ہے آج یاروں میں

وہ ہے افسردہ دل عالم بجا ہے یہ اگر کہئے
کہ مرنے والے ہیں پر اور زندے ہیں مزاروں میں

دل کا کیا حال کہوں صبح کو جب اس بت نے
لیکے انگڑائی کہا نا نہ سے ہم جاتے ہیں

فلک دیتا ہے جنکو عیش انکو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

گلے شکوے کہاں تک ہونگے آدھی رات تو گذری
پریشاں تم بھی ہوتے ہو پریشاں ہم بھی ہوتے ہیں

زمانہ دوستی پر ان حسینوں کی نہ اترائے
یہ عالم دوست اکثر دشمن عالم بھی ہوتے ہیں

بظاہر رہنما ہیں اور دل میں بدگمانی ہے
ترے کوچہ میں جو جاتا ہے آگے ہم بھی ہوتے ہیں

اے شیخ جسکو حور نہ ملیگا بڑھیگا شوق
محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا
وہی تو ہے شعلۂ تجلی کہ دشت ایمن سے تنگ ہوکر
جھکی ذرا چشم جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
یاں دلمیں خیال اور ہے واں مدِ نظر اور
نہیں تو ہو جو کہ خواب میں ہو تمہیں قسم ہو جو خیال میں ہو
رقیب اچھے بریں نے مانا بُرا مجھے تو نے دل سے جانا
مجھسے کہتے ہیں نکالیں گے ہمیں کچھ تدبیر
وہی قاتل وہی مخبر وہی منصف ہے مرا
کہاں کرشمہ برق جمال و طور کہاں
چشم جاناں سے الگ ہو لے حیا
وہ نازک کہ جامہ سے باہر نکل کر
رہبر نے راہِ عشق میں برسوں دیئے چکر مجھے
بیٹھے بٹھائے آئے جو شامت تو کیا علاج
کہتے نہ تھے وہ سُن کے بُرا مان جائینگے
ستم دیکھو بیان رنج پر کہتا ہے وہ ظالم
دلوں پر سینکڑوں سکتے ترے جوبن کے بیٹھے ہیں
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
بھری ہیں عجب ادائیں اُس شوخ سیمتن میں
یہ شوقِ خود نمائی کیا کچھ جنوں سے کم ہے
میت پہ آئینگے وہ یاں مجھ میں دم ہے باقی

جنت کو ہیں پسند جہنم کو تو پسند
یاں یہ تلاش آئے کوئی خوبرو پسند
جب انکے اپنی منو چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہوکر
بڑا مزا اس ملاپ کا ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہوکر
ہے حال طبیعت کا ادھر اور ادھر اور
کہاں چلے آنکھیں سما کر کدھر کو جاتے ہو دل میں آکر
بھلوں سے کرتے ہیں سب بھلائی گئی ہے بُرے کا تو کچھ بھلا کر
صاف کہدو کہ دل آیا ہے تمہارا کس پر
اقربا میرے کریں خون کا دعوے کس پر
نظر پڑی تھی کسی دل جلے کی پتھر پر
یوں جھکے پڑتے نہیں بیمار پر
تھکے اس طرح جس طرح کوئی چلکر
ظالم سے جب پوچھا کہاں آگئے منزل کے پاس
دل نے کہا کہ آؤ چلیں یار کی طرف
اے داغ اسنے اور کہو ماجرائے دل
یہ صدمے تو نہیں آخر کسی پر ہم بھی مرتے ہیں
کلیجوں پر ہزاروں تیر اس چتون کے بیٹھے ہیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں
ایک ٹیڑھا سادگی ہے ایک سیدہ بانکپن ہیں
بیتاب تجھکو لایا خلوت سے انجمن میں
زندہ لپیٹ دینا یارو مجھے کفن میں

غم نے ترے نچوڑ لیا قطرہ قطرہ خوں
تھوڑا ہی درد دل میں کھٹکنے کو رہ گیا

نام اسکا نو میرے دل میں تھا پنہاں ناصح
ہائے کمبخت ترے منہ سے یہ کیونکر نکلا

بیداد تری دیکھ کے یہ حال ہوا ہے
عاشق کوئی دنیا میں کسی پہ نہیں ہوتا

شب کو جلتا چھوڑ آئے تھے دل اس کوچہ میں ہم
وہ بھی قسمت سے چراغ راہ دشمن ہوگیا

اے داغ صدمہ غم ہجراں بجا درست
یہ سب سہی مگر نہیں جینا ضرور تھا

جو عرض تمنا پہ ظالم نے کہا مجھ سے
ابتک نہ ملا ہوگا سائل کو جواب ایسا

تو مید کرم ہو کر ہم توبہ کریں مے سے
دوزخ میں پڑے زاہد بے لطف ثواب ایسا

پوچھا تھا محبت میں ہوتا ہے قلق کیسا
قسمت نے کہا دیکھ اے خانہ خراب ایسا

لوگ کہتے ہیں بنا دِلی بگڑ کر لکھنؤ
پر کہاں اے داغ اُس اجڑے ہوئے گل کا جواب

مہرباں ہو کے جب ملیں گے آپ
جو نہ ملتے تھے سب ملیں گے آپ

کم نہیں سامان میں ہنگامۂ محشر سے آپ
دیجئے دلکو دعائیں بنگئے اس گھر سے آپ

حضرت زاہد ہر ایک نشہ کو عادت شرط ہے
مر نہ جا بنگے شرابِ چشمۂ کوثر سے آپ؟

حضرتِ زاہد نکل آیا فلک پہ آفتاب
پیر و مرشد اب تو اُٹھئے میکدے کے در سے آپ

ہے طرفہ تماشہ سرِ بازار محبت
سر بیچتے پھرتے ہیں خریدار محبت

اللہ کرے تو بھی ہو بیمار محبت
صدقے ہیں چھٹیں تیرے گرفتار محبت

ابرو سے چلے تیغ تو مژگاں سے چلیں تیر
تعذیر کے بھوکے ہیں خطاوار محبت

اسواسطے دیتے ہیں وہ ہر روز نیا داغ
اک درد کے خوگر نہ ہوں بیمار محبت

واعظ کی زباں پر تو وہ کلمے ہیں کہ گویا
بخشے ہی نہ جائیں گے گرفتار محبت

کل تابِ فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی
کیا کیا لب خاموش پہ قربان ہے اثر آج

اندیشۂ فردا نہ رہے حضرتِ زاہد
میخانے میں پی لیجئے تھوڑی سی اگر آج

وعدے پہ مری اُنکی قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے ادھر آج

پند گو لطفِ ملاقات اسے کہتے ہیں
لطف فرما جو وہ رہتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا
خاک میں دل کی صفائی نے ملایا مجکو
عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدہ کرتا
ترے وعدہ پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے
یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی
خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
کبھی مسجد میں جو وہ شوخ پریزاد آیا
میرے قابو میں نہ پہروں دلِ ناشاد آیا
دی مؤذن نے شبِ وصل اذاں پچھلی رات
جان لیجائے گا آنا شبِ تنہائی کا
ہوگیا پرتوِ رخسار سے کچھ اور ہی رنگ
رازِ دل کوئی کہے لاکھ میں کیونکر اپنا
وہ زمانہ بھی تمہیں یاد ہے تم کہتے تھے
میرے مرنے سے کیا ظالم نے کو سامانِ عیش
اُٹھنا ہی تیری بزم سے دشوار تھا ہمیں
غش کھا کے داغ یار کے قدموں پہ گر پڑا
لطف آرام کا نہیں ملتا
دل نے تری گلی سے نہ اُٹھنے دیا مجھے

خوش کبھی میں نہوا شاد کبھی تو نہ ہوا
عین حکمت تھی وہ کافر جو دل آزار رہا
کہ مرا ایک جہاں واقف اسرار رہا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا
تمھیں کہدو منصفی سے تمھیں اعتبار ہوتا
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا
نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا
پھر نہ اللہ کے بندوں کو خدا یاد آیا
وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا
ہائے کمبخت کو کسوقت خدا یاد آیا
کون اب روکنے والا ہے مری آئی کا
میں نے منہ چوم لیا اُس کے تماشائی کا
داورِ حشر جدا چاہیے محشر اپنا
دوست دنیا میں نہیں داغ سے بہتر اپنا
پر لبِ مطرب پہ آکر نغمہ شیون بن گیا
او سپر سنبھالنا دلِ بے اختیار کا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا
آدمی کام کا نہیں ملتا
سو بار قصدِ دیر و حرم ہو کے رہ گیا

یہ دل کو تاب کہاں ہے کہ ہو مآل اندیش
کچھ آگے داور محشر سے ہے اُمید مجھے

ڈوبکر سینے میں اس رنگ سے پیکاں نکلا
تری اُلفت کی چنگاری نے ظالم اِک جہاں پھونکا

مجھے کیوں کر یقیں ہو آگ ظالم کو جلائیگی
رہا تھا کونسا ارمان جیتے جی جلانے کا

انھوں نے وعدہ کیا اس نے اعتبار کیا
کچھ آپ نے مرے کہنے کا اعتبار کیا

دل سے بے ساختہ نکلا کہ وہ ارماں نکلا
اودہر چمکی اودہر سلگی یہاں پھونکا وہاں پھونکا

کسی دن آتش رنگِ شفق نے آسماں پھونکا
کہ تو نے لاش کو میری جواب اے بدگماں پھونکا

عِشق ورپردہ پھونکتا ہے آگ
ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں
جان جاتی دکھائی دیتی ہے

یہ جلانا نظر نہیں آتا
وہ تماشا نظر نہیں آتا
اُن کا آنا نظر نہیں آتا

سینے میں اب کہاں وہ جوش وہ بھی تھا اِک اُبال سا
عرض وفا پہ دیکھنا اوسکی ادائے دلفریب
اوسکی لچک پہ دم فدا اوسکی ادا پہ دِل نثار
تارے ہی گن کے کاٹتے رات فراق کی اگر

بیٹھ گیا کچھ اُٹھتے ہی چھوڑ گیا خیالِ سا
دلمیں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ ملال سا
ہائے وہ شاخ سی کمر ہائے وہ قد نہال سا
نکلا ستارہ بھی کہیں کوئی تو خال خال سا

کوسوں تک اُسلٹے پاؤں چلا آہ میں غریب
ہاتھوں سے جو بچے تری باتوں سے مر گئے
تہمت نہ رکھ خدا کے لئے مجھ پہ زاہدا

جبتک میری نظر سے نہ پنہان وطن ہوا
چٹکی میں تھا جو تیر وہ لب پر سخن ہوا
کب میں نے توبہ کی تھی جو میں توبہ شکن ہوا

بات کیا چاہیئے جب مفت کی حجت ٹھہری
نفس کے آنے جانے پر بشر کی زندگی ٹھہری
رہی ہے رات بھر تھم تھم کے رہ رہ کر چبک دلمیں
کل چھڑا لیں گے یہ زاہد آج تو ساقی کے ہاتھ
زندگی میں پاس سے دم بھر نہوتے تھے جدا

اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا
یہ پوچھو تو مسافر تو نے کیا لطفِ سفر پایا
جگا یا لے کے چٹکی درد نے جب بیخبر پایا
رہن اِک چلو پہ ہمنے حوض کوثر رکھدیا
قبر میں تنہا مجھے یاروں نے کیونکر رکھدیا

جس کی بغل میں شب کو وہ ہو اُس کو دیکھیے	جس وقت آنکھ کھل گئی دیدار ہو گیا
اے داغ کیا بتائیں محبت میں کیا ہوا	بیٹھے بٹھائے جان کو آزار ہو گیا
اللہ رے جامہ زیب تری جامہ زیبیاں	پہنا جو تو نے رنگ وہی رنگ کھل گیا
ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہ اُلفت کبھی نہ کرنا	تمھیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا
ہماری میت پہ تم جو آنا تو چار آنسو گرا کے جانا	ذرا رہے پاسِ آبرو بھی کہیں ہماری ہنسی نہ کرنا
وہ ہے ہمارا طریق اُلفت کہ دشمنوں سے بھی ملکے چلنا	یہ ایک شیوہ ترا ستمگر کہ دوست سے دوستی نہ کرنا
تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب	ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا
بتائیں لفظ تمنا کے تم کو معنے کیا	تمھارے کان میں اِک حرف ہم نے ڈال دیا
جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا	مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا
نہ رونا ہے طریقے کا نہ ہنسنا ہے سلیقے کا	پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا
رہے ہو جس طرح دل میں رہو نظروں میں بھی یونہی	کہاں کی ایسی گھبراہٹ ہے ٹھہرو دم تو لو جانا
ہوا ہے جب سے شہرہ اُس عدوئے دین و ایماں کا	کوئی دل چیر کے دیکھے عقیدہ ہر مسلماں کا
خوشامد اس قدر کی ہو گیا بدنام عالم میں	زمانہ جانتا ہے مجھ کو یہ عاشق ہے درباں کا
حورانِ خلد بولتی ہیں بڑھ کے بولیاں	نیلام ہو رہا ہے تمھارے شہید کا
وائے غفلت کہ اب کیا ہم نے	جو ہمیں پہلے کام کرنا تھا
گذاری میں نے ساری رات یہ کہکر وہ اب آئے	ذرا اے چشمِ تر تھمنا ذرا اے دل جگر رہنا
ہماری سخت جانی بس نہ ٹھہری کھیل ہی ٹھہرا	قسم ہے تم کو گردن پر چھری تم پھیر کر رہنا
سنبھل سنبھل کے بگڑتا ہے کچھ دلِ بیتاب	الٰہی آج یہ صدمہ ہے جان پر کیسا
مر گئے ہم تو وضعداری میں	دوستی کی نباہ نے مارا
جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا	کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا
کم ہوگا داغ سا بھی مکار اب جہاں میں	اُس بُت پہ شیفتہ ہو اور نام لے خدا کا

انتخابِ گلزارِ داغ

سلامت منزلِ مقصود تک اللہ پہنچا دے
مجھے آنکھیں دکھاتا ہے ہر ایک نقشِ قدم میرا

مجھے آباد کرتا ہے مجھے برباد کرتا ہے
خدایا دین و دنیا میں کرم تیرا ستم میرا

یہاں بھی تو وہاں بھی تو زمیں تیری فلک تیرا
کہیں ہم نے پتا پایا نہ ہرگز آج تک تیرا

صبر لے زاہدِ نافہم نہ میخواروں کا
بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہ گاروں کا

اُٹھ گئے نام شفا سُن کے ترے ہے خواہشِ مرگ
مُنہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

دوش پر اپنے جو صیاد نے زلفیں چھوڑیں
اور جی چھوٹ گیا آج گرفتاروں کا

گر میرے بُتِ ہوش رُبا کو نہیں دیکھا
اُس دیکھنے والے نے خدا کو نہیں دیکھا

جنت ہے مگر خانۂ دشمن بھی الٰہی
آتے ہوئے اس گھر میں قضا کو نہیں دیکھا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین پایا نہ خواب دیکھا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

آخر کو عشق کفر سے ایمان ہو گیا
ہیں بُت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا

رندانِ بے ریا کی ہے صحبت کسے نصیب
زاہد بھی ہم میں بیٹھ کے انسان ہو گیا

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

لے ہی تو آئیں گے اُسے ہمدم
میرے ہی نام سے تو آئے گا

ترا اک وعدۂ دیدار اور وہ بھی قیامت پر
پھر اُس پر صبر اتنا ہائے دلِ امیدواروں کا

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہو گا جسے ارماں ہو گا

بن گئی فرقت میں جو کچھ اپنے جی پر بن گئی
ہو گیا جو کچھ ہمارے دل کا عالم ہو گیا

حُسن میں انداز کے آتے ہی نخوت آ گئی
زلف میں پڑتے ہی بل ابرو بھی پرخم ہو گیا

کے مطالعے سے پایا جاتا ہے کہ غور و فکر سے شعر کہتے تھے شعر کی بندش اور الفاظ کے ہر ایک پہلو پر نظر غایر ڈالتے تھے۔ مہتاب داغ میں اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز روانی پائی جاتی ہے۔ طبیعت ہے کہ دریا کی طرح اُمڈی چلی آتی ہے۔ زبان صاف شستہ۔ بندش میں تصنع کو ذرا دخل نہیں۔ باایں ہمہ مضمون میں شوخی اور تیکھاپن اس درجہ ہے کہ شعر بے مثل ہو جاتا ہے۔ اور دل میں چٹکی لئے بغیر نہیں رہتا۔ حسن و ادا کے دلفریب نظارے اختلاط کی نوک جھونک کے مضمون۔ جس صفائی اور نفاست سے ان کے دیوانوں میں پائے جاتے ہیں وہ انھیں کا حصّہ ہے۔

المختصر اس سے کسی کو انکار نہیں کہ شہرت خاص و عام اور قبول و وام کے لحاظ سے بلامبالغہ اس زمانہ میں کسی شاعر کو اُس نعمت کا عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہوا جو حضرت داغ کا حصّہ ہے۔ داغ کا ہر شعر عجیب مقناطیسی جذب اور بجلی کی حرارت رکھتا ہے۔ جس کی تاثیر سننے والے کے دل کو بے چین کئے دیتی ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کا پیدا کرنا شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ مگر ہر کوئی اسے پیدا بھی نہیں کر سکتا۔ اگر جذبات۔ احساسات اور خیالات کی ہو بہو اور بولتی چالتی تصویر کھینچنا۔ قدرت کی نقاشی کے مرقعہ میں جگہ پا سکتا ہے۔ تو ہم حضرت داغ کو نیچرل شاعری کے دربار میں سب سے اونچی جگہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شعرا کی کثیر تعداد آپ کے تلمّذ سے مستفید ہوئی۔ اور جسقدر اچھے شاعر آپ نے ملک میں پیدا کئے۔ اسکی نظیر آجتک دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ اُردو شاعری پر آپ کا دوہرا احسان ہے۔

کل شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے۔ جن میں سے بعض ارشد تلامذہ کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ حضور نظام جنت مقام۔ بیخود بدایونی۔ نسیم بھرتپوری۔ بیخود دھلوی مرزا سائل دھلوی۔ آغا شاعر دہلوی۔ ڈاکٹر محمد اقبال۔ حسن بریلوی۔ بیباک۔ حیرت۔ آزاد رسا۔ فیروز۔ اشک۔ احسن۔ مارہروی وغیرہم۔

ایسے شخص کے کلام کا انتخاب ایک دشوار کام ہے تاہم چند اشعار اُنکے نتائج افکار سے ناظرین کی تفریح کیلئے نقل کئے جاتے ہیں

سے سانچے میں ڈھالا کہ وہی تغزل کا زیور قرار پایا۔ حضرت داغ نے اپنی طبع وقاد کی صنعت کاری سے اسے ایسا اُجالا اور مرصع کیا کہ معشوقۂ مجاز کے سر کا جھومر بن گیا۔ غزل کی شاعری کا سرتاج قرار پایا۔ اُستاد کامل فن نے اُسے ایسا کر دکھایا کہ ہر کس و ناکس کے دل کو بھایا۔ اور ہر گوئی اسی رنگ میں لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ فرق اتنا ہوا کہ کسی کو کسی حد تک کسی کو کسی درجہ تک اس تقلید میں کامیابی ہوئی۔ مگر بعض نامی شعراء اس تقلید میں اپنا اصلی رنگ بھی کھو بیٹھے۔

حضرت داغ یہی نہیں کہ غزل گوئی کے مسلم الثبوت اُستاد اور اپنے طرز میں لاثانی تھے۔ بلکہ وہ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ان کے دیوان سے مل سکتا ہے۔ مثنوی شاعری کے نہایت مشکل اصناف میں سے ہے۔ اور ہم فریاد داغ کا ذکر اوپر کر آئے ہیں۔ قصیدہ۔ بلاغت سخن۔ مہارت فن۔ علوئے تخیل۔ پختہ کلامی۔ اور علمیت و تبحر کی معیار سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اردو میں مرزا رفیع کے بعد شیخ ابراہیم ذوق اور میر ممنون کے قصاید ہی مقبول ہوئے اور مستند مانے گئے۔ لیکن حضرت داغ کے جو قصاید جناب داغ میں موجود ہیں۔ وہ اپنی آن بان میں کسی ہم عصر کے قصیدوں سے کم نہیں۔ اور انکی قادر الکلامی اور مشاقیٔ فن کا سکہ بٹھاتے ہیں۔ میرزا داغ کی اوستادی میں سوائے کم سواد حاسدوں کے اور کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ ان کے کلام کا خاص رنگ سہل ممتنع۔ فصاحت۔ روزمرہ کی صفائی شوخیٔ مضمون اور بیاں کی ندرت ہے۔ چنانچہ ہزارہا اشعار اور صدہا غزلیں قبول عام و خاص کا تمغہ پاکر لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ زبان کے چٹخارے اور لوچ کے ساتھ ساتھ بندشیں بہت چست ہوتی ہیں اور اکثر محض الفاظ کے الٹ پھیر سے شعر میں جان ڈالدیتے ہیں۔ ان کی پُرگوئی اور قادر الکلامی حیرت انگیز ہے۔ چھوٹی بحر ہو یا طویل۔ زمین شگفتہ ہو یا سنگلاخ۔ اپنے زور طبیعت سے آمد کا مزا دکھا دیا ہے۔ غرض کہ کہیں بھی اپنے رنگ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ آورد کا تمام کلام میں کہیں شائبہ تک نہیں ہے۔ گلزار داغ کی غزلوں

سلاست زبان کا بہت لحاظ کیا ہے اِس دیوان کا ایک ایک شعر سہل ممتنع ہونیکے علاوہ ایسا دلچسپ اور دلکش ہے کہ ایک مرتبہ سننے کے بعد اُس کا لطف دل سے نہیں جاتا۔ مثنوی جس کا نام "فریادِ داغ" ہے زمانہ قیام رامپور میں کہی گئی تھی۔ اور اس مثنوی کی اصلیت یہ ہے کہ ایک طوائف منی بائی المعروف بالمتخلص بہ حجاب کلکتے کی رہنے والی بے نظیر کے میلے میں رامپور آئی۔ مرزا صاحب کی منظور نظر ہوئی بس اسکی محبت و فراق کا وہ افسانہ ہے۔ حق یہ ہے کہ سچا واقعہ ہونے کی وجہ سے اُسکا ہر شعر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ زبان کے ساتھ تمام شاعرانہ خوبیوں کا لحاظ رکھا ہو۔ یہ تینوں دیوان اور مثنوی کئی کئی بار چھپ چکی ہیں اور ہر جگہ موجود ہیں یادگار داغ نامی چوتھا دیوان سید علی احسن نے مرزا داغ مرحوم کی وفات کے بعد لاہور سے شائع کیا۔ لیکن چونکہ بلا اجازت ورثائے مرزا مرحوم یہ دیوان شایع ہوا۔ اس لئے اصلی مسودات اور غزلیات مکمل طبع نہ ہو سکیں آخر کار راقم تذکرہ نے بعد حصول حق تصنیف بقیہ غیر مطبوعہ کلام بطور ضمیمہ یادگار داغ مرتب کر کے شائع کیا۔

اُن کے عادات اور حسن اخلاق کے متعلق اتنا لکھنا کافی ہے کہ طبیعت ایسی مرنجان مرنج تھی کہ کیا دنیاوی معاملات اور کیا شاعری کے میدان میں کبھی کسی سے بدمزگی نہ ہوئی۔ ہجو لکھنے لکھانے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اعراض و تعریض اُن کے مسلک سے باہر تھے۔ بعض ہم عصر اُستادانِ فن کو اُن سے حسد ہو تو ہو۔ وہ خود اس الزام سے بالاتر تھے۔ ایک اس کی زندہ نظیر وہ اشتیاق اور خلوص تھا۔ جو انھوں نے امیر مینائی مرحوم کی حیدر آباد میں مہمانداری اور تیمارداری میں ظاہر کیا۔ اسی طرح حضرت جلال۔ مجروح۔ ظہیر۔ تسلیم۔ راسخ۔ نساخ۔ شعرائے ہم عصر سے اون کے تعلقات ہمیشہ شگفتہ رہے۔ شاعری کی دنیا میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ شاذ ہی کسی کو موجد یا مقلد ہونے کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ ہاں صاحب طرز ہونا جُدا بات ہے۔ جرأت نے شوخ کلامی اور معاملہ بندی کا جو رنگ نکالا۔ اُسے منشی مادھو رام جوہر فرخ آبادی نے (جنکا ذکر خیر اور کلام حصّہ دوم میں درج ہو چکا ہے) اِس خوش اسلوبی

تاریخ لوحِ مزار پر کندہ ہوئی ہے۔ اس تاریخ کے سوا آپ کے نام اور تخلص ہیں تاریخ وفات نکلتی ہے یعنی (نواب میرزا داغ) اس تاریخ میں بکثرت توارد ہوا ہے قریب قریب ہر ایک تاریخ کہنے والے نے اور مادّوں کے ساتھ یہ مادّہ بھی نکالا ہے۔

قطعۂ تاریخ از جناب سائلِ دہلوی

رفت از دہر چوں فصیح الملک　　لرزہ اُفتادہ در تمامیٔ ہند
اوستادِ نظام آصف جاہ　　موردِ لُطفِ شاہ حامیٔ ہند
رست بر قامتش قبائے سُخن　　زیب بر روئے خطاب جامیٔ ہند
سلکِ نظمش بسانِ سلکِ گہر　　جوہری سخن نظامیٔ ہند
شد وفاتش بشام یومُ الحج　　دفن شد روز عید سامیٔ ہند
آہ دل بر کشید و سائل گفت　　مدفنِ پاک داغ نامیٔ ہند

اسی طرح اُنکے پیارے شاگرد سید رضی الدین کیفی نے تاریخ کہی۔ کیفی نوشت بلبل ہندوستان برفت داغ نواب میرزا گفتم

یہ قیامت تک کسی کے دل سے مٹنی کا نہیں　　مادہ تاریخ کا داغ فصیح الملک ہے

مرزا صاحب کے تین دیوان اور ایک مثنوی مطبوعہ موجود ہے اور چوتھا دیوان یادگار داغ بھی تیار تھا چاروں دیوانوں میں گلزار داغ و آفتاب داغ زمانہ قیام رامپور کے چھپے ہوئے ہیں۔ اِن دیوانوں میں اکثر وہی غزلیں ہیں جو رامپور کے مشاعروں میں کہی گئی تھیں اُن غزلوں میں ایک عجیب دلکشی اور سحر آفرینی ہے یہ وہ فکر سخن ہے جو بڑے بڑے ماہران و اُستادان فن کے مقابلے میں کیا گیا تھا اور اسی نے جہاں اُستادی کا سکّہ سب کے دلوں پر بٹھادیا تھا۔

"مہتاب داغ" حیدر آباد کے قیام کا نتیجہ ہے اور وہیں پہلی مرتبہ چھپا اب دوسری بار راقم تذکرہ نے اُن کے ورثا سے حقوق تصنیف لیکر بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے اور شائقین کے فائدہ اور اشتیاق کی نظر سے نصف قیمت کر دی ہے۔ اس دیوان میں مضامین کے ساتھ

پلنگ پر لیٹ کر اور حقہ سامنے رکھکر فکر سخن کرتے ہیں۔ کبھی اس طرف کروٹ لی کبھی اُس طرف کبھی اُٹھے، کبھی بیٹھے، اِس مشکل سے کوئی شعر نکلتا ہے، فرمایا "آپ شعر نہیں کہتے بلکہ شعر جنتے ہیں"، اُنکی سحر بیانی اور قبولیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ ہندوستان میں شاید کوئی قصبہ و قریہ ایسا ہو کہ جہاں اُنکا کلام خواص سے لیکر عوام تک کی محفلوں اور سماع کی صحبتوں میں گایا نہ جاتا ہو، مرزا داغ کا حق بہ حیثیت مصلح زبانِ اُردو قیامت تک مٹنے والا نہیں، اُنھوں نے بہت سے ثقیل اور غیر فصیح الفاظ ترک کر دیئے، موافق اور مخالف دونوں اس امر کے شاہد ہیں کہ غزل کے جسقدر موضوع ہیں اُن تمام صفتوں پر حضرت داغ حاوی تھے اور بلاشبہ تغزل کے عدیم النظیر اُستاد اور فرد یگانہ تھے۔ اسیر۔ منیر۔ حالی۔ ظہیر۔ مجروح۔ ذکی سالک۔ جلال۔ امیر۔ سب اُنکی قادر الکلامی کے معترف اور مداح تھے، بہر حال اِس شعر کے پتلے کی خوش آیند باتیں قدرتی طور پر ناموزوں طبائع میں موزونی پیدا کرنے بلکہ شاعر بنا دینے کے لئے کافی سامان تھیں، مرزا صاحب کے روزمرہ واقعات اور حالات کی تفصیل و تشریح کے لئے ایک مبسوط کتاب چاہیئے۔ آپ نے اٹھارہ برس حیدر آباد میں بعزت و آبرو بسر کر کے ۹۔ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۷۔ فروری ۱۹۰۵ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر دار فانی سے انتقال فرمایا۔ گذشتہ سالوں میں تین چار مرتبہ حاسدوں نے اُنکی وفات کی خبر اُڑائی۔ حتیٰ کہ اخباروں میں قطعات تاریخ وفات تک درج کر دیئے۔ اِس لئے چند روز لوگوں کو اِس کے ماننے میں تامل رہا لیکن آخر کار اِس مرتبہ خبر صحیح نکلی۔ انتقال کے بعد بحکم سلطانی عید بقر کے دن آپ کا جنازہ مکہ مسجد (حیدر آباد) میں لایا گیا جہاں بعد دوگانہ عید جنازے کی نماز پڑھی گئی، پھر یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں دفن کئے گئے۔ جناب امیر مینائی مرحوم بھی اِسی جگہ آسودہ ہیں۔ تجہیز و تکفین کے مصارف کے لئے خزانہ شاہی سے پانچ ہزار روپیہ عطا ہوا تھا۔ انتقال کی یوں تو ہزارہا تاریخیں شعرا نے لکھیں مگر یہاں ایک تاریخ ابو المعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی اُنکے داماد کی لکھی جاتی ہے۔ کیونکہ یہی

گزارش کیا۔ واقعی عرض کرتا ہوں، فرمایا "میاں یہ جنت کے قوال تھے" اسی طرح ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک صاحب تشریف لائے، آپ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، وہ واپس گئے سلام پھیر کر اپنے ملازم سے فرمایا "انھیں بلانا!" وہ جا کر لایا۔ پوچھا کیوں آئے تھے پھر چلے کیوں گئے؟ کہا آپ نماز پڑھتے تھے اور مجھے ایک دوسرا کام تھا۔ فرمایا "میں نماز پڑھتا تھا لاحول تو نہیں پڑھتا تھا" ایک مرتبہ نواب خلد آشیاں کے سامنے (سانس) کی تذکیر و تانیث پر بحث ہو رہی تھی۔ جو فریق مذکر کہتا تھا وہ دلّی والوں کے کلام سے سند پیش کرتا، فریق مخالف لکھنو والوں کے اشعار سے ثبوت دیتا تھا، مرزا داغ خاموش بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے، کہ نواب صاحب نے انکی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، مرزا داغ تم کچھ نہیں کہتے۔ فرمایا فریقین تھک لیں تو میں ایک قولِ فیصل عرض کرونگا، دونوں فریقوں نے بالاتفاق کہا کہ آپ ہی کے سر فیصلہ ہے۔ فرمایا "میرے نزدیک مؤنث کی سانس مؤنث ہے۔ اور مذکر کا مذکر" اس پر سب ہنس دیئے اور گفتگو ختم ہو گئی۔ ایک مرتبہ رامپور کے مشاعرہ میں طرح دی گئی "ہمکو رونا ہے خندۂ گل کا" آپ کچھ علیل تھے، مسہل ہو چکے تھے طرح پر غزل نہ کہی تھی، تلامذہ نے اصرار کیا۔ ناتوانی کا عذر فرمایا۔ مگر بعض ضدی شاگردوں نے نہ مانا فرمایا خیر قلمدان لاؤ۔ سب خوش ہو گئے کہ استاد غزل تصنیف فرمائیں گے، اب کان مشتاق ہیں اور نگاہیں استاد کا منہ تک رہی ہیں کہ یہ مطلع ارشاد ہوا ؎

ہمکو کیا لطف ساغرِ مل کا		کبھی کچھڑی ملی کبھی پھلکا	

احسن مارہروی کی زبانی سنا کہ ایک دن احباب و تلامذہ خدمتِ استاد میں حاضر تھے اور آپ غزل کہہ رہے تھے، مرزا مظفر حسین بیگ بارق تخلص بھی حاضر تھے انھوں نے استاد کے فکرِ بے ساختہ اور تصنیفِ برجستہ کو دیکھ کر معمولی طور پر کہا کہ خدا جانے آپ کس طرح شعر کہتے ہیں ذرا دیر نہیں ہوتی کہ پورا شعر کہہ دیتے ہیں، استاد نے یہ سنکر فرمایا "بھائی تم کس طرح شعر کہتے ہو،" انھوں نے جواب دیا کہ حضرت ہم تو کسی خاص وقت

اُمرا اور اراکین سلطنت کے علاوہ اپنے معمولی احباب اور نیاز مندوں سے وہ اس طرح ملتے تھے کہ باہم کوئی مغائرت معلوم نہ ہوتی تھی، بوجہ پیرانہ سالی اور کثرتِ امراض کے سبب زیادہ کہیں آتے جاتے نہ تھے البتہ اُنکے پاس جو شخص آتا تھا اُس سے نہایت اخلاق اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے، حیدرآباد میں شاعروں کی کثرت مشہور ہے مگر آپ بجز چند مشاعروں کے دو ہی کبھی کبھی، کسی عام مشاعرے میں نجاتے تھے، حاجی ابراہیم خالنساماں جو حضور بندگانِ عالی نظام مرحوم کے مقرب اور بڑے بارسوخ اور ذی اقتدار شخص تھے ابتدا سے اُن میں اور مرزا صاحب میں باہم بہت محبت و اخلاص کا برتاؤ تھا وہ مہینے دوسرے مہینے اپنے گھر مشاعرہ کیا کرتے تھے اور اُس مشاعرے میں اکثر بندگانِ عالی حضور نظام دکن کی تازہ غزل آیا کرتی تھی، اس مشاعرے میں مرزا صاحب البتہ اکثر جایا کرتے تھے اور حضور نظام کی غزل بھی خود ہی پڑھتے تھے، یا دو ایک مرتبہ مدارالمہام بہادر اور راجہ رائے رایاں بہادر آنت ونت کے مشاعروں میں شریک ہوئے ورنہ کسی مشاعرے سے غرض نہ تھی۔

مرزا داغ دلّی کے رہنے والے تھے اور جس طرح کہ اس شہر کے رہنے والوں میں عموماً خوش دلی و مذاق و لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی کا مادہ ہوتا ہے اسی طرح مرزا صاحب کی کوئی بات لطیفے سے خالی نہ ہوتی تھی، اُنکی مسلسل تقریر اُنکی دلکش گفتگو میں خدا جانے کس قیامت کے مزے تھے کہ جی یہ چاہتا تھا ہر وقت سنے ہی جائیے، وہ بالکل اپنے اس شعر کے مصداق تھے۔

باتیں سُنئے تو پھڑک جائیے گا	گرم ہیں داغ کے اشعار یہ کیا

ہمکو ایک معتبر ذریعے سے اُنکے چند لطیفے ملے ہیں۔ تفریحِ ناظرین کے لئے ذیل میں درج کرتے ہیں

مولوی حسن رضا خان صاحب حسنؔ بریلوی شاگرد رشید حضرت داغ مرحوم کا بیان ہے کہ زمانۂ قیام رامپور میں ایک روز میں حاضر خدمت ہوا دیکھا کہ ایک نہایت ہی ضعیف العمر صاحب عربی لباس پہنے ہوئے بیٹھے گا رہے ہیں، جب وہ اُٹھ گئے تو میں نے پوچھا "حضرت یہ ذاتِ شریف کون تھے؟" فرمایا تم واقف نہیں، عرض کیا نہیں، فرمایا سچ کہتے ہو

کے لیے مضر ہوتا تھا، چنانچہ اس مرض کا اثر تھوڑا یا بہت ابتک باقی ہے جسکے ہاتھوں اکثر عہدہ داروں نے بکفِ افسوس ملتے ہوئے حیدرآباد چھوڑا ہے بہرحال مرزا داغ مرحوم نہ کوئی ملکی خیال کے آدمی تھے، نہ جنگی، نہ انھیں شاعری کے سوا کسی مشغلہ سے کام تھا۔ اگرچہ خوشامد در آمد کے لیے شاعری ایک تنہا ذریعہ ہے مگر حضرت داغ نے اِس قسم کی تمام باتوں سے ہمیشہ احتراز کیا، یعنی وہاں رہ کر بجز بندگانِ عالی متعالی اعلیٰ حضرت قدر قدرت خلد اللہ ملکہ کے بڑے سے بڑے رئیس کے نہ خوشامدی بنے نہ درباری، ہمیں جہاں تک علم ہے کہہ سکتے ہیں کہ کسی خاص تقریب کے سوا اور وہ بھی ایک دو دفعہ، مرزا صاحب کسی رئیس ذی اقتدار کے ہاں محض اُسکی خوشنودی مزاج کے لیئے نہیں گئے، ہمیشہ بندگانِ عالی کی تحریک یا اجازت سے کہیں آتے جاتے تھے، مرزا داغ کا حیدرآباد میں جو اعزاز و اکرام ہوا وہ کسی پر پوشیدہ نہیں ہے، اور بیشک تمام اُردو کے شعرا کے طبقے میں یہ بات قابلِ فخر ہے کہ اس سلسلے میں ظاہری اعزاز کے لحاظ سے ایک شخص ایسا بھی ہو گیا، دکن کی قلمرو میں نعمت خان عالی کے بعد اس رتبہ پر فصیح الملک داغ فائز ہوئے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپنے اس حصول ترقی و اعزاز کے مدارج طے کرنے میں زیادہ تر اپنی مدد آپ کی ہے، یہی وہ قابلِ قدر بات ہے جس نے آپ کو خود دار بنایا اور جس نے آپ کو اُمرا کی جھوٹی خوشامدوں سے باز رکھا جس نے ہمیشہ نیک نام رکھا، اور مرنے کے بعد متفق اللفظ ایک دنیا نے یہی رائے قائم کی، اُنکی عام بے غرضی اور بے تعلقی کی یہ حالت تھی کہ دوسرے امیروں کا کیا ذکر ہے، مہینوں اور بغیر طلب محض اپنی مرضی سے اپنے آقائے ولی نعمت کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے اگرچہ اپنے ذاتی کتنے ہی کاموں کا ہرج ہوتا ہو الغرض از حد محتاط رہے اور دور اندیشی کو کام میں لاتے رہے، اِس خیال کو اُنھوں نے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے اور خوب کہا ہے۔

میں وضع کا پابند ہوں گو جان بھی جائے	جب کوئی بلائے نہیں آتا نہیں جاتا

حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر	تو کہہ دو ملے داغ سلطان سے

پھر تو روزانہ مراحم خسروانہ بڑھتے گئے، نو مہینے بعد ایک مراسلہ معتمد محکمۂ صرف خاص صادر ہوا کہ سرکار نے آپکے نام چار سو پچاس روپیہ حالی کا وظیفہ روز ورود سے جاری کیا، پھر چھ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ کو بحکم سلطانی آپ کا وظیفہ ایک ہزار ماہوار مقرر ہوا، اور ورود حیدرآباد کیوقت سے اُس تاریخ تک ایکہزار ماہوار کے حساب سے مرحمت فرمایا گیا، اس شاہانہ عطیہ کی تاریخ کہی

اِس ترقی کی کہو اے داغ یہ تاریخ تم	ابتدا سے اپنی ساڑھے پانسو نقدی بڑھی

گویا پچھلے نقصانات کی تلافی بھی شاہانہ الطاف کی بدولت کماحقہ ہو گئی اور ہر طرح آسودگی اور فارغ البالی نصیب ہوئی، علاوہ اس مقررہ وظیفے کے وقتاً فوقتاً جو عطیات شاہی ہوئے انکی تفصیل بیکار ہے، علاوہ بیش قیمت مرصع گھڑی و جیغہ و قبضہائے شمشیر و چوبہائے دستی، و پارچہ جات کشمیری و بنارسی ایک موضع جسکو حیدرآبادی زبان میں مقطعہ کہتے ہیں اور جو بلدۂ حیدرآباد سے دس بارہ کوس پر واقع ہے عطا کیا، اِس موضع کی آمدنی کم و بیش دو ہزار روپیہ سالانہ تھی، قیمتی اشیاء کے سوا وقتاً فوقتاً نقد انعامات بھی پاتے رہے، جس کے متعلق بتحقیق سُنا گیا کہ قریب چھبیس ہزار روپیہ کے جو انعامات میں دیئے گئے تھے خزانۂ خاص میں انکے نام جمع ہیں اور یہ حکم سلطانی تھا کہ مرزا صاحب جس وقت چاہیں یہ رقم وصول کر لیں، مگر یہاں الطافِ شاہی نے اسقدر مستغنی اور مالا مال کر دیا تھا کہ تادم آخر اس رقم کے منگانے کی ضرورت نہ پڑی، مرزا صاحب نے حیدرآباد میں اٹھارہ برس مستقل قیام کیا، اور نہایت عزت و آبرو سے بسر کی، ریاست میں اعلیٰ طبقے کے اُمرا کی باہمی مخالفتوں کا بازار اُس زمانے میں خوب گرم تھا، اور ہر نئے اُمیدوار یا ملازم کے لیئے اپنی ترقی کے واسطے منجملہ اور ذریعوں کے ایک بہت بڑا ذریعہ یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی ذی اقتدار رئیس کا درباری اور خوشامدی بنے، اور دوسرے رئیسوں کے خلاف سازشوں میں شریک ہو، اِس ترکیب سے مربی رئیس کے دل میں جگہ پیدا کی جاتی تھی اور یہی ذریعۂ ترقی ہوتا تھا، مگر ظاہر ہے کہ آخر میں ایسی باتوں کا نتیجہ اُسی

تقرر ہوا، جنرل اعظم الدین خاں سے الگی نہ بنی، اِس وجہ سے ریاستِ رامپور سے دست کش ہوئے اور دہلی چلے آئے، حیدر آباد دکن جانے تک کے وقفہ میں مختلف مقامات لاہور، امرت سر، ریاست کشن کوٹ، بنگلور، آگرہ، علی گڈھ، متھرا، جیپور، ریاست منگرول، اجمیر شریف اِن سب شہروں میں اپنے تلامذہ اور مشتاقوں کو اپنی ملاقات سے شرف بخشا، آخر سنہ ۱۳۰۵ھ میں آپ حیدر آباد تشریف لے گئے، اور پہلے پہل چند روز محلہ بازار شیدی عنبر میں مولوی سیف الحق ادیب دہلوی مترجم اخبارات کے پاس اور پھر اُسی کے متصل ایک دوسرے مکان میں مقیم ہوئے، آپ کی شہرت اور ناموری نے دلوں میں پہلے ہی گھر کر لیا تھا، تمام شہر میں دھوم مچ گئی، شدہ شدہ بندگانِ عالی حضور میر محبوب علی خان بہادر نظام دکن خلد اللہ ملکہٗ کو بھی معلوم ہوا، اور اس درمیان میں آپ کی پہلی عرضی راجہ گردھاری پرشاد بہادر عرف بنسی راجہ المتخلص بہ باقیؔ کی معرفت پیشگاہِ سلطانی میں پہنچ چکی تھی، پہلی بار جو قصیدہ آپنے حضور بندگانِ عالی دام اقبالہٗ کی مدح میں لکھا تھا اُس کا مطلع یہ ہے۔

میں ہوا بادیہ پیما طرف ملک دکن		سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گردِ دامن	

اِسکے بعد کچھ عرصہ کے لیئے دلّی چلے آئے، ابھی یہیں تھے کہ نواب آسمانجاہ نے بذریعہ شقہ طلب کیا، چنانچہ پھر حیدر آباد پہنچے اور باریابی کے منتظر رہے، حیدر آباد کی اُمیدواری اور اُسکے مصارف وہی لوگ خوب جانتے ہیں جنھوں نے وہاں کے اُمیدواروں کا حال دیکھا یا سنا ہے، بالآخر آپکے صبر و استقلال نے یہ نتیجہ خیر دکھایا کہ ۲۶ رجمادی الثانی سنہ ۱۳۰۸ھ روز شنبہ ۹ بجے شب کے مولوی ظہور علی صاحب کے مکان پر فرمانِ رحمت نشان یعنی حضور بندگانِ عالی آصف جاہ سادس کی غزل ایک سر بمہر لفافے میں چند چوبدار لیکر حاضر ہوئے اور زبانی یہ بہ کہا کہ صبح آٹھ بجے حاضرِ دربار ہونے کا حکم ہوا ہے، آپ نے اُسی وقت اُس غزل کو دیکھ کر واپس کیا اور صبح حاضرِ دربارِ خاص ہو کر نذر پیش کی، بس اسی تاریخ سے سلسلۂ اصلاح شروع ہو گیا، شرف حضوری کی جو تاریخ کہی یہ ہے، ؎

برابر کے کمرے میں ایک شاگرد کو لیکر ٹہلتے اور شعر کہتے جاتے تھے اور وہ لکھتا جاتا تھا یہانتک کہ ان کا نمبر آیا اور غزل پڑھی، شعر پڑھنے کا انداز بھی وہ انوکھا اور نرالا تھا کہ جس نے سنا ہی وہی اس لطف کو جانتا ہے، اول تو ڈیل ڈول تنومند اور شستہ پھر اس پر بڑی آواز یہ قدرتی مناسبتیں پڑھنے میں وہ شان پیدا کردیتی تھیں کہ سننے والے بیتاب ہوجاتے تھے اور معمولی شعر بھی مشاعرے میں سب سے اعلیٰ نظر آتا تھا، مولانا حالی فرماتے تھے کہ حضرت امیر کی زبان سے خود انھوں نے رامپور میں سُنا کہ "بھئی مشاعرے میں کیا جائیں ہماری طولانی غزلوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور مشاعرہ ختم ہونے پر داغ کی غزل سب کی زبان پر ہوتی ہے"، مرزا صاحب غزل خوانی کے وقت اور لوگوں کی طرح ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے تھے، نہ خواہ مخواہ بناوٹ کی آواز سے گلے کی رگیں پھلاتے تھے، نہایت سادہ طور سے باآواز شعر پڑھتے اور کسی کسی لفظ پر زیادہ جوش کے وقت صرف ایک ہاتھ اُٹھا دیتے تھے، مرزا صاحب کا دیوان انکے شاگردوں کے پاس رہتا تھا جو وقت پر پیش کیا جاتا تھا اور اُسی میں دیکھ کر غزل پڑھا کرتے تھے۔ ریاستِ رامپور میں مرزا صاحب کا قیام کم و بیش چالیس سال تک رہا اور مختلف اوقات سفر کا اتفاق ہوا، نواب خلد آشیاں کے ہمراہ حج کعبہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، ایک مرتبہ دلی اور لکھنؤ پٹنہ وغیرہ کئی مقامات میں ٹھیرتے ہوئے کلکتے تشریف لے گئے اور وہاں کم و بیش تین ماہ تک قیام کیا ؎

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں	عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

جس روز آپ پٹنہ پہنچے ہیں کسی رئیس شہر کے ہاں مشاعرہ تھا آپکے آنے کی خبر سنکر عمائد شہر آپ کو باصرار تمام مشاعرے میں لے گئے آپنے فی البدیہہ بائیس شعر جو جاتے وقت کہہ لئے تھے مشاعرے میں پڑھے اور خاطر خواہ داد پائی، کلکتے میں ناخدا کی مسجد کے سامنے آپ ٹھیرے تھے، جبتک وہاں رہے برابر ٹیابرج کے شعرا اور اہلِ بنگالہ سے ہم صحبت رہے اور شعر و سخن کے خوب چرچے رہے، نواب کلب علیخاں بہادر کے انتقال کے بعد ۱۸۸۶ء میں کونسل کا

تک جس عیش وعشرت سے زندگی بسر ہوئی تھی اُس دَور کا گویا خاتمہ ہو گیا، اِس انقلاب زمانے کے بعد مرزا صاحب مع اپنے قبائل کے رامپور چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزین ہوئے۔ نواب موصوف اپنی حیات تک لطبور مہمان نوازی سلوک کرتے رہے، اِنکے بعد نواب خلد آشیاں کلب علیخاں بہادر نے بھی وہی قدر دانی کی اور مرزا صاحب کو اپنی مصاحبت میں رکھا، اور بطور معتمدِ خاص کارخانجات اصطبل وگاڑی خانہ و فراشخانہ و کنول خانہ وشتر خانہ سپرد کیا، ۲۴ برس تک مصاحبت کے ساتھ آپنے ان خدمات کو نہایت خوبی، عمدگی اور دیانت سے سرانجام دیا۔ نواب خلد آشیاں کو اِن پر بہت بھروسہ اور اطمینان تھا اور عزت و قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے، رامپور میں نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے زمانہ سے شعر و سخن کی گرم بازاری شروع ہو گئی تھی، اور نواب کلب علیخاں بہادر کے عہد میں جو فروغ ہوا اُسکی کیفیت اظہر من الشمس ہے، غالب، شاہزادہ حیا، بحر، قلق، عروج، امیر، منیر، تسلیم، جلال، امیر مینائی وغیرہ سب نامی شعرا ریاست کے دعاگو تھے اور بجز غالب مرحوم کے سب وہیں قیام رکھتے تھے، اِن سب لکھنؤ کے سر برآوردہ شعرا کے مجمع میں گو دلّی کے شعرا میں صرف ایک مرزا صاحب ہی کا دم تھا، لیکن انکی خداداد معجز بیانی نے کسی کو ان پر غالب نہ آنے دیا اور یہ ہمیشہ آسمان شاعری پر آفتاب کی طرح چمکتے رہے، یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دہلی میں قیام کے ہنگام میں جب نواب یوسفعلیخان مرزا ولیعہد کے مصاحب تھے تو بچپن میں مرزا داغ اور نواب کلب علیخاں کا عرصہ تک ساتھ رہا تھا اور وہ بچپن کا خلوص نواب مرحوم نے تمام آخر بڑی وضعداری سے نبھایا۔

رامپور کے مشاہیر امرا کے ہاں اور خاص نواب صاحب کی طرف سے بھی مشاعرہ ہوا کرتا تھا اور اس سرکاری مشاعرہ کا اہتمام و انتظام مرزا صاحب ہی کے سپرد ہوتا تھا، مشاعرہ میں انکی غزل پر لوگوں کی نگاہیں رہا کرتی تھیں اور انکا یہ حال ہوتا تھا کہ اکثر بوجہ انتظام و اہتمام مشاعرہ اپنی غزل کہنے کی فرصت نہ ملتی، جسوقت مشاعرہ شروع ہو جاتا اُس وقت

سیکھنے کی مشق جن سے کی تھی انھیں سے بانک بھی سیکھی، اور مرزا سنگی بیگ سے جو خاندان میر حامد علی خاں کے مشہور پھکیت تھے پھکیتی اور علی مد سیکھی، گھوڑے کی سواری کی مشق سجن خاں اور بندو خاں چابک سواران شاہی سے کی، اور بندوق اور تیر اور چو رنگ لگانے اور سینا کاٹنے میں خاص ولیعہد بہادر سے شرف یاب ہوئے، غرضکہ اسی طرح اور مختلف فنون متفرق لوگوں سے حاصل کیے، قلعے میں پہنچکر جہاں اور باتوں کا چرچا دیکھا وہاں سب سے زیادہ شاعری کی گرم بازاری پائی، آپکی خداداد ذہانت اور ہونہار طبیعت کا رجحان اسی طرف زیادہ رہا، اور اس آتش شوق کے بھڑکانے والے سامان بہت کچھ جمع ہو گئے، خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ کا زمانہ تھا وہ بادشاہ اور ولیعہد کے اُستاد ہونے کی وجہ سے اکثر اوقات قلعۂ معلّیٰ ہی میں تشریف رکھتے تھے، مرزا صاحب کی ذہانت خداداد اور تیزی طبع دیکھکر آپکے مُربّی و سرپرست صاحب عالم میرزا ولیعہد بہادر نے آپ کو حضرت ذوق کا شاگرد کرا دیا، اُس وقت آپکا سن گیارہ یا بارہ برس کا تھا، قلعے کے علاوہ شہر میں مختلف مقامات پر مشاعرے ہوا کرتے تھے، مرزا صاحب نے پہلے پہل نواب مصطفیٰ خان مرحوم المتخلص بہ شیفتہ کے مشاعرے میں غزل پڑھی، جسکی طرح میں پہلا مطلع یہ فرمایا تھا۔

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں
کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

اگرچہ اب یہ مطلع موجودہ دیوانوں میں نہیں رکھا گیا ہے، مگر اہل نظر اس مطلع کو دیکھ کر بارہ تیرہ برس کے لڑکے کی جودت طبع کا اندازہ کر سکتے ہیں، اُسی زمانے کے ایک مطلع کو سُن کر ؎

لگ گئی چُپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی
مجکو کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

مولانا صہبائی نے تحسین و آفرین کے کلمے کہے تھے،

ہنگامۂ غدر سے دس ماہ پیشتر سنہ ۱۸۵۶ء میں بقضائے الٰہی یکایک وبائے ہیضہ میں ولیعہد بہادر نے انتقال کیا، مرزا صاحب کو اس حادثے اور صدمے سے سخت رنج پہنچا، ہنوز اس صدمہ کی یاد دل غمگین سے نجانے پائی تھی کہ دس مہینے بعد ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا، اور کامل ۲۶ برس

اسی کے پاس تھا دل کیا ہوا اے ہمنشیں دیکھو	ادھر دیکھو اُدھر دیکھو یہیں دیکھو کہیں دیکھو
اسی کے پاس ہر رہ رہ کے یہ جو مسکراتا ہے	اسی کی جیب دیکھو ہاتھ دیکھو آستیں دیکھو!
پکڑنا چور کا مشکل نہیں گر کچھ سمجھ ہووے	ہوائی رنگ دیکھو! ماہتابی سے جبیں دیکھو
یہ چاہ نہیں بھلی بری ہوتی ہے	جی لیتی ہے دوستی بری ہوتی ہے
لگتا نہیں جی کہیں بھی اُسکے بن آہ	سچ کہتے ہیں یہ لگی بری ہوتی ہے

داغ

داغ - تاجِ سخنوری کا گوہرِ شب چراغ نواب میرزا خان داغ دہلوی - المخاطب بہ سلطان الشعراء، بلبلِ ہندوستان، جہاں اُستاد، ناظمِ یار جنگ، دبیر الدولہ فصیح الملک بہادر مرحوم و مغفور، بتاریخ ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۶ھ مُطابق سنہ ۱۸۳۱ء ۱۴ بیساکھ سمت ۱۸۸۸ بکرمی روز چہارشنبہ بمقام شاہجہاں آباد دہلی محلہ بلیماران میں پیدا ہوئے لائق جوتشیوں نے متعدد زائچے آپکی پیدائش کے وقتاً فوقتاً تیار کیئے، کیونکہ مرزا صاحب کو فنِ نجوم سے صرف دلچسپی ہی نہ تھی، بلکہ خود بھی اِس فن میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے، سات برس کی عمر میں آپ کی تعلیم شروع ہوئی، لیکن جملہ علوم و فنون میں تکمیل کا عدیم المثال موقعہ قلعۂ معلیٰ دہلی میں سنہ ۱۸۴۴ء میں باریاب ہوکر حاصل ہُوا، اگرچہ اس سے پہلے بھی رامپور میں مولوی غیاث الدین، صاحبِ غیاث اللغات سے فارسی کی چند درسی کتابیں پڑھی تھیں، مگر جب قلعہ میں مستقل طور سے آئے تو مولوی سید احمد حسین ولد میر غلام حسین شکیبا جو میر تقی میر کے شاگرد تھے آپکے معلم مقرر ہوئے خوشنویسی میں پہلے اُستادِ زمانہ سید امیر پنجہ کش دہلوی کے شاگرد ہوئے، اور پھر معمولی اوقات میں مرزا عباد اللہ بیگ سے جو اُنکے شاگرد رشید تھے اصلاح لیتے رہے، مرزا صاحب کو قلعۂ شاہی کے متوسّل ہونے سے جو خصوصیت اور آسانیاں تعلیم میں نصیب ہوئیں وہ عام طور سے اور لوگوں کو میسّر نہیں آسکتیں - اجمالاً فنِ شہسواری و سپاہگری کے کل اُصول اور کرتب قلعے میں رہ کر آپنے سیکھے -

کیوں علاجِ ضعف کرتا ہے طبیب ہم سے ای دارا وہ کب ہوتا ہی صاف	دم بدم یاں ناتوانی اَور ہے اُس کے دِل میں بدگمانی اَور ہے
مت لگا مہندی بُتِ بے پیر اپنے ہاتھ سے غیر کے ہاتھوں سے میرا قتل کیوں منظور ہے	مِل نے تو خونِ دِلِ دلگیر اپنے ہاتھ سے ہائے لے قاتل لگا شمشیر اپنے ہاتھ سے

دارا

دارا - عالیجناب نواب خواجہ بہاؤالدین خان بہادر دلاور جنگ دارا، امیر حیدرآباد دکن شعرائے دکن میں نامور اور صاحبِ دیوان ہیں۔ ۱۲۷۳ھ سالِ پیدایش ہے۔ خواجہ یسین علی خان شکوہ کے فرزند رشید اور نواب قارالدولہ نورالحسین مرحوم کے داماد اور شاگرد ہیں خوش رو خوش وضع خندہ پیشانی رئیس تھے، کلام مزے کا اور پاکیزہ ہے +

بھری ہیں سینہ عاشق میں حسرتیں کیا کیا پھنسایا زلف میں کمبخت میری آنکھوں نے اُنکو میرا مجھکو اُنکا اعتبار آنے تو دو عرش پر پھر میں قدم رکھوں معاذاللہ کی جا	صنم برائے خدا اُسن لے مدعا دل کا خطا نظر کی ہے اس میں قصور کیا دِل کا دوستی کے درمیاں قول و قرار آنے تو دو پاؤں کے نیچے زمین کوئے یار آنے تو دو

داغ

داغ دہلوی - میر محمدی داغ - خلف الرشید میر سوز مرحوم - خوش رُو زیبا شمائل اور بڑے وجیہ جوان تھے - قسّامِ ازل نے اُنکی طبیعت میں ایک خاص درد ودیعت کیا تھا جسکی جھلک اُنکے کلام میں ملتی ہے۔ شفیق باپ کی اصلاح نے اُس میں اور چار چاند لگا دیئے تھے۔ بیس برس کی عمر میں ایک شعلہ رُو کے عشق میں مُبتلا ہوئے، چند روز اُسکی صحبت میں نہایت عیش و عشرت سے اوقات بسر کی - آخر کار فلکِ تفرقہ پرداز کی کارسازی سے دامِ مفارقت میں پھنسکر جان دی - یہ واقعہ شاہ عالم ثانی کے زمانہ کا ہے - حالتِ نزع میں بہت انتظار کے بعد ایک اشتیاق نامہ اپنے مطلوب کو بھیجا جسکے سرنامہ پر یہ شعر لکھا۔ ؎

از جاں رمقے بود کہ مکتوب تو آمد	دیگر چہ نویسم خبرم خوب گرفتی

اِس جواب کے لکھتے ہی طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا +

سحاب پارۂ دامن ہے آبدیدوں کا
نمودِ برق طپیدہ ہے دِل طپیدوں کا

جہاں ہوئے ہیں گلِ سُرخ خاک سے پیدا
اُسی زمیں میں ہے مدفن ترے شہیدوں کا

اثر یہ رکھتی ہے فریادِ دردمندوں کی
بُرا ہے صبر ستمگر ستم رسیدوں کا

کوئی بھی ساتھ کسی کے گیا نہ اے دارا
عدم کو جاتا ہے کیا قافلہ جریدوں کا

خط میں گر وصل کا مضمون لکھیں ہم دارا
آرزو کا کوئی ہرگز نہ ملے حرف سے حرف

جا پھنسا حلقۂ زلفِ بتِ عیار میں دِل
لیگئی کھینچ کے شامت دہنِ مار میں دِل

تاکے جھانکے نہ طرف غیر کے وہ پردہ نشیں
اپنا رکھ آئے ہیں ہم روزنِ دیوار میں دِل

شعلہ رُو یہ ترے عارض پہ نہیں خالِ سیاہ
جَل گیا گر کے کوئی آتشِ رخسار میں دِل

دِل لگی کیونکہ ہماری ہو کہیں اے دارا
لگ گیا اپنا تو اک کوچۂ دلدار میں دِل

کسی کی چشمِ میگوں کا تصور ہمکو ہے دارا
قدم اُٹھتا نہیں ہے لغزشِ مستانہ رکھتے ہیں

وہ جو دریا میں نہانے کو گیا شب دارا
چومتا تھا قدم اُس مہ کے قمر پانی میں

ہم خاک ہو کے آئے ہیں کوچہ میں یار کے
لیکن یہ خوف ہے کہ صبا کو خبر نہ ہو

ہم سُن چکے ہیں شورشِ رفتار کسی کی
اب شورِ قیامت کا بھی دھڑکا نہیں ہمکو

ہے کشتیٔ عمر اپنی جو گردابِ فنا میں
مانندِ حباب اپنا بھرُوسا نہیں ہمکو

یوں لاکھ اہلِ دانش تدبیر تو بنا لو
بگڑی ہوئی ولیکن تقدیر تو بنا لو

بدلہ ستم کا لینا ٹھیرا فلک سے دارا
آہِ جگر کو اپنے تم تیر تو بنا لو

دل سے لطف و مہربانی اَور ہے
مہربانی کی نشانی اَور ہے

قصۂ فرہاد و مجنوں اَور ہے
عشق کی میرے کہانی اَور ہے

چشم گر فتنہ ہے تو اُس کی نگاہ
اِک بلائے ناگہانی اَور ہے

اُس مسیحا دم کو لائے گا خدا
کوئی دم کی زندگانی اَور ہے

روکنے سے میری کب رُکتے ہیں اشک
بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے

ردیف دال

داد - منشی غلام حسین خاں داد - میکش تھانوی کے شاگرد ہیں - کئی برس ہوئے پیامِ محبوب نامی ایک رسالہ دکن سے شائع کیا تھا، جو تھوڑے عرصہ میں بند ہو گیا، کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں - انتخاب ملاحظہ ہو -

اکدن تو قصد کیجے تماشائے آب کا	مضطر ہے موج آنکھوں میں دم ہے حباب کا
چھپتا ہے اہلِ درد کا کب رنگِ اتحاد	ہے اشکِ عندلیب میں عالم گلاب کا
سُنکے شکوہ وہ بے وفائی کا	بولے جھوٹا ہے تو خدائی کا
اے بتو بندہ پروری سیکھو	تمکو دعوی ہے گر خدائی کا

دارا - صاحبِ عالم و عالمیان میرزا محمد دارا بخت دارا مرحوم عرف میرزا شبّو - ولیعہد اوّل حضرت ظلِ سُبحانی محمد بہادر شاہ اخیر بادشاہ دہلی - شاگردِ رشید ملک الشعرا الشیخ ابراہیم ذوق ۱۱ر جنوری ۱۸۴۹ء میں بعمر پچاس سال انتقال فرمایا اور شاہ چراغ دہلی کے مزار کے قریب میں دفن ہوئے آپ حضرت ابو ظفر کے خلفِ اکبر تھے اور مشہور ہے کہ عمر میں صرف بارہ برس چھوٹے تھے - اِنکی والدہ زکیۃ النسا بیگم مرزا سلیمان شکوہ کی دختر تھیں جو اکبر شاہ کے حقیقی برادر خورد تھے، آپکے آٹھ اور بقول بعضے بارہ فرزند دلبند تھے، جن میں سے دو میرزا احمد اختر اور مرزا نصیر الملک اب بقید حیات ہیں، اور ایک صاحبزادی بھی زندہ و سلامت موجود ہیں - میرزا دارا بخت صاحب مولانا فخر الدین کے خلیفہ تھے اور میر محمدی صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا - اور مولنا عماد الدین کے خط نسخ اور نستعلیق میں شاگرد تھے - بہت نیک خصلت بھولے بھالے شاہزادے تھے - آپکے کلام میں حضرت ذوق کا رنگ صاف جھلک رہا ہے - انتخاب کلام ہدیۂ ناظرین ہے -

آراستہ ہوچکی ہے۔ دو مثنویاں اور ایک دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ فارسی میں سیّد محمد محمود صفہانی سے اصلاح لی ہے۔ شاعری میں آپکا انداز کلام منیر سے ملتا ہے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کیا کرتے تھے۔ شاگردوں میں حکیم محمد وزیر، قنکر نظام آباد دکن میں شستہ دار ہیں۔ کلام سے علمی قابلیت مترشح ہوتی ہے۔ انتخاب یہ ہے

تنِ دل میں مرے یاد آئی جب سے تیری جاں ہو کر
فراموش آپ کو مَیں نے کیا ہے بے نشاں ہو کر

نہ پہنچیگا خیالی تو کبھی اُس شوخ کے در تک
جو پہنچا گوشِ گل میں بھی تو بلبل کی فغاں ہو کر

کیا بیخود کسی کی نرگسِ مخمور شہلا نے
رُخِ گلگوں دکھایا آج مجکو جام صہبا نے

بہت کھینچا پھرا میں گوشہ گوشہ سخت جانی سے
کباڑے کی طرح کھینچا مجھے میری تمنّا نے

خیالِ روئے رنگیں نے خیالی کردیا مجکو
مرا مرنے پہ بھی دامن نچھوڑا طبع شیدا نے

حسرت برس رہی ہے مری مشتِ خاک پر
چادر نہ پھول کی ہے نہ شمعِ مزار ہے

دکھلا رہا ہے چرخ پس از مرگ رفعتیں
بادِ صبا کی دوش پہ میرا غبار ہے

خبیر۔ ابوالخیر مظہر عالم قاضی بہیروی باشندہ دربھنگا۔ دَورِ موجودہ کے کہنے والوں میں ہیں بہار میں انکے کلام کی خاصی شہرت ہے۔ چالیس برس کے قریب عمر ہے۔ یہ کلام کا خلاصہ ہے

یہ وہ نکتہ ہے کہ سمجھیں اسے اسرار پسند
ہے فرشتوں کو بھی خالِ رُخِ دلدار پسند

سرِ شوریدہ کو چوکھٹ پہ مجھے رکھدینا
اب کرے یا نہ کرے اسکو درِ یار پسند

دِل ہے تو اسکے ہونگے خریدار اَور بھی
ہم ڈھونڈ لیں گے تم سے طرحدار اور بھی

ہمکو یہ دیکھنا ہے کہاں تک کرے گا جور
ہاں اے جفا شعار ستمگار اور بھی

فتنے اُٹھا رہی ہے تمہاری نگاہِ ناز
ڈھاتی ہے حشر شوخیٔ رفتار اور بھی

خبیر۔ رائے نرہری پرشاد منتظم دفتر معتمد پیشکاری حیدر آباد دکن آپنے فنِ سخن میں میر احمد علی مہر سے استفادہ کیا تھا سنہ ۹ء اکے خدنگ نظر سے کلام انتخاب ہوا زیادہ حالات باوجود تلاش دستیاب نہوسکے ؎

وحشتِ دل ان دنوں ایسی گریبان گیر ہے
طوق گردن میں ہے میری پاؤں میں زنجیر ہے

لاکھ کوشش سے نہیں ہے دل سنایا حالِ ہجر
کہہ چکا اپنی سی اب آگے تری تقدیر ہے

بعد کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا۔ کچھ منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں۔

دل بیمار نہ تجکو کبھی اچھا دیکھا
عمر بھر دام غم و رنج میں الجھا دیکھا

وصل و ہجر میں اس بت کی تماشا دیکھا
عاشقوں کو کبھی مرنا کبھی جینا دیکھا

خیر ہے آپ گرے طور پہ کیوں غش کھا کر
کچھ تو فرمایئے کیا حضرت موسیٰ دیکھا

بوسہ لینے نہ دیا پیار انہیں کرنے نہ دیا
کبھی آئے بھی تو شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا

یاس میں ہوتے تو کاہیکو یہ جھگڑا ہوتا
آسرا دیکے مجھے آپنے مرنے نہ دیا

خیالی

خیالی جناب محمد نسیم اللہ صاحب مبارکپوری شاگرد مہر غازیپوری سنہ ۱۹۰۲ء کے نسیم دکن سے کلام منتخب ہوا معمولی کہنے والوں میں ہیں، چند اشعار انکے نتائج افکار سے درج کئے جاتے ہیں +

چاہتا عزت نظر رکھتا اگر تو فقیر پر
اے خیالی مبتلا ہوتا نہ رانجھا ہیر پر

کانپ اٹھے عرش والے بھی شب فرقت مگر
اُف نکی اُس سنگدل نے آہ پُرتاثیر پر

کر گیا سرمہ اثر پہلے نگاہ ناز سے
لیگیا بازی بت کافر کا جادو تیر پر

چھوٹنا مشکل ہے صیاد اجل کے دام سے
لاکھ سر ٹپکا کرے مارا کرے نخچیر پر

شیشہ و ساغر نہ محفل میں سبو درکار ہے
ساقی مہوش سے کہدو ایک تو درکار ہے

غزالان ختن کے ہوش ہوتے ہیں خطا کیسر
کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے

خیال یاد زلف یار میں کاٹے نہیں کٹتی
درازی شب فرقت خدا جانے کہاں تک ہے

خیالی

خیالی منشی محمد فخرالدین خیالی خلف مولوی عبدالعلی متوطن رائے بریلی سنہ ۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی دان تھے فن طب میں بھی دخل تھا اور علم عروض و قوافی میں کمال حاصل تھا۔ فن سخن میں منشی امیر اللہ صاحب تسلیم سے لکھنو جاکر استفادہ کیا، وہ نہایت توجہ سے انکی غزل بناتے تھے تکمیل علوم وفنون کے بعد ریاست حیدرآباد دکن میں کچھ عرصہ تک چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم رہے۔ پھر بھوپال میں ملازمت اختیار کی۔ انکی تصانیف سے "نثر خیالی" در مدح شاہ جہان بیگم والیٔ بھوپال اور ایک ضخیم مثنوی چارسو صفحہ کی زیور طبع سے

خطا کیا دل کی مجرم آنکھ ہے لاکھوں میں ہم کہدیں
مصیبت کے دنوں سے عیش کے دن جب مجھے بدلے
عدو بدلے تو بدلے ہوں مگر ہم تجھ سے کب بدلے
مجھے دم توڑتے دیکھا تو ڈر کر پھیر لیں آنکھیں
یہ کیوں تیوری چڑھاتے ہو یہ کیوں آنکھیں دکھاتے ہو
خیال اب تو ہوا بزم سخن کا اور ہی عالم
خیال اتنا نہیں کوئی جو پوچھے بات بھی دلکی
دلِ بیتاب چٹکی سے مسل کر وہ یہ کہتے ہیں
پرائی آگ میں اے سوزِ الفت کون پڑتا ہے
کہا جب میں نے تم کس واسطے دشمن سے ملتے ہو
کوئی جینے سے خوش ہوتا ہے یہ مرنے پہ مرتا ہے
کہے دیتے ہیں یہ کھولیگی اک دن رازِ الفت کو
جفا کا ڈھنگ طرز جور اٹھانا کوئی آساں ہے
یہ راہِ عشق بھی دنیا کی راہوں سے نرالی ہے
نہ آیا کام میرے کوئی بھی صحرائے غربت میں
اٹھا رکھی ہو جو میں نے کوئی تدبیر ایسی ہے
گلہ جور و ستم کا ہے نہ شکوہ ہے جفاؤں کا
دکھا دینگے کسی دن بے بلائے کون آتا ہے
خدایا کیوں مرے ہی کام بن بن کر بگڑتے ہیں
خیال اس بت سے نکلے کام یہ کہنے کی باتیں ہیں

یہی اُنسے لڑی تھی، ہاں یہی ہم پہ بلا لائی
خیال، اغیار کا تو ذکر کیا ہے دوست سب بدلے
وہی جیسے کے تیسے ہیں نہ جب بدلے نہ اب بدلے
ہیں صدقے مجھ سے بدلے بھی جو تم آئیں تو کب بدلے
یہ کسدن کی غایت کے لئے جانے ہیں اب بدلے
جو پہلے رنگ تھے انداز تھے وہ سب کے سب بدلے
رُلاتی ہے مجھے آٹھ آٹھ آنسو بے کسی دلکی
یہی دل ہے اجی تعریف کرتے تھے اسی دلکی
مرے آنسو ہی آ آ کر بجھاتے ہیں لگی دلکی
تو وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بولے خوشی دلکی
زمانے سے نرالی زندگی ہے زندگی دلکی
خیال اچھی نہیں ہر لحظہ ہر دم بیخودی دلکی
ابھی کچھ روز گردوں اُس ستمگر کے چلن دیکھے
کہ جس میں ہر قدم پر راہزن ہی راہزن دیکھے
خیال اپنی غرض کے یار یارانِ وطن دیکھے
مگر مشکل ہے تیرا وصل، کب تقدیر ایسی ہے
کہ عادت ہی تری اے آسمانِ پیر ایسی ہے
بتا دینگے کہ جذبِ عشق کی تاثیر ایسی ہے
الٰہی کیا کبھی کم بخت کی تقدیر ایسی ہے
کہ میں ایسا نہ میری خوبیٔ تقدیر ایسی ہے

خیال محمد صفدر علیخان خیالؔ شاگرد امیر سنہ ۱۸۹۲ء میں دفتر امیر اللغات میں کام کرتے تھے

خیال

ترا غم بھی دل سے جدا کر دیا
ارے ابنو آ تخلیہ کر دیا

یہ کیوں تم نے محشر بپا کر دیا
یہ کیا تم کو سوجھی یہ کیا کر دیا

خزاں دیدہ تھا زندگی کا چمن
محبت نے کچھ کچھ ہرا کر دیا

ملے عمر رفتہ تو پوچھونگا میں
تجھے کس نے مجھ سے خفا کر دیا

جان نثاری کے یہ انعام دیئے جاتے ہیں
اُلٹے سیدھے مجھے الزام دیئے جاتے ہیں

کچھ زباں ہم بھی ہلائیں تو بھرا اچھا کیا ہو
آپ دشنام پہ دشنام دیئے جاتے ہیں

بادۂ ناب نہیں، بادۂ کوثر، واعظ!
اِسکی قیمت میں کھرے دام دیئے جاتے ہیں

مفت دو گھونٹ پلا دے ترے صدقے ساقی
ہم غریبوں سے کہیں دام دیئے جاتے ہیں

اور کچھ گانٹھ گرہ میں نہیں انکی ساقی
شیخ جی جامۂ احرام دیئے جاتے ہیں

رند دستار فضیلت نہ اُتاریں واعظ
آپ میخانے سے بے دام دیئے جاتے ہیں

جب رُخ سے ترے نقاب سرکی
آنکھیں روشن ہوئیں نظر کی

لایا ہے جواب میرے خط کا
ہو عمر دراز نامہ بر کی

بل کھا کے خیال میں بھی آئی
اللہ رے نازکی کمر کی

کیوں وصل دعا پہ منحصر ہو
محتاج ہے خود دعا اثر کی

ہر کام ہے دوسرے کے بس میں
اللہ رے بے بسی بشر کی

دم بھرتے ہو میری دوستی کا
یہ آج ہوا چلی کدھر کی

آفت ہے شباب کی تجلّی
کیا دھوپ کڑی ہے دوپہر کی

اُس بت کو خیال دید یا دل
کچھ قدر نہ کی خدا کے گھر کی

ترے کوچے میں تیری دید کی خواہش تو کیا لائی
ہماری موت آئی گھیر کر ہمکو قضا لائی

اجل روٹھی ہوئی تھی آئیے بیمار فرقت سے
خدا رکھے سلامت جانکنی کو یہ منا لائی

بھری محفل میں ہم آغوش غیروں سے تجھے دیکھا
یہی اک دیکھنا باقی تھا، یہ قسمت دکھا لائی

ساقی کی مست آنکھوں پہ دل لوٹے جاتے ہیں
شیشے جھکے ہُوئے ہیں پیالوں کے سامنے

کیا جلوہ بیحجاب ہو جب گر پڑیں کلیم
اُٹھتا ہے لُطف دیکھنے والوں کے سامنے

ستم ہے حشر میں وہ مُسکرا کر مجھ سے کہتے ہیں
اِدھر تو دیکھنا کسکی شکایت ہونیوالی ہے

ق

نامہ بر مجھ سے پوچھتا کیا ہے؟
ہیں نشاں صاف کوئے قاتل کے

کہیں پُرزے اُڑے ہوئے خط کے
کہیں ٹکڑے پڑے ہوئے دِل کے

کھینچ ناوک کو نہ ظالم یہ جفا رہنے دے
ایسے مہماں کو کلیجے سے لگا رہنے دے

زندگی کے مزے اُٹھائیں گے
ہو کے مہمان تیغ قاتل کے

الٰہی کیا کروں حسرت بھری آنکھ
اُٹھیں ضد ہی محبت کی نظر سے

خیال اس درد کا رہ رہ کے اُٹھنا
کوئی پوچھے مرے دل سے جگر سے

درد تھمتا ہے تو کس پیار سے دِل کہتا ہے
اُٹھ مرے راتوں کو تُو اُٹھ اُٹھکے جگانیوالے

کوئی دم اور ٹھہر جایئے جلدی کیا ہے؟
آپ کیا ہم بھی تو ہیں آپ سے جانیوالے

مقدر میں عشقِ بتاں لیکے آئے
ازل سے غمِ جاوداں لیکے آئے

وہ کہتے ہیں سنکر مری حسرتوں کو
تم آئے کہ اک کارواں لیکے آئے

چلے گا نہ یاں تیرے خنجر کا فقرہ
وہ گویا ہاتھ بھر کی زباں لیکے آئے

سلام اب تو جاتے ہیں اے کعبہ والو!
یہاں ہمکو وہم و گماں لیکے آئے

کہاں ہیں خیال اور کہاں کوئے قاتل
بڑے اک مرے مہرباں لیکے آئے

خیال

خیال سید شمس الحق نام گلاوٹھی ضلع بلندشہر کے رہنے والے منشی امتیاز احمد خان صاحب راز رامپوری کے تلمیذ رشید ہیں۔ عرصہ چھ سات سال سے ریاستِ رامپور میں وکیل ہیں کلام بامزہ ہوتا ہے۔ زبان کی جانب توجہ ہے۔ مضمون بھی خوب نکالتے ہیں۔ رامپور کے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔ پڑھتے بھی اچھا ہیں۔ بدرجۂ اوسط تمام خوبیاں اِنکے کلام میں موجود ہیں۔ اگر موجودہ مشق جاری رہی تو عنقریب اچھا کہنے والوں میں اُنکا شمار ہوجائیگا

مضمون میں شوخی اور طبیعت میں جدت بلا کی ہے، روزمرہ صاف اور بندش بہت چست ہے

آپکے والد محمد اکبر علیخان شاہجہانپور کے باشندے تھے۔ جناب خیال غالباً شاہجہان پور کی عدالت میں مختاری کرتے ہیں۔ شعر خاصہ کہتے ہیں اور کسی رنگ میں بند نہیں۔ زبان، بیان مضمون سب باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ آپنے شعر و سخن کا ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا مگر اب عرصہ سے بند ہے۔ الغرض شاہجہاں پور میں جہاں اچھے شاعروں کی کمی نہیں انکے کلام کی بھی اچھی خاصی شہرت ہی ۵۴ برس کے قریب سن ہے کچھ کلام نظر سے گزرا اسکا انتخاب حاضر کیا جاتا ہے۔

کوئی پرسانِ حالِ بینوا ابتک نہیں آیا
ترے بسمل کا پیغام قضا ابتک نہیں آیا

یہ کیا ہی کیوں چھپایا منہ مجھے حیرت زدہ پاکر
تمہیں افسوس اندازِ حیا ابتک نہیں آیا

دیکھے کوئی عروج تری جلوہ گاہ کا
ایک ایک کوہِ طور ہے ہر سنگ راہ کا

لاکھوں فریب ایک وہ اندازِ گفتگو
لاکھوں فتور ایک کرشمہ نگاہ کا

تم اپنے گریبان کی خیر مانگو
بلا سے ہوا چاک دامن کسیکا

قیامت ہی آئے نہیں میری طبیعت
بلا ہے ابھرنے میں جوبن کسیکا

نیا نیا ہے ابھی شوق خود نمائی کا
خدا نہیں ابھی سامان ہی خدائی کا

اسی کی چشم کی گردش کا آسماں بسمل
شفق شہید اسی پنجۂ حنائی کا

دکھایا مجکو جو وحشت نے وادیٔ پرخار
کہا جنوں نے یہ حق ہے برہنہ پائی کا

بتوں کو پیار کرے جان کھوئے دل کھوئے
اور انکے سامنے جھوٹا بنے فدائی کا

نہ پوچھ اے مرے وعدے کے بھولنے والے
اجل کو یاد ترے اعتبار پر نہ کیا

بٹھایا ہے مجھے خاموش رعب حسن نے لیکن
بتایا ہے نگہ کو لوٹ جانا تیرے جوبن پر

نگاہِ شرمگیں سے اسنے جب دیکھا یہ دل بولا
کوئی تیر اور بھی ظالم ابھی میں نیم بسمل ہوں

واہ رے خوبیٔ قسمت یہ سنا ہے کہ وہ آج
میری تقدیر کا دشمن سے گلا کرتے ہیں

افشاں جبیں پہ دوش پہ گیسو چھٹے ہوئے
طرفہ چراغ جلتے ہیں کالوں کے سامنے

جو گرا قصرِ محبت میں نہ اُبھرا وہ خیال
کیا بری اُفتاد ہے یہ عشق کی اُفتاد بھی

قدرِ وفا نہ ہو جب بے سود پھر وفا ہے
کچھ اور اب ارادہ ہم نے بھی کرلیا ہے

آنے کی کس کے اے دل امید کر رہا ہے
جھوٹا زمانہ بھر کا وہ ایک چالیا ہے

آنکھوں میں کھبنے والی دل میں تڑپنے والی
تیری ہر ایک شوخی تیری ہر اک ادا ہے

تم جانو یا نہ جانو جو حال ہے ہمارا
اللہ دیکھتا ہے اللہ جانتا ہے

سیماب، شمع، بجلی، ہیں بیقرار تینوں
عاشق کی بیقراری سب سے مگر جدا ہے

آنکھ اُس سے کیوں ملائی؟ کیوں تو نے چوٹ کھائی
میں دل سے پوچھتا ہوں دل مجھسے پوچھتا ہے

جب تک بغل میں دل تھا یہ تجربہ نہیں تھا
مشہور ہے کہ انساں کچھ کھو کے سیکھتا ہے

ناصح تجھے خبر کیا وہ خوب رو ہے کیسا
ہم کیا مٹے ہیں اُس پر عالم مٹا ہوا ہے

سینے سے ہم لگائے رہتے ہیں داغِ دل کو
کیونکر نہ ہو پیارا کس کا دیا ہوا ہے

کیا مفت چاہتا ہوں کچھ بھیک مانگتا ہوں
دینا ہی ہوگا بوسہ جب نقدِ دل لیا ہے

رسوائیوں کا تیری پھیلا خیال چرچا
جس سے جہاں ملے ہیں یہ تذکرہ سنا ہے

نیند آئی شام کو کچھ بات ہے
یہ ہمارے ٹالنے کی گھات ہے

چال اسکے ساتھ کچھ چلتی نہیں
عشق کی بازی ہمیشہ مات ہے

گالیاں ملتی ہیں جب کیجے سوال
حسن والوں کی یہی خیرات ہے

تعجب ہے کہ پیری میں بھی داغِ عشق باقی ہے
سحر ہوتے ہی ورنہ شمع اُٹھ جاتی ہے محفل سے

مری حالت وہ پوچھیں سُنکے رو دیں میں نہ مانوں گا
مرے خوش کرنیکو قاصد نے یہ باتیں گھڑیں دل سے

مری مشکل کی آسانی ہوئی ہے کیسی مشکل سے
نزاکت سے چھٹا پڑتا تھا خنجر دستِ قاتل سے

تم اپنے طالبِ دیدار سے ناحق اُلجھتے ہو
جو ارباب ہم ہیں جھک کے ملتے ہیں وہ سائل سے

جنابِ داغ کا فیضان ہے یہ شاعری اپنی
خیال اس فن کو سیکھا ہے بڑے اُستادِ کامل سے

خیال - ابوالمعانی جناب مولوی سید محمد علی صاحب شاہجہان پوری تلمیذ امیر مینائی لکھنوی

خیال

ہماری زندگی ہے آپ کے ہاتھ
نہیں، پر مرتے ہیں جیتے ہیں ہاں پر

ہمیں نے تو ستم بے شمار جھیلے ہیں
ہمیں تو ہیں کرم بے حساب کے قابل

دعائے وصل صنم کے لئے حرم کو گئے
چلے گناہ کو ٹھہرے ثواب کے قابل

کباب دل ہو تو جچتا ہے نشۂ مے عشق
گزک ہے خاص یہی اک شراب کے قابل

نہ آئی دختِ رز لبس میں جناب شیخ کے اب تک
نہ ہو کس طرح شک رندوں کو حضرت کی کرامت میں

خبر کیا پوچھتے ہو اپنے بیمارِ محبت کی
جو دم ارمان میں ٹوٹا تو نکلی جان حسرت میں

شہرت ہوئی تمہاری ہمارے ہی عشق سے
معشوق جس نے تم کو بنایا ہمیں تو ہیں

بے بندگی کے جسکو ہو انعام کی اُمید
عاصی ترے وہ بارِ خدایا ہمیں تو ہیں

آئینہ دیکھتے ہیں تو کہتا ہے اُن سے عکس
تم سا حسیں بھی جس پہ ہو شیدا ہمیں تو ہیں

کل دیکھ کر خیال کو تسکین ہو گئی
سمجھے تھے ہم کہ شہر میں رسوا ہمیں تو ہیں

نہ طاقت فغاں کی نہ ضبط فغاں کی
یہ زوروں پہ ہے ناتوانی ہماری

اِس تغافل کو ہمیں جانتے ہیں
یہ بھی اک طرح کی ہشیاری ہے

گالیاں دینے لگے جب خوش ہوئے
یہ نئی بخشش نیا انعام ہے۔

یہ بلا شرحِ مصیبت پر جواب
دل لگانے کا یہی انجام ہے

ہوش اک جلوہ میں لیلے وہ جمال اُنکا ہے
دلکو بیتاب جو رکھے وہ خیال اُنکا ہے

آج رہ رہ کے جو یوں عذرِ جفا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

لذتیں عالمِ اُمید کی برحق لیکن
عالمِ یاس میں کچھ اور مزا ہوتا ہے

چپ رہوں تو وہ سمجھتا ہی کچھ آزار نہیں
اور دُکھ درد سناؤں تو خفا ہوتا ہے

دے چکے دل تو پھر اب روتے ہو بیکار خیال
چوک جب ہو گئی پچھتانے سے ہوتا کیا ہے

جب کہا ایفائے عہد وصل کو کہنے لگے
کیسا وعدہ؟ کب کا وعدہ؟ ہو مجھے کچھ یاد بھی

یہ وفا، یہ جاں نثاری، یہ جگر، یہ دل کہاں
بندہ پرور غیر پر کی ہے کبھی بیداد بھی

کیا بات ہے عدم میں کہ دُنیا سے جو گیا
آیا نہ پھر پلٹ کے وہیں کا وہ ہو گیا

دلدار کی ہوس میں دل اپنا ہی کھو گیا
لالچ میں فائدے کی یہ نقصان ہو گیا

خوش ہوں کہ باوفا تو ہوں اُسکی نگاہ میں
ہر چند سر گیا وہ مجھے مان تو گیا

میرا سوال وصل ۔ پھر اُنکی وہ گالیان
پھر پوچھنا وہ طنز سے دُکھیئے سُنا جواب

جس سے دیکھا چار دن دیکھا ملاپ
یہ بھلا کس کام کا تیرا ملاپ

دشمنی کی ابتدا ہے دوستی
وہ ہی بگڑا ہمسے جس کا تھا ملاپ

مل گئیں آنکھیں تو اِس کی کیا خوشی
لُطف جب ہے دل سے ہو اُنکا ملاپ

رہ رہ کے تولتے ہو کیا خنجر دودم کو
گردن پہ پھیر بھی دے اب آ بنی ہے دم پر

پھیلا ہے نور اُسکا سارے جہان میں یکساں
اے کعبہ والے تمکو کیا ناز ہے حرم پر

کسکے یہ نقشِ پا ہیں کوئے عدو میں یار
سر جھک رہا ہے اپنا سجدے کو ہر قدم پر

اُس بت نے میرے دل میں گھر کر لیا تو کیا ہے
آخر بتوں کا قبضہ اک روز تھا حرم پر

دیکھا ہے جب سے اُسکو اتنے نڈھال کیوں ہو
خود روتے ہو خیال اب ہنستے تھے پہلے ہم پر

رُکا کیوں ہاتھ کیسی بیخودی چھائی یہ قاتل پر
وہ بیٹھا ہے چھری رکھے گلوئے نیم بسمل پر

تمہیں دیکھا ہے جسنے اُسکو اکثر ہو ہی جاتا ہے
تمھارے چاند سے چہرہ کا دھوکا ماہِ کامل پر

زہے طالع زہے قسمت خط اُس کا میرے پاس آیا
کبھی رکھتا ہوں آنکھوں پر کبھی سر پہ کبھی دل پر

جسے تو پردہ سمجھا ہے یہ دودِ آہ ہے مجنوں
ذرا آنکھیں جما کر دیکھنا لیلی کے محمل پر

آئے جو فاتحہ کو پڑی آنکھ یار پر
شیشہ بجائے سنگ ہو میرے مزار پر

محشر میں کچھ نہ داورِ محشر سے کہہ سکا
رحم آ گیا مجھے نگہ شرمسار پر

چتون تو کہہ رہی ہے وفا نام کو نہیں
دل دے جو کوئی تمکو تو کس اعتبار پر

قیس اپنی دھن میں ہے اُسے اسکی خبر نہیں
محمل میں کیا گذرتی ہے محمل سوار پر

کیا کس کی نگہ نے اسکو بیتاب
تڑپتی کیوں ہے بجلی آسمان پر

رمضان ۱۳۱۱ سنہ ہجری میں حضرت داغ مرحوم سے تلمذ اختیار کیا۔ اُردو میں میرا تخلص خیال ہے اور فارسی میں دانش۔ فارسی میں جناب خواجہ عزیزالدین صاحب عزیز لکھنوی کے فیض اصلاح سے مشرف ہوتا ہوں۔ اب شعر وسخن کا اتفاق کمتر ہوتا ہے۔"

جناب خیال واقعی ایک عمدہ اور بامذاق طبیعت و قابلیت کے شخص ہیں۔ فارسی میں بہت اعلیٰ قابلیت رکھتے ہیں۔ علاوہ نظم کے موجودہ زمانے کی روشنی کے موافق نثر بھی اچھی کہتے ہیں اس زمانے میں آپنے ایک فارسی مشہور کتاب نامہ دانشوران ناصری کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے جو انجمن ترقیٔ اُردو نے پسند کیا اور جسکی صحتِ زبان کی مولانا شبلی جیسے ماہر نے داد دی علاوہ شعر وسخن کے شکار کا بھی شوق ہے نشانہ اچھا لگاتے ہیں۔ راقم تذکرہ سے خط وکتابت رہتی ہے۔ کلام بہم رسیدہ میں سے کچھ اشعار منتخب ہوکر درج کیئے جاتے ہیں۔ زبان درست بندش چست مضامین صاف عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں۔ اپنے والد کا دیوان بھی آپنے اپنے کلام کے ساتھ ارسال کیا تھا۔ اب انکا کلام ملاحظہ ہو جو اُن غزلوں سے انتخاب کیا گیا ہے جو خود جناب خیال نے مؤلفِ تذکرہ کو ارسال کی تھیں۔

یہ نہ کہیئے کہ مجھ پہ کس کا حق	بندہ پرور میری محبت کا
بعضوں کی خامشی میں بھی اظہار ہے خیال	رستہ بتاتے ہیں لبِ خاموش نقشِ پا
جمال ان میں جلال ان میں پھر انپر شانِ استغنا	بتوں میں کیا کہوں جلوہ مجھے کس کا نظر آیا
گوشۂ خلوت، دلکو فراغت رات سہانی جوشِ جوانی	یار بغل میں ہاتھ میں بوتل آج مزا ہے بادہ کشی کا
دیکھو خیال آئینہ لگا کر کیسی اُداسی چھائی ہے منہ پر	کہتے نہ تھے ہم عشق و محبت جان کا گاہک ہے روگ ہے جی کا
صاف طینت صاف باطن ہے خیال	جب مِلا جس سے ملا دل سے ملا
اللہ اللہ رے اُس بت کا جمال	دیکھ کر جسکو خدا یاد آیا
پائے بوسی ہے عبث بے فیض کی	دیکھ کیا دریا کو ساحل سے ملا
دیکھ لی ہمنے سخاوت آپ کی	ایک بوسہ وہ بھی مشکل سے مِلا

اَے یاسمن اُس سے نہ مقابل ہو کہ جس کا پھر داغ جگر ہو گئے غیروں کے بھی تازہ	مَیلا ہو بدن ہاتھ لگائے سے کسی کے تربت پہ مری پھول چڑھانے سے کسی کے

خیال

خیال- مولوی محمد ریاض حسن خان خلفِ اوسط مولوی حکیم محمد ہادی حسن خان نایاب رئیس اعظم موضع رسول پور ضلع مظفر پور- ترتیب تذکرۂ ہذا کے وقت جو حالات آپنے قلمبند کر کے بھیجے اُن کا خلاصہ یہاں درج ہی آپ لکھتے ہیں کہ "میری ددھیال، ننھیال دونوں شیخ ہیں آبار واجداد ہمیشہ صاحب اعزاز و امتیاز رہے- عہد مغلیہ میں جو عزت و ناموری اُنہوں نے پیدا کی اُن پُرانی باتوں کا تذکرہ فضول ہی- عہد انگلشیہ میں میرے پردادا مولوی مولا بخش خان بہادر سی- آئی- ای نے غدر کے زمانے میں گورنمنٹ اور ملک کی جو خدمتیں کیں اُن کا ذکر کتابوں میں موجود ہے چنانچہ گورنمنٹ نے اُنہیں اسٹار آف انڈیا (نجم الہند) کا خطاب دیا- اُنکے بڑے صاحبزادے حاجی محمد امیر حسن خان مرحوم و مغفور میرے دادا تھے- میں ۱۲ رجب ۱۲۹۴ھ ہجری کو پیدا ہوا- چنانچہ ایک ترکیب میں خود کہتا ہوں-

در ہزار و صد و چار و نود ہجری سال پیکرِ خاکیٔ من از عدم آمد بوجود	روز اثنا عشر از ماہِ رجب پیش زوال ہمچو نجمے کہ زبیت الشرف آید بوبال

میں چھ برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا- دادا نے تعلیم و تربیت کی- فارسی عربی مختلف اُستادوں سے پڑھنے کا اتفاق ہوا- جن میں سب سے زیادہ حکیم حافظ سید فرزند علی صاحب دہلوی سے استفادہ ہوا- شعر و سخن کا مجھے بچپن ہی سے شوق تھا- چھ سات برس کی عمر میں ڈیڑھ دو ہزار اُردو فارسی اشعار یاد تھے- اور مجھے خوب یاد ہے کہ اس عمر میں بھی میں بعض اچھے شعروں سے متاثر ہوتا تھا- گیارہ برس کی عمر سے مَیں نے شعر کہنا شروع کیا- چنانچہ میری پہلی غزل کا پہلا شعر یہ ہے- ؎

تیری اے حور غضب ہیں آنکھیں	چشمِ بد دُور غضب ہیں آنکھیں

جب تک مولٰنا فرزند علی بیتاب دہلوی مرحوم یہاں رہے اُن کو کلام دکھاتا رہا- پھر

نوکِ مژۂ یار کا کرنا نہ تصوّر
نکلے گی نہ پھر دل میں جو یہ پھانس گڑ گئی

ہی صلح کی تدبیر عبث یار سے خوشوقت
الجھائیگا خود آپ سے قسمت جو لڑ گئی

عجب کمال پہ جوبن ترا شباب میں ہی
یہ ضَو نہ نُور نہ مہ میں نہ آفتاب میں ہی

ادا جان لیتی ہے جانی تمہاری
قیامت ہوئی ہے جوانی تمہاری

فدا تم پہ میں ہوں تم اَوروں کو چاہو
یہ قسمت مری قدر دانی تمہاری

تمہارا ہے وردِ زباں ذکر ہر دم
وظیفہ مرا ہے کہانی تمہاری

یہ خوشوقت آتش کے فیض و کرم سے
زباں زد ہوئی خوش بیانی تمہاری

خیال

خیال - غلام حسین خان خیال برادر زادہ و شاگرد برکت اللہ خان برکت شاعر فارسی بہت پرگو شاعر تھے - ایک لاکھ شعر کے قریب کہے تھے - بیگم سمرو کے ملازم تھے ۱۲۴۳ھ میں انتقال کیا - سُنا ہے کہ پانی پت میں انکے دو دیوان موجود ہیں - یہ اِنکے کلام کا نمونہ ہے -

تجھے تو غیر کو منظور منہ دکھانا تھا
نقاب کھولنا گرمی سے اک بہانہ تھا

پھرنے سر سے ہوا خانۂ مجنوں آباد
پاؤں جب ہم نے دھرا آنکے ویرانے میں

حاضر ہیں ہم تو آؤ شمشیر کیں نکالو
جو دل کی آرزو ہو اُس کو کہیں نکالو

جرعہ افشاں ہو ہماری خاک پر غافل کبھی
ہم بھی اے ساقی تری محفل کے میخواروں میں تھے

مژگاں کی یہ کاوش نہیں ناوک فگنی ہے
ابرو کی اشارت نہیں شمشیر زنی ہے

تیرا شگفتگی پر دل آیا ہی اے خیالؔ
اے غنچۂ فسردہ تجھے بھی ہوا لگی

خیال

خیال - منشی جیٹھ رائے خیالؔ کایستھ دہلوی - فارسی شعر بھی کہتے تھے - شاہ نصیر کے ہمعصر تھے - کلام درد انگیز ہے - زبان، بندش، مضمون، سب خوبیاں لایق داد ہیں - افسوس ہو کہ باوجود تلاشِ اسی قدر اشعار ایک بیاض میں سے دستیاب ہوئے -

تو جور و ستم کر نہ سکھائے سے کسی کے
کچھ پھل نہیں پائیگا ستائے سے کسی کے

حسرت ہی رہی جی میں مرے آہ پس از مرگ
بالیں پہ دمِ نزع نہ آئے سے کسی کے

خوشدل

خوشدل۔ محمد حمید الظفر خان رامپوری خلف عباس خان۔ زندہ دل شخص ہیں اور اسی وجہ سے اپنے حسب حال تخلص تجویز کیا ہے۔ مرزا عابد حسین اوج رامپوری کے تلامذہ میں ہیں رامپور کے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔

یاد آکے وہ تبسم ہمکو رُلا رہا ہے
سوز غم محبت دل کو جلا رہا ہے

ہر لحظہ سامنا ہے تازہ مصیبتوں کا
یہ عشق تیرا مجکو کیا کچھ دکھا رہا ہے

حال زبوں ہمارا کیا پوچھتا ہے ہمسے
کُچھ تو ستا رہا ہے کچھ غم ستا رہا ہے

کس شوق سے ہم اُسکی صورت کو دیکھتے ہیں
کِس ناز سے وہ اپنے مُنہ کو چھپا رہا ہے

اُلفت نے تیری ظالم آخر ہمیں مٹایا
اب کیوں ستا رہا ہے اب ہم میں کیا رہا ہے

ایک دن تھا وہ کہ تیرا کوچہ تھا اور ہم تھے
جنگل میں جوش سودا اب تو پھرا رہا ہے

میں وہ ہوں یاد تیری رہتی ہے میرے دل میں
تو وہ ہے اپنے دل سے مجھکو بھلا رہا ہے

اُس شوخ کا بگڑنا تقدیر کا تھا بننا
باہیں گلے میں ڈالے خوشدل منا رہا ہے

اِس سے عشاق کو ملتی ہے حیات جاوید
آب حیواں ہے کہ خنجر کا ترے پانی ہے

خوشوقت

خوشوقت۔ منشی خوشوقت رائے صاحب عرف راجہ بینی جی متخلص خوشوقت شاگرد آتش و میر وزیر علی صبا بخشی الملک راجہ لالجی بہادر بخشی زمانہ شاہی لکھنو کے بیٹے تھے گاہ گاہ مست تخلص بھی کر لیتے تھے۔ غدر کے دس بارہ برس بعد انتقال کیا۔ لکھنو کے عمائد میں گنے جاتے تھے اور کبھی کبھی فکر سخن سے دل بہلاتے تھے۔ کلام بہم رسیدہ کا یہ انتخاب ہے۔

گیسوؤں کا جو لئے دام وہ گلفام آیا
بلبل دل مرا خود اُڑ کے تہ دام آیا

تخت و تاج و علم و طبل شہنشاہوں کا
سب دھرا رہ گیا جب موت کا پیغام آیا

نہ پوچھو درد کہاں سینے میں ہے عاشق کے
غش آگیا ہے ابھی تو جگر جگر کرتے

شکل مہ و خورشید تو کب دل میں گڑیگی
جب آنکھ لڑے گی کسی اُوچھے پہ پڑیگی

اِس دل کے لگانے کا ہم انجام نہ سمجھے
پتھر میں یہ برچھی نہ کسی طرح گڑے گی

ہوئی بیتاب سیتا سُن کے یہ حال — پریشاں صورتِ سنبل کیے بال
ہُوا جینا اُسے سب رام مشکل — نہ لائی تابِ ہجرِ گل عنادِل
فراقِ رام کب ہو اُس کو منظور — غضب ہے شمع سے پروانہ ہو دور
سیا پھر آئی پیشِ مادرِ رام — پریشاں ہوئے زلفِ عنبریں فام
ہوئی پابوسِ خوشدامن ادب سے — ہوئی رخصت کی خواہاں رو کے سب سے
ہوئی دلگیر خوشدامن یہ سُنکر — کہا اے راحتِ دلہائے مضطر
بیاباں میں نہیں عورت کا ہے کام — نہ کر بربادِ ناحق ننگ اور نام
کہا سیتا نے اے خوشدامنِ پاک — نہوں جانے سے میرے آپ غمناک
نہیں بہتر ہے اِس سے کوئی دولت — کرے عورت جو شوہر کی اطاعت
رہا کب دامنِ شوہر ہو زن سے — کہیں سایہ جُدا ہوتا ہے تن سے

… حالِ بیقراریٔ رعایا

رواقِ طاق و منظر کا اُڑا رنگ — ہوا غم سے مُشبک سینۂ سنگ
زبس تھے غم سے گریاں سقف و دیوار — نظر آتے تھے روزن چشمِ خونبار
مکانِ شاہ کے ہر طاق و منظر — پئے گریہ تھے شکلِ دیدۂ تر
ہزاروں چشم سے روتا تھا دریا — حباب اُسکے ہوئے دیدے سراپا
کیا غم سے سحر نے پیرہن چاک — اُڑائی سر پہ اپنے شام نے خاک
جہاں گریاں تھا سب آہ و فغاں سے — فرشتے گل فشاں تھے آسماں سے
نہ کھولی آنکھ ایسی شہ نے کی بند — یکایک جبکہ چھوٹے دونوں فرزند
زمیں پر شاہ تھا اِس طرح بیتاب — کہ ہو جس طرح سے آتش پہ سیماب
لہو تھا ہر بنِ مژگاں سے جاری — پسند آنکھوں کو آئی اشکباری
اودھ میں زاغ نالاں بن میں بلبل — اُگے کانٹے یہاں پھولے وہاں گل
چلے جس دم اودھ سے رام و لچھمن — گرا لنکا میں سر سے تاجِ راون

ہوا آشفتہ خاطر دیکھکر شاہ
سرِ بالینِ پر و یں پر گیا ماہ

کہا اے جانِ شاہِ عالم آرا
ہوا کیا رنج دل پر آشکارا

زروئے شکر بولی کیکئی تب
کیا تم نے مرا کہنا سدا سب

کیئے تھے پیشتر دو مجھ سے اقرار
کیئے تم نے وفا ابتک نہ زنہار

کہا دسرت نے اے جانِ شہنشاہ
کرو مطلب سے اپنے مجھکو آگاہ

بجا لاؤں اُسے بالراس والعین
دلِ بیتاب کو بخشو ذرا چین

قسم ہے رآم کی گر جان مانگو
تو حاضر ہے نہیں افسوس مجکو

یہ سنکر کیکئی با دیدۂ تر
ہوئی حاضر حضور شاہ اُٹھکر

کہا ہیں شاہ سے مجکو دو مطلب
وفائے عہد ہے شاہوں کو انسب

بھرت کو سلطنت کا دیجئے کام
بیاباں میں رہیں چودہ برس رآم

یہ سنکر ہو گیا بے ہوش دسرت
گرا سر سے زمیں پر تاج دولت

ہوا چہرہ غم و اندوہ سے زرد
کہا یوں کیکئی سے با دم سرد

بھرت کو تاج دوں اے راحتِ دل
جدائی رآم کی لیکن ہے مشکل

جو آیا دیکھنے سے رآم کے ہوش
ہوا با گریہ و زاری ہم آغوش

زبس غم سے نہ تھا یارائے گفتار
رہا مانند نرگس محو دیدار

کہا تب رام سے ماں نے یہ مضموں
بھرت سے مجکو تم پیارے ہو افزوں

کیئے تھے شاہ نے دو مجھ سے اقرار
وفا میں اُنکی اب ہے صاف انکار

اگر دنیا میں چاہو بول بالا
بجا لاؤ قرارِ شاہِ والا

کہا شاہِ دو عالم نے زہے بخت
مبارک ہو بھرت کو افسر و تخت

یہ کہکر شاہ سے رخصت ہوئے رآم
پڑا دولت سرائے شہ میں کہرام

ہوئے مادر سے رخصت رآم جا کر
بہت روئی گلے مل مل کے مادر

شکی کی تقدیر راز و سرشت

....

کہا پھر منتھرا نے باصفائی ‏ بھلائی میں ہوئی حاصل برائی
کوئی ہو بادشہ کیا مجکو مطلب ‏ نہیں لونڈی سے بیوی ہونگی میں اب
ولے میں ہوں کنیز بانوئے شاہ ‏ کیا راہِ نمک خواری سے آگاہ
کہا میں نے براہِ خیر خواہی ‏ مبارک رام کو ہو بادشاہی
نہیں خواہش مجھے کچھ سیم و زر کی ‏ خطا کی میں نے گر تم کو خبر کی
مجھے مطلب نہیں ہے کچھ کسی سے ‏ خوشی اپنی ہے مالک کی خوشی سے
ولے کیا کیجئے اِس دل کا چارا ‏ بُرائی ہے تمھاری ناگوارا
زمانے میں ہے یہ روشن سبھوں پر ‏ کہ دشمن ہے برادر کا برادر
خصوصاً جبکہ ہووے بادشاہی ‏ مقرر ہو برادر پر تباہی
زبانِ چرب سے جب کی یہ تقریر ‏ ہوئی تب کیکئی بیزار و دلگیر
ہو دلگیر تب بولی وہ نادان ‏ کہ ہے تدبیر اس مشکل کی آسان
کیئے ہیں شہ نے جو دو عہد محکم ‏ کہو تم شہ سے امشب شاد و خرم
سحر گہ رام ہوں صحرا کو راہی ‏ بھرت کو دیجئے دیہیم شاہی
کیا یوں کیکئی کو جبکہ اغوا ‏ ہوا برگشتہ دِل پھر کیکئی کا
عروسی پیرہن تن سے کیا چاک ‏ ہوئی آشفتہ غلطاں بر سرِ خاک
کیئے غم سے پریشاں مشکبو بال ‏ بچھایا مکر و فن کا خاک پر جال
بوقتِ شب ہوا شاہِ زمن کو روز ‏ محل میں کیکئی کے رونق افروز
پریشاں حال دیکھا کیکئی کا ‏ ہوا دلگیر شاہ عالم آرا
یہ اُسکے عشق میں دیوانہ تھا شاہ ‏ کہ تھی وہ شمع رو پروانہ تھا شاہ
نہ تھی بیتابیٔ معشوقہ منظور ‏ نہ کرتا تھا کبھی نزدیک سے دور
جو فرشِ گل پہ کرتی تھی سدا خواب ‏ اُسے دیکھا زمیں پر در تپ و تاب

منتھرا کا رانی کیکئی [illegible]

مُرصّع سر پہ زیبا تاجِ زرّیں　　عیاں چہرے سے نورِ ماہ و پروین
پئے آرایشِ تاجِ زرافشاں　　کیا آئینہ پیشِ روئے تاباں
نگاہِ شہ پڑی کاکل پہ اِک بار　　سفید آئے نظر بال اُس میں دو چار
خزاں دیکھی بہارِ زندگی میں　　اماں دیکھی خدا کی بندگی میں
سُنا جب سار و اسنے یہ فسانہ　　ہوئی شوئے اودھ پیدل روانہ
ہوئی جا کر وہاں پر حیلہ انگیز　　نہ پایا کوئی دشمن اُس جگہ تیز
کنیز اک کیکئی کی منتھرا نام　　زبس تھی عقل و دانش سے وہ ناکام
کیا نطقِ زباں کو اُس کے اِغوا　　وہ نکلی شہر میں بہرِ تماشا
جو دیکھا یہ اودھ میں جلوۂ عیش　　حضورِ کیکئی آئی بصد طیش
سراپا تن میں روشن آتشِ خشم　　رواں مانندِ دریا چشمۂ چشم
کہا یوں کیکئی سے باغم و آہ　　کہ کیا غافل ہے تو اے بانو شاہ
بھرت کو شاہ نے گھر سے کیا دُور　　خلافت ہے بنامِ رام مسطور
محبت پر ہے نازاں شہ کی ناحق　　یہ تیرا ہے خیالِ خام مطلق
بظاہر تجھپہ عاشق ہے شہنشاہ　　و لے باطن میں کوشلیا کی ہے چاہ
یہ کوشلیا کا ہے سب مکر اور فن　　کہ بیشک سوت کی ہو سوت دشمن
خلافت کا اگر ہو رام کو تاج　　ترا فرزند ہو روٹی کو محتاج
یہ سنکر کیکئی بولی غضبناک　　کہ کیا کہتی ہے تو اے شوخ بیباک
اگر ہو رام کو تاجِ خلافت　　بھرت کو ہے زہے فخر و سعادت
مرے دل کے بر آئیں سب مطالب　　بھرت اور رام ہیں یک جاں دو قالب
نہو اُن میں کبھی ہرگز جدائی　　اگر ہو اک طرف ساری خدائی
تو ہے بد باطن و بدکار و بد ذات　　غضب تو نے نکالی منہ سے یہ بات

شربتِ وصل ہی بیمارِ محبت کا علاج
دِکھادو چاہنے والوں کو تم انداز محبوبی
اِس اندازِ حیا سے اور چوری کھلگئی آنکی
جو محفل ہی وہ مقتل ہو جو بیدل ہیں وہ بسمل ہوں

چارہ گر کیوں لیئے بالیں یہ دوا بیٹھے ہیں
سما جاؤ نظر میں سبکی دلمیں سب کے گھر کرلو
کہا تھا تمسے کسنے جھیپ کر ترچھی نظر کرلو
جو خنجر ہاتھ میں اپنے کبھی تم بن سنور کرلو

آپ کہتے ہیں بجا حضرتِ ناصح لیکن
ہو مدد تیری جو اے ہمتِ مردانہ عشق
میری خواہش گذر درد ہو دلمیں مرے

کیا کروں کیجیئے جو قابو میں مرے دل نرہے
جس کو مشکل میں سمجھتا ہوں وہ مشکل نرہے
درد کہتا ہی ہیں پہلو میں ہوں دل نرہے

خوشتر۔ شاعرِ شیوا بیان سخنورِ شیریں زبان منشی جگناتھ ولد منشی مُنالال سری باستب کایستھ ساکن لکھنؤ، عہدِ واجد علیشاہ میں سرکار شاہی میں متصدی گری پر فائز تھے۔ اِنکی "رامائن منظوم" و "شری بھاگوت" و "چتر گپت" بہت مشہور ہیں۔ مذہبی مسائل اور حکایات کو بہت خوبی اور فصاحت سے نظم کیا ہے ۱۲۷۹ھ میں اِنکا انتقال ہوا، بخوف طوالت رامائن میں سے چند اقتباس کرکے اُنکے حال کو ختم کیا جاتا ہے۔ خوشتر

راجہ رام چندرجی کا بن باس ہونا

مشعبد ہے عجب یہ پیرِ گردوں
جفا پیشہ، ستمگر، فتنہ خو ہے
اگرچہ پیر ہے، لیکن ہے بے پیر
کسی کا خوش نہیں آتا اِسے عیش
ہر اک کے عشق میں ہے رخنہ انداز
سدا اس سنگدل کا ہے یہ شیوہ
یہ وہ زنبور ہے چرخِ ستم کیش
شہنشاہِ اودھ تھا یعنے اِک روز

کہ ہر دم اِسکی صورت ہو دگرگوں
برائے رنج ہر کس حیلہ جو ہے
ہمیشہ منقلب ہے اسکی تدبیر
برائے جنگ پھرتا ہے لیئے جیش
میان ہر بشر ہے فتنہ پرداز
کہ پتھر مارتا ہے دیکھے میوہ
کہ پہلے نوش دے پیچھے جڑے نیش
سریرِ زرفشاں پر رونق افروز

خورشید - سید خورشید عالم۔ خلف شمس الشعرا مولوی سید مقصود عالم تھانوی - ان کا نشوونما غدر کے عین بعد میں تھا۔ نواب کلب حسین خاں نادر نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے، چند شعر انتخاب ہوکر درج ہوئے۔ اِن کے والد بڑے پایہ کے سخنور تھے انھیں سے انھیں تلمذ تھا ٭

اے اجل یہ قتل پر کس کا اشارا ہو گیا	صف بہ صف جو لشکرِ مژگاں صف آرا ہو گیا
ہاں یہ حرف شوق میں ہو معجزِ شق القمر	نالہ از خود دل کی بیتابی سے پارا ہو گیا
قتل گہ میں یہ شہیدوں کا بہایا ہے لہو	نیچے کا گھاٹ دریا کا کنارا ہو گیا
گھر میں اے خورشید جب شکِ قمر مہماں ہوا	نیر اعظم نصیبوں کا ستارا ہو گیا

خورشید - پنڈت جوالا پرشاد ایم اے وکیل چیف کورٹ لاہور آپ رائے بہادر پنڈت جانکی پرشاد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور میر منشی مرحوم کے صاحبزادے اور قوم کے کشمیری برہمن ہیں، اوائل شباب میں موزونی طبع کے باعث طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ یہ انھیں ایام کا کلام ہے نہ معلوم اب یہ مشغلہ جاری ہے یا بند ہو گیا۔ ۴۰ برس کا سن ہے۔

آزمانا تجھے ہم چاہتے تھے مدت سے	تیغ جلاد دکھا آج تو جوہر اپنا
خون ہی تن میں نہیں جسکا کہ ڈر ہے قاتل	کس لئے چلتا ہے دامن تو بچا کر اپنا
جسکو کہتا ہے تو خورشید قیامت واعظ	دیکھ ہے داغ نہاں اس سے تو بڑھکر اپنا
ایک حسرت ہی گئی ساتھ مرے زیرِ لحد	اور کوئی بھی نہ ساتھی ہوا مر کر اپنا
مانگا بوسہ تو کہا تو بھی ہوا اس قابل	منہ تو جا دیکھ ذرا آئینہ لیکر اپنا
نہ ہوا دستِ قضا سے بھی یہ کشتہ سیماب	ہائے مر کر بھی نہ ٹھیرا دلِ مضطر اپنا
کیوں نہ خورشید فلک پر ہو دماغ آج ترا	باغ ہے، جام ہے، اور پاس ہے دلبر اپنا

خوشتر - منشی عبدالرحمٰن محمد محسن باشندہ منگرول کاٹھیاواڑ۔ رسالہ العصر لکھنؤ سے کلام نقل ہوا

شمع رو جائیں کہاں اٹھکے تری بزم سے ہم	دل کو پروانہ کی مانند جلا بیٹھے ہیں

ہمیں اُن سے غرض ہی اُنکا تم اچھا برا دیکھو	ہمیں کیا کام غیرونکی بھلائی سے برائی سے

دل لیا ہے تم نے جس انداز سے	کوئی لے سکتا بھی ہی اِس ناز سے
ہر روز یہ پرسش ہی کہ تم کیوں ادھر آئے	اُمید پر آتے ہیں جو اُمید بر آئے
جاتے تھے کہیں اور اِدھر بھولکر آئے	کیا دیدہ و دانستہ وہ خود میرے گھر آئے
فرقت کی دعاؤں میں الٰہی اثر آئے	آئے نہ ستمگر تو کچھ اچھی خبر آئے
جاتے تھے میرے کوچہ سے پوچھا تو وہ بولے	ہم تیری بلا سے جدھر آئے اُدھر آئے
بے چین ہو تم اور مجھے رشک ہی اِس کا	اللہ کرے آج عدو کی خبر آئے
رحم آہی گیا دیکھ کے قاتل کو مرا حال	کام اپنے بُرے وقت میں زخم جگر آئے
محشر ہو اجل ہو کہ وہ کافر ہو کوئی ہو	ہم منتظر اُسکے ہیں کہ جو پیشتر آئے

اِک حشر بپا اور ہوا روزِ قیامت	محشر میں بُرے حال سے جب وہ نظر آئے
کیا غیر سے لڑ آئے ہیں کہتے نہیں بنتی	گھبرائے ہوئے وہ ادھر آئے اُدھر آئے
اُس شوخ نے بالوں میں پروئے ہیں جو موتی	خورشید ہمیں ابر میں تارے نظر آئے

وہ نشیلی آنکھ اک عیار ہے	دیکھنے کو مست ہے ہشیار ہے
آرزو بنکر نہ کوئی بھی رہا	آپ کا ہر تیر دِل کے پار ہے
مَیں ہوں عاشق میری بدنامی ہی کیا	اُن کا چرچا بھی سرِ بازار ہے
آپ سے بنتی نظر آتی نہیں	روز جھگڑے روز کی تکرار ہے
کون مرتا ہے کسی کے واسطے	جان کا کھونا بہت دشوار ہے
یہ تری محفل ہے یا ہے میکدہ	جسکو دیکھو مست ہی سرشار ہے
جان سے بڑھکر ہمیں ہو تم عزیز	تُم ملو تو اور کیا درکار ہے
اگلے لوگوں کا چلن کچھ اور تھا	اب زمانے کی نئی رفتار ہے
دِل ستانے کے لیے موجود ہے	جان جانے کے لیے تیار ہے

یہ بھی شامل تھے۔ چنانچہ پچاس روپیہ ماہوار سرکار برطانیہ سے مقرر رہے۔ حضرت داغ کی وفات کے بعد گاہے دکن گاہے دہلی رہے اب تین برس سے رامپور میں مقیم ہیں۔ اگرچہ فطرۃً طبیعت موزوں پائی ہے مگر شعر گوئی کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہے۔ نواب حامد علیخان صاحب والیٔ رامپور انکی بہت قدر و منزلت کرتے ہیں۔ مرزا خورشید عالم کے صرف ایک لڑکی ہے نواسے کو انھوں نے اب متبنٰی کرلیا ہے اور دکن کی پنشن اُسکے نام منتقل کرادی ہے۔ راقمِ تذکرہ سے مخلصانہ تعلقات ہیں بڑے خوش مزاج خوش تقریر ہیں۔ کلام کے لئے بہنگامِ نظرِ ثانی بار بار تقاضا کیا مگر فطری تساہل نے اقرار کی تکمیل کی نوبت نہ آنے دی اشعار ملاحظہ ہوں

گھر سے نکلے ہیں وہ اِس ٹھاٹ سے تنکر باہر	ہاتھ میں تیغ علم میان سے خنجر باہر
غش جو آیا مجھے محفل میں تو ظالم نے کہا	تجکو منظور رہے مرنا تو کہیں مر باہر
جب سے برباد ہوئے کوئی ٹھکانا نہ مِلا	ٹھوکریں کھاتی پڑیں پھرتے ہیں در در باہر
جو میری طرف سے تمہیں بھڑکاتے ہیں دشمن	ایک ایک مرے دل میں ہے ایک ایک نظر میں
ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم جسکو یہاں تک پہنچے	ساری دنیا ہے وہی حشر کے میداں میں نہیں
رازِ سربستہ یہ پیدائشِ عالم سے کُھلا	لُطف ظاہر میں جو ہے وہ کبھی پنہاں میں نہیں
وہ کہتے ہیں ہمارا چاہنے والا بھی ایسا ہو	زمانے سے انوکھا ہو تو دنیا سے نرالا ہو
وہ دل لیکر کسی کا پھیر دیں یہ ہو نہیں سکتا	پرایا مال وہ اپنا سمجھتے ہیں کسیکا ہو
شبِ وصل اُسنے شرما کر یہ شوخی سے کہا آخر	ہمیں چھیڑے تو غارت ہو ہمیں دیکھے تو اندھا ہو
ستم سہنے کا ساری عمر کے یہ پھل مِلا ہمکو	وہ اب سب سے یہ کہتے ہیں جو عاشق ہو تو ایسا ہو
نہ مَیں سچا نہ تم سچے تو آخر کون سچا ہے	خدا کے سامنے یہ پیش ہو جھگڑا تو اچھا ہو
ہُوا حاصل یہ ہمکو دوستوں کی بیوفائی سے	کہ ہم نے عمر بھر کو توبہ کرلی آشنائی سے
مِلے بھی بات بھی کرلی ڈھٹائی سے رُکھائی سے	بنے پھر جان کر انجان میری آشنائی سے
نہ مَیں سچا نہ تم سچے نہ میں جھوٹا نہ تم جھوٹے	چلو قصہ ہوا طے فائدہ کیا اب لڑائی سے

ندا آئی ہمارے جارج پنجم شاہِ انگلستان
ہمایوں فال ہے، نیکو سیر، نیکو طبیعت ہے
رعایا ہند کی تیار ہے اب جاں نثاری پر
دعائے خیر ہے تجھ پر سدا ظل الٰہی ہو

پہنکر آئے اورنگِ شہی پر تاجِ سلطانی
تو اے قیصر جہاں میں منبع بحرِ سخاوت ہے
کہ اس میں اِک زمانے سے وفاداری کی عادت ہے
ہُما بن کر ترے سر پر یہ چترِ تاجِ شاہی ہو

آج دہلی بنی ہو رشکِ چمن
لاڈلی ہو شہانِ ذی حشم کی
آج شہ کی سواری آتی ہے
پیش کرتا ہوں طشت کا غذ
کیوں نہ خورشید بھی ضیا پائے

آج دہلی بنی نئی دلہن
یہ دُلاری ہے جارج پنجم کی
یہ بھی پھولوں نہیں سماتی ہے
ہوں جو منظور یہ مرے گوہر
بزمِ شعر میں نام پا جائے

خورشید

خورشید - صاحب عالم مرزا خورشید عالم گورگانی خلف الرشید مرزا فخرو ولیعہد بہادر شاہ ثانی - ان کا نام تاریخی ہے سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں پیدا ہوئے - غدر کے وقت اِنکی عمر ۱۲ سال کی تھی - جوانی میں نہایت خوبرو زیبا منظر جوان تھے - ورزش جسمانی کا ہمیشہ شوق رہا - فنِ سپہ گری سے خوب واقف ہیں - لکڑی اور بانک دونوں خوب جانتے ہیں - بنوٹ سے بھی کسی قدر واقف ہیں غلیل لاجواب لگاتے ہیں - شعر بھی بہت اچھا کہتے ہیں - زبان ٹکسالی اور اُسی چاردیواری کے اندر کی ہے جس کا نام کبھی قلعہ معلّیٰ تھا - اصلاح دینے کا ملکہ اچھا ہے اور زبان کی صحت کے متعلق آپ کی معلومات وسیع اور قابلِ داد ہیں - نہایت بامذاق ہنس مکھ یار باش شہزادے ہیں - بڑے خوش گلو اور موسیقی کے فن سے ماہر ہیں - تباہی قلعہ کے بعد ۲۵ سال رامپور اور دہلی رہے - نواب یوسف علیخان صاحب نے سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا تھا - جو اب تک ملتا ہے - بلکہ اب نواب صاحب حال نے کچھ اُس پر اضافہ کر دیا ہے سنہ ۱۹۰۹ء میں اپنے علاتی بھائی حضرت داغ دہلوی مرحوم کے پاس حیدرآباد دکن رہے وہاں سے بھی دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ پاتے ہیں سنہ ۱۸۵۸ء کے جشن جوبلی میں جو چند شاہزادوں کی جدید پنشنیں مقرر ہوئی تھیں اُنمیں

چوگئی ہیں اور ٹمپرنس الیوسی ایشن لاہور و کشمیری پنڈت نیشنل ایسوسی ایشن کے سکرٹری ہیں اوائل سے فن شاعری کا شوق ہے اور اٹھارہ اُنیس برس سے طبیعت ادھر مائل ہے عشقیہ غزلیں کہنے سے اجتناب ہی۔ زیادہ تر ٹمپرنس سوسائٹی کے متعلق مضامین پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اور اکثر ٹمپرنس سوسائٹی کے سالانہ جلسوں اور رمنر والوج کے اجلاسوں میں دادسخن دیا کرتے ہیں۔ آپ اپنا دیوان مرتب کر رہے ہیں جسے عنقریب چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ زمانۂ حال کے شعرا میں انکا شمار ہے۔ کلام میں سادگی ہے زبان شستہ ہی اور نفس مضامین اخلاقی ہوتا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

نہ وہ اوصاف ہیں ہم میں نہ وہ اُلفت رہی دل میں
ہماری غفلتوں سے دیکھئے سارا وطن بگڑا

ذرا دیکھو تو بگڑی کسقدر حالت ہماری ہے
روش بگڑی، چلن بگڑا، ہمارا پیرہن بگڑا

اگر دل میں خیالاتِ من و مائی نہ لاؤ تم
تو اس اُجڑے چمن کو آج ہی رونق پہ پاؤ تم

میں کیا منھ سے کہوں میں کون ہوں دنیا میں کیا ہوں میں
بشر کی ہستیِ ناپاک کا اک آئینہ ہوں میں

میری ہستی بنائی خاک کے ذروں نے مل مل کر
اِسی باعث سے تو اک خاک کا پُتلا بنا ہوں میں

خدا کی جب نظر میں کُل بشر دنیا کے یکساں ہیں
تو دل میں کیوں خلش رکھتے ہو پھر ہندو مسلماں ہیں

نہیں بگڑا ہی اب بھی کچھ اگر تھوڑا سنبھل جاؤ
کدورت چھوڑ دو اور جانبِ اصلاح تم آؤ

طبیعت میں مری کچھ اندنوں ایسی صفائی ہے
ضیائے آئینہ منہ دیکھنے کو دل میں آئی ہی

فروغ مادۂ تاباں جذبۂ دل نے مرے لوٹا
یہاں سرخی ہوئی پیدا وہاں زردی سی چھائی ہی

کہاں لکھا ہی مذہب میں کرو تم بیر آپس میں
غضب ہے گر زمانے میں جُدا بھائی سے بھائی ہی

انتخاب از قصیدۂ تہنیتِ تاجپوشی

خیاباں کھل گئے فصل چمن میں اب بہار آئی
شمیم اٹھکھیلیاں کرتی نویدِ جانفزا لائی

یہ دہلی ہی کہ جنت آگئی ہی باغِ دنیا میں
کہ حوریں بھی فلک پر آج ہیں دیکھو تماشائی

یہ ہیں وہ کون جنکے عہد میں یوں ہمنیالی ہی
کہ پیتے شیر اور بکری بھی ہیں اک گھاٹ پر پانی

کہنے تو ہیں کہ دل میں ترے گھر بنائیں گے — پر سوچتے ہیں دل میں کہ کیونکر بنائیں گے

ہیں وہ محروم قسمت ہوں نہ جانا آجتک میں نے — اُمیدِ وصل کیا ہے حسرتِ دیدار کیسی ہے

مہروش تجھ سے خجل شب کو قمر ہو کے رہے — رُخ سے سر کے جو ڈوپٹہ تو سحر ہو کے رہے

جس کو دیکھا نگہ ناز سے مارا اُسکو — دیکھ لینا تری آنکھوں کو نظر ہو کے رہے

میں تو ترے سبب ہوں مصیبت میں مبتلا — تو میرے ساتھ اے شبِ ہجراں بلا میں ہے

قسمت کا اپنی پیچ کھلا ہے نہ کھل سکے — وہ اور ہے جو آپ کی زلف دوتا میں ہے

خورشید ایسی چوٹ لگی ہے کہ کیا کہوں — ہر وقت اک کھٹک سی دل مبتلا میں ہے

دیکھئے غم میں ترے جان رہے یا نہ رہے — ہے کوئی دن کی یہ مہمان رہے یا نہ رہے

تو سلامت رہے آباد رہے تجھ سے دُنیا — ہمسے ناشاد مری جان رہے یا نہ رہے

فائدہ حجتِ ناحق سے بس اتنا کہدو — تم کہیں رات کو مہمان رہے یا نہ رہے

یار ہے، شیشہ و ساغر ہے، کروں کیوں نا خیر — پھر خدا جانے یہ سامان رہے یا نہ رہے

سانس کے ساتھ نکلتے ہیں شرارے مُنہ سے — سوزشِ دل نے کلیجے کو جلا رکھا ہے

دلربا گھات میں پھرتے ہیں کوئی چھین نہ لے — دل کو اب تک تو مری جان بچا رکھا ہے

آفتِ جان تو حسینوں کی ادا ہوتی ہے — ورنہ دیکھو تو ترے حُسن میں کیا رکھا ہے

خورشید

خورشید۔ منشی شیخ محمد سعید خورشید۔ موضع شفیع ضلع منٹگمری پنجاب میں مقیم اور حضرت جلال لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شعرگوئی کا خاصہ مادہ ہے۔ یہ اِنکا کلام ہے ؎

ٹھوکریں کھاؤ سرِ طور تمہیں اے موسیٰ — جلوہ گر دل ہی میں ہمنے رُخ جاناں دیکھا

اِسکو جلنا تھا تو شمع سرِ محفل ہوتا — رونقِ بزمِ بتاں کاش میرا دل ہوتا

کسی کے قتل کو اُس کی بلا نکلتی ہے — کہ جسکے کوچے سے بسمل قضا نکلتی ہے

خورشید

خورشید۔ پنڈت بلدیو کشن صاحب متکوا المتخلص بہ خورشید۔ آپکے والد بزرگوار ریاستِ جموں وکشمیر میں بعہدہ سپرنٹنڈنٹی پولیس ممتاز تھے۔ آپ خود لاہور میں انسپکٹر تحصیل

بدظن ہی رازداں سے نگہباں سے مشتبہ
ای بختِ خفتہ ایسی بھی غفلت کی نیند کیا
کیا پوچھتے ہو دل پہ جو گذری فراق میں
ہی شرم تیرے ہاتھ مدد وائے گدازِ عشق
تا مشتِ استخواں کو نہ میرے ملے جگہ
قبضہ بتوں کا گھر میں خدا کے بھی ہو گیا
خورشید شاعری میں فصاحت کا ہے مزہ
جور و بیداد کو دیکھوں کہ میں اسکو دیکھوں
کششِ دل ہو مددگار تو کیا عیسیٰ کا گھر
میں تو دیکھوں نہ کبھی بھول کے اسکو خورشید
تم تو تم ناز عدو کے بھی اُٹھائے ہوگئے
تصور میں ہمارے کاش یہ تاثیر ہو جاتی
نہ اُٹھنا حشر کے دن بھی مرا سر اس ندامت سے
شرر افشاں جو مجنوں آہ تیرے دل سے نکلیگی
ذرا مجھپر ترحم سخت جانی آج برسوں میں
آنکھیں وہ فتنہ گر میری آنکھوں میں ڈالکے
حسن اور عشق کے جھگڑوں میں مزا جب آئے
اہلِ ایماں کا خدائی میں ٹھکانا نہ رہا
سوزشِ دل کے ہوئے اور یہ درماں اُلٹے
جو شفا ہو تو شفا غمزدوں کا دیدۂ دل پیچھے
ہیں کچھ بازیٔ طفلاں لگانا دل کہیں خورشید

آفت میں جان اپنے دلِ بدگماں کی ہے
آخر کچھ انتہا بھی تو خوابِ گراں کی ہے
تم سن بھی لو یہ تاب ہمیں کب بیاں کی ہے
کچھ جسم میں نمود ابھی استخواں کی ہے
حجت ہی اُن کو یہ کہ زمیں آسماں کی ہے
بندی نماز کی ہے منادی اذاں کی ہے
سچ پوچھئے تو شعر میں لذت زباں کی ہے
وہ کسی وقت مرے حال سے غافل نہ رہے
تو تو جنت میں بھی ای حور شمائل نہ رہے
کیا کروں جب کہ مرے کہنے میں مرا دل نہ رہے
ایک دن یہ بھی محبت میں ہوا رکھا ہے
کہ قید آہوں میں آکر یار کی تصویر ہو جاتی
مرے خوں سے جو آلودہ تری شمشیر ہو جاتی
بجھاتی آگ لیلیٰ پردۂ محمل سے نکلیگی
گلے ملنے کی حسرت خنجرِ قاتل سے نکلیگی
سینے سے لے گیا ہی ابھی دل نکال کے
حیلہ گر تم سا ہوا اور آئے طبیعت میری
دعویٰ کرتا ہے وہ کافر کہ ہے جنت میری
لب پہ آ آ کے پھرے نالہ سوزاں اُلٹے
ذرا ہاتھوں سے اپنے انتقام لینا تم جگر پہلے
وہ کھیلے کھیل اُلفت کا جو کھیلے جان پر پہلے

دیکھیے ہجر کی شب میں ہو سحر تک کیا حال
غش پہ غش مجکو ابھی سے سرِ شام آتے ہیں

ایک پر ایک گرا پڑتا ہے مشتاقِ جمال
شور برپا ہے کہ وہ لبِ بام آتے ہیں

کچھ عجب لطف اُٹھاتی ہی طبیعت خورشید
جب کبھی سُننے میں اشعارِ نظام آتے ہیں

دونوں ہیں دردِ عشق کے بیمار کیا کروں
دل کی دوا کروں کہ میں اپنی دوا کروں

جی چاہتا ہے عشقِ گزشتہ کا ماجرا
بیٹھا کوئی سُنا کرے اور میں کہا کروں

کہتے ہیں لوگ مر کے یہ چھوٹے گا رنج سے
مجھکو یہی ہے غم کہ غمِ جاوداں نہیں

ہالی ہو تری تیغ کا اور اپنا گلا ہو
چھوٹنے کا نہیں ہاتھ سے گر آبِ بقا ہو

ہنگامۂ محشر تری چالوں سے بپا ہو
ٹھکرا کے کہے تو میرے مرنے سے کھڑا ہو

مرنے کے بعد تم ہی تو آؤ گے قبر پر
تم ہی تو فاتحہ بھی پڑھو گے اُٹھا کے ہاتھ

لگیگی ایک گھر کی آگ سو گھر اسلیئے چپ ہوں
چھلکیگا اک جہاں دل سے جو آہِ آتشیں نکلی

کروں اصرار کیونکر وصل کے وعدہ پہ ڈرتا ہوں
ہو گی عمر بھر پھر ہاں اگر منہ سے نہیں نکلی

شبِ وعدہ اُمید و یاس کے جھگڑے رہے کیا کیا
کبھی ٹھہرا دلِ مضطر کبھی جانِ حزیں نکلی

یا تو ہمارے دل کو الٰہی قرار دے
ورنہ تو اُن بتوں پہ ہمیں اختیار دے

جدھر اُس کی کافر نظر ہو گئی
خدا کی خدائی اُدھر ہو گئی

وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہیں
جدھر ہو گئی بس اُدھر ہو گئی

جگر ہو کہ دل ہو وہ تیغِ نظر
جہاں پڑ گئی کارگر ہو گئی

جوابِ دادخواہاں داورِ محشر کو کیا دو گے
بتو اِک روز تم کو بھی خدا کو مُنہ دکھانا ہے

جسقدر تم کو تغافل ہو محبت ہو ہمیں
بیوفائی میں تمھاری یہ کمال اچھا ہے

قوت نہ آہ کی ہے نہ طاقت فغاں کی ہے
حالت بہت خراب دلِ ناتواں کی ہے

قاصد سے اب پیامِ زبانی پہ ہے یہ رشک
کیوں اس زباں پہ بات بھی اُنکی زبان کی ہے

آنکھوں کو لطف دید کا کانوں کو بات کا
قسمت جو دیکھیے تو ترے پاسباں کی ہے

کانوں ہیں بیوفا نہ پہن یاسمن کے پھول
ہیں آج تیرے کشتۂ رنج و محن کے پھول

شیریں نے ایک دن نہ بنایا گلے کا ہار
تیشہ سے روز جھڑتے رہے کوہکن کے پھول

یارب دلوں کی خیر وہ کہتا ہے دلفریب
دیکھیں تو کوئی دیکھے ہمیں اور نہ آئے دِل

خورشید کس غضب کی کہانی کہی کہ آج
اپنی طرح ہمیں بھی کیا مبتلائے دِل

پابوس ہوگئے ہیں قبولِ دعا سے ہم
ملتا تو مانگتے نہ تمہیں کو خدا سے ہم

کہتے ہیں اسکو شوق کہ نکلا جدھر سے تو
آنکھیں ملا کیئے ترے ہر نقش پا سے ہم

ہاں سچ تو ہے جو تم سے ستمگر کو دیدہا
ایسے ہی دق ہوئے تھے دِل مبتلا سے ہم

کام آئیگی مصیبت ہجراں میں ایکدن
پیدا کرینگے رسم محبت قضا سے ہم

قامت میں قیامت کے برابر تو نہیں تم
فتنہ ہو مگر فتنۂ محشر تو نہیں تم

پھرتے ہو خفا مجھسے پھر الٹی ہی شکایت
پھر جاؤ تو کچھ میرا مقدر تو نہیں تم

کہنے کو کہدیں یونتو ابھی دل کا راز ہم
دیکھیں بھی دردِ دل کا کوئی چارہ ساز ہم

سجدہ خدا کو کرتے ہیں دل میں بتوں کی یاد
نادِم ہیں خود کہ پڑھتے ہیں کیسی نماز ہم

جب ظلم کریں آپ تو کیونکر نہ کہیں ہم
کیا خوب ستمگر کو ستمگر نہ کہیں ہم

تم کو تو نہ توفیق ہوئی پرسش غم کی
پھر آپ بھی حالِ دلِ مضطر نہ کہیں ہم

آتے ہی ترے بزم میں اک پڑ گئی ہلچل
اسپر بھی تجھے فتنہ محشر نہ کہیں ہم

شوخی ہی طبیعت میں فصاحت ہے زبان میں
خورشید کو کس طرح سخنور نہ کہیں ہم

آبلے پاؤں کے برسوں سے لیئے پھرتے ہیں ہم
اپنے قسمت کے تو کانٹے بھی بیاباں میں نہیں

دستِ وحشت کو مرے اب تو ملے گی فرصت
ایجنوں اب تو کوئی تار گریباں میں نہیں

گھر آیا ہے ابر باراں میکدہ پر جوشِ رحمت ہے
رہیگی حرمتِ توبہ کہاں تک بادہ خوار ہیں

کہیں کس منہ سے ہجر یار میں مونس نہیں کوئی
ابھی اک بیکسی باقی ہے اپنے غمگساروں میں

عیش کے یار تو اغیار بھی بن جاتے ہیں
دوست وہ ہیں جو بُرے وقت میں کام آتے ہیں

مجھے مرنے پہ کیا کیا رشک ہو اُس مرنے والے کے
یہ تم بیٹھے ہو ایسا سوگ لیکر جانِ من کسکا

عقیدہ کھل گیا اُس کا پڑی کافر نظر جس پر
ڈھکا رکھتی ہے پردہ اُسکی چشمِ سحر فن کسکا

زبانِ شکر رعبِ حسن سے واں بند ہوتی ہے
کھلے شکووں پہ اُسکے روبرو جا کر دہن کسکا

خوشی میں جسکا گذرے وقت غم سے کیا غرض اسکو
وہ محوِ عیش و عشرت ہیں سنیں رنج و محن کسکا

پڑے ذرا تو کلیجے کی آگ پر پانی
جگر کے داغ پہ پھوٹے جو آبلہ دل کا

دل تڑپتا ہے مرے لیلیکے اِس نخچیر کا
او قدر انداز کیا کہنا ہے تیرے تیر کا

درازی میں کوئی اُسکے برابر ہو نہیں سکتا
شبِ غم کے مقابل روزِ محشر ہو نہیں سکتا

پابندِ حیا رہنا یا ترکِ حیا کرنا
اوّل شبِ وصلت ہے آخر تمہیں کیا کرنا

طبیعت اِس قدر بگڑی کہ اندازِ سخن بگڑا
کوئی مضموں جو تیرے وصل کا اے جانِ من بگڑا

یہ قد بوٹا سا، لب گلبرگِ تر، عارض گلِ رنگیں
چمن کا رنگ تیرے سامنے رشکِ چمن بگڑا

کس جا نہ جلوہ گر تری وحدت کا نور تھا
جلوہ ترا تھا عام نظر کا قصور تھا

کیا اُسکو ہو خبر کسی خاطر شکستہ کی
وہ مستِ ناز اپنی جوانی میں چور تھا

واہ کس شوق سے تھم تھم کے چھری پھیری ہے
میری گردن پہ ہوئے آپکے احسان بہت

شرارت چشم پر صدقے، فدا شوخی ہے چتون پر
اَدائے دلفریبی آپ غش ہو اُن کے جوبن پر

خوشی وہ غیر کی کرتے ہیں میرے رنج دینے کو
مرے صدقے ہیں گویا یہ کرم ہوتے ہیں دشمن پر

غنیمت ہے ہُوا مر کر تو لطفِ زندگی حاصل
وہ ظالم فاتحہ پڑھنے کو آیا میرے مدفن پر

نکالا قتل کا میرے نیا انداز قاتل نے
رکھی ایک تیغ پر گردن، رکھی اک تیغ گردن پر

مجروح دل پہلو میں ہے زخمی جگر سینہ میں ہے
یہ بھی کوئی دستور ہے گھائل رہی گھائل کے پاس

خورشید راہِ عشق میں اس گرم رفتاری کیساتھ
کیوں سرد ہو جاتے ہو تم آتے ہو جب منزل کے پاس

جوشِ وحشت میں بہم ربط ہوا ہے ایسا
ہاتھ ہوتا نہیں دم بھر کو گریبان سے الگ

یہ مری خاک ہے ظالم تو جھٹکتا کیوں ہے؟
اب نہ ہوگی یہ ترے گوشۂ داماں سے الگ

مہذب متین اور منکسر المزاج شخص ہیں فکر سخن سے کسی وقت خالی نہیں رہتے۔ دیوان اگرچہ چھپا نہیں مگر مرتب موجود ہے ۔

شایانِ حمدِ حق جو نہ مضموں رقم ہوا — اِس جرم میں قلم کا سدا سر قلم ہوا
چھوٹا یہ رنج و غم سے انہیں یہ الم ہوا — میں خوش ہوا انہیں مرے مرنے کا غم ہوا
طاعت نہ کام آئی نہ بندوں کی بندگی — آخر شریکِ حال اُسی کا کرم ہوا
دونوں گھروں میں ایک تجلی کا ہے ظہور — جلوہ وہی ہے دیر ہوا یا حرم ہوا
کس باوفا کو یاد کیا گالیوں سے آج — کس کے کھلے نصیب یہ کس پر کرم ہوا
کچھ فخر جام جم کو نہیں انکے دور میں — جو جام انکے منہ سے لگا جام جم ہوا
مجھکو تو دوستوں سے بھی ملنے کا رشک تھا — دشمن سے تم ملے یہ ستم پر ستم ہوا

خوں ہونے کے لیے خاک میں ملنے کے لیے — روز اس دل میں نئے ہوتے ہیں ارمان پیدا
کرتے ہو ستم مہر و محبت کے عوض میں — یہ جرم تو تعزیر کے قابل نہیں ہوتا
کہہ دیا شوق میں پہلے تو یہ رونا اب ہے — ہائے قاصد کی زباں اور فسانہ دل کا
رفتہ رفتہ ترے بیمار نے صحت پائی — ضعف سے درد گھٹا قوت سے آزار گھٹا
لیکے کب نکلے ہیں ہم گوہرِ مضموں خورشید — آہ جس وقت میں نرخِ دُرِ شہوار گھٹا

صحرا چمن کیا مرے پائے فگار نے — گلگوں ہر ایک خار بیاباں کا ہو چکا
اک ناتواں کا خوں اور اتنے سنان و تیر — دل سے مقابلہ صفِ مژگاں کا ہو چکا
دل میں، جگر میں، سینہ میں، پہلو میں، جا بجا — قبضہ کہاں کہاں ترے پیکاں کا ہو چکا
اُس بت نے ایک کو نہ رکھا اپنے دین پر — مذہب خراب گبر و مسلماں کا ہو چکا
تھاموں دل و جگر کو میں کیا ایک ہاتھ سے — اک ہاتھ مدتوں سے گریباں کا ہو چکا
ہوگا خرام ناز سے کیا اہلِ حشر پر — محشر تو ایک جنبشِ داماں کا ہو چکا

میسر تک نہیں خارِ وطن بارِ وطن کیسا — پڑا ہے دشتِ غربت میں یہ لاشہ بے کفن کسکا

ہُوا برباد تیری راہ میں مشتِ غبار اپنا
چمن میں آنکھ کھولی تھی کہ صیاد آگیا سر پر
رقیب روسیہ پر بھی کبھی تیغ آزمائی ہو
کریں پھر محفلِ کثرت میں کیوں ہنگامہ آرائی
ہُوا خورشید عاشق اُن پہ جو اچھا سمجھا ہی

جھٹکنا پر نچھوڑا تو نے ظالم اپنے دامن کو
رہی حسرت یہ بلبل کو نہ دیکھا میں نے گلشن کو
ہمارا کیا ہے ہم تو لو جھکا دیتے ہیں گردن کو
ملے گر مجلسِ وحدت میں جا شیخ و برہمن کو
سمجھنا دوست کو دشمن سمجھنا دوست دشمن کو

خورشید

خورشید - مہر سپہر فصاحت و سخندانی نیر اوجِ بلاغت و زباندانی قاضی غیاث الدین احمد صاحب خورشید ابن قاضی حسام الدین احمد مرحوم بزرگوں کا وطن شاہجہاں آباد دہلی ہے مگر اب عرصہ سے قصبہ سکندر آباد ضلع بلند شہر میں سکونت ہی وہاں کا عہدۂ قضا روز آبادی سے انکے خاندان میں چلا آتا ہی - جناب خورشید بہ سلسلۂ ملازمت چند سال ریاستِ گوالیار میں رہے اب عرصہ سے خانہ نشین ہیں دہلی مقام پیدایش ہی اور وہیں انہوں نے اپنی ننہال خاندانِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی میں تعلیم و تربیت پائی مولنا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے برادر زادہ مولانا محمد حسن تائب مرحوم تلمیذ فخر الشعرا میر نظام الدین ممنون سے فن شعر کی تحصیل کی اور مولنا مرحوم نے نہایت دلسوزی اور محنت سے رموز سخنوری و نکات شاعری کو ان کے دلنشین کیا - سن شریف اب ۱۹۱۴ء میں ۵۸ برس کا ہی صاحب دیوان ریختہ ہیں - اکثر غزلیں حضرت داغ دہلوی اور دیگر مشاہیر زمانہ حال کی زمینوں میں کہی ہیں اور حق یہ ہی کہ اپنی خداداد ذہانت اور مشاقی فن کا سکہ بٹھا دیا ہے - راقمِ تذکرہ کے ملاقاتی ہیں - دہلی میں دو مرتبہ خاص مجھ سے ملاقات کے لیئے تشریف لائے کلام بھی منتخب کر کے بھیجا قاضی نجم الدین برق شاگرد رشید حضرت مومن انکے حقیقی چچا تھے - سخن طرازی میں اعلیٰ درجے کی قابلیت حاصل ہی پڑھتے بھی اچھا ہیں ترکیب بیان نہایت دلچسپ ہی اور متانت سے خالی نہیں انکے کلام میں اکثر اشعار ناخن بدل پائے جاتے ہیں - بلاغت اور فصاحت دونوں اپنے اپنے محل پر انکے کلام میں اپنا اپنا جلوہ دکھاتی ہیں - مضمون آفرینی کا بھی خاصہ ملکہ ہی - بڑے

رُخ کے بوسے جو لیتی ہے کاکُل	ہم یہاں پیچ و تاب کھاتے ہیں

خورشید

خورشید منشی خوش وقت علی خان خلف منشی داؤد خان تھانہ دار اکبر آباد کے رہنے والے اور میرزا فتح الدولہ برق کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ نواب کلب حسین خان نادر کے دوستوں میں تھے، نہایت خوش فکر اور طباع سخن سنج تھے، آٹھ نو شعر سے زیادہ کی غزل نہیں کہتے تھے مگر غزل مرصع ہوتی تھی اور اہل مشاعرہ پھڑک جاتے تھے۔ منیر شکوہ آبادی کے ہمعصر اور نواب فرخ آباد کے ہاں ۱۸۴۲ء میں ملازم تھے۔ طاہر اکبر آبادی نے اپنے بچپن میں انھیں دیکھا تھا۔

بولے دہانِ تنگ سے تم جی پھڑک گیا	یہ کس طرف گلاب کا غنچہ چٹک گیا
ایذا اُٹھا چکا ہوں محبت کے درد کی	کھینچی کسی نے آہ میرا دل دھڑک گیا
گردن میں ہے کمندِ محبت پڑی ہوئی	جتنے کھنچے حضور میں آگے سرک گیا
خورشید مرحبا یہ محبت کا جوش ہے	آئی بہار ہاتھ میں ساغر چھلک گیا
جدائی کے صدموں کو ٹالے ہوئے ہیں	چلے جاؤ ہم دل سنبھالے ہوئے ہیں
عجب مست اللہ والے ہوئے ہیں	چُنے موتیوں کے نوالے ہوئے ہیں
لحد میں کس بل نکل جائیں گے	مرینگے تو سانچے میں ڈھل جائینگے
جبتک ہی روح جسم میں چلتے ہیں ہاتھ پاؤں	دولھا کے دم کے ساتھ یہ ساری برات ہے
پیری میں ولولے وہ کہاں ہیں شباب کے	اِک دُھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

خورشید

خورشید - میرزا عباس عرف میرزا خورشید، مدرس فارسی مدرسۂ کراچی۔ چندے حیدر آباد سندھ میں بھی ملازمت کی تھی ۱۸۷۶ء میں زندہ تھے۔ شعر اچھا کہتے تھے اور ترکیبیں بھی صاف سُتھری برتتے تھے۔ طبیعت کا میلان زیادہ تر مضمون کی طرف ہی۔ یہ انکا کلام ہے۔

جگہ دی جب سے دل میں ہمنے عشقِ شوخِ پُرفن کو	بنایا دوست کو دشمن بنایا دوست دشمن کو
مجھے زنجیر پا کیوں مانعِ صحرا نوردی ہو	گلا دیتی ہے میری گرمئ رفتار آہن کو
فلک کی فتنہ پردازی سے شاید جابری ہووے	اگر تحت الثریٰ بالا مکان ملجاوے مسکن کو

ہیں بخیطا گناہ کیے گو کہ سارے کریم　　رحمت کو بھولتے تو ہمارا قصور تھا

زاہد سے کہتا ہو وہ بت سامنے آ کر　　اب دیکھ لو گر شانِ خدا کو نہیں دیکھا

تنکا تنکا جمع کیوں کرتے بناتے کس لیے　　ہم نہ سمجھے تھے کہ برباد آشیاں ہو جائیگا

مرمٹوں کی تربتیں کردو برابر شوق سے　　یہ بھی اپنی بے نشانی کا نشاں ہو جائیگا

مانا نظر پڑی تھی دل آیا پھر اسپہ کیوں　　آنکھوں کی کیا خطا سب اِسی کا قصور تھا

عشقِ جاناں ہیں ہوئی باعثِ رونق ہر شئے　　درد بھی دِل میں رہا زینتِ پہلو ہوکر

ستم کیے تو کیے اب تو صاف ہو مجھسے　　جو کچھ ہوا وہ ہوا یہ کہو خفا تو نہیں

طلب یہ بوسہ کی کیوں اسقدر بگڑتے ہو　　زبان ہی سے کہا تھا چلو لیا تو نہیں

حفظِ جان ہجر میں اشفاق بہت ہو ای دوست　　کسکو کہدے کسے دیدوں میں امانت تیری

یہ منہ کو پھیر کے کیسے اشارے ہیں دمِ ذبح　　حلال کرتا ہے ظالم کسے دکھا کے مجھے

عاشق ہی کا یہ دل ہے کہ سا کتے ہیں بیمحابان [?]　　پتھر بھی جو ٹوٹیں گے تو فریاد کریں گے

بتوں کے قبضۂ قدرت کو کوئی کیا جانے　　یہی ہیں وہ کہ جو برسوں خدا کے گھر میں رہے

ہم ایسے زار بھی کہیں دیکھے ہیں ای حباب　　تن کے عوض ہوا ہی ہوا پیرہن میں ہے

دل سے اُٹھے نہ دھواں عشق میں جلتا ہی رہے　　یوں تو اک شمع بھی ہے بزم میں جلنے کے لیے

دم ہے تیرا جہاں میں شبِ فرقت باقی　　نہ رہیگی کوئی دُنیا کی مصیبت باقی

ہر آن بانیٔ ستم و جور ہو گئے　　تم تو جوان ہوتے ہی کچھ اور ہو گئے

خورشید

خورشید۔ حاجی میرزا خورشید احمد خاں خورشید۔ خلف شاہ انوار الحق ساکن گوپامئو نواب عظیم جاہ۔ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ شاہزادہ ارکاٹ کے داماد ہیں اور مدراس میں رہایش ہے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔

خالی ہی ہاتھ جائیں گے آئے تھے جیسے ہم　　لایا نہ ہو جو کچھ بھی تو پھر لیکے جائے کیا؟

اب وہ تیرِ مژہ چلاتے ہیں　　دل کو تودہ مرے بناتے ہیں

اور خراسان۔ فرغانہ۔ سمرقند۔ فارس۔ بخارا۔ بلخ۔ ممالک دور دراز میں مدّت سفر کیا اور ہر صاحبِ کمال سے فیض حاصل کیا فنِ شعر میں پہلے شاہ رؤف احمد صاحب رافت اپنے پیر سے اور آخر میں مومن خان اور نواب اسد اللہ خان سے مستفید ہوئے دہلی میں ولادت ہوئی تھی۔ فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر خوب کہتے تھے۔ یہ آپکے کلام کا انتخاب ہے ؎

کہاں پہلو میں دل خورشید جسکو ہم تسلّی دیں	جو کچھ تھا آنسوؤں کے ساتھ خوں ہوکر نکل آیا
جاتا نہیں آنکھوں سے تصور کبھی خورشید	موجود ہے ہر وقت وہ گویا میرے آگے
نویدِ وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے خورشید	کسی طرح کوئی تسکین اضطراب تو دے
بتوں کے عشق سے باز آتے ہی نہیں خورشید	رلاتا ہے تمکو محبت میں کیا مزہ کھتے

خورشید

خورشید۔ سیّد محمد مصطفیٰ خورشید عرف مولوی للّن نبیرۂ مولٰنا سید دلدار علی صاحب مجتہد العصر اوائل عمر سے شعر گوئی کا شوق رہا عربی فارسی اور فنونِ شاعری مثل عروض وقافیہ سے اچھی طرح واقف ماہر تھے فن سخن میں پہلے اپنے ماموں سید محمد جعفر اُمید اور پھر آغا حجو لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے علاوہ غزل کے مرثیہ و نوحہ وسلام بھی کہتے تھے۔ اکثر ایام محرم میں مثل اور مرثیہ خوانوں کے یہ بھی باہر جایا کرتے تھے دو مرتبہ کربلائے معلّی کی زیارت بھی کی۔ نواب مہدی علی خان ماہر داماد نواب تاج محل صاحبہ کی لڑکی ان سے منسوب تھیں۔ انکے خاندان میں اکثر بزرگ صاحب علم وفضل گذرے ہیں۔ کئی سال تک ایک ماہوار رسالۂ شعر وسخن "انتخاب" نامی اپنے اہتمام سے نکالتے رہے ۵۴ برس کی عمر میں ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔ ایک دیوان اُردو ایک رسالہ موسوم بہ "افادات" اِن سے یادگار ہے۔ "افادات" میں اپنا حال اور عروض و قافیہ اور اپنے متروکات وغیرہ تحریر کیے ہیں۔ یہ مختصر رسالہ نہایت قابلیت سے لکھا ہے شاعری اور عروض میں مشاق شاعر تھے اور مذاقِ سخن بھی اچھا تھا اکثر اربابِ فن اِنکے شاگرد ہیں۔ اِنکے کلام کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے ؎

موسیٰ کی طرح طالب دیدار کون ہو	اِس دل میں کیا نہیں جو سر کوہِ طور تھا

پرنیاں شہ کو مبارک ہو گدا کو کمل
میں تو دیتا ہوں وہ عاتم مجھے دشنام ہی دو
اقبالِ خدا داد کی ہے اور ہی صورت
کھلتی ہی نہیں دل کی کلی باغ جہاں میں
آج مختار ہیں جو ظلم وہ چاہیں کریں
یدِ بیضا کو ہتیلی کا پھپولا سمجھیں

جامۂ بخشلہ ہے جنوں نے مجھے عریانی کا
کچھ تو ملجائے صلہ مجکو ثنا خوانی کا
آئینہ بنانے سے سکندر نہیں ہوتا
مٹھی میں جو غنچہ کی طرح زر نہیں ہوتا
حشر کو ہوگا مرے ہاتھ میں دامن انکا
دیکھیں جو حضرتِ موسیٰ رخِ روشن انکا

خوابِ راحت ہی کہاں نادان وہ رخ میں
گردشِ ایام سے پھرتا نہیں اپنا نصیب
کون سا فسوں نہیں تیری نگاہِ ناز میں
بھی کسے جوشِ جوانی میں خبر انجام کی
نہیں جاتی اصالت آدمی کی صحبتِ بد سے
عشق لکڑی کو بھی ہے بے سر و ساماں کرتا
نہ ذبح کر مجھے ظالم کہ صید لاغر ہوں
دہانِ زخم سے چوسا زبانِ خنجر کو
غبار ہو کے پڑے دیدۂ رقیب میں ہم
اربابِ صفا زنگ کدورت سے بری ہیں

گردشِ ایام ہے اسے دل یہ گہوارہ نہیں
اخترِ قسمت مرا ثابت ہے سیارہ نہیں
کان ہے جادو کی چشم شعبدہ پرداز میں
عشق بازی کھیل اک سمجھے تھے ہم آغاز میں
ہو آہن رہے جو پاس آہن کے طلا برسوں
بیدِ مجنوں میں گل و برگ و ثمر کچھ بھی نہیں
عبث لہو میں نہ بھر ہاتھ منتِ پر کے لیئے
مزے وصال کے کیا کیا نہ ہمنے مر کے لیئے
لیئے عدو سے جو بدلے تو ہمنے مر کے لیئے
خورشید کے چشمے میں تو کائی نہیں ہوتی

ملکِ عدم کو اب کوئی پیاسا نجائیگا
پھٹ جائیگا شکم غمِ دنیا بہت نہ کھا
پھولو نہ بلبلو چمن ہے ثبات پر

قاتل نے آبِ تیغ کی رکھی سبیل ہے
اے بوالہوس غذا یہ نہایت ثقیل ہے
غنچوں کی جو چٹک ہے وہ کوسِ رحیل ہے

خورشید ‎

خورشید۔ خورشید احمد خورشید از اولاد حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی اوائل میں شاہ رؤف احمد سے بیعت کی بعد میں شاہ سعد اللہ حید رآبادی سے فیض یاب ہوئے اطراف ہندوستان

یارب جُدا نہ ہوئے کسی سے کسی کا دوست	کرتا دُعا ہوں ساری خدائی کیواسطے

خورشید

خورشید - میر سید علی مرحوم خلفِ سید مظفر علی قوم سید مذہب شیعہ - آپ قصبہ چلکانہ ضلع سہارنپور کے باشندے اور اچھے خاصے تعلیم یافتہ، خوش باش، خوش گذران زمیندار تھے، مزاج میں تہذیب، متانت اور تواضع کا سلیقہ قابلِ تعریف تھا - باہر کے باکمال جو سہارنپور آتے اِنکی کششِ اخلاق سے اکثر انکے مہمان ہوتے تھے - فنِ سخن میں خورشید اور فنا، دو تخلص کرتے تھے، مذاقِ سخن کی تحریک سے خود بھی دہلی اور لکھنؤ گئے اور وہاں کافی عرصہ تک باکمالوں کی صحبت سے فیضیاب ہوئے - آخر عمر میں زیادہ تر نعت کہنے کا شغل رہتا تھا - دیوان غزلیات سُنا ہے کہ مُرتب تھا مگر اولاد کی غفلت سے اُسکی اشاعت کی نوبت نہ آئی کربلا و نجف کی زیارت سے بھی بہرہ اندوز ہوئے تھے آخر ۸۰ برس کی عمر پاکر اپنے وطن ہی میں ۱۸۸۸ء میں وفات پائی - دونوں طرح کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو -

گلچیں نے کوئی تازہ جفا کی چمن میں کیا	جھونکے اُداس آج جو بادِ صبا کے ہیں
مارا ہے گر، جلا بھی تو اُے غیرت مسیح	ہم کب سے منتظر تیری قُم کی صدا کے ہیں
برق کو غیرت یہ دلواتی رہی	ابر کو ہر لحظہ شرماتی رہی
مثلِ دریا جوش میں آتی رہی	چشم تر یہ اشک برساتی رہی
	آبرو برسات کی جاتی رہی
دل سے دنیا کی ہوس جاتی رہی	گو وہ باغِ سبز دکھلاتی رہی
عقلِ دور اندیش سمجھاتی رہی	حُر کو فوجِ شام بہکاتی رہی
	حبِ حیدر راہ بتلاتی رہی

خورشید

خورشید - پنڈت سورج پرشاد خورشید وکیل فرخ آباد خلف پنڈت آسارام - اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے دیوان مطبوعہ نظر سے گذرا اُس کا انتخاب درج ذیل ہے کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے ۱۲۹۵ھ تک حیات تھے ؎

زمیں پر وہ تڑپ کر اس ادا سے جان دیتا ہی محبت ہے ترے تیر نظر سے	قضا بھی لوٹ جاتی ہی تمہارے رقص بسمل پر نکالوں کس طرح اسکو جگر سے

خورشید

خورشید - سید محمد خورشید علی بلگرامی ۱۹ شعبان ۱۱۵۹ ہجری میں بمقام بلگرام پیدا ہوئے ذوق علم جبلی تھا - سید محمد خلف علامہ عبد الجلیل بلگرامی کی خدمت میں تحصیل علم کیا آخر شعر کا شوق دامن گیر ہوا فارسی کہنے لگے پہلے شیخ صانع بلگرامی بعدہ شیخ محمد صدیق سخنور سے اصلاح لی اُسکے بعد حضرت آزاد بلگرامی کو بذریعہ خط وکتابت حیدر آباد دکن اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجا - اُس وقت تک فصاحت تخلص کرتے تھے حضرت آزاد نے خورشید تخلص بدل دیا اُس کے بعد شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ سے فیض پایا -

آغاز شباب میں بمقام کوڑا جہان آباد سرکار شاہ عالم بادشاہ میں سرفراز اور الف خان رسالہ دار کے ہمراہ ہوئے - ملازمت ترک کر کے پھر نواب سید نور الحسن خان بلگرامی کے پاس چلے آئے انکے قرابت قریبہ میں تھے وہ ضلع شاہ آباد میں صاحبان انگریزی کی طرف سے متعہد تھے خان صاحب نے اپنا کاروبار انکے سپرد کیا - آخر سرکار انگلشیہ میں بلیا کی تحصیل انکے سپرد ہوئی تھی کہ مرض لقوہ میں مبتلا ہوئے اور ۱۲ صفر سنہ ۱۲۰۱ ہجری کو انتقال کیا - طرز زمانہ کے موافق کبھی کبھی اُردو میں فکر سخن کرتے تھے یہ چند اشعار اُنکے لکھے جاتے ہیں - سید فرزند احمد صفیر بلگرامی انکے پرپوتے تھے -

مرا دل ہے مائل اب اُس تند خو کا لگا تیر اُلفت یہ دل ہیں کسو کا	جو پیاسا ہے ہر آن میرے لہو کا کہ جاری ہے آنکھوں سے دریا لہو کا
اسقدر رہتا بیاں ہیں اِس دل بیتاب کو	بیقراری جس طرح آتش پہ ہو سیماب کو
صبا کہیو پیام اتنا مرا اُس یار جانی کو	کوئی کھوتا ہی تیرے ہجر میں اپنی جوانی کو
بیمار عشق کے ترے جینے پہ حرف ہے	پانی کہاں وا کے ہی پینے پہ حرف ہے
وہ آئے چڑھ کے گھر سے لڑائی کیواسطے	یاں پاؤں ٹوٹے ہیں ہم ہیں صفائی کیواسطے

حال کیا ہم نفسِ سرد کا تجھ سے کہتے
گرم کیا تجھکو ہم اے نالۂ سوزاں کرتے

عید کے روز مرے گھر جو وہ آتا خواہش
دِل تو پہلے ہی دیا جان بھی قربان کرتے

خواہش **خواہش** میر اللہ داد متوطن الہ آباد قاضی محمد خلیل کی بیاض سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

ہر قدم پر ہیں آفتیں برپا
چال ہے یا کوئی قیامت ہے

خوب **خوب** ڈاکٹر خوبداد خان صاحب ہیڈ اسسٹنٹ محکمہ کمسریٹ انکے والد مبح خان ریاستِ رامپور کے باشندے تھے انہوں نے ۱۸۹۶ء میں اپنا دیوان بھی چھپوا دیا ہے۔ شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں مضمون بھی نکل آتا ہے اور خیال بھی صاف ہوتا ہے۔ سرسری نگاہ میں جو شعر اچھے معلوم ہوئے انتخاب کر کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

مظہر ہے دل تجلّیِ حق کے ظہور کا
ہر دم مشاہدہ ہے یہاں اِسکے نور کا

سینہ ہمارا وادیِ سینا سے کم نہیں
عالم ہمارے قلب پہ ہے کوہِ طور کا

کیوں ہے شیدا بتانِ کم سن کا
ناز کب تک تُم اُٹھائے گا اِن کا

گھائل جگر و دل ہوئے صرف ایک نظر سے
ہے وصف نگہ میں تری کیا تیغ دودم کا

ہے کس غضب کی الٰہی بہار گلچیں پر
کہ ہوتے ہیں گل و غنچے نثار گلچیں پر

آیا گلزار سے اے شوخ جو کل تو ہو کر
رنگ ایک ایک گلِ تر کا اُڑا اُبو ہو کر

کوئی مسجد کو چلا اور کوئی تبخانے کو
ہَیں چلا جھومتا ساقی ترے میخانے کو

ہو سکتا ہے تو بحر کرم ہم سے کب جُدا
ہوتا نہیں الگ کبھی دریا حباب سے

کی یہ کل ترکیب اُن کی ضد گھٹانیکے لئے
زلف کے شانے نے بوسے ہیں شانے کیلئے

خوب **خوب**۔ خوب چند نام عرف پاپا لال تیئیس برس کی عمر ہے۔ شیخ محمد صاحب ہزبر سے تلمذ ہے ابھی مشق سخن کی ابتدا ہے۔ حیدر آباد دکن وطن ہے۔ کلام مرسلہ میں سے یہ چند شعر منتخب ہو کر درج کئے گئے۔

زمین ہے سُرخ مانند شفق خونِ شہیداں سے
نہ کیونکر ترکِ فلک کو رشک آئے کوئے قاتل پر

مہمان جان کے لئے ترک ترے تیروں کو
خاطریں دِل سے مرے زخمِ جگر کرتے ہیں

محضرِ ظلم جفا جو کے سند ہونے کو
مُہر پر مُہر مرے زخمِ جگر کرتے ہیں

ہے یہ سوزِ دِلِ محزوں کہ ہر اک قطرۂ آب
آبلہ بنتا ہے ہونٹوں کو جو تر کرتے ہیں

شہدا لیتے ہیں اُٹھ اُٹھ کے قدم قبروں سے
وہ اگر گنجِ شہیداں میں گذر کرتے ہیں

آجکل زور پہ ہے گردشِ قسمت اپنی
عیب ہو جاتا ہے خواہاں جو ہنر کرتے ہیں

قتل ہو جاؤں تو نیند آئے مجھے آرام سے
صبح کا جھوکا ہوائے دامنِ شمشیر ہو

جان پڑ جائے مرقعہ میں اگر آجائیں آپ
مائلِ پرواز ابھی ہر طائرِ تصویر ہو

کریں وہ غیر کی خاطر ہمارے جیتے جی
نہ کیسے لطفِ حیات اپنا بدمزا ہو جائے

چُھٹے گا عشق بتوں کا کبھی نہ خواہاں سے
ہزار مُتقی بن جائے پارسا ہو جائے

اے ادب آکے ذرا دیکھ مقامِ تسلیم
راہِ معشوق میں سر رکھتے ہیں پا سے پہلے

پڑی جس طرف کارگر ہو گئی
قیامت وہ تیغِ نظر ہو گئی

خواہش حافظ مولا بخش صاحب خواہش شاہجہاں پوری شاگرد حافظ نثار احمد صاحب ثابت۔ یہ دو شعر انکے ملے ؞　　خواہش

دلِ دوپارہ کو گر عشق کا بخار رہے
تو مر کے صورتِ سیماب بیقرار رہے

ڈاک بجلی سے خبر کسو واسطے جاتی ہے جلد
کیا مُنہ تار برقی ہے نظر کے تار کا

خواہش منشی امیر حسن نام خلف اکبر مولوی حکیم سیّد امداد علی کاہش جونپوری حنفی مذہب قادری مشرب اور فنِ شعر میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ موضع بڑا گاؤں ضلع جونپور میں شادی ہو جانے کے باعث قیام اختیار کر لیا تھا۔ کچھ عرصہ مہاراجہ بنارس مرحوم کی سرکار میں ملازم بھی رہے تھے بعارضہ سل حضرت کاہش کے انتقال کے تین چار سال بعد رحلت کی ؞　　خواہش

جمع زلفوں کے جو اجزائے پریشاں کرتے
بیتِ ابرو کو ترے مطلعِ دیوان کرتے

کھول کر زلف کو رُخ پر ترے لٹکا دیتے
ہم اسی پیچ سے ہندو کو مُسلماں کرتے

ہے بزرگ انکے امروہہ کے رہنے والے تھے اپنے بزرگوں کی تقلید سے شعرگوئی کا اوائل عمر میں شوق ہوا۔ راجہ کالیچرن صاحب رئیس بریلی کی اُستادی کا شرف آپ کو حاصل ہے اور بریلی ہائی سکول میں فارسی کے مدرس ہیں۔ اکثر شاعری کا مشغلہ رہتا ہے کم وبیش چالیس سال سے آپ شعر کہتے ہیں اور بریلی کے اکثر نومشق شاعر آپ سے اِس فن میں مستفید ہوتے ہیں بندش مضمون کی طرف جسقدر توجہ ہے اُسی قدر شستگی زبان کی جانب سے بے پرواہی معلوم ہوتی ہے ہنگام ترتیب تذکرہ میں پچیس غزلیں نظر سے گذریں جن کا انتخاب ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

وہ مہر وش اگر سرِ بازار آویگا
خود ماہِ مصر بن کے خریدار آئیگا

ہوگا جو شوقِ آمدِ جاناں میں اضطراب
تسکین دینے وصل کا اقرار آئیگا

روئینگے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے
مدت کے بعد ملنے جو ہر خار آئیگا

ایسا ہوں بدنصیب کہ بن جائیگا وہ دھوپ
سر پر مرے جو سایۂ دیوار آئیگا

دیدارِ چشمِ ساقی میکش کریگا مست
جو خمکدے میں جائیگا سرشار آئیگا

عیشِ وصلِ یار سے فرقت کا غم کم ہوگیا
عید کا چاند اِن دنوں ماہِ محرم ہوگیا

آیا خیال ہمسری زلفِ یار کا
بگڑا دماغ نافۂ مشکِ تتار کا

فرقتِ ساقی میں بگڑی بن کے میخانے کی بات
کون پوچھے خم، صراحی، جام، پیمانے کی بات

یارِ زینت دوست کو ہے شوقِ آرایش کمال
ذکرِ آئینہ ہے دن بھر رات بھر شانے کی بات

قید خانے میں مجھے فصلِ بہار آئی ہے
کھول اے دستِ جنوں پاؤں کی زنجیر کے پیچ

خطِ نسخ پھیرا کتابی رخوں پر
ترے مصحفِ رخ نے قرآں ہوکر

جانبِ کعبہ جو گذرے بتِ پُرفن ہوکر
بتکدہ شیخ حرم آئے برہمن ہوکر

پژمردہ فکرِ صبحِ شبِ وصل سے ہے دل
پہلے بجھے پڑے ہیں چراغِ سحر سے ہم

فرطِ عصیاں نے کیا ہے مجھے محرومِ نجات
رحمتِ حق جو کرے پاس تو کچھ دور نہیں

عشقِ ابرو میں ہرے زخمِ جگر کرتے ہیں
آبِ شمشیر سے اِس کھیت کو تر کرتے ہیں

بھوس سے یار کو جاڑو نہیں نپایا شب وصل
اپنی گھوڑی کو جدا کر تو مٹرک سے ای شیخ
کام آخر مرا ٹوٹا ہوا چھپر آیا
ہنہناتا ہوا خندہ کا وہ چھپر آیا

ہوں کوئی دس سیر چاول اور من بھر شیر ہو
مے پرستو شیخ صاحب کی یہ اب توقیر ہو
کیا کوئی چھیڑے انھیں اور کیا لگائے کوئی ہاتھ
ہے دہن کا اُنکے بوسہ میرے سودا کا علاج
ڈالدو کھاری نمک تو خوب میٹھی کھیر ہو
پاؤں میں گھنگرو بندھیں اور ناک میں اک تیر ہو
ناک کے پکڑے سے جنکی پھوٹتی نکسیر ہو
جس طرح اے خندہ تلّی کی دوا انجیر ہو

مرا رقیب الٰہی ذلیل و خوار رہے
لحاف اوڑھ کے چھپر پہ مائیوں بیٹھے
لگا کے آگ بجھانے کو جاؤں دیکھوں اُسے
گلے میں ٹوٹی ہوئی جوتیوں کا ہار رہے
کہ جب نکاح کے دن اُنکے تین چار رہے
مرے محلّہ میں آکر اگر وہ یار رہے

ہضم ہوتے نہیں اب پانچ روپے رشوت کے
سینہ پر مار کے ہاتھوں کو وہ سر کوٹتے ہیں
لوگ کھاتے تھے پچاسے کے پچاسے پہلے
ڈھول پیچھے سے بجا کرتے ہیں تاشے پہلے

جو شعر غیر کو اپنا بنا کے پڑھتا ہے
چھپے ہزار وہ لیکن مری نگاہ میں ہے

خواجہ — **خواجہ** نواب فیاض الرحمن احمد المعروف بہ پیارے صاحب خواجہ مقیم کلکتہ خاندان شاہی میسور سے ہیں شعر گوئی کا بھی شوق ہے۔ مولوی سید حیدر طباطبائی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ یہ ان کا کلام ہے۔

آئینہ لیکے کیجئے انصاف
رحم بلبل پہ چاہیئے صیاد
کیوں نہ عاشق ہوں ایسی صورت پر
چادرِ گل ہوا اُس کی تربت پر

اے صبا مجنوں سے کہدے چھوڑ دے وحشت کو
بے دئیے جاں عشق میں اصلا نہیں عاشق کو چین
دیکھ لو جذبِ دلِ مجنوں کی تاثیر اے بتو!
وحشتِ دل لے چلی مجھکو بیاباں کی طرف
جائے پروانہ نہ کیوں شمع شبستاں کیطرف
محمل لیلیٰ رواں ہے خود بیاباں کی طرف

خواہاں — **خواہاں**۔ مولوی سید قاسم علی نقوی خلف سید ولدیت علی سید بریلوی سنہ ۱۲۶۴ھ سال ولادت

لپٹ جائے غبارِ عاشقِ ناشاد دامن سے	کہ وہ گورِ شہیدِ ناز سے بچ بچ کے نکلتے ہیں
افسوس دِل میں رہ گئی سب دل کی آرزو	پوری ہوئی نہ ایک بھی بسمل کی آرزو
ممکن نہ تھی جو لیلی پردہ نشیں کی دید	مجنوں کو تھی نظارۂ محمل کی آرزو
دِل نے جس جلوہ کو پہلو میں نہاں دیکھا ہو	تم نے موسیٰ وہ سرِ طور کہاں دیکھا ہے
توبہ پہ گری بجلی اور گھر کے گھٹا چھائی	اب پیرِ مغاں بوتل کونے میں دھری کیوں ہے
یہ خشکی لب کیا ہے یہ زردیِ رُخ کیسی	گر درد نہیں دِل میں آنکھوں میں تری کیوں ہے
کس غیرتِ گلشن کا سودا ہے تجھے اوگل	اِس فصلِ بہاری میں یہ جامہ دری کیوں ہے
عشق سے کب غرض تھی وصلِ بتاں	جان اپنی ہمیں گنوانی تھی
ناامیدی نہ مٹا داغِ تمنا دِل سے	اِس گلستاں میں یہ اک پھول کھلا رہنے دے
کبھی تو ہو آرزوئے کعبہ ہوس کبھی کوچۂ بتاں کی	بتاؤں کیا حال اپنے دِل کا لگی ہو ظالم کو لو کہاں کی
صبا یہ پیغام میرا کہنا جو کوچۂ یار میں گذرنا	کہ جاں بلب ہے مریضِ فرقت خبر بھی ہے کچھ مقیمِ وہاں کی
ادھر ہی صیاد اُدھر ہی گلچیں چمک رہی ہو فلک پہ بجلی	خدا ہی کچھ باغباں بھی ہمسے آئی ہے اب خیر آشیاں کی

منتخب از گلدستۂ [illegible]

منتخب از [illegible]

خندان میرزا امجد علی رامپوری۔ دورِ موجودہ کے شاعر ہیں۔ رسالہ نیرنگ رامپور سے کلام نقل ہوا۔

ہُوا معلوم کہ بس ہو گیا سب خوں پانی	جائے خون جبکہ مری چشم سے آنسو نکلا
ہم تو سمجھے تھے جبھی قافلۂ صبر لٹا	چشمِ خونبار سے جس روز کہ آنسو نکلا
بزم میں آپکی کب چین کسی نے پایا	پیٹتا سر، کوئی سینہ، کوئی زانو نکلا

خندہ۔ میر شجاعت علی صاحب خندہ بریلوی مذاقیہ کلام کہنے کا شوق تھا۔ طبیعت میں ظرافت بیحد تھی ۱۲۸۵ھ کے قریب بریلی میں زندہ و سلامت موجود تھے۔ دس بارہ غزلیں ہنگامِ ترتیب تذکرہ ہاتھ آئیں اُن کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو +

ایک سے ایک شبِ ہجر میں بڑھ کر آیا	کبھی پِسّو، کبھی کھٹمل، کبھی مچھر آیا

خنجر منشی مرزا فدا علی لکھنوی شاگرد سیفؔ شاہجہانپوری - آپکے والد مرحوم کا نام منشی آغا صاحب تھا - کٹڑہ سرائے میوا میں آپکا مکان ہے استعداد علمی بقدر ضرورت ہے، ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے - اِس حساب سے اب چوبیس برس کا سن ہے سولہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا مذاق شروع ہوا، پہلے چند غزلیں خواجہ عشرت لکھنوی کو دکھائیں اب جناب سیفؔ شاہجہانپوری سے تلمذ اختیار کیا ہے، چھ سات ناول بھی لکھ چکے ہیں - اب حال ہیں حضرت واجد علی شاہ کی تالیف پریخانہ کا ترجمہ کرکے شائع کیا ہے "مثنوی انجام عشق" زیر طبع ہے - کلام اور حالات جو اُنھوں نے ہنگام تحریر تذکرہ ارسال کیے اُنکا خلاصہ حاضر ہے -

تھا جس سے دِل کو چین وہ کاشانہ چھٹ گیا
اب جی کے کیا کریں درِ جانانہ چھٹ گیا

وہ وحشت ناک سناٹا وہ پُر ہیبت شبِ ہجراں
وہ گھبرا کے در و دیوار پر میری نظر جانا

ہماری سرد آہوں سے وہ بُجھنا شمع محفل کا
اندھیرے میں وہ گھبرا کر کسی کم سن کا ڈر جانا

بُرائی دخترِ رز کی نہ ہوتی پھر سرِ ممبر
اگر زاہد کبھی اک گھونٹ بھی تو نے پیا ہوتا

ظلم سے کوئی فائدہ نہ ہوا - مر گیا میں ترا بھلا نہ ہوا
مجکو یہ کہکے یاد کرتے ہیں - ہائے وہ درد آشنا نہ ہوا

غش میں جو ہے مریضِ غم ہوش میں آئے یا نہ آئے
گیسوئے مشکبوئے یار تیری بلا کو کیا غرض

بدلی رہی جو یوں ہی کچھ روز آسماں پہ
پیرِ مغاں کے بر میں ہوگی قبائے واعظ

ہوگی سحر کو گرمی بازارِ حسن سرد
شب بھر دکھلائے شعلہ رُخ کی بہا شمع

قلبِ لیلیٰ میں ہوا قیس کی آہوں کا خیال
آئی جب بادِ صبا پردۂ محمل کی طرف

اِک عمر پیا ہجر میں خونِ جگر و دِل
ہی پر تجھسے ناداں ہوں میں جام ابھی تک

راہ میں کعبہ پڑا تھا کر لیا جھک کر سلام
سامنے آتے ہوئے اُس بُت کے شرماتے ہیں ہم

بیکسی میں اپنی دِل رو یا جو فرطِ ضعف سے
درد نے اُٹھکر کہا کروٹ بدلواتے ہیں ہم

آئے تھے بے آبرو ہو کر جہاں سے رانکو
اضطرابِ دِل سے پھر اُس بزم میں جاتے ہیں ہم

جفاؤں سے کلیجہ پک گیا ہے پیشِ خدا اب تو
تری فریاد لیکر او بُتِ مغرور جاتا ہوں

جس کو دیکھا اُسی پہ لوٹ گیا
دل سا بھی کوئی من چلا نہ ہوا

یار بالیں پہ جب تک آ نہ لیا
تن سے دم، دم سے تن جُدا نہ ہوا

فصلِ گل آئی گو ہزاروں بار
نخلِ دل ہی مرا ہرا نہ ہوا

کہتا ہے ہر گھڑی دلِ زحمت طلب یہی
کچھ چاشنیٔ دردِ محبت ضرور ہو

اللہ رے اثر تری برقِ نگاہ کا
جل جائے اِک نظر میں اگر کوہِ طور ہو

ہوتی ہے عیاں لاکھ حجابوں میں تجلی
پردے میں نہاں وہ رُخِ روشن نہیں رہتا

منہ سُو نے ہی طعنہ یہ دیا آج سرِ بزم
عاشق کی زباں پر کبھی شیون نہیں رہتا

جب اُسکی شوخیاں بچپن میں دلکو چھینے لیتی ہیں
تو پھر کیا کچھ نہ ڈھائیگا ستم وہ نوجواں ہوکر

خوفِ عدو وہاں تھا یہاں خوفِ حشر ہے
دنیا میں چین تھا نہ ہمیں ہے مزار میں

اپنے گناہ پر جو ہوا مجکو انفعال
رحمت نے اُسکی لیلیا مجکو کنار میں

خونِ شہیدِ ناز کے دھبے جو پڑ گئے
نقش و نگار بن گئے شمشیرِ یار میں

حاسد کا گر گزر نہیں جنت میں الحذر
دشمن کا کیوں قیام ہے پھر کوئے یار میں

ہمارے جذبۂ دل میں اگر تاثیر ہو جائے
سنبھل جائے مقدر کارگر تدبیر ہو جائے

دعا میں اسقدر یارب مری تاثیر ہو جائے
کہ اُس سے جو کہے یہ عاشقِ دلگیر ہو جائے

نشانِ قبر تک ظالم نے اِس ڈر سے مٹایا ہے
مبادا گردِ عاشق اُٹھکے دامن گیر ہو جائے

کھنچے نقشہ بھلا کس طرح اُسکے روئے تاباں کا
مصوّر دیکھکر جب صورتِ تصویر ہو جائے

پریشاں کیوں نہ ہو قاتل ہماری سخت جانی سے
گلے پر پھیرتے ہی کُند جب شمشیر ہو جائے

وہ نازنیں شبِ وصل اسطرح حجاب میں ہے
زباں پہ قفلِ خموشی ہے منہ نقاب میں ہے

مٹائی محفلِ ہستی جگایا فتنۂ حشر
اثر بلا کا تری چشمِ نیمخواب میں ہے

وفورِ طیش سے رخسار اور سُرخ ہوئے
دو چند حسنِ رُخِ دلربا عتاب میں ہے

ادھر خیالِ جدائی ادھر خیالِ سحر
وصال میں بھی مری جان اک عذاب میں ہے

تھا تنگ ظرف جو باہر ہوا پیمانے سے
محتسب میرا یہ پیمان ہے پیمانے سے
پیری میں جوانی کا مذکور ہی کب کرنا
شیخ نکلا ہے بہکتا ہوا میخانے سے
توبہ توڑوں گا میں خشتِ خمِ میخانے سے
اک خواب ہی بھولا سا اک بات ہے مدت کی

ہلا دوں عرش کو تاب و تواں مجھ میں یہاں تک ہے
پھُنکا جاتا ہوں ہمدم سوزِ فرقت سے کہوں کیونکر
کسیکی تشنہ کامی کا تقاضا ہے یہ قاتل سے
تمہارا یہ تغافل بس مرے ضبطِ فغاں تک ہے
لگی اک آگ سی گویا مرے دِل سے زباں تک ہے
مجھے بھی دیکھنا ہی تیغ میں پانی کہاں تک ہے

خنجر
خنجر۔ ابوالبیان محمد سید عالم خنجر مودودی مارہروی۔ دور موجودہ کے شعرا میں سے ہیں اور فنِ سخن میں حضرت احسن مارہروی سے صلاح لیتے ہیں۔ مولانا نذیر احمد کی مفصل سوانح عمری مرتب کی ہے اور بھی چند کتب انکی تصنیف سے ہیں۔ ۴۰ سال کے قریب عمر ہے۔

آپ کو انشا پردازی میں اچھا ملکہ حاصل ہے۔ اور فکرِ معاش سے بھی بدرجہ اوسط آسودہ ہیں۔ یہ کلام کا انتخاب ہے۔

گُل اپنے رنگ و روپ پہ پھولا ہوا ہے کیا
ناراض کیوں ہوئے جو کہا تم کو بےمثال
ہم ٹھان کر گئے تھے کہ سب کچھ کہینگے حال
کعبے ہیں جسکو ڈھونڈتے ہو وہ تو دلمیں ہے
کیا عجب عقدۂ دشوار جو آساں ہوگا
دو دن کی ہے بہار ہمیشہ دھرا ہے کیا
تعریفِ حُسن کی ہے کوئی بددعا ہے کیا
پُوچھا نہ اُسنے یہ بھی ترا مدعا ہے کیا
خنجر تمہاری عقل پہ پردہ پڑا ہے کیا
درد جب حد سے گذر جائیگا درماں ہوگا

غیر سے ربط تجھے مجھ سے قضا کو نفرت
وعدۂ وصل سے کیا خوش ہوں کہ کھٹکا ہے یہی
وہ بھی دن ہوگا خدایا کہ بر آئے گی اُمید
کہنا جو اُسنے تھا وہ میرے دلمیں رہگیا
دِل نظروں نظروں ہی میں اُڑا لیگئے وہ صاف
کون حالِ دلِ بیمار کا پرساں ہوگا
حسرتیں نکلیں جو دل سے تو یہ ویراں ہوگا
وہ بھی دن ہوگا کہ کوئی مرا مہماں ہوگا
اصلی خیال شکوۂ باطل میں رہ گیا
میں دیکھتا کا دیکھتا محفل میں رہ گیا

دیکھ کر اشتیاق بسمل کا
عرش پر ہے دماغ قاتل کا

غیر نکلا نہ تیری محفل سے
کیا یہ ارمان تھا مرے دل کا

کچھ یہی واماندگی میں قیس کے کام آگئی
تھک گیا مجنوں تو پہنچی آہ محمل کی طرف

بہاریں جسکی قسمت میں تھیں لوٹیں اسنے ای خنجر
مرا شیون مری فریاد بھی پہنچی نہ گلشن تک

خدا شاہد ہے یکتا ہوں تمہارے جاں نثاروں میں
نہ مجھسا پاؤگے عاشق جو ڈھونڈھوگے ہزاروں میں

یہ مانا مجمع اغیار میں بولا نہیں جاتا
مگر کچھ تو کہو آنکھوں میں ہونٹوں میں اشاروں میں

سحر آتے ہیں، شام آتے ہیں وہ آتے ہیں اب آئے
دل بیتاب کو اب تک رکھا ہے ان سہاروں میں

آؤ، ملجاؤ گلے، رخ سے الٹ دو پردہ
کہیں خلوت میں بھی عاشق سے حیا کرتے ہیں

ذرا چھیڑا جنوں نے کشمکش ہونے لگی باہم
خدا جانے کہاں کی لاگ ہے دست و گریباں میں

مزے کیا کیا گناہوں میں گنہگاروں کو آتے ہیں
نئی رحمت نے وہ پیدا کیے ہیں لطف عصیاں میں

چارہ گر، درد کی کیا خوب دوا کرتے ہیں
اس کے پیکاں کو مرے دل سے جدا کرتے ہیں

میرے ہوتے ہوئے کیوں غیر پہ ہو مشق ستم
شرم آتی ہے مجھے آپ یہ کیا کرتے ہیں

آج کیا ڈر ہے کرو شوق سے عشاق پہ ظلم
دیکھنا تم کہ یہ کل حشر میں کیا کرتے ہیں

تم ماتم رقیب میں یوں نوحہ گر نہ ہو
دیکھو کسی غریب کا ٹکڑے جگر نہ ہو

میں خوگر وفا ہوں مزا ہے فراق میں
گو اس صنم کا وصل مجھے عمر بھر نہ ہو

شوخی نے پائی نشو و نما تیری آنکھ میں
تو وہ ہے جسکی لاکھ میں نیچی نظر نہ ہو

دریائے عشق میں در مقصود کب وہ پائے
جس کو یہ ہو خیال کہ اپنا ضرر نہ ہو

حسرت دید میں مر جائیں نہ عشاق کہیں
جلد اے کاش نقاب رخ زیبا الٹے

جان و دل لے لیے خنجر یہ کرم ہے انکا
میرے احسان تو کیا انکے ہیں احساں الٹے

ساقیا ٹال نہ پیاسا مجھے میخانے سے
میرے حصے کی چھلک جائیگی پیمانے سے

دل ملا شیشے سے آنکھیں لڑیں پیمانے سے
ہم کہاں جاتے ہیں ساقی ترے میخانے سے

خنجر ۔ منشی محمد عبد الغفور خان گھڑی ساز میرٹھ شاگرد مولنا شوکت شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں موزوں طبع شاعر ہیں یہ چند شعر کلام بہم رسیدہ میں سے انتخاب ہوکر درج تذکرہ کیے گئے ۔

جان و دل صبر و تحمل لیلئے اک و ارمیں
درد و غم رنج و تعب ارمان و حسرت ساتھ ہوں

بار بار آئے تو کیا چھوڑ و گے جسم زار میں
ساتھ دل کے دفن ہو گنج شہیداں کیوں نہو

نہ شاخ گل پہ تو بیٹھ اتنا پھول کر بلبل
خزاں ہو گل کے لیے اور گل خزاں کے لیے

فرشتے بولے لحد میں جو داغ دل دیکھا
اسی کی روشنی کافی بھی دو جہاں کے لیے

خنجر

خنجر ۔ خنجر تخلص منشی محمد سعید ولد سید عبد المجید سادات حسینی سے ہیں ۔ قدیم وطن دہلی تھا ۔ مگر ایام غدر میں دہلی چھوڑ کر قصبہ "نونی" میں جو دلی سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہے سکونت اختیار کرنی پڑی ۔ لیکن جب تعلیم و تربیت کے قابل ہوئے تو آپکے والد ماجد نے "نونی" میں مدرسہ نہونے کی وجہ سے سکندر آباد میں جہاں آپ کی ننہال ہے سکونت منتقل کر لی ۔ یہاں آپنے پہلے عربی فارسی میں تعلیم پائی پھر سرکاری مدرسہ میں داخل ہوئے اور مڈل تک پاس کیا ۔ اسی دوران میں فن طب بھی تحصیل کرتے رہے ۔ انگریزی کا مطالعہ بھی اسی وجہ سے چھوڑ دیا طب میں مہارت حاصل کرکے اب سکندر آباد میں مطب کرتے ہیں اپنے ماموں حضرت قاضی غیاث الدین صاحب خورشید سے مشورہ کرتے ہیں ۔ نثر کا شوق بھی نظم کے ساتھ رہا ، چند ناول بھی لکھے جو "جہاں نما" اور دیگر اخبارات میں ہفتہ وار شائع ہوا کیے ۔ رسالہ "ید بیضا" کے کئی سال تک اڈیٹر رہے ۔

نظم میں غلو رکاکت اور تعقید سے کلام کو بچاتے ہیں ۔ متروکات کا بھی زیادہ خیال ہے یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب کے رنگ سے آپ کا رنگ جداگانہ ہے ۔ کچھ شاگرد بھی کر لئے ہیں جن میں قمر ، سکندر آبادی و حشمت ، شاہجہاں پوری صاحب دیوان ہیں ۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو ۔

نظر آئے ہر اک ذرہ میں جلوہ شان وحدت کا
جو آنکھیں کھول کر دیکھے تماشہ تیری قدرت کا

دل چھپا یا ہو تو نے مٹھی میں
وصل کے ذکر پر تجاہل سے

ہاتھ لا اے نگار کیا کہنا !
اُلٹا وہ بار بار کیا ، کہنا

خنجر

خنجر - شیخ محمد عبداللہ خان ولدِ پیر بخش فاروقی ساکن اجمیر - سرسہ ضلع حصار میں کئی برس تک ریل کے محکمہ میں ٹھیکہ داری کرتے رہے آوائل مشق میں بطور خود کہتے رہے جب کچھ نیک و بد کی تمیز ہوئی تو سیّد زماں خان صاحب دہلوی کے شاگرد ہو گئے - کچھ کلام غلام عبدالقادر خان الفنی ناگپوری کو بھی دکھایا تھا اپنا دیوان موسوم بہ "چمنستانِ گفتار" عرصہ ہوا چھپوا کر شایع کر چکے ہیں - کلام معمولی درجے کا ہے کوئی خاص بات قابلِ ذکر انکے کلام میں نہیں ہے لکھنو کی طرز کے مقلد ہیں اور اُسی رنگ میں کہتے ہیں - سرسری نظر میں کچھ اشعار منتخب ہو کر درج تذکرہ کئے گئے

نہ شاکی ظلم کا ہوں میں نہ خواہاں ہوں عنایت کا
کیا ہے میں نے جامہ زیبِ تن صبر و قناعت کا

کیا ہے اُن سے تُو نے آج کیا دیدار کا وعدہ
ترے سودائیوں میں شور کیسا ہے قیامت کا

جب تک نہ سہے رنج و غم و زحمت و تکلیف
کچھ مرحلہ عشق میں حاصل نہیں ہوتا

نیند آتی ہے تصورِ ابرو میں کیا مجھے
چلتا گلے پہ ہے مرے خنجر تمام رات

ہجر ساقی میں خونِ دِل اپنا
پیتے ہیں ہم شراب کی مانند

کس طرح یار تجھ کو پائیں ہم
رہبر اپنا کسے بنائیں ہم

واعظ و شیخ بکے جائیں تو ہوتا کیا ہے
رند کب پند و نصیحت کو سُنا کرتے ہیں

رُلایا خوں جہاں کو تیری چشمِ ارغوانی نے
کھلایا زہر لاکھوں کو تری پوشاکِ دھانی نے

بہائے خون کے دریا تری تلوار نے قاتل
بُجھائی پیاس لاکھوں کی ترے خنجر کے پانی نے

لکھا تقدیر کا ارے ناداں
کہیں مٹتا بھی ہے مٹانے سے

جُھکا جاتا ہے دل اُس بت کیجانب
وہ قبلہ ہے تو دل قبلہ نما ہے

خنجر

خنجر - نواب محمد حسین خان باشندۂ فرخ آباد - دَورِ موجودہ کے شاعر اور غالباً مولانا طاہر فرخ آبادی کے تلامذہ میں ہیں - رسالۂ نیرنگ سے کلام منتخب ہوا ◆

نکلنا حسرتوں کا اپنے دل سے کچھ نہیں آساں
اگر نکلی کوئی حسرت بڑی مشکل سے نکلے گی

بوقتِ نزع گر بالیں پہ میری تم نہ آؤ گے
تو یہ جانِ حزیں نکلے گی پر مشکل سے نکلے گی

قطعہ

ہو اسیرِ وہوش، کی جس پر عنایت اے احمق
کیوں نہ پھر اُسکی زمین شعر میں جاگیر ہو

کہا یہ اُن سے کہ اک بوسہ ہم اگر لیلیں
تو کہیئے آپکا نقصان اِس میں کیا ہوجائے

بگڑ کے کہنے لگے وہ کہ مُنہ کو ہوا دُ
تمہارے واسطے دستور کیا نیا ہوجائے

کبھی خمار نہ محتاجِ جامِ صہبا ہو
جو چشمِ مست کا بوسہ کوئی عطا ہوجائے

اُسی کو کہتے ہیں پان جو بیقرار رہے
اُسی کا نام ہے دل جس میں اضطرار رہے

خطا رقیب کریں دیں سزا مجھی کو آپ
کسی کا جرم ہو کوئی قصوروار رہے

جھکائیں سر کو حسین آ کے سارے عالم کے
سرِ مزار اگر نقشِ پا ریار رہے

اُٹھے جبتک نہ دُھواں اُسنے رواں ہو کیا اشک
کہیں پانی بھی برستا ہے گھٹا سے پہلے

وہ بیکس ہُوں سو بار آ کر قضا
سرہانے مرے نوحہ گر ہو گئی

خمیر

خمیر - اِنکا نام اور حال باوجود تلاش معلوم نہ ہوا - ایک پُرانی بیاض میں کچھ اشعار نظر پڑے اُس میں سے یہ چند شعر منتخب ہوئے - غالباً نواح اودھ کے باشندے تھے اور مذاقیہ شعر کہنے میں معقول دسترس تھی *

نہ پہیں اتنا لے گردشِ آسماں
کہ ہر استخواں کا رواہو گیا

رُخِ پُر ملاحت کا بوسہ ملا
نمک خوار میں آپکا ہو گیا

جو غم شب کے خاصے میں سبح رہا
وہی صبح کا ناشتہ ہو گیا

لبِ شیریں کی یاد میں اے خمیر
جو پُھلکے تلے گلگلا ہو گیا

فقرے تمہارے چھڑکے ہوئے نون مرچ کے
کیا چٹ پٹے بڑے ہیں وہی کے مسالہ دار

خمیر اشعار سے میرے نکیوں بھوکوں کی سیری ہو
کہ مجھ کو فیض پہنچا ہے یہ نعمت خوانِ عالی سے

قطعہ

روکھی سوکھی بھی آبرو سے ملے
یہ بھی اِس وقت میں غنیمت ہے

جب کہا اُن سے ایک بوسہ دو
یہ جو رخسار ہیں گلابی سے

چنکے بولے کہ جان جائے گی
ہاتھ اُٹھاؤ اب اس کابی سے

زمانہ جانتا ہی ناز بردار جفا ہم ہیں
خدائی دیکھتی ہے دشمن رسم وفا تم ہو

مروّت میں، وفا میں، ناز برداری میں، چاہت میں
ذرا ہمیں بھی سنوں کس بات میں مجھسے سوا تم ہو

جو واپس ہم نے دل مانگا خلیل اُسنے تو وہ بولے
کہ اچھا بے وفا اب کون نکلا ہم ہیں یا تم ہو

وفا کر یا نہ کر تو جان مجھ کو کیا تری مرضی
تجھی کو سب کہیں گے بیمروت دیکھنے والے

ستایا لیکے دل ظالم نے کی یہ دل لگی اچھی
اسی کا نام اُلفت ہی تو اِس سے دشمنی اچھی

نہ پوچھو حال شب جُدائی جو دلکو رنج و محن ہوا ہے
تمہاری سر کی قسم ہی صاحب کہ صبح کرنا کٹھن ہوا ہے

جو قصۂ زلف چھڑ گیا ہی تو پہروں طول سخن رہا ہے
سکوت سب نے کیا ہی او بت جو تیرا وصف دہن ہوا ہے

جو روئے گلگوں کا دھیان آیا تو دل نے لُطف چمن دکھایا
خیال آنکھوں کا جبکہ باندھا تو صید مضموں ہرن ہوا ہے

بڑھا ہی جبدن سے عشق گیسو نہ دل پہ قابو رہا سر مُو
ہمارے قبضے میں ای پریرو سواد ملک ختن ہوا ہے

یہاں تو نور کا تڑکا ہے یاد روئے وش میں
وہ کوئی اور ہونگے شام فرقت دیکھنے والے

خمار

خمار ۔ حکیم برجموہن لال صاحب خمار بریلوی شاگرد حضرت ہوش۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ سنہ ۱۸۷۱ء میں زندہ و سلامت موجود تھے اور اُس زمانے کے مشاعروں میں شریک رہتے تھے کلام سے پایا جاتا ہے کہ چند غزلیں حضرت اسیر لکھنوی کو بھی دکھائی تھیں۔

تاسف کیا کریں ہم سر کے جانیکا بھلا قاتل
چلو اچھا ہوا گردن سے اپنا بار سر کا

یوں لکھا احوال اپنے دیدۂ بیدار کا
پھول اِک خط میں بنایا نرگس بیمار کا

اے شیخ جا کے بزم میں اُس مے پرست کی
دیکھوں گا میں کہ کس طرح ہشیار آئیگا

جب دیا کاندھا جنازے کو مرے اُس مہر نے
بن گیا پھولوں کی چادر کا ہر اک گل آفتاب

قابل تشبیہ اُس دم ہو کہ جب پیدا کرے
یہ دہن یہ چشم یہ ابرو یہ کاکل آفتاب

وہ پھرا کیا کہ پھری ساری خدائی ہمسے
دوست بھی ہمکو ستانے لگے دشمن ہوکر

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان روزوں
اب تو سرسبز یہاں باغ سخن دیکھتے ہیں

آب کوثر کی ہمیں چاہ نہ ہو بعد فنا
آب خنجر سے گلا اسلئے تر کرتے ہیں

صولت جنگ۔ جی، سی۔ ایس۔ آئی۔ فرمانروائے ٹونک۔ نواب محمد علی خان سابق نواب ٹونک کے خلف اکبر ہیں ۱۸۴۸ء مطابق ۱۲۶۵ھ سال پیدائش ہے ۱۸۶۶ء میں بعد معزولی اپنے والد کے مسند نشین ہوئے۔ ایام نابالغی میں ریاست کا انتظام صاحبزادہ عبید اللہ خان فیروز جنگ کی تفویض رہا۔ یکم جنوری ۱۸۷۰ء کو کامل اختیارات حکمرانی عطا ہوئے۔ نواب صاحب خود تجربہ کار زمانہ دیدہ باخبر ہیں ریاست کی سلامی جو انکے مسند نشین ہونے کے وقت گیارہ توپ کی تھی اب پھر سترہ توپ کی ہو گئی ہے۔ بائیس تیئیس برس صاحبزادہ عبید اللہ خان وزیر مدار المہام ریاست رہے اُنکی وفات کے بعد انتظام ریاست میں کچھ خلل واقع ہوا، اور کونسل ہو گئی اب پھر دوبارہ اختیارات ریاست مل گئے ہیں۔ نواب صاحب کے گیارہ فرزند ہیں شعر و شاعری کا بھی شوق ہے پہلے جناب بسمل خیرآبادی برادر کلاں جناب مضطر سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے اُنکی وفات کے بعد جناب مضطر اُستاد بنائے گئے اور اُنکی اُستادی کے زمانے میں نواب صاحب کی غزلیں بعض گلدستوں کے ذریعے ملک میں پھیلیں۔ اپنے دوسرے اُستاد جناب مضطر کو اُنھوں نے "اعتبار الملک" "افتخار الشعراء" "اقتدار جنگ" اور "خان بہادر" کے خطاب سے معزز فرمایا۔ علاوہ جناب مُضطر کے آسد، ظہیر، کوثر، خلش، وغیرہ اکثر شعرا اُن کے دامن دولت سے وابستہ رہے اور بعض اب بھی ہیں۔ کلام بُہت پاکیزہ اور صاف ہے، شوخی اور جودت متانت اور سلاست، موقعہ بموقعہ مناسب مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اشعار میں رنگینی بھی ہے۔

جذبِ اُلفت کا جب اثر جانوں۔	رُوٹھوں میں اور مجھے منائیں آپ
تُم وستِ نازنیں سے جو چھو لو چمن کے پھول	کلیاں تمام باغ کی رہ جائیں بن کے پھول
شاخِ جفا نے پائے ہیں مہر و وفا کے پھل	نخلِ وفا میں آئے ہیں رنج و محن کے پھول
تجھپر فدا ہزار کلی ہر کلی کا رنگ	تجھپر نثار لاکھ چمن ہر چمن کے پھول
کوئی ہے زُہد پہ نازاں کوئی عبادت پر	یہاں تو اِک میرے آمرزگار کچھ بھی نہیں
دل ایک چھوٹی سی شے ہے پہ تعجب کا محل یہ ہے	خیالاتِ جہان کس طرح سے اسمیں سماتے ہیں

ہائے ملتے نہیں کہتے ہیں کہ جلدی کیا ہی
مُنہ کے ہیں سن کے اور اس ضد کے میں صدقے قربان

عید آئیگی تو ہم ہنستے گلے مِل لیں گے
صبح سے آج وہ مچلے ہیں کہ ہم دل لیں گے

فراقِ جاناں میں ہی یہ حالت کہ سبکو مجھ سے ہی اک عداوت
نہ آپ آنکھیں ہمیں دکھائیں نہ ہمکو محفل سے اب اُٹھائیں

ذرا جو آنکھ لگ گئی ہی تو دل اُچھلکر جگا رہا ہے
ہمیں تو خود در دہی جگر کا اب انجمن سے اُٹھا رہا ہے

آرزو تھی تری دِل میں اُتر آتی تصویر
یہی کرتے مری جاں دل پہ جو قابو ہوتا
عشوہ نہ کرینگے، کہ وہ غمزہ نہ کرینگے

ہم اُسے سر کو جھکائے ہوئے دیکھا کرتے
سامنے ہمکو بٹھا کر تمھیں دیکھا کرتے
آئیں گے جوانی پہ تو کیا کیا نہ کرینگے

رہی محفل تری یُونہی بھری غیروں سے آئے دن
جگہ ہمکو بھی ملجائے پسِ دیوار تھوڑی سی

خوشبو جو پسینہ کو ترے دی ہی خدا نے
نظر اِس طرف انکی کیا ہو گئی
صبا کی ذرا شوخیاں دیکھنا

یہ بات کسی پھُول کی خوشبو میں نہیں ہے،
مرے دردِ دل کی دوا ہو گئی
کہ بُو اس کی لا کر ہوا ہو گئی

دِل آج بہت دیر سے پہلو میں نہیں ہی
سمجھتا ہُوں اُنہیں تیری نشانی

اُلجھا تو تمہارے کہیں گیسو میں نہیں ہے
لگاؤں کیوں نہ داغوں کو جگر سے

نہ لالی ہی وہ رنگت ہی، نہ پھولوں ہیں وہ شوخی ہی
مِرا سینہ بنا ہے غیرتِ گلزار داغوں سے
بہت روئے ہیں آیا ہے نظر جب پھُول لالے کا

بجھادی شعلۂ عارض سے کِسنے آگ گلشن کی
ہم اپنے گھر میں بیٹھے کر رہے ہیں سیرِ گلشن کی
اِسی صورت اِسی رنگت کا اک دل ہم بھی رکھتے تھے

سخت جانی مری گردن نہیں کٹنے دیتی
تیغ جلّاد کی بیکار ہوئی جاتی ہے

کوئے جاناں کو سمجھتا نہیں کم کعبہ سے
نہ جلاؤ، نہ جلاؤ، میری تربت پہ چراغ
نامہ بر ہوش میں آ مجھ سے یہ کیا کہتا ہے!

پاؤں سے میں نہ چلوں گا کبھی سر کے ہوتے
حاجتِ شمع نہیں داغ جگر کے ہوتے
خط سیاہی سے لکھوں خونِ جگر کے ہوتے

خلیل

خلیل - عالیجناب معلیٰ القاب امین الدولہ وزیر الممالک نواب حافظ محمد ابراہیم علیخان صاحب بہادر

علمی استعداد خاصی ہے۔ ہنگام ترتیب تذکرہ جو کلام بھیجا اُس کا انتخاب درج تذکرہ کیا گیا۔ کلام میں صفائی روزمرّہ کے علاوہ، معاملہ بندی، شوخی، اور بندش کی خوبی سب باتیں موجود ہیں ملاحظہ ہو

نالے ہیں اُٹھتے بیٹھتے کیوں لب پہ اے خلیلؔ ۔۔۔ بیٹھے بٹھائے تم کو یہ آزار کیا ہوا

دی دغا دل نے دوست نے مجھکو ۔۔۔ اب بھلا اعتبار ہو کس کا
تم ہو، میں ہوں، گلا ہے، خنجر ہے، ۔۔۔ اور اب انتظار ہے کس کا

پڑی تھی تم پہ نظر دل کو کیوں کچل ڈالا ۔۔۔ قصور آنکھ کا تھا دل گناہگار نہ تھا
چاہتا ہے دل جسے، جب وہ ہی پہلو میں نہیں ۔۔۔ چاندنی چھٹکی تو کیا، ٹھنڈی ہوا آئی تو کیا

مدّتوں یاد وہ شب و روز کی باہم صحبت ۔۔۔ یا ہمیں راہ میں بھی دیکھ کے کترا جانا
اتنی مدت سے تو تم دل میں مرے رہتے ہو ۔۔۔ اور کچھ حال نہ تم نے مرے دل کا جانا

تم تو افسردہ ہر اک بات پہ ہو جاتے ہو ۔۔۔ ہمکو بھاتا نہیں یہ پھول سا مرجھا جانا

آئے ایسے ہی ہاں نظر کا تیر ۔۔۔ دیکھنا اب نہ تم خطا کرنا
ہائے دل کا علاج کون کرے ۔۔۔ وہ نہیں جانتے دوا کرنا
دو گے کب تک بتوں پہ جان خلیلؔ ۔۔۔ چاہیئے اب خدا خدا کرنا

اطاعت عشق میں کرتے ہیں وہ نازک مزاجوں کی ۔۔۔ اِدھر انکو منائے ہیں اُدھر دل کو سنبھالے ہیں

رحم کر اب بھی مرے دل پہ ذرا اے کافر ۔۔۔ کھا چکا اب تو تری زلف کے جھٹکے لاکھوں
پھانسی بنتے ہیں، کبھی جال کبھی، دام کبھی ۔۔۔ گیسوؤں کو بھی ترے یاد ہیں ٹٹکے لاکھوں

ہائے کیا شوخی ہے، کیا انداز ہے، کیا حسن ہے، ۔۔۔ جس طرف گذرے، وہ بسمل کر گئے دو چار کو
گال اُنکے، اور گلہائے چمن، اے عندلیب ۔۔۔ صدقے ان پھولوں پہ کر ڈالوں ترے گلزار کو
سخت جاں ایسا ہوں قاتل سے گلا کٹتا نہیں ۔۔۔ دیکھتی ہے تیغ مجھکو، اور میں تلوار کو
دل نہ وابستہ ہو کیوں، زلفِ گرہ گیر کے ساتھ ۔۔۔ اُنس ہو جاتا ہے، دیوانے کو، زنجیر کے ساتھ

ضبط سے کام ہمیشہ ترے بسمل لیں گے ۔۔۔ جان دیدینگے ترا نام نہ قاتل لیں گے

چمن چمن یہ نسیم سحر پکار آئی | خزاں نے کوچ کیا بلبلو بہار آئی

جلوۂ یار نہ تھا دارو ئے بیہوشی بھی | دیر تک ایک نظر دیکھ کے بیہوش رہے

داغ دیجاتی ہی برسات میں بے یار گھٹا | ابر تر آگ کلیجہ کو لگا جاتا ہے

دھوم سنتے رہے آج آتی ہی کل آتی ہی | قامتِ یار کے آگے نہ قیامت آئی

جمال حور کا مٹی کی مورتوں کو دیا | کمال صنعتِ پروردگار دیکھ چکے

محبت مرض ہے محبت دوا ہے | محبت اجل ہے محبت شفا ہے

شرافت ہی حسنِ عمل سے خلیل | جبیں پر کہاں شیخ و سید لکھا ہے

ہوتی ہی شکست اسکو جو مجھ رند سے اکثر | جب دیکھئے توبہ درِ قاضی پہ کھڑی ہے

فرقت کی نہیں شب یہ شب آفات یہی ہی | روتا تھا جسے روز میں وہ رات یہی ہی

لاکھ نازک ہو رشتۂ الفت | ٹوٹتا ہے یہ تار مشکل سے

عشق اپنا اثر آخر کو یہ دکھلاتا ہے | پہلے غم کھاتے تھے ہم اب ہمیں غم کھاتا ہے

نظارۂ معشوق سے سیری نہیں ہوتی | ہو وصل بھی تو وصل کی حسرت نہیں جاتی

لاکھ پردوں میں ہوں پھر چھپتے نہیں | چتونیں چاہت کی تیور پیار کے

دل پہ بے یار کچھ عجب گذری | کیا کہوں کس طرح سے شب گذری

یہ بھی معلوم وصل میں نہ ہوا | کب ہوئی صبح رات کب گذری

خلیل

خلیل - جناب حافظ خلیل حسن صاحب مانکپوری خلفِ حافظ عبدالکریم ۱۲۷۶ھ سالِ ولادت ہے۔ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل کے جو اب حیدر آباد میں ہیں بڑے بھائی ہیں حضرت امیر مینائی کے یہ بھی شاگرد ہیں اور مدت تک ریاستِ رامپور میں انکی خدمت میں رہے ہیں پھر کئی برس گوالیار رہے - اب پندرہ سولہ برس سے ریاستِ بلرام پور میں ملازم ہیں مہاراجہ صاحب بہادر آپ کی بڑی قدر کرتے ہیں - انکی تصنیف سے علاوہ دیوان کے تین چار عاشقانہ مثنویاں بھی ہیں قصائد کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آپ کے پاس ہے - تاریخ گوئی میں آپ کو کمال حاصل ہے

مُسلمان جانتے ہیں شمع قندیلِ حرم تجھکو
چراغِ دیر ہے تو اے صنم چشمِ برہمن میں

خالی ہیں سبو شیشے ہیں تہی لبریز شراب سے جام نہیں
چلتے ہیں یہاں سے بادہ کشو اِس بزم میں اپنا کام نہیں

جو مر گئے اُنکو زیرِ زمیں کچھ راحت و رنج سے کام نہیں
شادیٔ بیاضِ صُبح نہیں اندوہِ سوادِ شام نہیں

ہُوں بندۂ عشقِ حُسنِ بتاں کچھ دیر و حرم سے کام نہیں
مذہب ہی جُدا ہے محبت کا یاں کفر نہیں اسلام نہیں

بلبل ہیں شگفتہ ہنستے ہیں گُل ہے باغ میں دھوم بہار آئی
دے موت خدا تجھکو شبنم یہ رونے کا ہنگام نہیں

شاعر ہُوں خلیل تخلص ہے کعبہ تک ہند سے جاتے ہیں
کیوں ننگ ہے تجھکو ملنے میں اے بُت میں بھی گمنام نہیں

خدا کو بھُول گئے لوگ فکرِ روزی میں
خیالِ رزق ہے رزّاق کا خیال نہیں

ترکِ دُنیا خوب ہے حرص و ہوا اچھی نہیں
ہر کس و ناکس کے آگے التجا اچھی نہیں

عشاق کو محفل سے اُٹھاؤ نہ حسینو!
آئے ہیں ہوا کھانے کو بیمار چمن میں

تُم سیر کو جاتے ہو دھڑکتا ہے میرا دل
بلبل کہیں مر جائیں نہ دو چار چمن میں

ناز سے مُنہ کو جو زلفوں میں چھپا لیتے ہو
جی سے بھاتا ہے یہ انداز تمھارا مُجھکو

تُم سُنو یا نہ سُنو نالے کیئے جاؤں گا
دردِ دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہو

اجل ہے گھات میں دم توڑتا ہُوں تم مسیحا ہو
اکیلا چھوڑ کر جاؤ نہ بیمارِ محبّت کو

جس سنگ پہ چاہو جبہہ سا ہو
پر شرط یہ ہے کہ بے ریا ہو

کیونکر نہ کہوں تمھیں مسیحا ٭
دردِ دلِ زار کی دَوا ہو ٭

اچھے نہیں ہیں جوششِ وحشت کے رنگ ڈھنگ
تیور کچھ اب کے سال بُرے ہیں بہار کے

دم سے طلسم آدمِ خاکی کا ہے خلیل
پھرتی ہیں پُتلیاں یہ سہارے سے تار کے

پاؤں پر خم رہی جبینِ نیاز
زندگی یُوں بسر ہوئی میری

طالبِ وصل ہُوں نہ چھیڑ مجھے
دل لگی کیا غریب سائل سے

نہو جو داغِ جگر تو غلط ہے دعویٔ عشق
بغیر مہر سند معتبر نہیں ہوتی

کیونکر ڈروں نہ اُنکے خطِ مشک فام سے
پُہنچے ہیں سیّدوں کو بہت رنج شام سے

سوز و گداز عشق سے ہو جائینگے فنا — اپنا مآل کار ہے مثلِ مآلِ شمع

حشر برپا ہو کہیں لوگ قیامت آئی — ربع مسکوں میں ہو ہل چل جو چلو چار قدم

جانِ جاں عاشقوں میں نام جدائی کا نہ لو — موت کا ذکر نہیں کرتے ہیں بیماروں میں

دل سے ہم شیدائے چشم یار ہیں — نرگس بیمار کے بیمار ہیں

چھیڑتے ہیں عاشقانِ زار کو — خوب رو کتنے غریب آزار ہیں

کیا اسکی جستجو نے چھڑوا دیئے ہیں مسکن — پروانے ہیں چمن میں بلبل ہیں انجمن میں

مری قدر کیا ہو جہان میں کہیں مجھ سا کوئی بشر نہیں — وہ دوا ہوں جس میں شفا نہیں وہ دعا ہوں جس میں اثر نہیں

مرے دل کو جس کا خیال ہے شب و روز شوقِ وصال ہے — وہ کہاں ہے، کون ہے؟ کیا ہے شے ابھی تک کچھ اسکی خبر نہیں

نہیں دم زدن کی یہ ہے جگہ جو خیال بھی ہو عروج کا — تو صدا یہ آتی ہے کان میں کہ بس اے حباب ابھر نہیں

مرے اسکے ہیں جو معاملے وہی اسکو خوب ہے جانتا — یہ مقامِ راز و نیاز ہے دل و جاں کو اسکی خبر نہیں

کرے دید اسکی مجال کیا وہ جمال دشمنِ ہوش ہے — جھلک اسکی جسکو نظر پڑی اسے پھر کسی کی خبر نہیں

وہ جو کرتے ہیں مرا امتحاں پڑیں بیچ والے نہ درمیاں — اگر آگ میں بھی وہ پھینکدے تو خلیل کچھ مجھے ڈر نہیں

اللہ رے حسنِ عارضِ رنگین کے عکس سے — یاقوت بن گیا ہے گہر گوشِ یار میں

ہو نہ غصہ آگئے ہیں لختِ دل نالوں کے ساتھ — باغباں گلبرگ منقارِ عنادل میں نہیں

سر ترے زانو پہ ہو دم نکلے جب آئے قضا — اور کچھ حسرت ترے بیمار کے دل میں نہیں

زندگانی کا سبب عاشق کی ہجر یار ہے — زیست پروانہ کی وصلِ شمع محفل میں نہیں

ہمتِ مردانہ ہے میری مجھے مشکل کشا — غیر سے خواہان مدد کا وقت مشکل میں نہیں

عمر غفلت میں بسر ہوتی ہے اپنی روز و شب — کچھ نہیں معلوم ہم سوتے ہیں یا بیدار ہیں

کسکو یاں تاب رقم واں کسکو پڑھنے کا دماغ — ورنہ قاصد شرح شوق وصل کے طومار ہیں

دل ہی دل میں گفتگو رہتی ہے باہم روز و شب — میرے اسکے درمیاں تقریر کی حاجت نہیں

وصف روئے نگار کرتا ہوں — لکھتا ہوں شرح داستانِ چمن

یار نے آ کے دم نزع کہا
کیا ارادہ ہے کدھر جائیے گا

جوبن رہتا نہیں کسیکا
یہ دھوپ میں سایہ ہے پری کا

ہاتھ پورا نہ پڑا زخم لگائے اوچھے
قتل کرنا بھی نہ تجھکو مرے جلاد آیا

جس نے پوچھا یہی جواب ملا
آدمی باوفا نہیں ملتا

طالب مقصود گر ہے اپنی ہستی کو مٹا
ہوگیا جس وقت خود گم مدعا مِل جائیگا

عاشق ہوں بتو تم مجھے جو چاہو سزا دو
اللہ کا بندہ ہوں گنہ گار تمھارا

قاتل نے بعد قتل مری مسکرا دیا
کیا خوب خوں بہا کے مجھے خوں بہا دیا

کھنچتے ہو دُور ہمسے ہمارا قصور ہے
کیوں چاند کہہ کے تمکو فلک پر چڑھا دیا

شبِ غم میں دِل پر قلق جب ہوا
خیال اُس کا آ کر خبر لے گیا

بزم سے یار نے یہ کہکے نکالا مجھکو
اُٹھئے، گھر جائیے، دم لیجئے، ستائے بہت

حرصِ نعمت کی بہت کرتی ہے انسانکو خراب
پھوٹ جائے بدن کھیر جو کھاجائے بہت

اے پری ہیں ترے دیوانے کے مرنیسے خراب
ہتکڑی، طوق، رسن، خانہ زندان زنجیر

جبیں پہ غصے سے پڑ گئی چین پھر الٹیں آنکھیں بھویں چڑھا کر
دہن کا بوسہ جو اُس سے مانگا بگڑ گئے صاف منہ بنا کر

نگرِ تصور بتوں کا دل میں محل تو یہ ہے کہ کچھ حیا کر
خلیل کعبہ میں بُت پرستی خدا خدا کر خدا خدا کر

بلا ہے سایہ بھی ان بتوں کا خدا بچائے ہر اک بشر کو
پری کو دیوانہ چٹکیوں میں بناتے ہیں یہ اُڑا اُڑا کر

ہوئی ہے مدت میں وصل کی شب حشر تک ہو سحر نمایاں
کروں میں آہیں جھکا کے سر کو خدا سے تو ای صنم دعا کر

بتوں کو بھی بدنہ کہیو واعظ خدا کو گر ایک جانتا ہے
نکال حرفِ دوئی نہ مُنہ سے خدا خدا کر خدا خدا کر

حسینوں میں حسن ضو قمر میں گلو نمیں بو سنگ میں ہے آتش
کیا ہے عالم کو تو نے حیران ہر اک میں جلوہ دکھا دکھا کر

بتانِ ہندوستاں میں تو نے بہت سی کی سیرت پرستی
خلیل کعبے میں چل کے یہاں سے کبرائی خم اخدا کر

کوئی بلبل نہ کسی پھول کا شیدا ہو خلیل
گُل کے پردے میں رہے وہ نہ اگر بُو ہو کر

روئے پہ باندھ لے جو مری چشمِ تر کمر
کیسی زمیں فلک پہ ہو پانی کمر کمر

مطبوعہ میں شامل نہو سکا اخلاق اور معرفت کا رنگ بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے خلیل کے کلام میں اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار زیادہ ہے اور تشبیہ و استعارہ کا شوق حد اعتدال سے متجاوز ہے۔ مراعاۃ النظیر اور صنعت تجنیس کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ بعض شعار بالکل فحش کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ زلف۔ کنگھی۔ مانگ۔ چوٹی۔ خط و خال کے مضامین کثرت سے نظم کیے ہیں۔ صاف عاشقانہ شعر غزلوں میں کم نکلتے ہیں۔ نازک خیالی اور شگفتگی مضامین کی طرف توجہ کم معلوم ہوتی ہے اسی لئے کلام میں دلکشی (جیسی کہ ایسے سخنور کے ہاں اُمید کیجا سکتی ہے) نہیں ہے عموماً جو ایک مصرعہ میں زور ہوتا ہے وہ دوسرے میں قائم نہیں رہتا۔ ہمنے اپنی پسند کے مطابق عاشقانہ اور اخلاقی مضامین کے اشعار کا انتخاب کیا ہے مگر دیوان میں ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے سلطان عالم واجد علی شاہ کے عہد میں نظامت اور چکلہ داری کے عہدہ پر ممتاز رہے تاحیات کمال عیش و عشرت سے بسر کرتے رہے۔ دیوانِ مطبوعہ کا خلاصہ درج ذیل ہے

ناقصوں پر نظرِ مہر نہ رکھتا جو فلک
لعل پتھر کو نہ پھر سیپ کو گوہر ملتا

جب عرضِ حال کرتا ہوں کہتا ہے وہ صنم
کچھ اور کہیے یہ تو ہے قصہ سُنا ہوا

دل ہی میں نہیں کچھ ترا جلوہ تو ہر اک کو
شمع حرم و دیر و کلیسا نظر آیا

وہ رنگ ہے تیرا کہ ترے رنگ کے آگے
جس رنگ کو دیکھا ہے وہ پھیکا نظر آیا

آدمی وہ ہے کہ جو حضرت آدم کی طرح
شیرِ مادر کا بھی شرمندہ احساں نہوا

چُپ کس لیے رہتے ہو خلیل جگر افگار
بتلاؤ تو کیا حال ہے اے یار تمہارا

کبھی دیکھا جو اُبلتے ہوئے مے کو خم سے
جوش اپنی بھی جوانی کا ہمیں یاد آیا

اہلِ دنیا ہیں تمام اپنی غرض کے بندے
پڑ گئی جب کوئی مشکل تو خدا یاد آیا

کیا بہار ہیں جسنے بت پایا جو لٹکا
گیا نہ زلف کا سودا ہزار سر پٹکا

شبِ فراق میں بیتابیوں نے گیند کیطرح
فلک پہ مجکو اُٹھایا زمیں پہ دے پٹکا

کٹتی نہیں ہیں مجرمِ اُلفت کی بیڑیاں
جو مر گیا وہ قید سے آزاد ہو گیا

وُہی ہنسی مجھے دُکھ دے رہی ہے	لبِ جاناں کے بوسے لے رہی ہے
وُہی ہنسی کٹی جو بانس ہو کر	کھٹکتی ہے جگر میں پھانس ہو کر
اُسی ہنسی میں جادو بھر رہا ہے	اُسی ہنسی سے میرا من ہرا ہے
مرونگی جان دونگی سر دھنونگی	سُنونگی پھر وُہی ہنسی سُنونگی

خلیل

خلیل شرف الدولہ منتظم الملک نواب محمد ابراہیم خان بہادر مستقیم جنگ خلفِ خواجہ عبد الحکیم لکھنوی از اہل خطہ۔ آپ محمد علی شاہ بادشاہ کے وزیر اور موزونی طبع کے اقتضا سے نواب عاشور علی خان کے شاگرد تھے۔ غدر میں مارے گئے بڑے مقتدر اور والا منزلت امیر تھے۔ لکھنؤ میں اِنکے نام کی کوٹھی ابتک مشہور ہے گاہ گاہ شعر کہتے تھے ملاحظہ ہوں ؛

سُن کے حالِ شب فرقت بولے	کہیئے کچھ اور بھی فرمایئے گا
ربع میں دیکھ کے فرماتے ہیں	ہم جلائیں گے جو مرجایئے گا
وصل میں کہتے ہیں بھولے بنکر	کس طرح ہجر میں مرجایئے گا
ایسے وعدے بھی وفا ہوتے ہیں	ہاں بجا سچ ہے ضرور آیئے گا
مثلِ مہِ نو عشق میں اُس رشک قمر کے	اُٹھتی ہے صدا مجھ سے وفا کوش پہ انگشت
دیوانہ تیرا بادیہ پیما ہوا اگر ؛ ؛	دوڑیگا اُسکے لینے کو خود قیس بن کے پاؤں
دیکھی قریبِ چشم جو گیسوئے مشکبار	تشبیہ دی کہ ہیں یہ غزالِ ختن کے پاؤں
ہاتھوں پہ سر جو معرکہ امتحاں میں تھا	پیچھے ہٹے نہ ایک قدم کو ہکن کے پاؤں
درگاہ میں خدا کی دعا ہے یہی خلیل	ہوں روز حشر سر پہ مرے پنجتن کے پاؤں

خلیل

خلیل سخنور خوش فکر میر دوست علی خلیل مرحوم خلف سید جمال علی باشندۂ قصبۂ بڈولی اودہ خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کے شاگردوں میں نامور تھے اِنکی خوش کلامی کا بڑا شہرہ تھا۔ نواب نادر میرزا نیشاپوری کی مصاحبت میں بسر اوقات کرتے رہے ۱۲۷۵ھ میں کلکتے بھی گئے تھے اِنکا اُردو دیوان مطبع نامی لکھنؤ میں چھپا تھا۔ مگر معتبروں سے سُنا کہ اچھا کلام بیشتر ضائع ہوگیا اُردو دیوان

نہروں سے آبپاشی کھیتوں پہ آبیانہ — فوجِ پولس معیّن بھرپور ہے خزانہ
سکھوں کا ڈھنگ دیکھا مغلوں کا طور دیکھا — ایسا نہ عہد دیکھا ایسا نہ طور دیکھا
اقبال کی رہیگی دولت شفیق جب تک — ہے عدل کی جہاں میں رحمت رفیق جب تک
آزادیوں کا حامی لبرل فریق جب تک — ہم بھی دعائیں دیں گے ہر دم خلیق جب تک
ملکہ و جارج پنجم انصاف و عدل پیشہ — زندہ رہیں ہمیشہ زندہ رہیں ہمیشہ
دہلی کی شان دُگنی ہو جائیگی یقین ہے — اُجڑا ہوا نہیں ہے اُجڑا ہوا نہیں ہے
خلدِ بریں سے بہتر اس شہر کی زمیں ہے — ہر نقش دلفزا ہے ہر بات دلنشیں ہے
لندن بنا ہوا ہے ہندوستاں میں دہلی — ہر انتخاب بیشک سارے جہاں میں دہلی

بنسی کی صدا

سکھی میں مست ہوں بنسی کی دھن سے — کہوں گی جو مجھے کہنا ہے اُن سے
تجھے میں کیا بتاؤں جی کہاں ہے — تو ہی مجھکو بتا دے پی کہاں ہے؟
برہ کی آگ سے میں جل رہی ہوں — تڑپتی ہوں کلیجہ مل رہی ہوں
نگاہِ ناز سے بسمل ہوئی ہوں — فقط بسمل نہیں بے دل ہوئی ہوں
میرے چت چور کو کوئی بُلا دے — سُنا دے، پھر کوئی بنسی سُنا دے
مری آنکھوں میں وہ رنگیں ادا ہے — مرے کانوں میں بنسی کی صدا ہے
کسی کا مدھ بھری گوری میں دم ہے — مرا اُس بانس کی پوری میں دم ہے
اسی غمّاز نے مارا ہے مجھ کو — اسی آواز نے مارا ہے مجھ کو

مرونگی جان دونگی سر دھُنونگی — سنونگی پھر وہی بنسی سُنونگی

وہی بنسی رسیلی ہے سُریلی — وہی بنسی رنگیلی ہے چھبیلی
وہی بنسی بھرا ہے سوز جس میں — نئی آواز ہے ہر روز جس میں
وہی بنسی جو بے جاں بولتی ہے — مگر رازِ حقیقت کھولتی ہے

پھر انقلاب آیا بگڑی سپاہ دہلی
پھر خاک میں ملایا کالوں نے جاہ دہلی

مغلوں کی سلطنت کا نام و نشان نہ رکھا
بابر کا نام لیوا باقی یہاں نہ رکھا

تھے سب مشیر شاہی دربار میں چھچھورے
گاتے رہے ملاریں سنتے رہے کٹورے

مارے گئے ہزاروں دمباز مفت خورے
ستھراؤ کر رہے تھے ہتیار بند گورے

شاہ سخن کے اکثر مضمون قید کر کے
بھیجا ظفر کو آخر رنگون قید کر کے

شہزادیوں پہ ٹوٹا کیسا غضب خدا نے
پھرتی تھیں تنکے چنتی جنگل میں بے ٹھکانے

تھے خاک کے بچھونے ڈیرے نہ شامیانے
تکیے کے بدلے پتھر رکھنے لگیں سرہانے

پھولوں میں تل رہی تھیں نازوں میں پل رہی تھیں
وہ بے نقاب ہو کر گھر سے نکل رہی تھیں

ملکہ ہوئی یہاں کی وکٹوریہ پیاری
فرمان کر دیا تھا امن و امان کا جاری

بازار میں لنڈن کی نکلی بڑی سواری
دربار قیصری کی بڑھ کر تھی شانداری

ہندوستاں کے راجا خیل و خدم سے آئے
اقبال جاہ و حشمت جس کے قدم سے آئے

پھر اڈورڈ ہفتم نے کی صلح پسندی
رشیا سے رشتہ جوڑا جرمن سے بھائی بندی

خوش انتظامیوں کے صدقے تھی عقلمندی
دہلی کا کاروشن شاہانہ سربلندی

پیل دماں پہ نکلے کرزن سوار ہو کر
چلنے لگی سواری باد بہار ہو کر *

اب آپ جارج پنجم دربار کر رہے ہیں
فیض قدم سے بن کو گلزار کر رہے ہیں

امن و اماں کا سب سے اقرار کر رہے ہیں
تعریف روزمرہ اخبار کر رہے ہیں

یہ جشن ہو مبارک یہ جشن ہو مبارک
ہندوستان، دہلی، انگلینڈ کو مبارک

چہرہ ہی نور افشاں کیا شان قاہری ہے
اقبال و دبدبہ سے عالم کو تھرتھری ہے

قبضہ میں بحر و بر ہیں مشہور سروری ہے
نوشیرواں سے بڑھ کر انصاف گستری ہے

زیر و زبر ہیں یکساں ایسی ہے حکمرانی
پیتے ہیں شیر بکری اب ایک گھاٹ پانی

ریلوں کی ہے ترقی جاری ہے ڈاکخانہ
زوروں پہ ہے تجارت صنعت کا ہے زمانہ

شوکت کنیز تیری، رتبہ غلام تیرا	مشہور ہو رہا تھا دنیا میں نام تیرا
انصاف پروری سے دِلّی پری ہوئی تھی	اِس شہر میں اٹاٹٹ دولت بھری ہوئی تھی
ہاں تجھکو جامع مسجد رضواں پہ برتری ہے	عالم فریب منظر انداز دلبری ہے
جب تک ہے حوض جاری ہے نام میں تری ہے	نیکی کی جڑ ہری ہے نیکی کی جڑ ہری ہے
جنّت میں کیوں نمازی جائیں نماز پڑھنے	دِلّی میں جب فرشتے آئیں نماز پڑھنے
حامیٔ دین احمد اورنگ زیب نامی	ارکانِ سلطنت کی لیتا رہا سلامی
لیکن رہا ہے کس کا جاہ و حشم دوامی	مغلوں کے دبدبہ میں آنے لگی تھی خامی
ایسے سحر سے بیٹھے جلسوں میں شام کردی	اِن عیشی جیوڑوں نے ترکی تمام کردی
ایسے ہوئے محمد شاہ زمان رنگیلے	نقال-بھانڈ کتھک مجرا کریں سجیلے
دربار میں طوائف آتے تھے بے وسیلے	شیشہ کی یہ صدا تھی جام شراب پی لے
رندوں کا لال قلعہ میخانہ بن رہا تھا	خود بادشاہِ دہلی مستانہ بن رہا تھا
نادر کی فوج آئی نشہ حرام کرنے	پابند عیش جاتے کیوں روک تھام کرنے
مسجد میں آکے بیٹھا جب قتل عام کرنے	پہنچا وزیر اعظم جھک کر سلام کرنے
نادر ہوا روانہ پھینکے ہم اٹھا کے لاشے	مستِ شراب عشرت کرنے لگے تماشے
چوپٹ تھے شاہ عالم اندھیر چھا رہا تھا	ظالم غلام قادر آنکھیں دکھا رہا تھا
ہر شخص اپنا اپنا نقشہ جما رہا تھا	ہلکر اُچھل اُچھل کر فتنے اُٹھا رہا تھا
دہلی نے ہائے کیا کیا آشوب دہر جھیلے	آئے کبھی مرہٹے چھائے کبھی رہیلے
ساعت سعید آئی پھر وقت نیک آیا	دِلّی کو فتح کرنے انگریز ایک آیا
سب نے نجات پائی جب لارڈ لیک آیا	بارے ہوا بڑا دن کھانے میں کیک آیا
سکّہ جمایا اپنا اب ایسٹ انڈیا نے	ہرّے تھے شور و غل تھے بجتے تھے شادیانے
بس ایک لاکھ پنشن پاتا تھا شاہِ دہلی	پر نام تھا ابھی تک عالم پناہ دہلی

آہیں نکل رہی تھیں بے اختیار کیسی　　بچوں کے واسطے تھی ماں بیقرار کیسی

ایسا نہ دن دکھائے دشمن کو بھی الٰہی!　　دہلی کو مدتوں تک جیسی رہی تباہی

وہ خاندانِ لودھی بابر کا چڑھ کے آنا　　میدانِ پانی پت میں توپوں کا دندنانا
دیتا تھا جان کیسا آزادیوں پہ رانا　　آتا ہے یاد مجھکو اُس وقت کا زمانا

تھی باپ کی محبت بیٹے پہ جان دیدی　　مفتوحہ سلطنت کی اُسکو عنان دیدی

کی ہی شہِ ہمایوں نے سلطنت ادھوری　　زوروں پہ چڑھ رہا تھا جب شیر شاہ سوری
گردش میں تھا نصیبا ہندوستاں سے دوری　　ایرانیوں نے کردی آخر مراد پوری

بیرم کی جاں نثاری ابتک زبان زد ہی　　وہ نیک نام زندہ دنیا میں تا ابد ہے

کیا تربتِ ہمایوں پہ مقبرہ بنا ہے　　صفدر کا مدرسا ہے درگاہِ اولیا ہے
طوطیٔ ہند نامی خسرو یہیں ہُوا ہے　　تیرا جہان آرا سبزہ ہرا بھرا ہے

غالب کی ہے یہیں پر اُجڑی ہوئی نشانی　　اُردو لحد کے اُوپر کرتی ہی نوحہ خوانی

درگاہِ قطب صاحب سنگِ مزار دیکھے　　سہروں میں پھُول دیکھے پھولوں میں خار دیکھے
شاہوں کے جشن کیا کیا پروردگار دیکھے　　آخر کو زیرِ تربت سب تاجدار دیکھے

سُکھ نیند سو رہے ہیں قبروں میں شاہزادے　　بادِ سحر جگادے بادِ سحر جگادے

انسان کو جان پیاری جاں کو بدن پیارا　　بلبل کو گُل مبارک گل کو چمن پیارا
عاشق کو کوئے جاناں شیریں کو بن پیارا　　شاہِ جہاں کو دہلی ہمکو وطن پیارا

رکھیں گے یاد اسکو جیتے رہینگے جب تک　　جامِ شرابِ عشرت پیتے رہینگے جب تک

دہلی کے لال قلعہ فردوس کے نمونے　　اقبال دوڑتا تھا قدموں کو تیرے چھونے
دربارِ شہ جہانی دیکھا ہے خوب تو نے　　پائی تھی کامیابی کس کس کی آرزو نے

کس تختِ پُر مرصع طاؤس جلوہ گر تھے　　فرمانروائے دولت بیٹھے ہوئے کدھر تھے

دیوانِ خاص تیرا دیوانِ عام تیرا　　آئین کے موافق ہر انتظام تیرا

کوروں کے دل میں جاکر ارجن گرج رہا تھا	بانکوں کا بانکپن بھی جن سے نہ بچ رہا تھا
اُنکے محل تھے کیا کیا جمنا ترے کنارے	اندر پرست دہلی کہتے تھے تجھکو سارے
بھیشم کے دَور دورے کوروں کی حکمرانی	ایسے ہوئے پریچھت کلجگ نے ہار مانی
پھر جنمے جے نے اپنی کی تیس مار خانی	اب نام اُنکا سُن لو کھنڈرات کی زبانی
حسرت سے کہہ رہے ہیں دالان ٹوٹے پھوٹے	ہمپر بھی نقش کاری ہمپر تھے بیل بوٹے
تجھکو پُرانے قلعہ آباد رکھنے والا	دُنیا کے حادثوں سے آزاد رکھنے والا
تعمیر میں نرالی ایجاد رکھنے والا	وہ کون نامور تھا بنیاد رکھنے والا
کیا تجھ میں خوبیاں تھیں کیا شانداریاں تھیں	کس شاہِ ذی حشم کی مہمانداریاں تھیں
دہلی میں راجپوتی لہرا رہا نشاں تھا	اقبال اوج پر تھا ہمدرد آسماں تھا
کروٹ جو ایک بدلی غوری کا آستاں تھا	دُھننا تھا سر پتھورا مندر مرا یہاں تھا
چونسٹھ تھے اُس میں کھنبے کھمبوں میں مورتیں تھیں	اِن مورتوں میں کیا کیا عالم کی صورتیں تھیں
مینار قطب صاحب کب سے کھڑا ہوا ہے	کچھ بول چال مُنہ سے کیا تو لڑا ہوا ہے
کیوں سربلندیوں سے اتنا بڑا ہوا ہے	تیری بنا میں کس کا پتھر گڑا ہوا ہے
التمش کی مسجد تُو ہی نشاں بتادے	کرتی تھی حکمرانی رضیہ کہاں بتادے
چتوڑ کی لڑائی دولت پہ جان دینا	وہ قوم کی حمیت عزت پہ جان دینا
خلجی کا شوخ چنچل صورت پہ جان دینا	جانباز پدمنی کا عصمت پہ جان دینا
ہیں زندہ داستانیں ہستی رہیگی جبتک	جمنا کنارے دہلی بستی رہیگی جبتک
تغلق نے تخت چھینا قلعہ نیا بنایا	فیروز شہ نے اپنا پھر کوٹلہ بسایا
سنگین لاٹ گاڑی سُکھ سے رہی رعایا	یک لخت پھر کیسا نازل ہوا خدایا
تاتاریوں کو لیکر تیمور لنگ آئے	دلّی کے رہنے والے جانوں سے تنگ آئے
لاکھوں کے خوں بہائے کی لوٹ مار کیسی	تیغ دودم ہوئی تھی سینے کے پار کیسی

کیا غضب ہے ای اجل دنیا میں کوئی ذی حیات / تیرے دستِ ظلم سے زندہ نہ رہنے پائے ہائے
چشم بد دور اپنے حق میں جو ترے آگے کہے / دین و دولت اسکو ہی نظر کھا جائے ہائے
کیسے کیسے خاندانوں کو کیا تو نے تباہ / کیسے کیسے گھر بنے تو نے اجاڑے ہائے ہائے
نامیوں کے کھوج تک باقی نہ رکھے نام کو / صفحۂ ہستی سے وہ نام و نشاں مٹوائے ہائے
بے گنہ نادان جواں سب پر پھری تیغ جفا / یہ ستم یہ ظلم تیرا کس سے دیکھا جائے ہائے
تھا جو گلدستہ میں ای بادِ فنا چوٹی کا پھول / کیا غضب ہے کیا ستم ہے وہ ہی گل مرجھائے ہائے
جسکے لکھتے تھے قصیدے شاعرانِ ذی شعور / اُن سے نوحے مرثیے اب اسکے تو لکھوائے ہائے
سب جسے آنکھوں میں رکھیں آہ وہ ہر دلعزیز / کارواں سے مثلِ یوسف یوں بچھڑ کر جائے ہائے
شادیانے جسکے بجتے اُسکی یہ نوبت ہے آج / پیچھے میت آگے ماتم اُسکا ہوتا جائے ہائے
بین کے نغموں کے بدلے بین کا ہی شور و غل / دھوم سے اُس کا جنازہ یوں اجل اٹھوائے ہائے
جھاڑتے تھے روز و شب جو اُسکے پاپوش کی گرد / اُسکی میت پر اُنھیں سے مٹی اب ڈلوائے ہائے
فرشِ دیبا کی بھی جسکو سلوٹیں تھیں ناگوار / اُس تنِ نازک کو تو یوں خاک میں ملوائے ہائے
ہاتھ جو بہر سلام اُٹھتے تھے جس کے روبرو / آج اُسی کی فاتحہ کو ہاتھ وہ اٹھوائے ہائے
چھا گئی ہے کیا غم و اندوہ کی دل پر گھٹا / ہے سیہ پوش اُسکے ماتم میں یہ کعبہ ہائے ہائے
قیصری دربار میں جو شوق سے آنے کو تھا / ای اجل اُسکو ہی تو ملکِ عدم پہنچائے ہائے
حشر تک ماتم رہے گا اس غمِ جانکاہ کا / شاہ آصف جاہ جیسا شخص یوں مرجائے ہائے

سرگذشت دہلی

اُجڑا ہوا نہیں ہے ہرگز دیارِ دہلی / پوچھے ہمارے دل سے کوئی بہارِ دہلی
ہیں زندہ یادگاریں نقش و نگارِ دہلی / کچھ نام کر گیا ہے ہر تاجدارِ دہلی
تاریخ و فن اِس میں ہیں ہندوستان کی ہے / یونان و مصر و فارس سارے جہان کی ہے
بھارت میں جبکہ ڈنکا پانڈوں کا بج رہا تھا / وہ بھیم وہ یدھشتر وہ کرشن سج رہا تھا

جو مرتوں کا ذرا بھی تمھیں خیال نہیں	ہمیں بھی جائیے اب حسرت وصال نہیں
گلی میں ماہ رخوں کی نجاؤ حضرتِ دل	جتائے دیتے ہیں اچھی یہ دیکھ بھال نہیں

خلیق

خلیق ۔ منشی عبدالخالق دہلوی کسی پنجابی سوداگر کی دوکان پر ملازم ہیں۔ استعداد علمی بہت معمولی ہے مگر شاعری کا شوق حد اعتدال سے متجاوز ہے۔ جو کچھ آمدنی ہوتی ہے اُس کا کثیر حصّہ اِس فن کے شوق کی نذر کر دیتے ہیں سائل صاحب اور منشی چندربھان کیفی انکے اُستاد ہیں۔ اور شعرا سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ قابلِ قدر رسالوں میں کئی نظمیں انکے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ اِن نظموں میں تاریخی مضامین ایسی جامعیت اور قابلیت سے سلسلہ وار لکھے گئے ہیں، جن سے اِنکے مصنف کی علمی استعداد، اور واقفیت عامہ کے متعلق اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے اور مشقِ سخن بھی پختگی اور سنجیدگی کا پہلو لیئے ہوئے ہے۔ واقعات کا تسلسل بہت خوبی سے دکھایا ہے اور روانی قابلِ تعریف ہے ❊

ڈر تو یہ ہے جو بدل لے وہ ستمگر آنکھیں	اُلٹی چھریاں کہیں ہو جائیں نہ پھر کر آنکھیں
یہ تماشا ہے نیا صُلح بھی ہے جنگ بھی ہے	دِل ملے پر بھی لڑا کرتی ہیں اکثر آنکھیں
کہتے ہیں مجھپہ مرتی ہے دنیا تو کیا عجب	ایسا کوئی جہاں میں طرحدار بھی تو ہو
کہتا ہے مجھ سے داورِ محشر کے رُوبرو	دِل سے نکال دعویٰ باطل کی آرزو
ریاکاری میں ساری عمر کر دی رائگاں اپنی	جہاں میں جسنے جنت کی تمنا میں عبادت کی
میں جسکو دیکھا دل ہو گیا اُس کا بس اَے زاہد	نکر تعریف میرے سامنے حورانِ جنت کی
اے قیس تجکو دشت نوردی سے کیا حصول	لیلیٰ کے دل میں شکل نکال اپنی راہ کی
پامال یوں نہ کیجئے وقتِ خرامِ ناز	فریاد کچھ تو سُنئے دلِ دادخواہ کی
اُمید و یاس میں دل کا عجب دستور رہتا ہے	کبھی مسرور رہتا ہے کہیں رنجور رہتا ہے
ریاکاری خدا کے گھر میں بھی اے حضرت زاہد	زباں پر نام حق دِل میں خیال حور رہتا ہے

نوحۂ وفات نظام

دیکھیں ہم اور پھولوں کو کیا محوِ چشم ہیں	نرگس کا پھول تہِ نظر باغ بھر میں ہے
انصاف کر کہ ہم کسے چاہیں ترے سوا	تو ہی بتا کہ نازپری کس بشر میں ہے

خلیق

خلیق - جناب محمد نصر اللہ خاں صاحب باشندہ حسن پور تلمیذ جناب میر لکھنوی ان کا کچھ حال باوجود تلاش میسر نہ ہوا ناچار اندراجِ کلام پر اکتفا کیا گیا ۔

آئی نظر کسی کی جو ترچھی نظر مجھے	دل کی خبر رہی نہ جگر کی خبر مجھے
ممکن نہیں کہ چھوڑ دے دردِ جگر مجھے	رہنے دے اب خدا پہ ہی اے چارہ گر مجھے
اے رفتگانِ راہِ عدم پھر بھی آئیو	کچھ پوچھنی ہے تم سے عدم کی خبر مجھے
نہ ہوتے ہم جو رسوائے زمانہ	یہ شہرت آپ کی ہوتی کہاں سے

خلیق

خلیق - عالیجناب راجہ دیبی داس صاحب سوم تعلقدار پائگاہ حیدر آباد کے امرائے عظام میں سے ہیں منشی حفیظ سے تلمذ ہے - دو شعر نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں ۔

یوں تو اک روز تجھے آنا ہی اے موت ضرور	گر شب ہجر میں آجاتی تو احسان ہوتا
بڑھ گئی مرہم کافور سے سوزش دونی	کاش زخموں پہ مرے وہ نمک افشاں ہوتا

خلیق

خلیق - جناب منشی محمد خلیق صاحب ساکن بٹاوہ ضلع خاندیس - آجکل کے شاعروں میں ان کا شمار ہے رسالوں میں غزلیں شایع کراتے رہتے ہیں ان میں سے چند شعر انتخاب ہوئے - کوئی خاص بات قابلِ ذکر انکے کلام میں نہیں ہے ۔

آج کوئی آنے والا ہے ضرور	یہ پتا بے تابیٔ دل سے ملا
قاصد نے اسکی نوک پلک کا کہا جو ذکر	نشتر سا ہائے میرے جگر میں چبھو گیا
لایا نہ کچھ جواب ہمارے سوال کا	قاصد ہمارا جا کے ادھر ہی کا ہو گیا
اے بیکسی بہائے ہیں کس نے یہ چار شک	آ کر مرے مزار پہ یہ کون رو گیا
رسوا ہوا ذلیل ہوا تیرے عشق میں	جو کچھ مرے نصیب میں ہونا تھا ہو گیا
کہے گا کون مسیحا تجھے زمانے میں	مریضِ عشق کا جب کچھ تجھے خیال نہیں

ہر چند چاہا کہ کلام دستیاب ہو مگر انکے عزیزوں کی لاپرواہی سے مجبور ہو کر پرانے تذکروں سے کچھ اشعار انتخاب کر کے درج کیے گئے ؎

غفلت میں فرق اپنی تجھ بن کبھو نہ آیا
ہم آپ میں نہ آئے جب تک کہ تو نہ آیا

اشک جو چشمِ خوں فشاں سے گرا
تھا ستارہ کہ آسماں سے گرا

مُجرائی طبع کُند ہے لطفِ بیاں گیا
دنداں گئے کہ جوہرِ تیغ زباں گیا

گذری بہارِ عمر خلیق اب کہیں گے سب
باغِ جہاں سے بلبلِ ہندوستاں گیا

کہا میں سنے جو اے گُل کچھ وفا کر
تو وہیں ہنس پڑا وہ کھِل کھِلا کر

ہے حسن ترا مہرِ درخشاں کے برابر
دنداں در ولب لعلِ درخشاں کے برابر

کیا چاہیئے عاشق کے تجھے قتل کو خنجر
ابرو ہیں ترے خنجرِ براں کے برابر

جس گھڑی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم
جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم

کِسکے خرام ناز کا پامال ہوں خلیق
لگتی ہے چوٹ دلکو مرے ہر قدم کیساتھ

مُرغانِ قفس کرتے ہیں سب نغمہ سرائی
کیا فصلِ بہاری کی چمن سے خبر آئی

گلشن میں یہ کس شخص کا ہے ڈھیر کہ بُلبل
منقار میں لیجا کے کئی پھول دھر آئی

مُدت سے بہم رہتے تھے جس گھر میں ہم اور یار
اب دیکھ کے وہ خالی مکاں آنکھ بھر آئی

کیا پوچھتے ہو حال اسیرانِ قفس کا
گلشن سے جو بیخود ہو نسیم سحر آئی

ایسا تو جہاں میں کوئی ہو وے گا نہ رُسوا
آفت جو خلیق جگر افگار پر آئی

دل میں تھا آتے ہی اُسکے جا ملیں لگ آغوش سے
جب وہ آیا سامنے تب رہ گئے خاموش سے

خلیق - جناب منشی ارشاد حسین صاحب خلف حاجی محمد امداد حسین صاحب صفیر مرحوم رئیس فرخ آباد ۱۲۸۵ھ کے قریب زندہ و سلامت موجود تھے بعد کا حال معلوم نہیں یہ کلام کا نمونہ ہے

خلیق

سمجھے تھے جسکو دوست وہ دشمن نظر میں ہے
اُمیدِ خیر کیا ہو کہ شر ہر بشر میں ہے

تاثیر جس کا نام ہے وہ اے شبِ فراق
آہِ سحر میں ہے نہ دعائے سحر میں ہے

جُدائی مجھ سے باباجان کی دیکھی نجائیگی
نظر باباکی صورت جسگھڑی مجکو آئیگی
مری جانِ حزیں ہرگز نہ یہ صدمہ اُٹھائیگی
اکیلی گھر میں یہ دُکھیا پڑی آنسو بہائیگی

تیقّن ہی نہ صُورت اچھّی ہونے کی کوئی ہو گی
نہ باباگھر میں آوینگے نہ میری زندگی ہو گی۔

یہ خط کس کا ہی آج آیا مُطالعہ جسکو فرماکے
پھوپی زینب کو چپکے سے کہی کیابات بلواکے
ہوئی تشویش اور آنسو بہے چہرے پہ باباکے
گئیں حجرے میں کیوں باباکے امّاجان گھبراکے

یہ ہی کیا مشورہ ہونا بتادے ہوش جاتے ہیں
سکینہ گود میں بیٹھی ہے اور مجھ سے چھپاتے ہیں

خلیق

خلیق۔ شاعرِ شیریں زبان میر مستحسن خلیق دہلوی خلفِ ارشد میر غلام حسن حسن مرحوم برادر خورد میر احسن خلق نے لکھنو اور فیض آباد میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشقِ سخن کا شوق دامنگیر ہوا حسن خلق کی رعایت سے خلیق تخلص اختیار کیا اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ انھیں ایام میں میرزا تقی ترقی نے چاہا کہ فیض آباد میں شعر و سخن کا چرچا ہو۔ مشاعرہ قائم ہوا اور خواجہ حیدر علی آتش کو لکھنؤ سے بُلوایا پہلے ہی جلسہ میں جو میر خلیق نے غزل پڑھی اُس کا مطلع یہ تھا۔

مثلِ آئینہ ہی اُس رشکِ قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہی اُدھر کا پہلو

آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہی تو میری کیا ضرورت ہی چند روز کے بعد میر حسن اُنکے والد نے قضا کی۔ عیال کا بوجھ اُنکے سر آپڑا اور شعر شاعری کے خیالات پست ہو گئے بڑے پُر گو تھے۔ غزلیں بیچا کرتے تھے اِس پر بھی دیوان مکمّل کر لیا تھا۔ مگر اُسے رواج نہیں دیا۔ تمام عمر مرثیہ گوئی میں بسر کی میر ضمیر اور میرزا فصیح مرثیہ گو انکے ہمعصر تھے۔ میر خلیق کے ادائے کلام اور پڑھنے کی خوبی دیکھنے اور سننے کے قابل تھی۔ خوبیِ محاورہ اور لُطفِ زبان جو انکے مرثیوں میں پایا جاتا ہے وہ انکے ہمعصروں کے کلام میں مفقود ہے۔ لکھنؤ میں انکی اور انکے تمام گھرانے کی زبان محاورے کے لحاظ سے مستند سمجھی جاتی تھی۔

یہ چشمِ مست کی اُلفت نے کردیا بیخود
کہ خود بخود نظر آتے ہیں بادہ خوار سے ہم

عاشق کی زندگی ہے سہارے کی زندگی
اُمید چاہئے دلِ اُمیدوار میں

کیا بات ہے تری نگہ ناز واہ واہ
عاشق کا کام کر ہی دیا ایک وار میں

ڈھونڈے کوئی بے مثل اگر حسنِ بشر میں
وہ کھُبتے ہیں آنکھوں میں وہ چھُبتے ہیں نظر میں

اُس مہرِ منوّر کی قیامت ہے تجلی
بجلی کی طرح کوندتی پھرتی ہے نظر میں

تھیں پرواکسی کی کیا کہ تم ایسے ہو خوش قسمت
وہی ملتا ہے جو مانگو وہی ہوتا ہے جو چاہو

بے خبر ہے حُسن کے انداز سے
آنکھ ہے اُس کی نشیلی ناز سے

قیامت ہی ترے کوچہ میں تیری دلربائی سے
مچا ہے شورِ محشر کٹنے والوں کی دہائی سے

رُخِ روشن ہے آئینہ قدِ موزوں سہی بالا
زمانہ محوِ حیرت ہے کسی کی خودنمائی سے

سُرخ ڈوروں میں نگاہِ یار ہے
خون میں لتھڑی ہوئی تلوار ہے

اور کس کا میرے دل پر وار ہے
آپ ہیں یا آپ کی تلوار ہے

نگہ ناز ہے تلوار ادا قاتل ہے
اب بھی مشکل نہ ہو آساں تو بڑی مشکل ہے

خلیق۔ مرزا ظہور علی ولد مرزا ہوشدار جو مشہور مرثیہ خوان اور ماہرِ فنِ موسیقی تھے اُردو شعر بھی کہتے تھے محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں حسب طلب نواب نوازش محمد خان شہاب جنگ مرشدآباد کو گئے تھے اور وہ زمانہ اُنکے آغاز جوانی کا تھا۔ سنہ ۱۱۹۹ ہجری میں صوبہ بنگال میں کسی عہدہ پر مامور تھے مرثیہ اچھا کہتے تھے فیلن صاحب نے اُنکا پورا ایک مرثیہ اپنے تذکرے میں درج کیا ہے اور اصنافِ سخن میں سے کچھ نہیں لکھا۔ لہذا اُس مرثیہ کے چند بندوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ خلیق

ہوا صغرا پہ جب ظاہر کہ بابا کا سفر ٹھہرا
مجھی کو چھوڑنا گھر میں اُنھیں مدنظر ٹھہرا

یہ سب ہے درمیاں اب کوچ کنبے کا سحر ٹھہرا
دم اُس بیمار کا غم سے لبوں پر آنکر ٹھہرا

لگیں کہنے الٰہی آج میرا دم نکل جائے
جو بابا کے جدا ہونیکا دل سے غم نکلجاوے

عجب عالم ہیں بے ہوشی کے وہ مجھکو نظر آیا
کہ اتنا بھی نہ آیا ہوش جو پوچھوں کدھر آیا

بیقراری ہیں کٹی رات تو یاں اپنے تئیں
چین سے زلف ہیں دل کیونکہ رہا ہوویگا

دل لگاتے تو لگا یا پہ نہ تھا کچھ معلوم
جی پہ کیا گذریگی اور جان پہ کیا ہوویگا

خلق

خلق منشی محمد مستجاب خان نام اصل وطن انکا قاسم گنج ضلع فرخ آباد ہے عرصہ سے بصیغۂ ملازمت سرکار نظام حیدر آباد دکن با قاعدہ فوج ہیں ملازم ہیں پہلے اضلاع دکن ہیں متعین تھے اب چند سال سے خاص بلدے ہیں مامور ہیں قریب ۴۵ سال کے عمر ہے خلیق اور نیک آدمی ہیں۔ فن سخن ہیں حضرتِ داغ دہلوی مرحوم کے شاگرد ہیں اکثر اپنے اُستاد مرحوم کی خدمت ہیں حاضر رہے شعر خاصا کہتے ہیں۔ اپنے استاد کے رنگ کی اچھی طرح تقلید کرتے ہیں مشاق اعلیٰ درجے کی ہے زبان کی صفائی سلاست اور ستھرا پن انکے کلام ہیں پایا جاتا ہے۔ یہ اِنکے کلام کا انتخاب ہے۔

اُسکی نظروں سے وہ بچنا بلبلِ ناشاد کا
آڑ ہیں سے تاکنا چھپ چھپ کے وہ صیاد کا

صبر بھی اور صبر مجھسے عاشقِ ناشاد کا
ظلم بھی اور ظلم پھر تجھ سے ستم ایجاد کا

عیش زیبا ہے تمھیں غم زیب دیتا ہے ہمسے
وہ تمھارا ہے تو یہ حصہ دلِ ناشاد کا

عاشقی کا لطف جب ہے دل بھی ہوں عاشق کے دو
ایک طالب وصل کا ہو ایک ہو بیداد کا

لو رہا وہ امتحاں ہیں سخت جاں ثابت قدم
لو وہ آخر ہو گیا دم خنجرِ فولاد کا

خلق کا اب پاؤں قابو ہیں نہ دل کہنے ہیں ہے
ہاتھ لینا میرے مولا وقت ہے امداد کا

کاکل ہیں ہے گیسو ہیں ہے مٹھی ہیں تری ہے
مژگاں تری سفاک نگاہیں تری خونریز
اِقرار ہیں اِک گھات تو اِنکار ہیں اک بات
جاتے ہیں مسافر جو شب و روز عدم کو
خزاں رہی تو تڑپتے تھے بیقرار سے ہم
وہ دل گیا وہ اُڑے ہوش وہ گئے اوسان

دُنیا ہیں مرے دل کا ٹھکانا ہی نہیں لو
پھر اُسپہ نمک پاش یہ حسن نمکیں اور
دیتی ہے مزا آپ کی ہاں اور نہیں اور
بستی کوئی بستی تو نہ ہو زیرِ زمین اور
بہار آئی تو شوریدہ ہیں بہار سے ہم
سنبھالنا کہ چلے اپنے اختیار سے ہم

وہ میرے قتل پر تیار خوش کرنیکو دشمن کے
لگے یہ غم کہ اُنکے ہاتھ سے اپکی قضا کیوں ہے

خلش ۔ فردوس علی خلش عزیز و شاگرد عبد الحکیم بسمل مندرجہ ذیل اشعار ایام نابالغی کے ہیں ایام غدر میں زندہ تھے

اُس سے مل جل کے دِلا دیکھ تو کیا کیا نہ ہوا
ہم کو کیا تیرے ہی کچھ حق میں یہ اچھا نہ ہوا

کچھ اثر نفانہ آہ سے مقصود
یہ بھی اک طبع آزمائی تھی

ضعف سے لب پہ تھم گئے نالے
ورنہ آفت فلک پہ آئی تھی

کیا مزے سے خلش گذرتی تھی
جبکہ اُس بُت سے آشنائی تھی

خلش

خَلِش ۔ منشی نصیر الدین کاتب خلش باشندہ میرٹھ۔ شاگرد منشی احمد حسن شوکت چند شعر انکی طبعزاد درج کئے جاتے ہیں

نصیحت کا اثر واعظ تری مجھ رند پر کیا ہو
جو دختِ رز پہ مرتا ہو وہ کیا حوروں پہ شیدا ہو

لبِ زخمِ جگر بوسہ اگر لیں تیغ بُرّاں کا
ہمارے خوں بہانے کا اُنہیں خاصا بہانا ہے

گلوئے تشنہ کا ماں شہادت کام آجائے
اگر خونِ تمنّا کا لبِ خنجر کو چسکا ہو

خلش

خَلِش ۔ منشی محمد حسام الدین سب انسپکٹر پولیس حسن گنج واناؤ ارمغان ۹۴ سے یہ کلام منتخب ہوا۔ احسان شاہجہاں پوری کے تلامذہ میں ہیں۔

جسنے دیکھا گر پڑا مثلِ کلیم
جلوۂ رُخ اُن کا برقِ طور تھا

منہ کی کھائی حشر کے دن شیخ نے
زہد و طاعت پر بہت مغرور تھا

دل وہ اچھا جس میں تیرا غم رہے
دم وہ اچھا جس کا تو ہمدم رہے

وصل کی شب میں حیا آنے نپائے
شوخ چشمی کا وہی عالم رہے

اے خلش دل میں کھٹکنے کے لئے
یادِ مژگاں بن کے خارِ غم رہے

خلق

خلق ۔ میر حسن علی خلق خلف الرشید میر حسن صاحب بدرِ منیر مقیم فیض آباد لکھنو اپنے والدِ مرحوم کے شاگرد صاحبِ دیوان تھے۔ ترتیب تذکرۂ شوق کے زمانے میں وجیہ و خوبرو جوان تھے خاندانی رسم کے بموجب مرثیہ کہتے تھے۔ میر خلیق انکے حقیقی بھائی تھے ۱۸۰۳ء کے بعد سو برس کی عمر میں وفات پائی ٭

مجکو کسی نے بھیجے تھے کل یاسمن کے پھول
پھولوں میں آپ آئے ہیں میرے بہن کے پھول
دلمیں کھٹک رہی ہو خلش دوستوں کی یاد
کیا گھٹاؤں سے دھواں دھار ہیں ساون بھادوں
قتل کرتے مجھے بے یار ہیں ساون بھادوں
مینہ برستا ہے ترستے ہیں وہ گھر جانے کو
ابر دوڑا ہوا جاتا ہے سوئے میخانہ
ابرِ نیساں ہے خلش دستِ گہر بارِ خلیل
ہم بزم میں صرف انکی نظر دیکھ رہے ہیں
اب بزم میں انکو بھی نہیں دیکھتا کوئی
بیٹھے ہیں مرے پاس مگر دل میں خلش ہے
قصور اس میں تمہارا کچھ نہیں ہے بے خطا تم ہو
مجھے اب کچھ نہیں معلوم میں کیا اور کیا تم ہو
برا ہوتا ہے ہر اک بات کا حد سے گذر جانا
کھڑے تھے میکدے میں منہ چھپائے حضرتِ زاہد
وہ رشکِ غیر پر بولے طبیعت اپنی اپنی ہے
برابر کی محبت میں یہی تو حال ہوتا ہے
شبِ وعدہ پڑیگی بات پھر آخر کشاکش میں
تعلق اٹھ گیا جس روز سے دونوں کے مرنے میں
وعدہ کر جاؤ مرے دل کے بہلنے کے لیئے
تعلق ہی نہیں باقی تو پھر میری شکایت کیوں

تلووں سے اسنے مل دیئے مارے جلن کے پھول
مرجھائے بھی نہیں ہیں ابھی تو کفن کے پھول
کانٹے بنے ہوئے ہیں سفر میں وطن کے پھول
روزِ روشن میں شبِ تار ہیں ساون بھادوں
کوئی چلتی ہوئی تلوار ہیں ساون بھادوں
اب تو کچھ میرے طرفدار ہیں ساون بھادوں
کھل گیا صاف کہ میخوار ہیں ساون بھادوں
بخشش و فیض میں سرکار ہیں ساون بھادوں
کچھ اس سے نہیں بحث کدھر دیکھ رہے ہیں
آپس میں سب اک اک کی نظر دیکھ رہے ہیں
گھبرائے ہوئے جانبِ در دیکھ رہے ہیں
نہ یوں محوِ وفا میں ہوں نہ سرگرمِ جفا تم ہو
تمہارا مدعا میں ہوں کہ میرا مدعا تم ہو
نہ اتنا باوفا میں ہوں نہ اتنے بے وفا تم ہو
بڑی مشکل سے پہچانا تمھیں مردِ خدا تم ہو
کسی پر مبتلا ہم ہیں۔ کسی پر مبتلا تم ہو
کبھی تم سے خفا ہم ہیں کبھی ہم سے خفا تم ہو
ہم اپنی وضع کے پابند پابندِ حیا تم ہو
نہ تم سے ہمنوا ہم ہیں نہ ہم سے ہمنوا تم ہو
سیکڑوں حیلے ہیں ہر وقت پہ ٹلنے کے لیئے
تمہیں مطلب نہیں مجھ سے تو پھر میرا گلہ کیوں ہے

دَور موقوف نہ ہو گا ستمِ ایجادوں کا
حشر تک روز زمانے میں قیامت ہوگی
یار اُٹھ جائے گا پہلو سے جو گھبرا کے خطیر
حشر میرے لئے صبحِ شبِ فرقت ہوگی

خلش

خلش منشی جگیشر پرشاد خلفِ منشی کاشی ناتھ متوطن سیرامپور ندرہ ضلع گیا آپ کو مولنا عبدالرؤف عشرت لکھنوی سے تلمذ ہے۔ بابو ٹھاکر پرشاد وکیل کے ہاں بالفعل محرر ہیں کچھ کلام بھیجا تھا اُس میں سے یہ چند شعر منتخب ہوئے۔ ابتدائی شوق ہے۔

کاٹ لے سر خلش کا اے قاتل
آج ہو جائے فیصلہ دل کا
شبِ وصل دلبر خفا ہو گیا
الٰہی یہ کیا ماجرا ہو گیا

ہائے اسپر بھی تجھے رحم نہ آیا افسوس
مل گئے خاک میں ہم نقشِ کفِ پا ہو کر
رقصِ بسمل کی تڑپ اُنکو خلش دکھلاؤ
آج بیٹھے ہیں وہ مشتاقِ تماشا ہو کر
آہ میں ہو اثر تو پھر کیا ہے
آئیں وہ میرے گھر تو پھر کیا ہے

خلش

خلش۔ مولنا خواجہ سیّد کرامت علی صاحب خلش۔ آپ سید خواجہ نظام الدین علی صاحب گورنمنٹ پلیڈر کے حقیقی بھتیجے اور اولاد حضرت خواجہ اجمیر سے ہیں تیرہ برس کی عمر سے شوق شاعری ہوا۔ ابتدا میں حضرت ابوالحسن صاحب ساکت رامپوری سے غزل میں مشورہ کیا کرتے تھے دو سال بعد صلاح لینی ترک کردی۔ پھر چند غزلیں نواب عبداللہ خاں مطلب کی تحریک سے نواب فصیح الملک مرزا داغ کو دکھائیں کثرتی بدن تھا اور ورزش کا بھی شوق تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں حکیم مومن خان مومن دہلوی کا مقلد ہوں اور اُنہیں کو اپنا اُستاد مانتا ہوں۔ نواب محمد ابراہیم علی خاں صاحب بہادر والئی ٹونک نے آپکے ذہن رسا کی تعریف سُنکر آپ کو زمرۂ اُستادان سخن میں داخل کرلیا ٹونک اور اجمیر میں زیادہ تر قیام رہتا تھا۔ معاملہ بندی۔ روزمرہ۔ شستگی زبان نشست الفاظ آپ کا حصّہ تھا۔ شوخ مزاجی طبیعت میں خلقی تھی۔ الغرض مشق سخن قابل تعریف تھی ۴۰۔ ۴۶ سال کی عمر میں ۱۳۱۸ھ میں انتقال کیا۔ بیس پچیس شاگرد بھی تھے دیوان تیار تھا۔ مگر شائع نہیں ہوا کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

سالک نے دہلی کے مشاعرہ میں پڑھی تو انھوں نے اُسپر مصرعے لگائے تھے جو بہت چست اور انکی خوش مذاقی کا کامل ثبوت ہیں۔

یا وہ گو غیر ہیں اپنا تو یہ دستور نہیں
پر ابھی مرگ کا خواہاں دلِ رنجور نہیں
جان دینے میں ہمیں عذر کچھ اے حور نہیں
ترکِ کیفیتِ دنیا ہمیں منظور نہیں
ورنہ اک دم میں پہنچتے ہیں عدم دور نہیں

خط لکھا تھا پئے تسکین دلِ خانہ خراب
اب نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہی نہ آنکھوں میں ہی خواب
اور بھی کر دیا کمبخت کو میں نے بیتاب
کیا کہوں حالتِ بیتابیٔ اُمیدِ جواب
کوئے جاناں میں چلا جاؤں یہ مقدور نہیں

خطا

خطا۔ جناب شفقت حسین صاحب ۱۸۹۹ء میں چھلونی سیبری میں موجود تھے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا

وصل میں بھی نہیں ہوتے ہیں مری یہ حاصل
ایسا پتھر کا جگر لاؤں کہاں سے یارب
لذتیں دردِ جدائی کی جو پاتا ہوں میں
عیش میں شاد نہو درد میں ناشاد نہو

کسی کا فرادا کا جب سے اسنے تیر کھایا ہی
میں تم کو مفت دیڈالوں جو آمادہ ہو لینے پر
دلِ بسمل نے پہلو میں مرے محشر اُٹھایا ہی
یہاں تک اس دلِ آفت طلب نے اب ستایا ہی

خطیر

خطیر۔ مولوی سید امداد علی ولد میر امیر علی فرخ آبادی ۱۳۰۲ھ میں ۲۵ برس کی عمر تھی اوائل سن تمیز سے شعر کہتے ہیں طب میں بھی دخل ہی۔ فن شعر میں امداد حسین خاں صفیر سے فیض پایا ہی۔ یہ انکا کلام ہے۔

لحد کو غیر کوئے یار میں کب دیکھ سکتے ہیں
مری تربت کے پتھر اُنکی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں

تلاشِ کوچۂ دلبر میں پائے شوق تھکتے ہیں
پتہ ملتا نہیں دیر و حرم میں ہم بھٹکتے ہیں

یہ ظاہر موم ہیں پوچھو نہ اِن کی سختیٔ باطن
یہ آہن دل ہیں جنکے رنگ کُندن سے دمکتے ہیں

آج غصہ میں وہ زنداں کی طرف آتا ہے
بیڑیاں پاؤں میں بولیں تو قیامت ہوگی

اپنے دامن سے مرے منہ کو چھپا لے قاتل
دیکھ کر دیدۂ مذبوح کو حسرت ہوگی

میرے اخلاط میں ہی زلفِ سیہ کا سودا
جب پری زاد نظر آئیں گے وحشت ہوگی

میکشوں کے مزار پر رکھنا	ہوں جو بھیگے ہوئے شراب کے پھول
ظلم ہم پر ذرا سمجھ کے کرو	اے بتو بندۂ خدا ہیں ہم

خضر - شیخ محمد یوسف ٹھاکر جان صاحب نواب کلب حسین خاں نادر کے تذکرہ سے کلام نقل ہوا اغلب کہ یہ خضر اور انکے بعد جن کا ذکر ہے ایک ہی صاحب ہوں۔

وعدۂ وصل کے دن ہجر میں ٹھیرائے بہت	ایسے کلمے تو حضور آپنے فرمائے بہت
بولے جھنجلا کے میں پاؤں پہ گرا جب انکے	ایسے تو کاسۂ سر ہمنے ہیں ٹھکرائے بہت
شہر سے موسم گل میں جو میں وحشی نکلا	ساتھ کوسوں مرے یاران وطن آئے بہت
فاتحہ پڑھکے مری قبر پہ غیروں سے کہا	یاد آئیگا یہ جاں باز ہمیں ہائے بہت

خضر - بابو شیخ محمد یوسف مرحوم خلف شیخ کریم بخش مولوی - مقیم سہارنپور کے شاگرد اور فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے اور کسی قدر انگریزی کی بھی مہارت تھی - سہارنپور میں ایک انگریزی کارخانہ گنّے پیلنے کا تھا اُس میں عرصۂ دراز تک کلرک رہے - مرنجاں مرنجان - شریفانہ مزاج پایا تھا - پہلے یوسف تخلص کرتے تھے آخر میں خضر اختیار کیا سنہ ۱۹۰۰ء میں کتب دینیہ کی کماحقہٗ مطالعہ اور مناظرہ کے بعد آبائی مذہب سنت جماعت کو ترک کر کے شیعہ ہو گئے اور آخر عمر تک اس کا اعلان کرتے رہے سنہ ۱۹۰۸ء میں بعمر ۴۳ سال انتقال کیا - کچھ اشعار سہارنپور سے ایک عنایت فرما نے بھیجے وہ درج کیے جاتے ہیں۔

جو مکر و فن فلک سے ہُوا تھا فرو گذاشت	وہ زاہدوں کے گنبد دستار نے کیا
جوانی میں جو رہبر تھے ہمارے ولولے ہر دم	وہ پیری میں ہمیں اب دور سے رستہ بتاتے ہیں
غلاف کعبہ پکڑے خضر کوئی رات کہتا تھا	دہائی ہے خداوندا یہ بت ناحق ستاتے ہیں
کس طرح خوئے وفا تجھسے ستمگر چھوٹے	غیر ممکن ہے کہ تلوار سے جوہر چھوٹے
جب تلک دم ہی مرے دم میں یہ ممکن ہی نہیں	شیشہ پہلو سے مرے ہاتھ سے ساغر چھوٹے

خطا دہلوی - ان کا حال صرف اتنا معلوم ہے کہ سنہ ۱۸۸۰ء کے قریب جب یہ غزل مرزا قربان علی بیگ

بسی بسی کر کے نام بتایا تا میں بیٹھا ایک	اُلٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سن لے میرے لال	عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

ناخن کی پہیلی

بیسیوں کا سر کاٹ لیا	نہ مارا نہ خون کیا

خضر

خضر۔ صاحب عالم مرزا خضر سلطان خضر فرزند ارجمند حضرت بہادر شاہ بادشاہ دہلی کا تخلص ہے فنِ شعر میں نواب اسد اللہ خان غالب المعروف بہ میرزا نوشہ کے شاگرد تھے۔ اِنکا کلام آشوب غدر میں تلف ہو گیا۔ غدر میں انکی عمر چھبیس سال کی تھی لفٹنٹ ہاڈسن نے جو انہیں مقبرۂ ہمایوں سے شہر لا رہا تھا رستہ میں اُنکا رتھ ٹھیرا کر متصل موجودہ جیلخانے کے بضرب گولی انکا کام تمام کر دیا مرزا ابوبکر انکے بھتیجے اور مرزا مغل بھائی نے بھی موت میں انکا ساتھ دیا۔ مرزا خضر سلطان صاحبِ اولاد تھے لڑکا مرزا عثمان اختر کئی برس ہوئے انتقال کر گیا۔ لڑکی میرزا مجاہد الدین شاہی خلفِ مرزا مغل سے منسوب تھیں۔ شعر اچھا کہتے تھے اور تلاش مضامین والفاظ بھی بُری نہیں تھی نشستِ الفاظ بھی درست ہے البتہ کہیں کہیں پُرانی زبان برت جاتے ہیں

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر	غیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں تھوڑا
لہو میں میرے رنگیں ہوں اگر دیکھوں تو نہ دیکھوں	اُنھوں کے ہاتھ پر رنگِ حنا دیکھا تو کیا دیکھا
نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی نہ سن سکتے ہیں کچھ میری	ہمیں اس وقت میں اے بیوفا دیکھا تو کیا دیکھا
جام جمشید کو آئینہ سکندر کو ملا	خضر ہیں وہ ہوں کہ حصہ میں مرے دل آیا
چھٹوں کس طرح پھندے سے بتوں کے	مجھے کچھ بن نہیں آتی خدایا
کہتے ہو کہ اک روز تجھے قتل کرینگے	پر یہ بھی تو اے شوخ ستمگر نہیں ہوتا
کہتے ہو وہ بھی ہوس پیشہ ہی جیسا تو ہے	مجھ سے اِک چھیڑ ہوئی شکوہ عدو کا ہوا
گالی سے کون خوش ہو مگر حُسنِ اتفاق	جو تیری خُو تھی وہ ہی میرا مدعا ہوا
تری خاکِ کفِ پا سے نہ بدلوں	کوئی دے گر مجھے اکسیر آکر

کاتب کے بعد اصرار سے دو ہفتہ کی محنت میں وسط الحیوٰۃ اور غرۃ الکمال دیوان دوم و سوم مدون ہوئے اور دیباچوں سے آراستہ کئے گئے - اس بیان میں امیر خسروؒ فرماتے ہیں کہ مثنوی قران السعدین بھی شامل کردی گئی تھی - گویا مثنوی مذکورہ ۳۶ برس کی عمر میں امیر خسروؒ نے تالیف فرمائی تھی معمے کی تصنیف میں جو جو ایجادیں اور اختراعیں کی ہیں اُن کا بھی بالتفصیل ذکر دیباچہ میں کردیا خود فخریہ لکھتے ہیں کہ میرے زمانہ سے پیشتر فارسی میں تین دیوان کسی نے ہندوستان میں نہیں لکھے کچھ عربی اشعار بھی اُس میں شامل کئے ہیں -

امیر خسروؒ صاحب تصانیف کثیر تھے وہ سب فارسی زبان میں ہیں اور مستند سمجھی جاتی ہیں مثل خمسہ امیر خسروؒ بجواب خمسۂ نظامی و قران السعدین - ہاں اردو ہندی سے متعلق جو اشعار انکے مشہور ہیں اور جا بجا دیکھے گئے وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں - زبان کے ابتدائی زمانہ میں الفاظ کی کمی کے سبب ادائے مطلب میں جو دقت واقع ہوتی ہی اُسکو سب جانتے ہیں - مجبوراً دوسری زبانوں کے الفاظ بکثرت لانے پڑتے ہیں - چنانچہ یہی کیفیت حضرت امیر خسروؒ کے اُس کلام میں موجود ہے جو اُردو کہا جاتا ہی -

ایک غزل میں جو زیادہ مشہور ہی اُنھیں تو یہ التزام کیا ہی کہ ایک مصرع فارسی زبان میں ہی اور دُوسرا اُردو میں - اس صنعت کو غالباً اہل فارس صنعتِ ملمع کہتے ہیں - نمونہ کلام ملاحظہ ہو -

ز حالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں	کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ	سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکین	کسے پڑی ہی جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں زمہر آں مہ بگشتم آخر	نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو	سپیت من کے درائے رکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے	دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے
بانس کا مندر واہ کا باشا - باشے کا وہ کھاجا	سنگ ملے تو سر پر رکھیں واہ کو راؤ راجا

شخص قابل ذکر ہیں۔ برادر حقیقی تاج الدین زاہد۔ برادر علاؤالدین علیشاہ۔ مولٰنا شہاب الدین قاضی سراج الدین یہ شرف قبول کم مصنفین کو نصیب ہوا ہی کہ اُنکی تصانیف خواص و عوام میں مقبول ہوں۔ مگر یہ وصف حضرت امیر خسروؒ کا حصہ ہی اگر انکی بعضی تصانیف مقتدر علما کی حرز جان ہیں تو بعضی ایسی بھی ہیں جو بچہ بچہ کی ورد زبان ہیں۔ اسکی نظیر تحفۃ العراقین اور خالق باری۔ جو تبحر اور جامعیت خدا نے آپ کو عطا کئے تھے وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوا کرتے۔ خمخانۂ جاوید میں حضرت امیر خسروؒ کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں کسی معافی نامہ یا تمہیدی مقدمہ کی ضرورت نہیں۔ پہلا دیوان اردو یا ریختہ میں چاہے کسی کا ترتیب دیا گیا ہو لیکن اسمیں کسیکو شک نہیں ہوسکتا کہ پہلا شعر اردو کا پہلی تصنیف اردو کی امیر خسروؒ کی عالی دماغی کا مولود ہی۔ اُنہوں نے آیندہ اُردو کے عنصر انتخاب کیئے۔ مسالہ جمع کیا۔ ارکان مہیا کیئے اور ایک ڈھانچا بنا کے دکھا دیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر پہیلیوں اور بیتوں (دوہوں) کی زبان ایسی صاف اُردو ہی کہ متقدمین ریختہ کی زبان سے صاف ملتی ہی۔ المختصر امیر خسروؒ اگرچہ سب سے اوّل صاحب دیوان اردو کے نہیں مگر اوّل اُردو شعر کے موزوں کرنے والے ہیں۔ اور اُردو شعر کے موجد ہونے کی حیثیت سے ہم انھیں خمخانۂ جاوید کا پیر مغاں تسلیم کرتے ہیں۔

کوئی شخص تحقیق اور صحت سے اُن کی تصانیف کی فہرست یا تعداد نہیں بتا سکتا مشہور ہی کہ شاہانِ مغلیہ کے کتب خانہ میں ایک لاکھ اشعار سے زائد اُنکے موجود تھے مگر اُسپر بھی گاہ گاہ نیا کلام شائقین تلاش کر کے لے آتے تھے۔ حضرت کا قول تھا کہ ہندوستانی اسقدر طباع ہیں کہ معمولی کوشش سے ہر ملک کی زبان۔ محاورہ اور نظم و نثر کہنے میں استعداد کامل پیدا کر سکتے ہیں اور برخلاف اسکے ایران عرب توران کے ہزار ہا آدمی ہندوستان آئے کسیکو ہندوستانی زبان بولنی یا لکھنی نصیب نہ ہوئی۔

امیر خسروؒ کو باوجود انتہائے کمال اور کثرت مشق اپنے کلام کو جمع اور مرتب کرنے کا بالکل خیال نہ تھا چنانچہ دیوان عالم صغر سنی یعنے ۱۹ سال کی عمر تک کا کلام جسکا نام تحفۃ الصغر ہی اُن کے بھائی تاج الدین نے مرتب کیا اور بڑے اصرار سے اُسپر دیباچہ لکھوا کر مکمل کیا اسی طرح علاؤالدین علیشاہ

کامل ستر برس عہدہ عرض بیگی سلطنت پر مامور رہے۔ اُنکی وفات کے بعد خان اعظم قتلوخاں کی سرکار میں جو سلطان بلبن کا بھتیجا تھا ملازمت اختیار کی کئی قصیدے اُسکی مدح میں موجود ہیں خود فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد سامانہ جاکر شاہزادہ بغراخان صوبہ سامانہ پسر سلطان بلبن کا مصاحب ہوا اور وہ مجھ پر از حد مہربان ہوگیا۔ شبانہ روز اپنے ہمراہ رکھتا تھا۔ ۶۷۸ھ میں طغرل بیگ صوبہ بنگالہ نے بغاوت کی اور سلطان بلبن خود اُسکے زیر کرنے کو شاہزادہ بغراخاں کو ساتھ لیکر روانہ ہوا۔ اور انجام کار وہاں کی حکومت بغراخاں کو دیکر دہلی واپس آگیا اُسوقت سلطان کی عمر ۸۵ برس کی تھی۔ میں کامل ایک سال کے سفر اور اعزا کی مفارقت سے بیدل اور شکستہ خاطر ہوگیا تھا۔ ملازمت ترک کرکے شاہی لشکر کے ساتھ دہلی واپس آگیا۔ واپسی پر سلطان محمد ولیعہد نے جو میری سخنوری کی شہرت سُنکر کچھ مشتاق ہوگیا تھا۔ مجھے ملتان طلب کرلیا۔ مگر چند ہی ماہ میں مُغلوں سے مقابلہ میں سلطان محمد مارا گیا۔ اور سلطان شہید کے نام سے ملقب ہوا۔ میں بھی بدشواری قید سے رہائی پاکر دہلی آیا اور مومن پور عرف پٹیالے میں گنگا کنارے چند ماہ والدہ کی خدمت میں حاضر رہا۔ اس عرصہ میں ۶۸۵ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے انتقال کیا اور بغراخاں کا لڑکا کیقباد تخت سلطنت پر بیٹھا کیونکہ بغراخاں نے بنگال سے معاودت منظور نہ کی۔ دربار میں ملک نظام الدین کا دور دورہ تھا۔ میری بھی طلبی ہوئی۔ مگر میں نے حاتم خاں کی ملازمت ترک کرنی مناسب نہ سمجھی۔

حاتم خاں کے ہاں چند ہی دن گذرے تھے کہ ملک نظام الدین نے قضا کی اور میں دربار شاہی میں بادشاہ کی مصاحبت کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوا۔ کیقباد کی اقبالمندیکا پیمانہ جلد ہی لبریز ہوگیا اور مفلوج ہوکر مرگیا۔ شائستہ خاں جو اُسکے لڑکے شمس الدین کا وزیر تھا بالآخر خود مستقل بادشاہ ہوگیا اور فیروز شاہ کے لقب سے ۶۸۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ بڑا ذی علم اور امیر خسرؒو کا بڑا قدردان تھا بڑی بات یہ تھی کہ شاعرانہ باریکیوں اور نزاکتوں کو خود بھی خوب سمجھتا تھا۔ اسکے زمانہ میں امیر خسرؒو مالامال ہوگئے۔ اُنکے بے تکلف دوستوں میں چار

حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے برگزیدہ مرید و خلیفہ تھے بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ ان کی مریدی ہی سے ان کے پیر کی شہرت اسقدر پھیلی۔ ان کو اپنے پیر و مرشد کے ساتھ جتنی محبت و خلوص تھا اُسکے متعدد افسانہ مشہور ہیں گویا فنا فی الشیخ تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے انتقال کا اِن کو سخت صدمہ ہوا اور اس رنج و غم کی حالت میں ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء کو انتقال فرمایا۔ اور اپنے پیر و مرشد کی قبر کے قریب دفن ہوئے۔

یاوری بخت سے سلطان نظام الدین اولیاؒ کا قیام انکے نانا کے مکان پر تھا۔ اِس طرح بچپن میں شرف ملازمت و استفادہ حاصل کیا۔ اُنھوں نے ہدایت کی تھی کہ "بہ طرز صفاہانیاں بگو" خود فارسی کتب پڑھائیں۔ اِس فیضان سے کلام خسرو میں سوز گداز کی شان پیدا کردی اور اس کا اثر یہ ہے کہ چھ سو صدیاں گذر جانے پر بھی کلام زندہ اور ابتک دلوں میں اپنا اثر جمائے ہوئے ہے۔ خود اپنے دیوان تحفۃ الاصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲ برس کی عمر میں شعر و رباعی کہنا شروع کیا۔ علما اور عمائد مجھے دیکھکر استعجاب کرتے تھے میں رات دن مطالعہ اور فکر شعر میں غرق رہتا تھا۔ انوری و سنائی اور خاقانی کے کلام سے مجھے بہت دلچسپی رہی اور ہر اُستاد کے رنگ میں کہنے کی مشق کرتا رہا۔ اسی لیئے میرے مجموعہ میں تمام اساتذہ کی تقلید اور پیروی کے نمونے جابجا موجود ہیں۔ خواجہ عزیز الدین کلاتی جو عالم متبحر اور بڑے پایہ کے سخنور تھے اُن ایام میں دہلی میں نظر بند تھے کسب کمال کا ذوق اُنکی خدمت میں لے گیا انھوں نے کلام سنکر کلمات تحسین و آفرین سے دل بڑھایا اور اکثر نکات و اشارات سخنوری دِل نشین کیئے اور مشکل اشعار کو جنکے مطالب کی باریکی کو ذہن نہ پہنچتا تھا حل کر کے بتایا۔ فطری مناسبت۔ کثرت مطالعہ۔ ولولۂ شوق شفقت بزرگان نے رفتہ رفتہ درجۂ کمال کو پہنچا دیا۔ خوش قسمتی سے شاہزادہ محمد سُلطان ولیعہد سُلطان غیاث الدین بلبن جیسا مربّی مل گیا اور اس وسیلہ سے دربار شاہی میں بار حاصل ہوا۔

اُنکے نانا کی سرکار میں دو سو ترکی اور دو سو ہندی غلاموں کے علاوہ دس ہزار سوار ملازم تھے یادگار عمر پائی امیر خسروؒ کی بہن ۲ برس کی عمر تھی کہ اُنھوں نے ۱۱۳ برس کی سن میں انتقال کیا۔

قوۃ ایجاد عطا کی تھی کہ تمام اصنافِ نظم و نثر میں صدہا مضامین تازہ کے گُل کھلا گئے۔ نظم فارسی میں اس درجہ کمال تھا کہ شیریں کلامی اور قبولیت عام کیوجہ سے آپ کا لقب "طوطیِ ہند" مشہور ہے۔ فن موسیقی میں مہارتِ تام رکھتے تھے اسی طرح جب ہندی کی طرف التفات کی باگ کو پھیر اسینکڑوں راہیں اسمیں نکال لے گئے خدا کی قدرت پر نظر کرنے والے کہاں ہیں دیکھیں! وہ لڑکا جو اُردوئے شاہی کی بدولت ہندوستان کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا اور اس بھیڑ بھاڑ سلطنتوں کے بناؤ بگاڑ میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ خدا کے سہارے سے قوت پکڑ کر ایسا ہوا کہ امیر خسروؒ کو مل گیا اور اُنھوں نے اپنی پیرانہ سالی کا سہارا سمجھکر اپنی گود میں لیا اور گویا چھاتی سے لگا کر رکھا۔ ہندی اور عرب و عجم و ترک کے میل جول سے جو زبان اُردوئے شاہی میں پیدا ہو گئی تھی اسوقت سب لوگ اپنے اپنے کام اُس سے بیتے تھے مگر کوئی پہچانتا نہ تھا۔ امیر خسروؒ نے اُسکو روشناس کرنے کا ذمہ لیا اور یہی پہلے شخص ہیں جو اسکو زبان جان کر کام میں لائے۔ اور فارسی۔ ہندی بھاشا وغیرہ کے ساتھ اس نئی زبان کو پیوند کیا۔ خالق باری اور اُسکے سوا سینکڑوں پہلیاں۔ کہہ مکرنیاں۔ دوسخنے۔ غزلیں غرض کہ بہت کچھ اس رنگ میں کہا جو آجتک لوگوں کی زبانوں پر ہے۔ اسکو یہاں بالتفصیل بیان کرنا ضرور نہیں یہ مختصر عبارت اسلئے لکھدی گئی کہ اجنبی واقف ہو جائیں۔ یعنی اس اُردو زبان میں جس شخص کو سب سے پہلے کسی مستقل تصنیف اور فکر کا موقع ملا اور شہرت بھی حاصل ہوئی وہ حضرت امیر خسروؒ ہیں +

امیر خسروؒ کی ولادت تیرہویں صدی عیسوی کے درمیان مومن آباد (ضلع ایٹہ) میں ہوئی ان کے اسلاف چنگیز خاں کے وقت میں ماوراء النہر سے ہندوستان میں آ کر رہے۔ انکے والد سیف شمسی ایک بڑے جرّی دلدار سپاہی تھے امیر خسروؒ کی سات برس کی عمر ہوئی تھی کہ وہ کسی معرکے میں کام آئے۔ عماد الملک اِن کے نانا نے جو شاہی مشیر تھے اِنکی پرورش اور تربیت کی +

شاعروں میں ہیں کلکتہ میں عرصہ تک مطب کرکے اب رامپور اپنے وطن چلے آئے ہیں اور ٹھیکہ داری کرتے ہیں۔ فقیر منش اور بہت خلیق اور مہذب شخص ہیں چند غزلیں نظر سے گذریں اُنکا انتخاب درج ذیل ہے۔

اُنکے انکار سے کیا کام تھا تجکو خستہ
اپنا مطلب کسی پہلو سے نکالا ہوتا

جنازہ اُٹھنے دو عاشق کا پھر سنور لینا
ابھی تو رات ہی پچھلے پہر سنور لینا

وفورِ ضعف سے بیمارِ غم کو مشکل ہے
جگر سے ہاتھ اُٹھاکر جگر پہ دھر لینا

دل آپ گرفتار ہو گیسوئے دوتا میں
کمبخت مجھے کیوں لئے جاتا ہے بلا میں

جو مرگیا اُلفت میں ہوا نام اُسیکا
اُبھرا وُہی جو ڈوب گیا بحرِ فنا میں

آرزو میری کوئی کیا نخلِ ماتم کی تھی شاخ
جو کلی کمبخت میں آئی وہ مرجھائی ہوئی

حسرتیں جو دل میں میرے رہ گئیں تھیں وقتِ ذبح
منہ چھپائے حشر میں پھرتی ہیں شرمائی ہوئی

کس بلاکش کی ہوائے خستہ یہ رحلت کی گھڑی
شامِ غم پھرتی ہے گھر گھر آج گھبرائی ہوئی

خستہ۔ منشی جیالال خستہ دہلوی۔ دفتر میونسپل کمیٹی میں ملازم ہیں۔ ۴۰ برس سے زیادہ عمر ہے شعر گوئی کا شوق اور یہ کلام کا نمونہ ہے۔ مذاق ستھرا اور پاکیزہ ہے۔ خستہ

جوشِ مستی سے جھکی جاتی ہیں آنکھیں اُن کی
خود اُنھیں محو کئے دیتا ہے جوبن اُن کا

دل کوئی مانگا ہوا ہے عاشقِ ناشاد کا
آپ کیوں باقی رکھیں ارماں کوئی بیداد کا

نہ وہاں تجھسے پری پیکر نہ میں حوروں کا شیدائی
نہ جنت میرے قابل ہے نہ میں جنت کے قابل ہوں

الٰہی کس طرح گذرے گی مجھسے ہیچکارے کی
نہ ماہر ہوں کسی فن میں نہ عالم ہوں نہ فاضل ہوں

جلتے پائے کوئی ہشیار نہ میخانہ سے
ہوگیا عہد صراحی کا یہ پیمانے سے

خسرو۔ خسروِ اقلیمِ معانی بادشاہِ جہانِ شیریں زبانی خواجہ ابوالحسنؒ عرف امیر خسروؒ۔ کون ہے جو اس خسروِ معانی سے آگاہ نہیں۔ کیا علمائے کرام کیا صوفیانِ عظام کیا خاص و عوام کس کو حضرت امیر خسروؒ سے واقفیت نہیں۔ اگرچہ عام طور سے شعرائے فارس کے اعلیٰ طبقہ میں انکا شمار ہوتا ہے مگر اردو زبان کے تاریخ دان جانتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو کو خدا نے وہ خسرو

طویل کتاب اپنے آقائے نامدار کی فرمایش سے لکھی تھی جو چھپ بھی گئی ہے حضرت ظہیر۔ انور۔ نواب رونق۔ تسلیم وغیرہ کے جلسوں میں شریک رہتے تھے۔ بہزار وقت وتلاش یہ چند اشعار ملے۔

محشر میں دیکھئے لب معجز نما کے کام	مٹتا ہے بات بات پہ دفتر گناہ کا
بے جرمیوں پہ قتل مرا پر ضرور تھا	کیا کم ہے یہ قصور کہ میں بےقصور تھا
واں تھی حیا سے مانع گفتار خامشی	سمجھے سب اہل بزم کہ اُسکو غرور تھا
غیر سے اُلفت نہیں ضد ہی سہی	تمکو وعدے بھی نہیں ہیں یاد کیا
یہ ناامیدئ مطلب کہ یاس مرنے سے	یہ بےکسی کہ دم مرگ انتظار رہا
وفا نہیں تو نہیں مورد جفا ہی سہی	ہزار شکر کہ میں داخل شمار رہا

خستہ۔ جناب حیدر علیخان صاحب بہادر فضل اسسٹنٹ کمشنر ملک برہما۔ حالات باوجود تلاش دستیاب نہو سکے صرف ایک غزل ہاتھ آئی اُسکے چند شعر درج ذیل ہیں۔

تجھ کو غیروں سے جو اُلفت ہو گئی	لے ہمیں بھی تجھ سے نفرت ہو گئی
چین سے گذری شب وصل صنم	صبح ہوتے ہی قیامت ہو گئی
گھر سے نکلا ہے بُت محشر خرام	شہر میں برپا قیامت ہو گئی
زلف سُلجھانا بھی اُن کو بار ہے	اس قدر نازک طبیعت ہو گئی
کیا سبب ہے اے بُت ظالم تجھے	نام سے خستہ کے نفرت ہو گئی

خستہ۔ جناب منشی معشوق اللہ خاں صاحب تلمیذ حضرت داغ۔ باوجود کوشش حالات دستیاب نہوئے۔ چند رسالوں سے کلام منتخب ہو کر نقل ہوا۔

دل لیا ناز وادا نے تیغ نے جان وجگر	خون جو کچھ تھا بدن میں اُسکو پیکاں لیچلا
ہے کدھر جذب محبت کیا ہوا تیرا اثر	دیکھ پہلو سے مرے دل کو وہ پیکاں لیچلا
ساقی نگاہ لطف ہو پھر میگسار پر	لینا خبر کہ نشۂ مے ہے اُتار پر

خستہ۔ حکیم غلام حضرت خاں صاحب رامپوری شاگرد امیر مینائی۔ آجکل کے

چہرہ اُس بُت نے جو ناگاہ لب بام کیا	روز خورشید درخشاں کا وہیں شام کیا
جسکو پروا ہی نہیں کوئی مرے یا جیوے	دل دیا ہائے میں اُس شوخ کو کیا کام کیا
جور و جفا مت کرو دل کو نہ آزار دو	چاہ کے پیاسوں کو تک شربت دیدار دو
ہائے رے نامنصفی خلوت و جلوت کے بیچ	سب کو بلاؤ صنم اِک ہمیں دھتکار دو

خستہ

خستہ عبداللہ خاں عرف میاں جیون۔ اصل وطن کشمیر تھا مگر یہ خود دہلی میں پیدا ہوئے اُنکے والد نواب مجدّ الدولہ عبداللہ خاں بہرام جنگ کے رفقا میں تھے جو شاہ عالم ثانی کے وزیر تھے اور اپنے والد کے بعد یہ بھی اُس منصب پر ممتاز رہے متواضع اور خوش مزاج شخص تھے۔ فنِ سخن میں حکیم ثناءاللہ خاں فراق کے شاگرد تھے۔ یہ اُن کے اشعار ہیں +

جو کوئی لاوے پیام اُس کے آج آنے کا	میاں میں صدقے ہوں اُسکے زباں ہلانے کا
دستِ قاتل پہ مرے خوں کی جو تھی رنگینی	ایسی رنگت کا کبھی رنگ حنا نے نہ دیا
سایہ ساں پہنچے تو تھے پاؤں تلک گر پڑ کر	اُسنے دامن کو بھی پر ہاتھ لگانے نہ دیا
جب خاکِ غریباں پہ تم اس حال سے آؤ	انصاف کرو کیونکہ نہ برباد ہو کوئی
یہانتک تو ہوئے محو تمہارے کہ جہاں میں	لو ہم سے قسم ہمکو اگر یاد ہو کوئی

خستہ

خستہ حکیم محمد سلیم خاں مرحوم خلفِ حکیم محمد عظیم خاں دہلوی از خاندان حکیم محمد شریف خاں (حکیم محمود خاں صاحب) منصب دار ریاست جیپور۔ ان کا وطن اصلی دہلی تھا۔ مگر بعد غدر جیپور میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی تھی مہاراجہ رام سنگھ والی جیپور کے دربار میں ذی رسوخ اور صاحب اثر تھے آخر عمر میں کونسل عالیہ کے سر رشتہ دار بھی ہو گئے تھے۔ علم طب میں ایسا دخل تھا کہ دُور دُور جواب نہ رکھتے تھے انکے مطب اور حذاقت کی آجتک شہرت چلی آتی ہے علاوہ ازیں شاعری میں بھی دستگاہ معقول تھی پندرہ برس ہوئے ۵۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ بڑے خلیق زندہ دل وسیع مشرب بزرگ تھے۔ شعر بہت خوب کہتے تھے۔ گو مشق کم تھی۔ مذاق سخن صاف شستہ اور رنگ میں پختگی پائی جاتی ہے طبیعت معانی خیز پائی تھی علم طب میں ایک

مدتوں ہمنے ترے در پہ جبیں سائی کی
یُوں مٹایا خطِ تقدیر کا لکھا کس نے

رات دن آنکھوں میں تصویر پھرا کرتی ہی
تم کو ہمنے نہیں دیکھا ہی تو دیکھا کس نے

وائے قسمت نہ دمِ نزع بھی صورت دیکھی
اُسنے منہ پھیر لیا غیر جو حالت دیکھی

عشق گیسو میں بلا کے غم رہے
اپنے جینے سے بھی برہم ہم رہے

دل پر نگاہ ڈالکے اُسنے لگادی آگ
شعلہ چراغِ طور کا برقِ نظر میں ہے

دن رات خرد کوچۂ جاناں کی کرو سیر
مطلب نہیں کیا حور سے کیا باغِ ارم سے

جب سے ہوائے عشقِ عدو لگ گئی تمہیں
مُرجھا گئے ہیں پھول سے رخسار اور بھی

خرم خرّم۔ پنڈت گلاب رائے مجو تخلص بہ خرّم دہلی وطن تھا۔ یہ صاحبزادے پنڈت کنھیالال شگفتہ عرف مجو مبارک تخلص ڈپٹی کلکٹر تھے اب پنشن پاتے ہیں اور پوتے اِنکے پنڈت سورج نراین منصف ہیں

دل جلا کیا کوئی آتا ہے یہاں
خرّم آتی ہے مجھے بوئے کباب

غبارِ خط نہیں خرّم ہے گرد اُس روئے تاباں کے
مدوّر ہے۔ بنی کیا خوب میری آہ کی صورت

یاد آتی ہے مجھے خرّم جو وہ زلفِ سیاہ
سانپ پھرتا ہے مری چھاتی پہ لہراتے ہوئے

خرم خرّم۔ منشی سیتل پرشاد خرم حیدرآبادی۔ شاید منصبدار ہیں ظریف اور خوش طبع آدمی ہیں ۶۰ و ۷۰ برس کے درمیان عمر ہے۔ حیدرآباد کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے ہیں *

ملیں گے خاک میں ہم خاکسار ہیں ای چرخ
کریگا کیا بھلا دشمن ہمارا تُو ہو کر

ہُوئی ہے مجھے کہ کُن سے نمودِ ہستی کی
فنا بھی ہوگی یونہیں ایک روز ہُو ہو کر

خدا کو روزِ قیامت میں مُنہ دکھانا ہے
رواں جہاں سے ہو خرّم تو سرخرو ہو کر

خستہ خستہ۔ قطب بخش نام۔ سید محمد کرمانی کی اولاد اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مجاور تھے خوش خلق و مہذب نیک اور باوضع بزرگ تھے۔ کبھی کبھی شعرگوئی کی طرف بھی توجہ کرتے تھے اور اس فن میں بھورے خان آشفتہ سے مشورہ کرتے تھے۔ یہ اُنکے اشعار ہیں۔ ۱۸۴۸ء سے پہلے انتقال کیا * ۵

میں بھی اللہ سے روز ایک نیا دل مانگوں
آئے دن آپ جو تازہ ستم ایجاد کریں

خلش درد بھی یارب ہے یہاں روز افزوں
ظلم پر ظلم وہ بیداد پہ بیداد کریں

فرقت میں سوا اسکے تمنا مجھے کیا ہو؟
وہ درد اٹھے دل میں کہ جسکی نہ دوا ہو

خلش کی لذتیں قاتل مرے دل سے کوئی پوچھے
مرا دل توڑ کر ناوک ترا جب دم نکلتا ہے

دل و دین کی خیر ہو خیر وہ آتا ہے بن ٹھن کر
کہ جسکی سادگی میں حسن کا عالم نکلتا ہے

کچھ زیادہ تپش دل ہو یہاں بھی ہر شب
روز افزوں جو یونہی حسن خداداد رہے

بیدار ہوں یا خواب کا عالم ہے الٰہی
حیرت ہے شب وصل کہ وہ میرے گھر آئے

جب میں کہتا ہوں حشر آ لینے دو!
کہتے ہیں وہاں بھی گر خدا نہ سنے

خرد

خرد- خواجہ محمد شفیع الدین انصاری خرد تلمیذ آزاد سہارنپوری دکن میں سکونت ہے اور ڈاکخانہ میں ملازم ہیں۔ داغ صاحب کے ہاں اکثر نشست رہتی تھی ایک مختصر دیوان بھی چھپا ہے۔

اس طرح ہوتے نہ ہم خوار و ذلیل و رسوا
تیرا سودا نہ اگر زلف پریشان ہوتا

رام اس بت کے ہوئے سینکڑوں مشتاق جمال
کھینچکر قشقہ جو وہ شوخ جبین پر نکلا

حسرت و یاس و الم کا ہے جو بالین پہ ہجوم
آج پرسا ترے بیمار قضا لیتے ہیں

انتظار شب ہجراں کا کہوں کیا عالم
آنکھ دروازے سے ہر وقت لگی رہتی ہے

خرد

خرد- منشی ہردیال پرشاد سررشتہ دار محکمہ سکرٹریٹ دربار گوالیار دور موجودہ کے کہنے والے ہیں۔ باوجود بار بار دریافت کوئی حالات بہم نہ پہنچے رسالہ ارمغان شاہجہانپور میں عرصہ تک انکی غزلیں شائع ہوتی رہیں اُس میں سے کچھ اشعار منتخب ہوکر درج تذکرہ کئے گئے۔

آنچل سے چھپاتے ہو عبث روئے منور
اس ابر میں یہ چاند نہاں ہو نہیں سکتا

کبتک ترے سودائے محبت کو چھپاؤں
وہ جوش ہے دل میں کہ بیاں ہو نہیں سکتا

ہم تو نگاہ لطف کے امیدوار تھے
آنکھیں پھرائیں یار نے یہ کیا ستم کیا

اتنا کوئی کہدے اُنسے جاکر
بیمار کو دیکھ لو تم آکر

گریباں چاک دامن پارہ پارہ
بڑی مشکل ہے کس کس میں رفو ہو

حور و قصور جنت و عفو و ثواب و اجر	سب کچھ ہے ایک تیرے کرم کی نگاہ میں
کیونکر چھپے گا نالہ و افغان ہیں دردِ دل	غماز اب کئی مرے رازِ نہاں کے ہیں
مر کر بھی قیدِ غم سے نہ آزاد ہو سکے ہم	اِک مرغِ جان ہے سات قفس آسماں کے ہیں
افکارِ دنیوی سے ہیں اہلِ عدم پرے	یہ سب تعلقات خرد اِس جہاں کے ہیں
نگاہِ زنداں ہر رخنہ افگن ہے رخنہ افگن نگاہِ زنداں	ٹپک رہی ہو شراب غم سے شراب غم سے ٹپک رہی ہے
بس فنا بھی ہو یادِ گیسو ہے یادِ گیسو بس فنا بھی	مہک رہی ہے لحد ہماری لحد ہماری مہک رہی ہے
پسند گوشہ نشینی جو ہم کو زیست میں تھی	رہے مزار میں یوں جیسے اپنے گھر میں رہے
بخیل ایسے گرفتارِ حرصِ دنیا ہیں	کہ دم بھی جسم سے نکلے تو مال و زر میں رہے
غیر ہیں سب نہیں اپنوں میں بھی اپنا کوئی	سمجھے اپنا نہیں اپنوں میں بھی اتنا کوئی
اب وہ نوبت ہے کہ دشمن بھی مجھے کہتے ہیں	ہائے کیا تُو نے یہ احوال بنا رکھا ہے
اُس پری نے دمِ نزع آکے مری بالیں پر	ملک الموت کو دیوانہ بنا رکھا ہے

خرد

خرد۔ صاحبزادہ مرتضیٰ خان خرد رامپوری پہلے آغا غنی سے مشورہ کرتے تھے پھر حضرت جلال سے اصلاح لینے لگے۔ صاحبزادہ محمد علی حسن خاں کے بیٹے ہیں ۱۲۶۶ھ سالِ پیدائش ہے۔ انکا کلام بہت اچھا ہوتا ہے طبیعت میں جدت شوخی مضمون آفرینی سب کچھ ہے اب سنا ہے کہ بسمل تخلص کرلیا ہے۔ بعض بعض شعر بے مثل کہہ جاتے ہیں۔

کلیسا کیا حرم کیا بُت کدہ کیا ؟	تمھیں ڈھونڈا ہے گھر گھر ہمنے کیا کیا
نہیں گر خون پہلو میں ہوا دل	شب فرقت پھر آنکھوں سے بہا کیا
خلشیں ہوتیں مگر کوئی نہ ارماں ہوتا	کاش اس دل کی جگہ سینہ میں پیکاں ہوتا
منہ کو آنچل سے چھپاتے جو تم آکر شبِ وصل	جلوۂ حسن چراغ تہِ داماں ہوتا ؛
اپنا یہ حال۔ انکی توجہ ادھر نہیں	سچ ہے کسی کے دل کی کسیکو خبر نہیں
ایماں کی خیر حضرتِ زاہد منائیے	یہ بُت وہ ہیں کہ جنکو خدا کا بھی ڈر نہیں

خرد

خرد۔ نواب فخرالدین خان خرد دہلوی۔ خلف نواب شرف الدین محمد خان۔ قلعۂ دہلی میں بہادرشاہ کے زمانے میں بخشی گری کے منصب پر ممتاز تھے۔ نواب مصطفی خان شیفتہ کے گہرے دوست تھے۔ انکے کلام کی بھی انھوں نے ہی تدوین کی تھی۔ یہ انکے اشعار ہیں۔

ہماری اُن کی محبت آہ ابر و برق کی سی ہے
ہم اُنکو دیکھکر روتے ہیں اور وہ ہمپہ ہنستے ہیں

لبوں پہ جان ہے جلدی پہونچ کہیں ظالم
یہ آرزو ہے کہ دم تیرے رُوبرُو نکلے

خرد

خرد۔ حکیم مرزا محمد علی حسین خان خرد عرف حکیم انور آغا لکھنوی مقیم حیدرآباد دکن پنشن خوار سرکار تھے ایران بھی گئے تھے۔ انگریزی میں بھی معقول دستگاہ تھی ۱۲۳۸ھ سال پیدائش تھا۔ دکن میں عرصۂ دراز تک رہے اور مشاعروں کے انعقاد سے شعر وسخن کا چرچا جاری رکھا غزلوں کے علاوہ قصیدہ گوئی میں بھی ملکہ تھا۔ دس یا بارہ برس ہوئے حیدرآباد میں انتقال کیا۔ دکن کی علمی صحبتوں میں اکثر شریک رہتے تھے استعداد علمی بہت اچھی اور پایہ کی تھی اور ہزارہا اشعار اساتذہ کے نوک زبان تھے لکھنؤ کے اُساتذہ کی صحبت پائی تھی ❊

قیس لیلیٰ کے سبب عشق میں کامل نکلا
لوگ مجنوں جسے سمجھے تھے وہ عاقل نکلا

سخت جانوں پہ نہ آساں ہوئی مشکل دم نزع
دم بھی مشکل میں جو نکلا تو بمشکل نکلا

خرد اُس طفل نے دل لے لیا ناداں بنکر
ناسمجھ جسکو سمجھتے تھے وہ عاقل نکلا

خوش سلیقہ دلبرانِ وقت ہیں مطلب کے دوست
یہ عدوے جان ہیں دشمن سب کے اور پھر سب کے دوست

کچھ تو سمجھا ہوں جو خود جان کے کھویا ہے دِل
تجھ میں وہ بات ہے جس بات کا جویا ہے دِل

شعر بے عشق کبھی لایق تاثیر نہیں
ساز ہے سوز نہیں۔ شمع ہے تنویر نہیں

جب ہے تو جلوہ نما اے بتِ بے پیر نہیں
بزم میں شمع نہیں۔ شمع میں تنویر نہیں

دستِ قدرت نے بنایا ہے مرقع تیرا
جو کہ مانی سے کھنچے وہ تری تصویر نہیں

مثل غالب ہوں خرد قائلِ قولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

میں کیا ہوں کون ہوں نہوا عمر بھر یہ علم
خود اپنی معرفت سے رہا اشتباہ میں

دروغ و مکر دونوں دشمنوں کو زہر لگتے ہیں	تکلف اور بناوٹ کے ہیں بے حد دشمن جانی
بڑھی مشقِ سخاوت رفتہ رفتہ ایسی حضرت کی	کہ کم عمری میں ہیں مشہور عالم حاتمِ ثانی
انھیں کے عہد دولت مہد میں ہم جیسے شاد ہیں	کہ خستہ خاطروں کی دل سے فرماتے ہیں مہمانی

خبیر

خبیر۔ سید محمد مہدی بلگرامی ولد سید محمد عسکری یہ بزرگ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے پھوپھا اور استاد تھے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کیا کرتے تھے۔ بمقام بھاگل پور ۱۲۷۲ھ ہجری میں انتقال کیا یہ اُن کے اشعار ہیں۔

ہنسنے رونے کا بھلا کب سر و ساماں باندھا	تم نے ہی دیدہ و دانستہ یہ طوفاں باندھا
سدِّ وصال رنجش دلدار ہو گئی	اتنا بڑھا غبار کہ دیوار ہو گئی

خبیر

خبیر۔ میر نادر حسین صاحب شاگرد مشتاق لکھنوی۔ آپ دورِ موجودہ کے شاعر ہیں حالات باوجود تلاش بہم نہ پہنچے۔ کلام حاضر ہے ؞

اِک نہ اِک دن جان دیدو نگا میں تیرے ہجر میں	گر تو ہیں اے بے وفا تو مجھ سے بیگانہ رہا
جستجو قیس کی منظور تھی ورنہ کیا تھا	دشت میں پھرتی تھی کیوں صاحب محمل خاموش
ممنون ہوا دردِ جگر کا میں شبِ وصل	سینے پہ رکھا ہاتھ ترس کھا کے کسی نے
دیکھا نہ گیا اِس سے مرے سینے کی جانب	خورشید کو اندھا کیا داغِ جگری نے

خبیر

خبیر۔ مولوی غلام محمد خان خٹک خبیر فرخ آبادی۔ حضرت رشک کے تلامذہ سے ہیں انکے بزرگ رؤسا بنگش کی سرکار میں ملازم تھے اور غلام قادر خان انکے والد مہاراجہ سیندھیا کی فوج میں رسالہ دار تھے۔ یہ خود ایک عرصہ تک نواب کلب علیخاں والی رامپور کے مصاحب رہے۔ صاحب دیوان و مثنوی ”دریائے عشق“، ”سخن فیض“ ہیں ؞

تشنۂ آبِ اجل جان کے مجکو شاید	آبِ شمشیر پلانے میرا قاتل آیا
بے ماہ پر آگے ترے مہتاب کا عالم	خورشید میں نقشہ ہے چراغ سحری کا
کہتے ہیں مقتل عشاق میں آکر سفاک	آئیں تو روبرو وہ کون ہیں مرنیوالے

ہوئے ہو تم اُس بے مروت کے خاور	نہ ہے وہ کسی کا نہ ہوگا ہمارا

خاور

خاور - میرزا نواب بہادر خاور باشندہ خیر آباد ملازم سرکار معتمد نواب بہرام الدولہ بہادر خویش نواب سر سالار جنگ بہادر مرحوم وزیر حیدر آباد دکن - زیادہ حال معلوم نہیں یہ انکا کلام ہے ؂

کس نے جھانکا ہے آج محمل سے	صبر جاتا رہا مرے دل سے
جا کے اب در پہ اُسکے بیٹھ رہیں	یہی ٹھیرا ہے مشورہ دل سے
پوچھتے ! کیا ہے ماجرا وہاں کا	کوئی پھرتا جو کوئے قاتل سے
سیکڑوں روز قتل ہوتے ہیں	شوق ہے اُنکو رقص بسمل سے

خاور

خاور - میرزا احمد سُلطان خاور گورگانی ابن میرزا مظفر بخت خلف میرزا شاہرخ بہادر فرزند دوئم حضرت بہادر شاہ ثانی - عمر اب پچاس سال سے متجاوز ہے - یہ خود مرزا فیروز شاہ خلف مرزا سلیم کے داماد ہیں - اور ۱۳۰۸ھ سے ضلع بھونگر ریاست حیدر آباد دکن میں صیغہ دار انعام ہیں تصانیف سے ایک رسالہ موسوم بہ " خورشید خاور نظر سے گذرا - اُس میں سے چند اشعار انتخاب ہو کر درج تذکرہ کیئے جاتے ہیں کلام میں کوئی بات بجز سادگی قابلِ ذکر نہیں معلوم ہوتی ؂

خالق ہے وہی غمزہ و انداز و ادا کا	جسنے کہ بتایا کہ ہیں ڈھنگ آہ و بکا کا
ضرورت دشت پیمائی کی اب جاتی رہی خاور	کہ گھر میں ہی مزا آنے لگا ہمکو بیاباں کا
ہوئی ہے نعش غم دل اور جگر پر مرتسم ایسی	کہ سینے کے قفس میں بند دطاؤس ہیں گویا
بڑھتا ہے شوق طاعتِ اصنام اور بھی	لُطفِ ثواب سُنتے ہیں جب پارسا سے ہم

اشعار از قصیدہ در مدح اعلیحضرت نظام خلد آشیان

ازل ہی میں نہوں جسکو عطا اوصاف سُلطانی	وہ ہرگز کر نہیں سکتا جہانداری جہانبانی
روش وہ سیدھی سادھی ہو ہمارے قدر قدرت کی	سمجھ سکتی ہی جس سے خلق حضرت کی خدادانی

دُنیا میں ہم جو آئے تو کیا کام کر چلے	ناحق ہم اپنے نام کو بدنام کر چلے

خاور

خاور ۔ میرزا احمد اکبر خان خاور مرحوم ابن مرزا محمد مہدی سیستانی شاگرد میر وزیر صبا۔ مہاراجہ صاحب والئے پٹیالہ کی سرکار سے سو روپیہ کا مشاہرہ مقرر تھا۔ سنہ ۱۲۹۵ھ میں پینتالیس سال کا سن تھا۔ لاہور میں عربی اخبار موسومہ "نفع العظیم" کے اڈیٹر تھے بڑے جید فاضل اور اکثر فنون سے ماہر تھے۔ فارسی اشعار نہایت عمدہ کہتے تھے۔ سیاحی کا بہت شوق تھا اکثر اطراف ہندوستان کی سیر کی تھی۔ فارسی شعر اکثر کہتے تھے چنانچہ کوہ نور وغیرہ لاہور کے پرانے اخباروں میں بسا اوقات اِن کا کلام شائع ہوتا رہا اپنے زمانے کے اکثر مشاہیر سے روشناس تھے۔ ۷۰ برس سے زیادہ عمر پائی۔ آپ کا دل و دماغ علمی معلومات کا ذخیرہ تھا اور انھیں اپنے عہد کی زندہ تاریخ سمجھنا چاہیئے۔ مدتوں دہلی لاہور لکھنؤ میں رہے۔ کثیر الاحباب اور بڑے زندہ دل بزرگ تھے۔ انتخاب کلام حسب ذیل ہے ؎

معمور ہے داغوں سے سراپا مرے دل کا	مثل شجر طور ہے نقشہ مرے دل کا
دیوانگی نے بادشہ وقت بنایا	چلتا ہے پریزادوں میں سکہ مرے دل کا
مر مر کے بسر کرتا ہوں میں زیست کو اپنی	رہ رہ کے ٹپکتا ہے پھپولا مرے دل کا
جیتا ہوں نہ مرتا ہوں عجب دکھ میں پڑا ہوں	کیا پوچھتا ہے حال ہے کیسا مرے دل کا
ساقی نے دیا جام مئے ناب نہ خاور	پانی کی طرح بہ گیا شیشہ مرے دل کا

جنوں رنگ لائے کچھ ایسا ہمارا	پریزاد دیکھیں تماشا ہمارا
ندیکھا ہو جنے کبھی رقص بسمل	وہ آج آکے دیکھے تماشا ہمارا
بگولا بنی پھرتی ہے خاک اپنی	موئے پر بھی وحشی ہو سودا ہمارا
بھری ہے ہوا شاہِ خوبان کی دل میں	ہما بن کے پھرتا ہے سایا ہمارا
لہو پی کے چھوڑیگی وہ زلف مشکیں	گھٹا یہ سُکھائے گی دریا ہمارا
نچھوڑینگے ہم کوئے دلبر کو واعظ	یہ جنت ہماری یہ طوبا ہمارا

شام کثرت ہے نمایاں زلفِ روئے یار پر
صُبح وحدت کے ہیں جلوے یار کے رخسار پر

چلے بُت خانے کو خدا حافظ
زاہدو! اپنا لو خُدا حافظ

ستم کو تیرے کب ستم جانتا ہُوں
عنایات و لطف و کرم جانتا ہُوں

دو عالم کی ہستی ہے موہوم ساری
جسے دیکھتا ہُوں عدم جانتا ہوں

نہ مہر و وفا نے جفا چاہتا ہُوں
بہر حال تیری رضا چاہتا ہوں

پروانے کیسے جلتے ہیں محفل میں آ کے دیکھ
پوشیدہ عاشقوں سے تو اے شمع رو نہو

دیکھ صورت کو تری ہوش نہیں رہتا ہے
اپنا احوال بھلا کیا میں سناؤں تجکو

خاموش دیکھ ارض و سما میں ہے کسکا نُور
سُورج ہیں کون ماہ درخشاں ہیں کون ہے

شمع پروانے کو جلاتی ہے
شمع کا دِل جلا دیا کس نے

روشن ہوئی جب شمع تو پروانے سے بولی
اب تیرے پر و بال جلانے کے دن آئے

تجھے جبکہ ڈھونڈا نظر آپ آیا
عیاں ہوں میں تجھ میں نہاں مجھ میں تو ہے

کرے قتل گر ہمکو انکار ہے کب
وہ تلوار کس کی یہ کِس کا گلو ہے۔

خان **خان** ۔اشرف خان نام تھا۔ دہلوی الاصل تھے۔ پھر لکھنو چلے گئے۔ جب دہلی میں رہتے تھے تو انجمن مشاعرہ ترتیب دیتے تھے غلام ہمدانی مصحفی سے فن شعر میں مستفیض ہوئے۔ ۔

رہی کچھ تھوڑی سی وحشت کی ہوا میرے بعد
پہلے میں وحشی ہوا قیس ہوا میرے بعد

تو ابھی سے تو نہ اُس بُت کی طرفداری کر
مجھ سے ہو جائیو اے دِل نہ جدا میرے بعد

اِس بُرائی کے سزاوار ہمیں ہیں پیارے
گالیاں کسکو سُناؤ گے بھلا میرے بعد

اے خان غمِ فراق میں تم زہر کھا مرو
اِس کے سِوا نہیں کوئی تدبیر دوسری

خان **خان** ۔محمد خان نام سعادت یار خان رنگین سے تلمذ تھا۔ نیک طینت خوش اخلاق شخص تھے۔ اوائل اٹھارہ صدی میں دہلی میں موجود تھے۔ یہ دو شعر انکے ملے۔

یاد جس وقت تری آتی ہے
مجکو ہچکی وہیں لگ جاتی ہے

خاکسار

خاکسار۔ محمد بلاقی خاکسار تخلص ساکن مراد آباد سپاہی وضع عاشق مزاج۔ وارستہ رنگ شخص تھے اور قدرت اللہ شوق کے دلی دوست اُنہیں کے فیض صحبت سے گاہ گاہ ریختہ بھی کہتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کا زمانہ پایا تھا۔ عالم جوانی میں فوت ہوئے یہ چند شعر تذکرۂ شوق سے درج ہوئے ۞

مرے دیدۂ تر بہا کر چلے	دوآبے میں یہ گھر ڈوبا کر چلے
کیا تیغ ابرو سے مجھ کو شہید	یہ کیا خوب جوہر دکھا کر چلے
دکھا ساق سیمیں تو اب شمع کو	رولا کر۔ گلا کر۔ جلا کر چلے

خاموش

خاموش۔ حضرت میاں عبداللہ شاہ بنّوری چشتی صابری۔ یہ بزرگ نہایت عالی خاندان اور صاحب سجادہ حیدر آباد دکن میں تھے۔ عارف باکمال و سالک حال و قال مشہور تھے تنہائی پسند۔ اکثر جہاں رہتے تھے خاص اوقات کے سوا کسی کو آنے کی اجازت ہوتی تھی اور شبانہ روز خاموش رہا کرتے۔ کبھی اشد ضرورت ہوتی تو کسی سے بات کر لیتے گویا اسم بامسمّٰی خاموش تھے۔ باوجود ان مشاغل صوفیانہ و مجاہدانہ کے فن سخن سے طبیعت مانوس تھی۔ آپ کا کلام بھی عارفانہ اور بالکل تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا اور سیدھا سادا ہے ایک بہت مختصر دیوان قریبًا پندرہ سال ہوئے چھپا تھا اُس سے کچھ اشعار انتخاب کر کے درج کیئے جاتے ہیں۔ سال وفات معلوم نہ ہوا ۞

بھلا ہُوا سو ہُوا۔ یا بُرا ہُوا سو ہُوا	طرف سے یار کی جو کچھ ہوا ہوا سو ہوا
قریب مجھ سے ہو پھر کیوں نظر سے غائب ہے	جمال اپنا تو مجھ کو دکھا ہُوا سو ہُوا
ایک مدّت حرم و دیر میں ڈھونڈا تا حق	سیمبر بر میں چُھپا تھا مجھے معلوم نہ تھا
بظاہر ملاقات ہوتی ہے مشکل	مگر خواب میں تو ملا کیجیئے گا
ہم عشق کے بندے ہیں سمجھو شیخ و برہمن	کیا تم سے کہیں کفر ہے اسلام ہمارا
صحرا میں رہیں باغ میں ہم کیا ہیکو جائیں	گلشن میں نہ ہو جب کہ وہ گلفام ہمارا

خاکسار

خاکسار۔ میر محمد یار متخلص بہ خاکسار معروف بہ میر کلو شاہ جہان آبادی فیلن صاحب لکھتے ہیں کہ خاکسار عرف کلو سودا اور میر حسن سے پیشتر تھا اور میر تقی کے اشعار کو ایام طفلی میں صلاح دیتا تھا۔ لیکن میر صاحب اس امر کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ جب میں اُسے مشاعرہ میں بلاتا تھا تو وہ آنے سے جان چراتا تھا۔ نساخ انھیں جانِ جاناں مظہرؒ کا شاگرد بتاتے ہیں۔ بہر حال ایک خوشگو اور عاشق مزاج شاعر تھے۔ قدیم تذکروں میں یہ بھی نظر سے گذرا کہ اِن کا لقب "شاہ الشعرا" تھا۔ آپ قدم شریف دہلی کے خادموں میں تھے۔ قلندرانہ وضع رکھتے تھے سودا اور میر کے عہد شباب میں کہنہ مشق گنے جاتے تھے۔ زبانِ ریختہ کے بڑے مشاق تھے۔ صاحبِ دیوان اور شاعر خوش بیان تھے۔ علی ابراہیم علی خان مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ اشعار اس عزیز کے میرے ہاتھ نہیں لگے اور یہی باعث ہے کہ تذکروں میں آپ کے اشعار کی کمی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؛

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہ کنعان عزیز
ہمنے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جان عزیز

کیوں نہ وہ مصحفِ رو جان سے مجھے ہووے زیاد
کس مسلمان کو نہیں دین اور ایمان عزیز

خاکسار عرش سے بھی دیکھا پرے تیرا مزاج
آپ میں آ ذرا اپنے تئیں پہچان عزیز

تیغ قاتل سے رہے محروم بے تقصیر ہم
روز محشر کو اُٹھیں گے اِس لیئے دلگیر ہم

کیا ہے حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے سے
آہ جوں شمع ہے راحت مجھے جل جانے سے

ترے باغباں کا یہ دیکھا سلیقہ
کہ نرگس کو بویا نہ بوئیں یہ آنکھیں

دِل شیفتہ کر کے کیا لیا تُو
اے خانہ خراب کیا کیا تُو

تری زلف سیہ سے اے پیارے
مجھ کو اک سر ہزار سودا ہے

رونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی
اِس خانماں خراب کو چپکا خدا کرے

کیا ہے اِس خاکسار کی تقصیر
یہ مگر تم کو پیار کرتا ہے

قیامت بھی ہوگی تو میری بلا سے
مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہے

خاک

خاک ۔ میر طالب حسین ابن سید میر عظیم علی ساکن قصبۂ چلکانہ ضلع سہارنپور۔ اثنا عشری مذہب کے پیرو تھے اور قدیم وضع اور قطع کے پابندِ مذہب بزرگ تھے۔ چالیس سال تک ریاستِ سرمور ناہن میں معقول عہدوں پر مثل وکالتِ شملہ لاہور اور آخر میں مشیر ریاست بھی رہے اور اپنے آقا کو اپنی حسن خدمات سے رضامند رکھا۔ سنہ ۱۳۰۰ھ میں سفر حجاز اختیار کیا مگر قسطنطنیہ میں جہاز زیادہ عرصہ رُکے رہنے کے باعث سعادتِ حج سے محروم رہے۔ شعر گوئی کے دلدادہ تھے مگر غزل کم کہتے تھے۔ زیادہ تر طبیعت کا میلان اخلاقی اور نعتیہ مضامین کی جانب تھا۔ ایک طولانی مثنوی "گلِ باغِ ارم" تیس چالیس جزو کی حسنِ آداب و اخلاق میں جو مستورات کے درس کے لائق ہے تصنیف کر کے سنہ ۱۲۹۴ میں شائع کی تھی۔ قصائد اور متفرق کلام بھی بہت سا یادگار رہا۔ آخر سنہ ۱۹۰۶ء میں ٦٦ سال کی عمر پاکر ریاستِ ناہن میں انتقال کیا اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔ کچھ کلام اُن کا بعد انتخاب پیشکش ہے ؂

از قصائد

نہیں مطلع مہِ نو مدحتِ ابروئے احمد کا	بنا ہے مدِ بسم اللہ اُونچا ہو کے سرمد کا
بیانِ خوبیِ تصویر بھی وصفِ مصوّر ہے	جو ہے وصفِ محمد وصف ہے ربِ محمد کا
گنہگاروں کا حصہ ہے ترے دربارِ رحمت میں	یہیں تو بڑھ گیا ہے حوصلہ کچھ نیک سے بد کا
خدا کا گھر ہے مولد والدِ شپیر و شبّر کا	جو پیدا ہو خدا کے گھر میں وہ مختار ہے گھر کا
علی کے ہاتھ پر کی جسنے بیعت خلد میں پہنچا	خدا کا ہاتھ پکڑا اُسنے اور بازو پیمبر کا

از غزلیات

پھول کیطرح رہوں بُو کیطرح سے جاؤں	بار ہو وے نہ کسی پر مرا مرنا جینا
شعلۂ عشقِ بتاں دل میں چھپا کر رکھا	ہمنے اِس آگ کو چھاتی سے لگا کر رکھا
سوزِ فرقت سے کبھی آہ نہ آئی لب تک	آگ کے ساتھ دھوئیں کو بھی دبا کر رکھا
دیکھ آئینے میں ابرو کو ہے مائل قاتل	آپ تلوار سے اپنی ہوا بسمل قاتل
سر جو کاٹا ہے تو در پر بھی پڑا رہنے دے	نالہ کر سکتا ہے کیا جب نہ ہو سائل قاتل
کہیں کمر میں بل آنجائے یہ بوجھ اُسنے کہاں اُٹھائے	کہ سر پہ زلفوں کا بار بھی ہے گلے میں پھولوں کا ہار بھی ہے

خاک میں مر کے یہ حسرت کے سوا لے نہ گئے
قبر میں ساتھ امیروں کے دوشالے نہ گئے

حشر تک سنگِ لحد بن کے رہے چھاتی پر
صدمے فرقت کے پسِ مرگ بھی ٹالے نہ گئے

ہوش بھی کر گئے ہمراہ نظر کے پرواز
شیخ جی پیکے جو بہکے تو سنبھالے نہ گئے

تشنہ کام و تشنہ لب کو آبِ جو درکار ہے
دِل کو تیری آرزو اور مجھکو تُو درکار ہے

کچھ نشاں اِس کا ملے گر ہو حقیقت پر نظر
جستجو میں اُسکی اپنی جستجو درکار ہے

خاک تیرے نقشِ پا کی مُنہ پہ مل لیتے ہیں وہ
کوچۂ اُلفت میں جنکو آبرو درکار ہے

تیری وحدت کثرتِ عالم پہ ہے چھائی ہوئی
ایک ہے لیکن زمانے بھر کو تُو درکار ہے

خاطر

خاطر۔ مرزا معظم سلطان خاطر خلف اکبر مرزا محمود شاہ شاکر گورگانی دفتر ٹریفک سپرنٹنڈنٹ۔ ایس پی۔ آر۔ دہلی میں کلرک ہیں اور چالیس سال کے قریب عمر ہے۔ تلمذ اپنے والد بزرگوار سے رکھتے ہیں۔ انداز کلام مندرجۂ ذیل اشعار سے نمایاں ہے۔

دیکھنا کچھ ہے ٹھکانا ہیبتِ جلاد کا
خنجرِ فولاد سے باہر ہے دم فولاد کا

جستجو میں عمر کھوئی تب مِلا اتنا سُراغ
خود فراموشی بھی اک کلمہ ہے اُسکی یاد کا

تجھکو دعویٰ ہے خدائی کا تو آ بسم اللہ
میرا دِل تیرے لیئے عرشِ معلی ہوگا

مِٹ نجائے تربتِ عاشق بسملِ دِل کہیں
دیکھکر رکھیے قدم آگے مری جان دیکھکر

مُفت کا دِل سُنکے ہی خوبانِ عالم کا ہجوم
کیا گری پڑتی ہے دُنیا جنسِ ارزاں دیکھکر

ابھی کچھ تھے ابھی کچھ ہیں۔ ابھی بدلے ابھی بگڑے
عدو کے سامنے وہ میری حالت بنکے آتے ہیں

عجب انداز ہیں محفل میں اُنکے آنے جانیکے
شرارت بن کے جاتے ہیں قیامت بنکے آتے ہیں

سمجھ لو تم ہمارے ضعف کے آثار جتنے ہیں
حسینوں میں ہیں سب اندازِ نزاکت بن کے آتے ہیں

کسنے نکالا انکو گھروں سے جو ہو گئیں
آباد حسرتیں دلِ خانہ خراب میں

دِن بھر جو تمکو دیکھ کے اُٹھتے ہیں ولولے
ارمان وہ بنکے شبکو جگاتے ہیں خواب میں

ہیں دل کے آبلے مرے دریا سے پوچھئے
کسکی بندھی ہوئی یہ ہوا ہے حباب میں

نہ مٹا خونِ شہیدانِ ستم کا دھبہ
حشر تک بن کے شفق چرخ کے دامن میں رہا

وقتِ آخر بھی نہ دیدار کی حسرت نکلی
کب وہ آئے ہیں کہ جب دم نہ مرے تن میں رہا

گر یہی دل کی تڑپ ہے تو پسِ مردن بھی
دفن یاروں نے کیا مجکو میں مدفن میں رہا؟

اپنے صیاد کے احسان بھلادوں کیونکر
میں قفس میں بھی رہا یوں کہ نشیمن میں رہا

کبتک رہیگا بادۂ اُلفت سے سرگراں
للہ اب تو ہوش میں آ کچھ سنبھل کے چل

فقیرِ عشق ہیں پروائے ملک و مال نہیں
ہمارے پاس وہ شے ہے جسے زوال نہیں

تری نگاہ کا ہر بار اُٹھ کے جھک جانا
یہ کیا ہے مجھ سے مرے دلکا گر سوال نہیں

کسیکی فتنہ خرامی سے حشر برپا ہے
وہ بدنصیب ہے اب بھی جو پائمال نہیں

ہو مجھ سے وصل کا وعدہ عدو سے ایفا ہو
تمھیں کہو کہ یہ فقرہ نہیں یہ چال نہیں؟

یہ کچھ شوقِ شہادت ہے کہ ہم سر بیچکر اپنا
برائے نذرِ قاتل آج خنجر مول لیتے ہیں

یہاں کے واسطے کیا کیا تزک کیا کیا تکلف ہے
وہاں کیواسطے بھی کچھ تونگر مول لیتے ہیں

خریداری دلوں کی اور نیچی نیچی نظروں سے
پرکھتے کس طرح ہیں اور کیونکر مول لیتے ہیں

وہ ہونگے اور بکجاتے ہیں جو تقدیر کے ہاتھوں
کوئی بیچے تو ہم اے دل مقدر مول لیتے ہیں

جذبِ اُلفت پردہ دار روئے زیبا کیوں نہو
میرے دل کے آئینہ میں تیرا نقشہ کیوں نہو

بیحجابی روکشِ چشمِ تمنا کیوں نہو
جسکو آنکھیں دے خدا محوِ تجلی کیوں نہو

کیا حیا ہے نیچی نظروں کے تصدق جائیے
تم نہ آنکھ اپنی اُٹھانا کوئی مرتا کیوں نہو

بات جب بنتے بھی دے برگشتگی تقدیر کی
ہیں بجا بھی کچھ کہوں اُنسے تو بیجا کیوں نہو

آنسو ٹپک پڑے جو مری التجا کے ساتھ
کچھ رحم کھا کے ہو لئے وہ مُسکرا کے ساتھ

جویائے معرفت ہو تو باطن پہ کر نظر
کبتک چلے گا شیخ یہ تقوی ریا کے ساتھ

قاتل نہ توڑ آس ہماری دمِ اخیر
تیرِ نگاہ بھی کوئی تیغِ ادا کے ساتھ

تقدیر کی ہے بات جو اب بھی نہو قبول
آمین کہہ رہے ہیں وہ میری دعا کے ساتھ

ٹیس نے اُٹھکے کلیجے کی کیا کام تمام
درد آخر کو میرے درد کا درمان نکلا

مالکِ حور و جناں کہتے تھے سب رضواں کو
جاکے دیکھا تو درِ یار کا درباں نکلا

کچھ خلش کا تو مزہ دل کو ملے ای صیّاد
توڑ رگِ جاں میں مری توڑ دے نشتر اپنا

کر عہد پہ اُس عہد شکن کے نہ بھروسا
جز یاس نہیں نخلِ تمنّا میں ثمر اور

کس منہ سے کہا تھا کہ تجھے شاد کرینگے
کس دل سے یہ کہتے تھے کہ بیداد کرینگے

خاطر۔ جناب رائے سورج نراین صاحب تلمیذ حضرت ظہیر دہلوی۔ اِنکے اُستاد نے اِن کی خاطر
دو غزلیں بھیجی تھیں اُن میں سے چند شعر درج ہوئے حالات اور کلام بارہا طلب کئے۔ مگر دستیاب نہیں ہوئے۔

تقصیر نظر کی ہے نہ آئیں جو نظر میں
آنکھوں میں سمائے ہیں وہ بیٹھے ہیں جگر میں

مرغوب ہے اس درجہ اُنھیں اپنی نمایش
آئینے لگا رکھے ہیں دیوار میں در میں

پڑتے ہیں زباں پر مری چھالے دمِ گفتار
کیا قہر کی گرمی ہے مرے سوزِ جگر میں

دِل چھین لیا دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے
کیا سحر ہے اُس شوخ کی دزدیدہ نظر میں

خاطر۔ منشی سید ظفر حسن صاحب لکھنوی تلمیذ حضرت جلیل۔ روزگار کی وجہ سے بمبئی میں خاطر
رہتے ہیں اِنکی اکثر غزلیں نظر سے گذریں۔ باوجود کوشش حالات معلوم نہ ہوئے۔ کچھ اشعار منتخب ہوکر ضبط تحریر میں آئے۔ اگرچہ مدتِ مشق کچھ زیادہ نہیں ہے مگر موزونی طبع کے ساتھ شوخی اور خوش مذاقی اِنکے کلام سے آشکار ہے مضمون کی طرف بھی خیال کی پرواز ہے۔

چل بسے ہوش و خرد میں ہاتھ ملکر رہگیا
اک چھلاوہ میرے دِل میں مجھکو چھلکر رہگیا

ہائے رے جوشِ شباب اُف رے مستانہ روش
جب قدم رکھا کسی کا دِل کچل کر رہگیا

جب اُٹھانے کے لیئے میرے چلا دربانِ یار
میں بشکلِ نقشِ پا در پر مچل کر رہ گیا

خوب کی جلوہ نمائی مرحبا اے برقِ طور
ہو گیا بے ہوش کوئی کوئی جل کر رہگیا

یادِ گیسو سے اگر رات کو اُلجھن میں رہا
دِن کو بیتاب خیالِ رُخِ روشن میں رہا

عاشق ہوا ہوں اک بتِ بالا بلند پر
مجکو کہتے ہو کہ چل باہر ہو

صد آفرین ہے میری بھی عالی پسند پر
آپکے کہنے سے کب باہر ہوں

ہے کہیں یہ بھی رہ و رسم وفاداری کی
پاس سے میرے جو وہ غرفہ نشیں اُٹھ جائے

دل مرا چھین کے یوں راہ بتائی تُو نے
طاقت و صبر و قرار و دل و دین اُٹھ جاوے

تیرے قامت کا اگر شور نہ ہو کیا شک ہے
کفِ افسوس ہی پھر بیٹھے ملیں گے تا حشر

سارے عالم سے قیامت کا یقین اُٹھ جاوے
ہائے گر یارِ دمِ باز پسین اُٹھ جاوے

اُس سے در پردہ کچھ اظہار محبت کا کروں
ہم نشیں پاؤں کو ہاتھ اُسکے لگاتا تو ہے تو

یہ بغل کا مرے دشمن جو کہیں اُٹھ جاوے
ہے غضب اُس کا اگر ہاتھ کہیں اُٹھ جاوے

خادم
خادم - جناب عتیق الرحمٰن خان صاحب تلمیذ جناب قدرت رامپوری - باوجود تلاش انکے حالات بہم نہ پہنچ سکے یہ اشعار انکے ہیں +

کعبہ سے دیر کی لی راہ مسلماں ہو کر
یہ شرارت ہے نئی جان جلانیکے لئے

بُت کا بندہ میں ہُوا صاحبِ ایمان ہو کر
دل طلب ہم سے کرو غیر کے مہماں ہو کر

خاص
خاص - محمد حیدر خاں خاص پسر الٰہی بخش خاں منشی پلٹن شاہی شاگرد شاہزادہ جمعیت شاہ ماہر - اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی میں موجود تھے تذکرہ نویسوں نے یہ اشعار انکے لکھے ہیں -

تھی جُدائی گرچہ پہلو میں مرے وہ یار تھا
ناز تھا - آزردگی تھی - رنج تھا انکار تھا

کاوشیں جھیلیں تہ کیا کیا یارِ دم مژگاں میں تری
گاہ نشتر تھا جگر میں گاہ دل میں خار تھا

دیکھ لے نقشہ اگر اُس عالمِ تصویر کا
تو تو کیا زاہد دل آوے اُس پہ تیرے پیر کا

مار کر مجکو ہوا تو قاتلِ عالم پر دلیر
حلق تھا میرا فساں قاتل تری شمشیر کا

کیوں تھا غمائے خلش ہر دم نفس کے ساتھ ہے
دل میں شاید رہگیا ہے کوئی پیکان تیر کا

خاطر
خاطر - منشی سید محمد صالح صاحب لکھنوی شاگرد جناب فاخر لکھنوی - زمانہ حال کے شعرا میں سے ہیں - ان کا کلام لکھنو کے گلدستوں میں نظر سے گذرا اور یہ چند شعر درج تذکرہ کئے گئے +

تذکرۂ ہزار داستان

معروف بہ

خمخانۂ جاوید

جلد سوم

خادم — خادم شیخ خادم علی خان مرحوم خادم از رؤسا قصبہ کیتھل من مضافات سرہند (حال تحصیل ضلع کرنال) انکے چچا قادر علی خان بسبب ملازمت عماد الملک غازی الدین خان فرخ آباد میں سکونت پذیر ہوئے اور یہ بھی اُنکے ساتھ وہیں جا رہے - نواب احمد خان مخاطب بہ ناصر جنگ بنگش نے آپ کو مظفر جنگ کا اتالیق مقرر فرمایا تھا آپ غلام محمد آزاد کے شاگرد تھے اُردو فارسی دونوں زبانوں میں مشہور انشا پرداز تھے - یہ کلام کا انتخاب ہے ٭

ہر چند ٹالتا ہے تو لیکن تری طرف　　آتا ہوں پھر پھرا کے میں قبلہ نما کی طرح

سج دھج میں آن بان میں ترکیب و طور میں　　بھاتی ہے ہمکو اپنے ہی اُس خوش ادا کی طرح

خادم سخن تو اور بھی کہتے ہیں خوب خوب　　پر ہم سے سیکھ لے کوئی طرز و ادا کی طرح

نام	تخلص	صفحه	نام	تخلص	صفحه

صفحه	تخلص	نام	صفحه	تخلص	نام

صفحہ	تخلص	نام
۶۳۷-۳۸	ذکی	مولوی سید ذکی حسین
۶۳۸	〃	میرن صاحب
〃	〃	منشی عبدالغفور خاں
〃	زندہ	منشی محمد یحییٰ
〃	〃	منشی زین الدین اورنگ آبادی
۶۳۹	زوار	سید زوار حسین الہ آبادی
〃	زور	منشی میر تراب علی
۶۳۹-۴۰	زہیر	مولوی آغا حسین
۶۴۰	〃	قاضی عبدالحق بریلوی
۶۴۱-۴۲	〃	سید قلندر پراں
۶۴۱	زیب	مرزا جمال الدین
۶۴۱-۴۲	〃	راجہ جھنو لال بہادر
۶۴۲-۴۵	زیبا	مرزا بندہ علیخاں لکھنوی
۶۴۵	〃	منشی محمد قاسم دہلوی
۶۴۵-۴۶	زیبا	منشی عبدالمجید خاں
۶۴۶-۴۷	〃	مولوی عبدالغنی بدایونی
۶۴۷	〃	رائے اجودھیا پرشاد
۶۴۸	〃	مرزا عبدالرحمٰن بیگ
〃	زید	سید احمد
۶۴۹	زیدی	منشی سید نورالدین
〃	زیرک	حافظ مولوی قلندر بخش
۶۴۹-۵۰	خاطر	منشی ظفر حسین
۶۵۰	فرد	حکیم انور آغا لکھنوی
〃	خلش	خواجہ کرامت علی اجمیری
۶۵۰-۵۱	خلیل	نواب صاحب ٹونک
۶۵۱	خورشید	منشی خوشرفت علیخاں
〃	خیال	مولانا فیض الحسن

صفحہ	تخلص	نام
۵۶۹-۹۰	ریاض	سید ریاض احمد
۵۹۰	〃	سردار مرزا لکھنوی
۵۹۰-۱	〃	سید رضا حسین لکھنوی
۵۹۱-۲	〃	نواب سید جعفر مرزا خاں
۵۹۲	〃	منشی محمد یعقوب
〃	〃	منشی ریاض الدین
۵۹۳	〃	مولوی ریاض الدین احمد
۵۹۳-۶۰۲	ریحان	دیوان دیا کرشن لکھنوی
۶۰۲	ریحانی	منشی محمد سجاد حسین
۶۰۳	زار	منشی برہان الدین خاں دہلوی
۶۰۳-۴	〃	لالہ مینڈو لال
۶۰۴	زار	لالہ دھنپت رائے
〃	〃	حافظ امام بخش لکھنوی
۶۰۴-۵	〃	مرزا مظفر علی
۶۰۵	〃	منشی احمد حسین
〃	〃	میر امداد علی
۶۰۵-۶	〃	میر محمد ہادی لکھنوی
۶۰۶	〃	منشی رحیم الٰہی
۶۰۶-۷	〃	سید حسن عسکری
۶۰۷-۸	〃	محمد عبدالقادر

صفحہ	تخلص	نام
۶۰۸	زار	مولوی احسان الحق لکھنوی
۶۰۸-۱۱	〃	پنڈت تربھون ناتھ کشمیری دہلوی
۶۱۱-۱۲	〃	منشی بانکے لال
۶۱۲-۱۳	〃	مرزا فیاض الدین گورگانی
۶۱۴	زائر	منشی سید علی حسن
〃	زاہد	شاہزادہ مرزا زاہد الدین
۶۱۴-۱۵	〃	برہمچاری پرمانند جی دہلوی
۶۱۵	〃	مرزا مصطفےٰ حسین
〃	〃	منشی ولایت حسین اکبرآبادی
〃	〃	سید عابد حسین
۶۱۵-۱۸	〃	سید زاہد حسین
۶۱۸-۲۱	زبیر	مرزا محمد رئیس بخت گورگانی
۶۲۱-۲۲	زر	شیخ بلاقی
۶۲۲	زخم	حکیم ابوالفیض فتح محمد خاں
〃	زخمی	منشی راج بہادر
۶۲۲-۲۳	〃	منشی محمد شرف الدین
۶۲۳-۲۴	زعم	سید غلام محمد
۶۲۴	زکی	مرزا محمد خاں لکھنوی
۶۲۴-۲۵	〃	سید محمد زکی
۶۲۵-۲۷	〃	حافظ سید محمد زکریا خاں دہلوی

صفحہ	تخلص	نام
۵۲۵-۲۶	رنگ	سیٹھ پسٹن جی فرام جی
۵۲۶	〃	لالہ کیشو داس
〃	〃	لالہ لکھپت رائے
۵۲۶-۲۹	〃	حاجی محمد وزیر خاں
۵۲۹	〃	حریف خاں
۵۲۹-۳۳	رنگین	مرزا سعادت یار خاں
۵۳۳	〃	لالہ بلاس رائے
۵۳۳-۳۴	〃	منشی موہن لال دہلوی
۵۳۴	〃	میر اکبر علی
〃	〃	منشی انور علی
۵۳۵	〃	منشی ناصر حسین خاں
〃	〃	منشی محمد ایوب
۵۳۵-۳۶	〃	راجہ ہری دت
۵۳۶-۴۳	رواں	منشی جگت موہن لال
۵۴۳	روح	محمد غیاث الدین
۵۴۳-۴۴	رومی	حافظ غلام یٰسین حیدرآبادی
۵۴۴	روش	میر حسین علی
۵۴۴-۴۶	روشن	روشن شاہ بریلوی
۵۴۶-۴۷	〃	مرزا جہاں اشرف
۵۴۷-۴۸	〃	بابو منی لال شاہجہانپوری
۵۴۸	روشن	منشی اکرام اللہ خاں
〃	〃	دیوان روشن لال
۵۴۸-۵۲	رونق	نواب احمد علیخاں
۵۵۲-۳	〃	لالہ رام سہائے
۵۵۳	〃	حافظ محمد جان
۵۵۳-۵۵	〃	لالہ لچھمی نراین
۵۵۵	〃	لالہ شیو ناتھ سہائے
〃	〃	حافظ شیخ عبدالباری
۵۵۵-۶	〃	محمود میاں
۵۵۶	〃	منشی رادھا موہن لال
۵۵۶-۶۳	〃	منشی پیارے لال
۵۶۳	رؤف	بابو رؤف الدین
۵۶۳-۴	رئیس	نواب محمد عمر علیخاں
۵۶۴-۶۶	〃	مرزا خادم حسین
۵۶۶-۵۶۷	رہا	غلام محمد خاں
۵۶۷	〃	میر رضی
۵۶۷-۸	رہائی	ڈاکٹر شیخ عبداللہ
۵۶۸	رہبر	نواب مصطفیٰ علیخاں
〃	〃	منشی محمد مہدی
۵۶۸-۹	ریاست	شیخ ریاست علی لکھنوی

صفحہ	تخلص	نام
۴۸۰	رفعت	سید عنایت احمد
۴۸۰-۱	〃	منشی محمد داود
۴۸۱-۲	〃	منشی سرفراز علیخاں بریلوی
۴۸۳	〃	مولانا غلام جیلانی گیلانی
۴۸۳-۴	رفیع	مرزا محمد طاہر لکہنوی
۴۸۴-۵	〃	مسٹر رفیع الدین
۴۸۵	رفیق	مرزا اسد بیگ دہلوی
۴۸۵-۶	〃	شیخ الٰہی بخش
۴۸۶-۹	〃	منشی ابن علی
۴۸۹-۹۰	〃	مولوی حبیب اللہ
۴۹۰	〃	شیخ ملک قادر بخش
۴۹۰-۱	〃	صاحبزادہ محمد رفیق خاں
۴۹۱	〃	مولوی عبد المجید رامپوری
〃	〃	حافظ محمد رفیق
۴۹۱-۳	رفت	مرزا قاسم علی
۴۹۳	〃	حافظ حبیب النبی
〃	〃	مولوی حبیب الٰہی
۴۹۳-۴	〃	سید علی محمد
۴۹۴-۶	رقم	حکیم سکھانند دہلوی
۴۹۶-۷	رقیب	منشی محمد ظہیر حسن
۴۹۷	رکن	سید غلام نبی
۴۹۷-۵۰۲	رمز	مرزا فتح الملک بہادر ولیعہد
۵۰۲	رمز	منشی ابراہیم خاں
۵۰۲-۳	رمز	منشی برج بہاری لال مرادآبادی
۵۰۳-۴	〃	مرزا جلال الدین حیدر
۵۰۴	〃	منشی بلاس رائے
۵۰۴-۵	〃	میر فاضل حسین لکہنوی
۵۰۵	〃	سوامی سدانند سرسوتی
۵۰۵-۶	〃	منشی حافظ انوار الحق
۵۰۶	رنق	نجیب اللہ خاں
۵۰۶-۷	رنج	خواجہ محمد نصیر محمدی دہلوی
۵۰۷	〃	حکیم فصیح الدین
۵۰۷-۸	〃	مرزا جان علی
۵۰۸-۹	〃	میر محمد علی
۵۰۹-۱۲	رنجور	شمس العلما مولوی محمد یوسف
۵۱۲-۱۴	رند	لالہ کھیم نراین لکہنوی
۵۱۴-۱۷	〃	پنڈت گنگا پرشاد کشمیری لکھنوی
۵۱۷		نواب احمد علیخاں رامپوری
۵۱۷-۱۸	〃	منشی اکرام الدین دہلوی
۵۱۸-۲۵	〃	نواب سید محمد خاں

صفحہ	تخلص	نام
۴۴۵-۶	رضا	شیخ رضا عباس
۴۴۶-۷	〃	مرزا رضا حسین بیگ بریلوی
۴۴۷	〃	مبین الرضا خاں بدایونی
〃	〃	داروغہ رضا حسین لکھنوی
〃	〃	مرزا نظیر حسین عظیم آبادی
۴۴۸	〃	نواب محمد رضا خاں
〃	〃	شیخ رضا حسین
۴۴۹	〃	مرزا نظیر الدین گورگانی
〃	〃	منشی علی رضا سیتاپوری
〃	〃	سید رضا علی رامپوری
۴۴۹-۵۰	〃	مولوی محمد رضا صدیقی
۴۵۰	〃	محمد موسیٰ رضا
۴۵۰-۵۱	رضوان	نواب محمد واجد علیخاں
۴۵۱-۴	〃	مرزا شمشاد علی بیگ دہلوی
۴۵۴-۶	〃	مولا بخش
۴۵۶-۸	〃	نواب رضوان علیخاں
۴۵۸-۹	رضی	سیف الدولہ سید رضی خاں دہلوی
۴۵۹-۶۲	〃	قاضی محمد حسین
۴۶۲	〃	سید غلام شبیر الہ آبادی
۴۶۳	〃	ڈاکٹر زیرک حسین

صفحہ	تخلص	نام
۴۶۳-۴	رضی	سید رضی حیدر
۴۶۴	رعایت	سید رعایت علی لکھنوی
۴۶۴-۶۵	رعب	شیخ حکیم محمد حنیف علی
۴۶۵	〃	منشی محمد علیخاں
〃	رعد	منشی محمد عابد علی بلگرامی
۴۶۵-۹	〃	منشی حسب لال
۴۶۹-۷۰	〃	مولوی محمد صدیق حسن خاں جونپوری
۴۷۰	〃	حکیم میر نادر علی
۴۷۰-۷۱	رعنا	سید محمد حمید الدین
۴۷۱	〃	منشی عاشق حسین لکھنوی
〃	〃	منشی عبد الغفار دہلوی
۴۷۱-۲	〃	سید محمد ہاشم دہلوی
۴۷۲-۳	〃	منشی سید نور احمد لکھنوی
۴۷۳-۴	رغمی	مولوی عظیم اللہ صاحب
۴۷۴-۵	رفاقت	مرزا مکین دہلوی
۴۷۵	〃	شیخ بہادر حسین لکھنوی
〃	رفعت	لالہ رام دلدرا
۴۷۵-۷۷	〃	نواب مہدی حسن خاں لکھنوی
۴۷۷-۹	〃	مرزا پیارے گورگانی
۴۷۹-۸۰	〃	محمد منیر الدین

صفحہ	تخلص	نام
۳۹۰	رسا	میر احمد علی
۳۹۰-۹	〃	منشی حیات بخش
۳۹۹	〃	سید احمد حسین لکھنوی
۳۹۹-۴۰۰	〃	سید ابو الحسن
۴۰۰-۱	〃	سید محمد اسمٰعیل
۴۰۱	〃	شاہ عبد العزیز
۴۰۲	〃	غلام مصطفےٰ
۴۰۲-۳	رستم	رستم علیخاں
۴۰۳	رسوا	لالہ آفتاب رائے دہلوی
〃	〃	عبد الحمید
۴۰۳-۵	〃	منشی کفایت علی
۴۰۵-۶	〃	سید محمد اصغر لکھنوی
۴۰۶-۷	〃	سید باقر حسین لکھنوی
۴۰۷	〃	پنڈت گنگا پرشاد
۴۰۷	〃	سید اولاد حسین بریلوی
۴۰۷-۸	〃	منشی فیض احمد بدایونی
۴۰۸-۹	〃	مرزا ہادی حسین بریلوی
۴۰۹	〃	سید افضال حسین شاہجہانپوری
۴۰۹	〃	بابو ہرکشن داس
۴۰۹-۱۰	〃	منشی محمد وحید

صفحہ	تخلص	نام
۴۱۰-۱۶	رشک	میر علی اوسط لکھنوی
۴۱۶	〃	بابو گنگا پرشاد بلند شہری
۴۱۶-۱۸	〃	مولوی حفیظ اللہ خاں
۴۱۸	〃	علی اوسط فتحپوری
۴۱۸-۲۲	〃	نواب رامپور
۴۲۲	رشکی	راجہ کندن لال لکھنوی
۴۲۲-۳۱	〃	نواب محمد علیخاں دہلوی
۴۳۲	رشید	قاضی کبیر حسن
۴۳۲-۹	〃	پیارے صاحب لکھنوی
۴۳۹-۴۰	〃	مولوی رشید احمد رامپوری
۴۴۰	〃	حافظ رشید الرحمٰن
۴۴۰-۴۱	رضا	حمید الدین چاندپوری
۴۴۱	〃	مرزا جیون
〃	〃	مرزا محمد رضا لکھنوی
〃	〃	میر محمد رضا دہلوی
۴۴۲	رضا	مرزا علی رضا
〃	〃	گمنام
〃	〃	مولوی غلام رضا لکھنوی
۴۴۲-۵	〃	مولوی برکت اللہ لکھنوی
۴۴۵	〃	قاضی عنایت رضا

صفحہ	تخلص	نام
۳۵۵	راقم	منشی مظفر علی
۳۵۵-۶	〃	خواجہ میرزا قمر الدین خان دہلوی
۳۶۱	رام پرشاد	منشی رام پرشاد لکھنوی
〃	راوی	منشی مصاحب علی
۳۶۲	رابط	منشی دیبی پرشاد
۳۶۳	〃	نواب مظفر علیخاں مراد آبادی
۳۶۴	〃	شیخ امام الدین
۳۶۵	رحم	راجہ نیم چند
۳۶۵-۶	رحمٰن	منشی عبد الرحمٰن
۳۶۶	〃	منشی ضیاء الرحمٰن
〃	رحمت	منشی رحمت علی دہلوی
۳۶۷	〃	پنڈت گنگا پرشاد لکھنوی
۳۶۷-۹	〃	حافظ رحمت اللہ بنارسی
۳۶۹-۷۰	〃	رحمت اللہ بلند شہری
۳۷۰-۲	〃	منشی ظفر علی رحمت اللہ
۳۷۲	〃	منشی رحمت اللہ
۳۷۲-۳	〃	مولوی رحمت علی
۳۷۳	رحمتی	کنور سکھراج عظیم آبادی
۳۷۴	رحیم	مرزا رحیم بیگ دہلوی
۳۷۴-۵	〃	عبد الرحیم خان

صفحہ	تخلص	نام
۳۷۵-۶	رحیم	منشی بھگو خان
۳۷۶	〃	شیخ رحیم بخش
〃	〃	سید عبد الرحیم شاہ
۳۷۷-۸۰	درخشاں	نواب ضیاء الدین احمد خان دہلوی
۳۸۰	〃	منشی خیرات علیخاں
۳۸۰-۱	〃	منشی عزیز الدین
۳۸۱-۲	رزاق	عبد الرزاق خان
۳۸۲	رزم	منشی بینی مادھو
〃	〃	محمد حنیف
〃	〃	محمود علیخان
۳۸۳	〃	شیخ خورشید حسن قدوائی
〃	رسا	میرزا کریم الدین گورگانی
۳۸۳-۵	〃	میر احمد علی رامپوری
۳۸۵	〃	قاضی عوض علی - ۳۰۰
〃	〃	حکیم عبد اللہ خان دہلوی
〃	〃	صاحبزادہ ابراہیم شاہ
۳۸۶	〃	میر عابد حسین لکھنوی
۳۸۶-۷	〃	نواب شبیر علیخان لکھنوی
۳۸۷	〃	منشی رحیم بخش
۳۸۸	〃	غلام محی الدین
۳۸۸-۹۰	〃	نواب وجیہ الدین خان

صفحہ	تخلص	نام
۲۹۸	راجہ	راجہ بلاس رائے۔
۲۹۸-۳۰۳	″	مہاراجہ بلوان سنگھ کاشی نریش
۳۰۴-۷	″	مہاراجہ سردو بجے سنگھ بلرامپور
۳۰۷-۸	راحت	مرزا محمود بیگ دہلوی۔
۳۰۸-۱۰	″	منشی بشیر محمد خان دہلوی
۳۱۰-۱۳	″	منشی بھگونت رائے لکھنوی
۳۱۳	″	نامعلوم ریختی گو۔ دہلوی
۳۱۴	″	سیّد عابد حسین بریلوی
″	″	محمد نثار علی رامپوری
″	″	محمد رئیس الدین خان
۳۱۴-۵	راحم	شیخ رحیم بخش
۳۱۵-۶	راز	مرزا حاجی گورگانی
۳۱۶	″	صاحبزادہ عبیداللہ خان
۳۱۷	″	نواب عباس علیخان لکھنوی
۳۱۷-۱۸		سیّد فیاض احمد
۳۱۸-۲	″	منشی امتیاز احمد خان رامپوری
۳۲۲	″	منشی محمد حسین جلال آبادی
″	″	شیخ عنایت اللہ
۳۲۳-۵	″	حکیم محمد باقر لکھنوی
۳۲۵	″	منشی علی احمد

صفحہ	تخلص	نام
۳۲۵-۲۶	راسخ	شیخ غلام علی عظیم آبادی
۳۳۳-۴	″	نواب ظفریاب خان لکھنوی
۳۳۴	″	میاں عنایت محمد خان
″	″	منشی سعادت علیخان دہلوی ۲۵
۳۳۴-۴۱	″	مولٰنا عبدالرحمن دہلوی
۳۴۲	راشد	مرزا بختاور شاہ گورگانی
۳۴۲-۶	راضی	دیوان جانی بہاری لال جی
۳۴۶	″	یعقوب خان
۳۴۶-۷	″	منشی خلیل الدین احمد
۳۴۷-۸	راغب	سبحان قلی بیگ
۳۴۷-۸	″	حافظ یار خان
۳۴۸	″	احمد حسین دہلوی
۳۴۸-۹	″	محمد عثمان خان۔
۳۴۹-۵۰	″	منشی یعقوب بخش
۳۵۰	رافت	شاہ رؤف احمد دہلوی
۳۵۱-۲	″	عبدالرؤف خان
۳۵۲	″	عبدالغنی خان
۳۵۲	راقب	امام الدین خان
۳۵۳-۴	راقم	لالہ بندرابن دہلوی۔
۳۵۴-۵	″	خلیفہ غلام محمد دہلوی

صفحہ	تخلص	نام
۲۳۵	ذبیح	میرزا امان علی
"	"	نواب اسمٰعیل خان بریلوی
۲۳۵-۹	"	مولوی سید محمد اسمٰعیل
۲۳۹-۴۱	"	منشی باقر حسین
۲۴۱	"	منشی محمد اسمٰعیل
۲۴۱-۳	"	حکیم اسمٰعیل خان دہلوی
"	"	سید عبدالحی
"	"	خواجہ محمد اسمٰعیل
۲۴۳-۴	"	مولوی اسمٰعیل خان بھوپالی
۲۴۴	ذخیر	منشی قربان علی
"	ذرہ	مرزا راجہ رام ناتھ دہلوی
۲۴۴-۵	"	میر ولایت علی -
۲۴۵	"	منشی ہر پرشاد ...-
۲۴۶	"	منشی انواری لال
"	ذکار	اولاد محمد خان
۲۴۶-۵۱	"	منشی خوب چند دہلوی
۲۵۱-۲	"	پنڈت سری کشن -
۲۵۲-۳	"	منشی بخشش محمد
۲۵۳	ذکائی	ہاشم علی
۲۵۴	ذکی	نواب جعفر علیخان

صفحہ	تخلص	نام
۲۵۳-۴	ذکی	نواب اسدالدولہ فیل جنگ
۲۵۴-۶۵	"	ملک الشعراء مہدی علیخان
۲۶۵-۶	"	حکیم عبدالاحد
۲۶۶	"	منشی محمد کریم
۲۶۶-۷	"	مرزا کبیرالدین گورگانی
۲۶۷	"	اشفاق حسین
"	ذلیق	مولوی محمد نصراللہ خان
۲۶۷	ذوق	الف خان
۲۶۹-۸۹	"	ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم
۲۸۹	ذوقا	ذوقا شاہ
۲۸۹-۹۰	ذوقی	شاہ ذوقی
۲۹۰	"	سید عبدالواحد
۲۹۱	ذہین	حافظ محمد اسمٰعیل خان
۲۹۲	"	حکیم نورالحسن
۲۹۲-۴	"	نواب کاظم علیخان لکھنوی
۲۹۴	"	سید واجد علی -
۲۹۴-۷	"	غلام مصطفیٰ ۲۲۴
		ردیف رائے مہملہ
۲۹۸	راجہ	راجہ راج کرشن
"	"	راجہ راجہ بہادر

صفحہ	تخلص	نام
۱۹۹	دلسوز	خیراتی خان
〃	دلشاد	عبدالرحمٰن ۱۵۰-
۱۹۴-۵	دلگیر	منشی چھنولال لکھنوی
۱۹۵-۱۰۰	〃	شاہ نظام الدین اکبرآبادی
۲۰۰	〃	سید اظہر حسین مارہروی
۲۰۰-۱	〃	منشی عبدالوہاب
۲۰۱	دلیر	نواب علی محمد خان لکھنوی
〃	〃	نواب دلیر جنگ مدراسی
۲۰۱-۵	〃	نواب امراؤ بہادر باندا
۲۰۵-۹	〃	سید امیر حسن مارہروی
۲۰۹	〃	میرزا تصدق حسین
〃	〃	منشی علی شیر
۲۱۰	دماغ	منشی گنگالال
〃	〃	مرزا سجاد علی لکھنوی
۲۱۰-۲	دوپیازہ	ملا عبدالمومن دہلوی
۲۱۲	دوست	شیخ غلام محمد
۲۱۲-۳	〃	سید خواجہ
۲۱۳	〃	منشی دوست محمد خان
۲۱۳-۴	دولہا	نواب محمد حسن علیخان دہلوی
۲۱۴-۶	〃	نظیر الدولہ جہانگیر محمد خان

صفحہ	تخلص	نام
۲۱۶-۷	دولہا	میرزا علی نقی لکھنوی
۲۱۷-۸	دیوانہ	رائے سرب سنگھ دہلوی
۲۱۸	〃	میرزا محمد علی جان
۲۱۹	〃	میر طالب علی بنارسی
〃	〃	منشی ہنس گوپال-
۲۲۰	〃	قسیم الدین احمد
〃	〃	سید باقر علی
۲۲۰-۱	〃	سید محمد فاروق- ۱۷۶
۲۲۲	ڈاکٹر	لالہ بھولاناتھ- ۱۷۷
		ردیف حرف ذال
۲۲۳-۴	ذاخر	سید فرزند حسین لکھنوی
۲۲۴-۷	ذاکر	نامعلوم الاسم
۲۲۷-۸	〃	مولوی ذاکر علی بنارسی
۲۲۸	〃	منشی میر جان لکھنوی-
۲۲۸-۹	〃	میرزا ذاکر الدین گورگانی
۲۲۹-۳۲		مولوی ذاکر علی شاہپوری
۲۳۲-۳	〃	شیخ برکت اللہ دہلوی
۲۳۴	〃	عنایت خان
〃	ذائق	منشی عبدالعزیز لکھنوی
〃	〃	منیر اللہ کانپوری

صفحہ	تخلص	نام
۱۳۷	دانا	منشی روشن لال
″	دانش	منشی تصدق حسین
۱۳۷-۸	″	حکیم احمد حسین خان لکھنوی
۱۳۸	″	قاضی بشیر الدین
۱۳۸-۹	″	حافظ بشارۃ الحق
۱۳۹-۴۱	″	حکیم مرزا افلا احمد لکھنوی۔
۱۴۱	داؤد	ندیم الدولہ حافظ داؤد دہلوی
۱۴۱-۸	″	مولوی محمد داؤد بی۔اے
۱۴۸	دبنگ	حافظ سراج احمد
۱۴۸-۵۱	دبیر	منشی محمد ابراہیم
۱۵۱-۶۴	″	میرزا سلامت علی دبیر
۱۶۴-۸	درخشان	ماہتاب الدولہ سید علیخان لکھنوی
۱۶۸-۷۷	درد	خواجہ میر درد دہلوی
۱۷۷	″	مسٹر عزیز الدین احمد بی اے
۱۷۷-۸	دردمند	فقیہ صاحب
۱۷۸	دردی	مفتی محفوظ علی۔
۱۷۸-۹	درس	منشی منی لال
۱۷۹	درویش	میر شاہ علی دہلوی
۱۷۹-۸۰	″	درویش علی
۱۸۰	دریا	پنڈت رتن ناتھ لکھنوی۔

صفحہ	تخلص	نام
۱۸۰-۱	دریا	منشی سید محمد عباس
۱۸۱	دقیق	میر واجد حسین
″	دل	شیخ محمد عابد
۱۸۱-۲	″	منشی بینی پرشاد
۱۸۲	″	زور آور خان
۱۸۲-۳	″	نواب لقمان الدولہ محمد حیدر خان
۱۸۳-۶	″	حکیم ضمیر حسن خان
۱۸۶-۷	″	سید احمد اللہ
۱۸۷	″	سید احمد جعفری۔
″	″	منشی محمد علی حسین خان
۱۸۷-۸	″	سید علی حیدر کنتوری
۱۸۸	″	مرزا بہادر جعفر علیخان لکھنوی
۱۸۸-۹۱	″	خواجہ دل محمد ایم اے
۱۹۱-۲	″	شیخ ممتاز علی۔
۱۹۲	″	منشی محمد حسین
″	دلاور	سید دلاور علی
۱۹۲-۳	″	محمد دلاور حسین خان
۱۹۳	″	نواب دلاور حسین لکھنوی
″	دلخوش	لالہ بہادر سنگھ دہلوی
۱۹۳-۴	دلریش	منشی اٹل بہاری لال

صفحہ	تخلص	نام
۶۳	خواہش	مولا بخش
"	"	منشی امیر حسن
۶۴	"	میر اللہ داد
"	خوب	ڈاکٹر خوبداد خان
۶۴-۵	"	منشی خوب چند
۶۵-۶	خورشید	سید خورشید علی
۶۶	"	میر سید علی
۶۶-۷	"	پنڈت سورج پرشاد
۶۷-۸	"	شیخ خورشید احمد
۶۸-۹	"	سید محمد مصطفیٰ لکھنوی
۶۹-۷۰	"	حاجی میرزا خورشید احمد خان
۷۰	"	منشی خوش وقت علیخان
۷۰-۱	"	میرزا عباس
۷۱-۷	"	قاضی غیاث الدین دہلوی
۷۷	"	شیخ محمد سعید
۷۷-۹	"	پنڈت بلدیو کشن
۷۹-۸۱	"	صاحب عالم میرزا خورشید عالم گورگانی
۸۲	"	سید خورشید عالم
"	"	پنڈت جوالا پرشاد ایم۔اے
۸۲-۳	خوشتر	منشی عبدالرحمٰن

صفحہ	تخلص	نام
۸۳-۷	خوشتر	منشی جگن ناتھ
۸۸	خوشدل	محمد حمید الظفر خان رامپوری
۸۸-۹	خوشوقت	منشی خوش وقت رائے
۸۹	خیال	منشی غلام حسین خان دہلوی
۹۰ "	"	منشی جبیکہ رائے دہلوی
۹۰-۴	"	مولوی ریاض حسن خان۔
۹۴-۶	"	مولوی سید محمد علی۔
۹۶-۸	"	سید شمس الحق۔
۹۸-۹	"	منشی صفدر علیخان
۹۹	خیالی	محمد نسیم اللہ
۹۹-۱۰۰	"	محمد فخر الدین
۱۰۰	خیر	ابوالخیر مظہر عالم
"	"	رائے نرہری پرشاد ۱۰۳
		ردیف حرف دال
۱۰۱	داد	منشی غلام حسین
۱۰۱-۳	دارا	میرزا دارا بخت گورگانی ولیعہد
" -۳	"	نواب بہاؤالدین خان
۱۰۳	داغ	میر محمدی دہلوی۔
۱۰۴-۳۶	"	جہان استاد نواب فصیح الملک دبیر الدولہ مرزا داغ دہلوی

صفحہ	تخلص	نام
۱۸	خستہ	معشوق اللہ خان
″	″	حکیم غلام نصرت خان
۱۹	″	منشی جیالال دہلوی
۱۹-۲۵	خسرو	خواجہ ابوالحسن دہلوی
۲۵-۶	خضر	مرزا خضر سلطان دہلوی
۲۶	″	شیخ محمد یوسف
″	″	بابو محمد یوسف
۲۶-۷	خطا	اسم نامعلوم
۲۷	″	شفقت حسین
۲۷-۸	خطیر	منشی اُمراؤ علی
۲۸	خلش	منشی جگیشر پرشاد
۲۸-۳۰	″	مولانا خواجہ کرامت علی -
۳۰	″	منشی فردوس علی دہلوی
″	″	منشی نصیر الدین
″	″	منشی حسام الدین
۳۰-۱	خلق	میر احسن علی
۳۱-۲	″	منشی مستجاب خان -
۳۲-۳	خلیق	میرزا ظہور علی
۳۳-۴	″	میر مستحسن خلیق دہلوی
۳۴-۵	″	منشی ارشاد حسین - ۵۰

صفحہ	تخلص	نام
۳۵	خلیق	محمد نصر اللہ خان
″	″	راجہ دیبی داس
۳۵-۶	″	منشی محمد خلیق
۳۶-۴۳	″	منشی عبدالخالق دہلوی
۴۳	خلیل	شرف الدولہ نواب محمد ابراہیم خان لکھنوی
۴۳-۸	″	میر دوست علی لکھنوی
۴۸-۵۰	″	حافظ خلیل حسن مانکپوری
۵۰-۲	″	نواب ابراہیم علیخاں والی ٹونک
۵۲-۳	خمار	حکیم برجموہن لال -
۵۳	خمیر	نامعلوم
۵۴	خنجر	شیخ محمد عبداللہ
″	″	نواب محمد حسین خان
۵۵	″	منشی عبدالغفور خان
۵۵-۷	″	منشی محمد سعید
۵۷-۸	″	سید عالم مارہروی
۵۹-۶۰	″	مرزا فدا علی لکھنوی -
۶۰	خندان	میرزا امجد علی
۶۰-۱	خندہ	میر شجاعت علی
۶۱	خواجہ	نواب فیاض الرحمٰن
۶۱-۳	خواہاں	سید قاسم علی

فہرست اسماء شعراء مندرجۂ خمخانۂ جاوید جلد سوم

صفحہ	تخلص	نام	صفحہ	تخلص	نام
۱	خادم	شیخ خادم علیخان	۱۱-۲	؍؍	مرزا احمد سلطان دہلوی
۲	؍؍	عتیق الرحمٰن	۱۲	خبر	سیّد محمد مہدی
؍؍	خاص	محمد حیدر خان دہلوی	؍؍	؍؍	میرزا نادر حسین لکھنوی
۲-۳	خاطر	سیّد محمد صالح	؍؍	خبیر	غلام محمد خان
۳	؍؍	رائے شوبرج نراین	۱۳	خرد	نوّاب فخر الدّین خان دہلوی
۴-۵	؍؍	منشی ظفر حسن لکھنوی	۱۳-۴	؍؍	حکیم انور آغا لکھنوی
۵	؍؍	مرزا معظم سلطان دہلوی	۱۴-۵	؍؍	صاحبزادہ مرتضیٰ خان
۶	خاک	میر طالب حسین	۱۵	؍؍	خواجہ شفیع الدّین
۷	خاکسار	میر محمد یار دہلوی	۱۵-۶	؍؍	منشی ہردیال پرشاد
۸	؍؍	محمد بلاقی	۱۶	خرم	پنڈت گلاب رائے
۸-۹	خاموش	میاں عبداللہ شاہ	؍؍	؍؍	منشی سیتل پرشاد
۹	خان	منشی اشرف خان دہلوی	۱۶-۷	خستہ	منشی قطب بخش
۹-۱۰	؍؍	محمد خان دہلوی	۱۷	؍؍	میاں عبداللہ خان دہلوی
۱۰-۱۱	خاور	میرزا محمد اکبر خان	۱۷	؍؍	حکیم محمد سلیم خان دہلوی
۱۱	؍؍	مرزا نواب بہادر	۱۸	؍؍	منشی حیدر علی خان۔

PK
2184
S75
v. 3

LIBRARY
DEC 2 1964
UNIVERSITY OF TORONTO

945036

تذکرہ ہزار داستان

Ram, Lala Sri

المعروف بہ

Tazkirah-i hazar dastan

۲۵ ھ ۱۳

خمخانۂ جاوید

جلد سوم ۳

v. 3.

مؤلفہ

جناب لالہ سری رام صاحب ایم اے سابق منصف دہلوی خلف الصدق

عالیجناب آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال صاحب مرگباشی

مطبوعہ دلّی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۷ء

تعداد طبع اول ۱۰۰۰

قیمت مجلد پانچ روپیہ

بلا جلد چار روپیہ

1917

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا

ہزار ہزار شکر اُس ناظم کون و مکاں کا کہ زبان اردو کے شعراے
ماضی و حال کا یہ مکمّل تذکرہ موسوم بہ

تذکرہ ہزار داستان

معروف بہ

خمخانہ جاوید

۱۳۲۵ھ

جلد سوم

لالہ سری رام ایم۔ اے منصف دہلوی خلف الصدق عالیجناب آنریبل رائے بہادر
مدن گوپال صاحب بیرسٹر ایٹ لا رئیس دہلی و لاہور کی لگاتار محنت تلاش اور کوشش کا نتیجہ ہے

سنہ ۱۹۱۷ء

لالہ ٹھاکر داس صاحب اینڈ سنز کے اہتمام سے

دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپا

کتب خانہ انجمن ترقی اردو
دہلی

۳۰/-

۲۸۸

محمد عبد الرحمن بارکر

مانٹریال - ۱۳ جولائی ۱۹۹۴ء

Tazkyra e hazar dastan
(called)
Xwmxana e javed

(Tazkyra of poets)

lala sri ram

1917
1325

rae bahadur lala madan gopal

vol. 3 only
very rare!

PK
2184
S75
v.3

Sri Ram
Tazkirah-i hazār dāstān

PLEASE DO NOT REMOVE
CARDS OR SLIPS FROM THIS POCKET

UNIVERSITY OF TORONTO LIBRARY